

مَقَالَاتُ مِحْجَرِ الْإِسْلَامِ

مجموعه تالیفات

سید الامام البکیر حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ



ادارۃ تالیفات اشرفیہ

چوک فوارہ ملت ان پاکستان

{0322-6180738, 061-4519240}

ہدیۃ الشیعہ

تاریخ اشاعت..... ذوالحجہ ۱۴۴۱ھ
ناشر..... ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت..... سادات پنجاب پرنٹنگ پریس، ملتان
بائڈنگ..... ابو ذریبک بائڈنگ..... ملتان

انتباہ

اس کتاب کی کاپی رائٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں

قارئین سے گزارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔
الحمد للہ اس کا کیلئے ادارہ میں علامہ کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔
پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں
تا کہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ملنے کے پتے

ادارۃ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ نعمت ان پکٹسٹن

ادارۃ اشاعت..... اردو بازار..... کراچی	ادارہ اسلامیات..... انارکلی..... لاہور
قرآن محل..... کیشی چوک..... راولپنڈی	مکتبہ سید احمد شہید..... اردو بازار..... لاہور
مکتبہ دارالخلاص..... قصبہ خانی بازار..... چناب	مکتبہ رحمانیہ..... اردو بازار..... لاہور
مکتبہ اسلامیہ..... امین پور بازار..... فیصل آباد	اسلامی کتاب گھر..... خیابان سرسید..... راولپنڈی
مستاد کتب خانہ..... قصبہ خانی بازار..... چناب	اسلامک بک کینی..... امین پور بازار..... فیصل آباد
مکتبہ ماحدیہ..... سرکی روڈ..... کوئٹہ	مکتبہ رشیدیہ..... سرکی روڈ..... کوئٹہ
مکتبہ عمر فاروق..... شاہ فیصل کالونی..... کراچی	مکتبہ الشیخ..... بہادر آباد..... کراچی
مکتبہ نعمانہ گوجرانولہ..... سوئی کتب گھر..... گوجرانولہ	مالی کتاب گھر..... گوجرانولہ..... مکتبہ ملیہ..... اکوڑہ سنگ
الامام محمد قاسم النالوتوی ریسرچ لائبریری مردان: 0341-9164891	

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTRE)

119-121- HALLIWELL ROAD
BOLTON BLT 3NE (U.K.)

عرض ناشر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلْحَضْرَةِ الْجَلَالَةِ وَالنُّعْمَةِ لِعَالَمِ الرِّسَالَةِ

اما بعد! ہمارے اکابر میں سے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے علم و فضل کے اعتبار سے آپ کو اپنے ہم عصر اہل علم پر جو فضیلت و فوقیت عطا فرمائی وہ اظہر من الشمس ہے۔

ادارہ نے حضرت کی جو نایاب علمی تصانیف شائع کی ہیں ان میں آب حیات، تقریر دلپند، یاد اور زیر نظر کتاب ”ہدیۃ المصیبع“ شامل ہیں۔

آج سے تقریباً نصف صدی قبل ہمارے بزرگ جناب حضرت مولانا محمد اسلم صاحب رحمہ اللہ (معروف تبلیغی بزرگ، خطیب جامع مسجد نشتر ہسپتال) نے کراچی میں اپنے ”کتاب خانہ حقانیہ“ سے شائع فرمائی تھی۔ پھر مستقل طور پر کراچی سے ملتان تشریف لے آئے تھے۔ حضرت ہی نے بندہ کو اس کی اشاعت کی ترغیب دی۔ یوں ادارہ کی طرف سے پرانی کتاب کا عکس ہی شائع ہوتا رہا۔

کتاب ہذا کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر اب ادارہ نے اس کو جدید کمپیوٹر کتابت کے بعد شائع کیا ہے جو اولاً حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کیلئے اور ثانیاً حضرت مولانا محمد اسلم صاحب رحمہ اللہ کیلئے صدقہ جاریہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اکابر کے علوم و معارف کی نشر و اشاعت کرنے اور انہیں حرز جاں بنانے کی توفیق عطا فرمائے آمین

واللہ

محمد اسلم غفرلہ

مصر المظفر ۱۴۳۶ھ

فہرست عنوانات

۳۳	تقدیم الکتاب
۳۴	حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ سرسید کی نظر میں
۳۵	سبب تالیف
۳۶	انتخاب نام کاراز
۳۷	کتاب کی کھلی صداقت
۳۸	کتاب کے جواب کی صحیح راہ
۳۹	ایک شبہ کا ازالہ
۴۰	نقل روایات میں مصنف کا رویہ
۴۱	تحفہ اشاعہ شریعہ پر اعتماد
۴۲	شیعہ کو ہمدردانہ مشورہ
۴۳	شیعہ کی دلیرانہ غلط بیانی
۴۴	مولوی صاحب کی دروغ گوئی کا ایک دلچسپ پہلو
۴۵	باب مذہب اہلسنت موافق قرآن مجید و حدیث پاک ہے اور مذہب شیعہ مخالف ہر دو
۴۶	اہلسنت اہل حق اور شیعہ اہل باطل ہیں، دلائل

۴۳	مضمون آیت پر تفصیلی نظر اور حق تلاوت میں ایمان کا انحصار
۴۴	اہلسنت سے ادائیگی حق تلاوت اور شیعہ کی اس سے قطعی محرومی
۴۴	بروئے آیات قرآنی قرآن کا حفظ ہونا حق ہونے کی نشانی
۴۵	شیعوں کے حافظ نہ ہونے کا واقعات سے ثبوت
۴۶	شیعہ ادائیگی حق تلاوت سے کیوں محروم ہیں؟ شیعوں کو کلام اللہ سے طبعی لگاؤ نہیں
۴۶	شیعہ اپنے اساتذہ کے حق میں گستاخ اور بے ادب ہیں
۴۶	تلاوت کا حق ادا کرنے والوں کے پیر و بھی حصر ایمانی میں شامل ہیں
۴۷	آیت کے شان نزول سے بیان مذکور کی شہادت
۴۷	ادائیگی حق تلاوت میں سنی اور شیعہ فرقوں میں اکثریت کا لحاظ
۴۸	شیعوں کی ایک راہ گریز اور اس کا انسداد
۴۸	اہلسنت کو کلام اللہ سے حسن عقیدت ہے شیعوں کو نہیں
۴۹	شیعوں کی نظر میں کلام اللہ کی حرمت ناک بے وقعتی
۵۰	حق تلاوت سے خشوع و خضوع مراد لینے میں نہ شیعہ کی مطلب برابری ہے اور نہ یہ احتمال آیت شریفہ پر چسپاں ہوتا ہے
۵۰	حق تلاوت سے خشوع و خضوع مراد لینے کی صورت میں ترتیب معانی کا الٹ جانا
۵۱	حق تلاوت سے کثرت تلاوت مراد لینے کی صورت میں ترتیب معانی کا ٹھیک اور درست رہنا
۵۲	آیت مذکورہ میں ایک شبہ اور اس کا ازالہ
۵۲	آیت مذکورہ کے ذیل میں ایک اور فائدہ
۵۳	اس ایک آیت کی طرح اور بھی آیت قرآنیہ مذہب اہلسنت کو حق اور مذہب شیعہ کو باطل قرار دیتی ہیں بغرض اجمال صرف ایک پراکتفا کی گئی

۵۴	استدلال آیت مذکورہ پر شیعوں کی طرف سے ایک لچر شک و شبہ
۵۴	شبہ کا ایک پہلو سے جواب
۵۴	شبہ کا دوسرے پہلو سے جواب
۵۴	کلام اللہ پر بے اعتباری ظاہر کرنا خود اپنے خیال کی بیخ کنی ہے
۵۵	کلام اللہ پر سے اعتبار اٹھ جانا احادیث پر سے اعتبار کو پہلے کھودیتا ہے
۵۵	کلام اللہ میں کمی و بیشی کا خیال تلاوت اور حفظ قرآن کا خاتمہ کر دیتا ہے
۵۵	حضرات اہل بیت کا عمل قرآن میں کمی و بیشی کے خیال کو لغو ثابت کرتا ہے
۵۵	قرآن کا حد درجہ شائع ہونا خود اس میں کمی و بیشی کے خیال پر ضرب کاری لگاتا ہے
۵۶	قرآن مجید کی بے پناہ شہرت عقل کے نزدیک خلیفہ ثالث کے دامن کو الزام سے پاک کر دیتی ہے
۵۷	قرآن کی حفاظت کا ثبوت خود قرآن کی زبانی
۵۷	شیعوں کے غلط خیال کے شرمناک نتائج
۵۸	اسی سلسلے میں کلینی کی افترا پردازی اور مرتبہ قرآن میں خلل اندازی
۵۹	حفاظت قرآن کے دو لچر احتمالات اور ان کے دندان شکن جوابات
۶۰	قرآن مجید کے نام ذکر کا موقع استعمال اور اسکی مفید تشریح
۶۱	دوسرے سوال کا مسکت جواب
۶۲	شیعوں کا لغو خیال یہود اور نصاریٰ کے مقابلے کیلئے ایک راہ کھولتا ہے
۶۲	اگر یہود سے پالاجیت بھی گئے تو نصاریٰ ان کی نہیں چلنے دیں گے
۶۳	عیسائیوں سے نبرد آزما کیلئے اس عقیدہ سے دست برداری لازم ہے کہ حلت و حرمت کی تہدیلی آئمہ کے دست قدرت میں ہے
۶۴	بے اصل روایات کی بے بنیاد توجیہ

۶۵	تفویض کے خیال کی قرآن بخ کنی کرتا ہے
۶۵	تفویض کا خیال قرآن کو کتب منسوخہ کی حیثیت دیتا ہے
۶۶	تفویض کی شکل میں ظہور حضرت امام مہدی کے وقت قرآن کی وہی حیثیت ہوگی جو انجیل کی بوقت نزول حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوگی
۶۷	تفویض سے انکار میں نصاریٰ و یہود سے گلو خلاصی ملنے کے علاوہ ختم نبوت پر ایمان پختہ ہوتا ہے
۶۸	حق کے زور سے ابن بابویہ آخر سنیوں کا ہمزبان ہو گیا
۶۸	آیت مذکورہ سے سنیوں کی فضیلت کا انکشاف
۷۰	آیت سوئم کی بصیرت افروز تشریح
۷۱	حزن کے معنی سمجھنے میں بعض غیر منصفوں کی فاش غلطی
۷۲	شیعوں کی کج فہمی کی ایک پُر مذاق توجیہ
۷۳	اللہ کی معیت کی وضاحت
۷۴	آیت معیت سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مدد کا ثبوت
۷۵	آیت معیت میں شیعوں کی طرف ایک عبارتی دھوکا اور اس کا جواب
۷۵	دارالندوہ کے واقعہ کی اصل شکل
۷۷	ملا عبد اللہ مشہدی کی بے اختیارانہ حق گوئی
۷۷	سفر ہجرت کی حقیقت حال
۷۸	واقعہ سے شیعہ کی خام خیالی کا جواب
۷۹	آیت معیت کی منصفانہ ترجمانی
۸۰	آیت معیت میں شیعوں کی ایک اور معکمہ خیز تاویل اور اس کا بطلان
۸۰	آیت معیت کے الفاظ بھی شیعوں کو منہ توڑ جواب دے رہے ہیں

۸۲	معیت حق صدیق کی ذات کے ساتھ تھی
۸۳	آیت میں معنا کا لفظ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے رتبہ کا آئینہ دار ہے
۸۳	شیعوں کی ایک اور راہ گریز اور اس کی روک تھام
۸۵	تقیہ کا عذر رنگ
۸۵	لصاحب سے متعلق لطیف و دقیق تشریح اور صحابی و صاحب کا مفہوم
۸۶	صاحب بمعنی صحابی نہ ہو تو بھی کچھ قدح نہیں
۸۶	نقل معنی کی حقیقت صورت
۸۸	لفظ صاحبہ میں بہ نسبت لفظ صحابی زیادہ فضیلت ہے
۸۹	شیعوں کی طرف سے خلافت صدیقی پر نکتہ چینی
۹۰	باب وعدہ خلافت و استخلاف
۹۱	آیہ تمکین معتقدات شیعہ سے کسی طرح مطابق نہیں
۹۲	جن سے وعدہ تھا ان کو تمکین ہی حاصل نہ ہو سکی لہذا وعدہ پھر بھی غلط نکلا
۹۲	استخلاف بمعنی توطن کسی طرح موزوں نہیں۔
۹۳	استخلاف بمعنی تسلط ہے بدلات فی الارض
۹۳	آیت استخلاف کی صحیح تفسیر
۹۴	نہ صرف استحقاق خلافت بلکہ ترتیب خلافت کا پتہ بھی اس آیت سے چلا
۹۴	آیت استخلاف کا مصداق صرف خلفاء اربعہ ہیں
۹۵	آیت استخلاف کی بنیاد مہاجرین کی قربانیاں ہیں
۹۶	آیت مذکورہ سے مشیت خلافت قریش کا راز بھی کھل گیا
۹۷	آیت مرقومہ حضرت فاروق کی نزاہت کی دلیل ہے
۹۷	فرمان نبوی کی تعمیل نہ ہو سکنے کے اسباب

۹۹	حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے کا وزن
۹۹	کاغذ، قلم، دوات نہ لانے میں بھی شریک تھے صرف فاروق کیوں؟
۱۰۰	شیعوں کو یہ خواب کہاں سے آ گیا کہ منشا نبوی تحریر مسئلہ خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ تھا
۱۰۱	فرمان نبی سے خلافت صدیقی کی طرف اشارہ سمجھا جائے تو عین قرین قیاس ہے
۱۰۲	خلفاء نعمت خلافت سے اصالتاً نوازے گئے دوسرے انکے طفیلی تھے
۱۰۳	”وَمَنْ كَفَرَ“ سے شیعہ کے کفران نعمت کی طرف اشارہ ہے جو اعجاز قرآنی ہے
۱۰۴	شیعوں کا شیوہ تمہر بازی امیر کی اتباع سے نکال کر ان کا قدم امیر معاویہ کی تقلید پر جماتا ہے
۱۰۵	الفاظ آیت تحفظ فضیلت صحابہ کیلئے سنگین حصار کھینچتے ہیں
۱۰۶	خلفائے ثلاثہ پر ارتداد کی تہمت خدا تعالیٰ پر دروغ گوئی کی تہمت ہے
۱۰۶	وَمَنْ كَفَرَ کے اصلی مصداق
۱۰۷	باب مناقب صحابہ بدیل تفسیرات آیہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
۱۰۷	اس اُمت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم کا درجہ ہے اور رسالت کے بعد بغض فی اللہ کا
۱۰۸	صحابہ کی منقبت میں اشداء علی الکفار کو باقی اوصاف پر مقدم کرنے کی حکمت
۱۰۸	محبوب کے متعلقین کی محبت محبوب ہی کی محبت ہے
۱۰۹	متعلقین محبوب کی محبت محبوب کی محبت کا جزو ہے
۱۰۹	بدخواہان محبوب کی دشمنی محبت کا جزو نہیں اس کا لازم ہے
۱۰۹	کسی کی مدح میں پہلے ہلکی پھر بڑھیا پھر اور بڑھیا خوبی بیان کرنا صحیح ترتیب ہے
۱۱۰	محبت کرنا آسان ہے اور دشمنی دشوار خصوصاً اقربا سے

۱۱۱	صحابہ بشہادت کتاب اللہ نفس و شیطان پر بھی اشد تہلیلہ اُن کی گمراہی کا خیال بھی گمراہی ہے
۱۱۲	نفس و شیطان کی آمیزش بغیر غلط فہمی سے کوئی غلطی ہو تو اُمیدِ ثواب ہے
۱۱۲	مشاجرات صحابہ کا باعث نفس و شیطان نہیں بلکہ بغض فی اللہ تھا
۱۱۳	نفس دب سکتا ہے لیکن اس کا مزاج نہیں بدل سکتا
۱۱۳	نیکی کی اصل روح اور بدی کی اصل نفس ہے
۱۱۳	روح عالم ملائکہ کی ایک چیز ہے اور نفس طبقہ شیاطین میں سے ہے
۱۱۴	انسان میں نیکی و بدی کے مختلف دور ملائکہ اور شیاطین کی تقویت و تاثیر سے ہوتے ہیں
۱۱۵	نفس دب جائے تو اشد اعلیٰ الکفار کا مقام ہاتھ آتا ہے
۱۱۵	نفس دب جائے تو بھی قابل اعتبار نہیں
۱۱۵	انسان ہمیشہ ایک ہی حال میں نہیں رہ سکتا
۱۱۶	غلبہ نفس اور مغلوبیت نفس سے سرزد ہونے والی خطاؤں میں بے حد فرق ہے
۱۱۷	اشد اعلیٰ الکفار سے خطا ممکن ہے لیکن شیطان کا تسلط ممکن نہیں
۱۱۷	”اَجِدَاءُ اور رُجَمَاءُ“ کیلئے اخلاص لازم اور ریانا ممکن ہے
۱۱۷	غلط فہمی کے سبب بڑوں بڑوں سے خطا ہو جاتی ہے
۱۱۸	امکانِ خطا کے باوجود اتنی تعریف دلیلِ غفران و رضا ہے
۱۱۹	امکانِ خطا کے باوجود اتنی تعریف اعدائے صحابہ کے منہ پر طمانچہ ہے
۱۱۹	تعریف صحابہ کا ایک مقصد آنے والے دشمنوں کا چڑانا اور جلانا بھی ہے
۱۲۰	صحابہ کرام شیعوں کے بھی محسن ہیں
۱۲۰	صحابہ کی تعریف قرآن کی پیشین گوئی ہے کہ آئندہ صحابہ کے دشمن پیدا ہونگے

۱۲۱	صحابہ سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ غیر مشروط ہے
۱۲۱	ایمان کے معنی اور مراتب یقین
۱۲۱	علم یقین
۱۲۲	عین یقین
۱۲۲	حق یقین محبت حق یقین کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے
۱۲۳	صحابہ حق یقین کے مراتب پر فائز تھے اور حب فی اللہ اور بغض فی اللہ میں بھی راسخ تھے
۱۲۳	صحابہ کا مقصود صرف رضائے الہی تھا
۱۲۳	صحابہ کی محبت اور تسلیم سے اوپر کسی محبت و تسلیم کا درجہ ہی نہیں ہے
۱۲۵	حق یقین کے مراتب میں تفاوت ہے
۱۲۵	باہمی مناقشات ”رُحَمَاءَ بَيْنَهُمْ“ کے منافی نہیں ہیں
۱۲۶	صحابہ کی رنجش کی بناء بھی محبت تھی
۱۲۶	جن روایات پر تشیع کی بنیاد ہے ان کے راویوں کی ثقاہت کا حال
۱۲۸	آیت ہجرت میں رضائے الہی کا مدد صرف ہجرت پر ہے لہذا ارتداد کا الزام بھی مفید مقصد نہ ہوگا!
۱۲۹	ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ منورہ کے درمیان عجیب و غریب فرق
۱۳۰	آیت السابقون میں ہجرت سے مراد صرف ہجرت مدینہ منورہ ہے
۱۳۰	آیت ہجرت سے صرف رضائے الہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کا ایمان اور اعلیٰ درجہ کے اعمال صالحہ بھی ثابت ہوتے ہیں
۱۳۰	دوام جنت کی خوشخبری سے بڑھ کر حسن خاتمہ کی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے
۱۳۱	آیات فضائل صحابہ میں جو شبہات شیعہ پیش کریں گے، وہی بھیہنہ خارجی بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں پیش کر سکتے ہیں

- ۱۳۱ صحابہ علیہ السلام میں رسوائی نہیں اور انکار اور اساق اپنے رضائے الہی نہیں
- ۱۳۲ صحابہ کے خلاف اصرار و اصرار کے ذریعہ یہ لایا کہ ان رضائے الہی ہیں
- ۱۳۳ عقیدہ کا اظہار میں آئے یہ آیت "اللہم ارہمہ" کی ضرب کاری
- ۱۳۴ باپ عقیدہ کا ہدائی تفصیل میں اہدائی ہر خار و داری اور طمانے پیچہ کا اظہار
- ۱۳۴ ہدائے الہی میں
- ۱۳۴ ہدائے دوسرے میں
- ۱۳۵ ہدائے تیسرے میں
- ۱۳۵ ہدائی تین تین
- ۱۳۵ ہدائے رطل میں ایک اہدائے کا ازالہ
- ۱۳۶ ہدائی تین تین میں ایک دوسرے کو ادا ہیں
- ۱۳۷ عقیدہ کا ہدائے کے نتائج (۱) ہار و معصوم کی مطرقت ملکہ
- ۱۳۷ امام آخر الاماں کی طویل روپوشی اندیشہ کا ہے
- ۱۳۷ پھر امام کو امام بنانے میں بھی شاید خدا سے ہدایہ ہو گیا
- ۱۳۸ امام زماں کو شاید ہدائی معصوم سے خدا معزول کر چکا
- ۱۳۸ عقیدہ کا ہدائے کا استعمال قرآن مجید سے
- ۱۳۹ قواعد عقائد عقیدہ کی رو سے خدا سے خطا ممکن معصوم سے ناممکن
- ۱۳۹ ہدائے عقیدہ کے رکھے والوں کے لیے مطرقت معصوم کی ہدایہ
- ۱۴۰ حق واضح ہونے کے بعد ملاحظہ وری ہے پھر کسی اور بات کا انتظار ممانعت ہے
- ۱۴۱ ہدائے اہل عقیدہ کے کی غلط فہمیاں ہیں
- ۱۴۱ ہے استاد کی غلط فہمیاں
- ۱۴۲ امام کا امتحان سے مقصود خداوندی قطع صحت ہے نہ کہ تفصیل علم

۱۴۳	امتحان بغرض قطع حجت کی ایک قرآنی مثال
۱۴۴	بعثت انبیاء اور تکالیف شرعیہ کی وجہ بھی قطع حجت بنی آدم ہے
۱۴۵	دوزخی اور جنتی پہلے ہی سے طے ہیں
۱۴۶	اَخْبَارُ کُمْ کے تفسیری فوائد
۱۴۷	جیسے بعض جگہ بالاتفاق ماضی سے مجازاً مستقبل مراد ہے اسی طرح بعض جگہ مستقبل سے بھی ماضی مراد ہے
۱۴۷	حوادثِ آئندہ یقینیہ کو ماضی اور وقائعِ ماضیہ مخفیہ کو مجازاً مستقبل سے تعبیر کرنا صحیح ہے اس کی مثال
۱۴۸	ازلی سعادت و شقاوت کی عام فہم مثال
۱۴۹	تینوں زمانے مجتمعہ موجود ہیں فنا نہیں ہوئے
۱۵۰	سب زمانے احاطہ خداندی میں ہیں
۱۵۰	ماضی و مستقبل بھی خدا کیلئے حال کا حکم رکھتے ہیں مگر باہم مقدم مؤخر ہیں
۱۵۰	کلام الہی میں ماضی و حال و استقبال کے استعمال کی ترتیب
۱۵۱	وقائعِ عالم قدیم نہیں ہو سکتے کیونکہ مستمر نہیں
۱۵۲	حصولِ علم کے دو طریقے بالواسطہ و بلاواسطہ
۱۵۲	کبھی علم بواسطہ علم بے واسطہ میں محو ہو جاتا ہے کہ اس کا خیال بھی نہیں رہتا
۱۵۳	کبھی دو چیزوں کا علم بے واسطہ یا ایک کا بواسطہ دوسری کا بے واسطہ بھی اکٹھے ہی حاصل ہو جاتے ہیں
۱۵۳	بے واسطہ اور بواسطہ حاصل ہونے والے علم الہی میں کوئی تقدم تاخر نہیں
۱۵۳	کلام الہی میں ماضی و حال علم بے واسطہ سے تعبیر ہے اور استقبال علم بالواسطہ سے
۱۵۴	بنی آدم کے علوم چونکہ بواسطہ ہیں اس لیے بعینہ استقبال (بواسطہ) تکلم فرمایا

۱۵۵	اگر علوم بے واسطہ سے تکلم فرماتے تو وہ بنی آدم پر حجت نہ ہوتے کیونکہ ان کے بس میں نہیں
۱۵۵	محدوثات کی بحث اور علم الہی کے دو دفتر
۱۵۶	عقیدہ بد اقرآن سے اس طرح ثابت ہے جیسے "لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ" سے نماز کی ممانعت
۱۵۷	علم الہی قدیم غیر متغیر محیط ہے
۱۵۷	عقیدہ بد ا خدا کیلئے جہل مرکب تجویز کرتا ہے
۱۵۷	عقیدہ بد ا تمام موجودات کو ایک طرح خدا پر فضیلت دیتا ہے
۱۵۸	تمام عالم علم الہی کے محدثات کا دفتر ہے
۱۵۸	محدثات کی ایک تقبہی تمثیل
۱۵۹	"لِكُلِّ آجَلٍ كِتَابٌ" کی عجیب تفسیر
۱۵۹	اُم الکتاب کی توضیحی مثال
۱۵۹	محدثات علم الہی میں نہیں لہذا بدا کی گنجائش بھی نہیں
۱۶۰	اُم الکتاب اور محدثات کی ایک اور مثال
۱۶۰	محدثات بالفرض احکام میں بھی ہو تو حذاقت ہے بدائیں
۱۶۱	عقیدہ بداء پر تیسرا استدلال
۱۶۱	جواب کی ایک توضیحی مثال
۱۶۳	دوسری توضیحی مثال
۱۶۳	دوسرا جواب
۱۶۳	دفع توہم
۱۶۴	لفظ میقات کی تفسیر

۱۶۳	تیسرا جواب
۱۶۵	بدائیلے کذب لازم ہے
۱۶۶	مخاطب کی غلط فہمی سے علم خداوندی میں بدا ثابت نہیں ہو سکتا
۱۶۷	آیہ میقات کی دودگر تفسیریں اور بدائے استیصال
۱۶۸	خاتمہ مباحث بدائے
۱۶۸	بدائے ضمن میں آئمہ کے علم غیب پر بحث
۱۶۸	”ماکان وہیکون“ تسلیم کرنے میں مساوات لازم ہے
۱۶۹	ایک عجیب تفسیری لطیفہ
۱۷۰	بالفرض اگر علوم غیب آئمہ کیلئے ثابت بھی ہوں تو بدائے کا خدشہ دور نہیں ہوا
۱۷۱	مناقب خلفاء و صحابہ بزبان امیر رضی اللہ عنہ و دیگر آئمہ
۱۷۲	مناقب صدیق رضی اللہ عنہ
۱۷۳	علامہ رضی کی خیانت جو مفید مطلب نہ ہو سکی
۱۷۳	صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شجاعت اور استقامت
۱۷۳	مقام تعریف مقام تصریح ہوتا ہے نہ کہ مقام اخفاء
۱۷۶	مناقب عمر رضی اللہ عنہ بزبان امیر رضی اللہ عنہ
۱۷۷	باب عقیدہ تقیہ
۱۷۷	عقیدہ تقیہ اور اس کے عقلی و نقلی مباحث
۱۷۸	تقیہ شیعہ کی اپنی روایات کے آئینے میں
۱۷۸	موت پر اختیار، طیب کا علم، بے انتہا شجاعت، پھر تقیہ کیوں؟
۱۷۹	حضرت امیر نے بعد وفات صدیق کے مناقب خلفاء ان کے اس وقت خوف بھی نہ تھا
۱۸۰	حکایات تقیہ کی روایات کتب شیعہ بے زور نکذیب کرتی ہیں

۱۸۰	امیر کا حکم کہ سچائی اختیار کرو خواہ کچھ بھی ہو
۱۸۱	امام کی شجاعت اور اشتیاق جنت
۱۸۱	انبیاء اور آئمہ کا منصب مبر محل اور حق گوئی ہے
۱۸۲	تقیہ اگر فرض تھا تو امام حسین کی شہادت معصیت ہوگی
۱۸۲	امام کا اپنی کرامت سے حضرت عمر کو مرعوب کر دینا
۱۸۳	تقیہ از روئے عقل و نقل و عرف
۱۸۵	تقیہ از روئے کلام اللہ
۱۸۵	تقیہ جنت سے محرومی کا سبب ہے
۱۸۶	خوف کفار سے ست ہونا ممنوع ہوا تقیہ تو دور کی بات ہے
۱۸۶	تقیہ سبب عتاب ہے نہ کہ موجب ثواب
۱۸۷	انبیاء خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے
۱۸۷	خاتم الانبیاء کو تبلیغ کا تاکید امر
۱۸۸	انبیاء اور ان کے نائب، سب کا مقصد انذار و تہشیر ہے
۱۸۹	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد ہی اظہار دین تھا
۱۸۹	تبلیغ دین انبیاء علماء اور آئمہ پر فرض ہے
۱۹۱	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی تقیہ کا استیصال ہے
۱۹۲	مہر کے فضائل اور ترغیب جس سے تقیہ کی حقیقت کھلتی ہے
۱۹۲	جہاں اظہار حق نہ ہو سکے ہجرت واجب ہے
۱۹۳	اکراہ میں بھی اظہار حق افضل ہے
۱۹۳	سیدنا ابراہیم کے کسی واقعہ سے اخفاء دین ثابت نہیں
۱۹۵	اخفائے علاقہ زوجیت اخفائے دین نہیں ہے

۱۹۶	بچاؤ اور تقیہ میں فرق عظیم ہے
۱۹۶	حضرت امیر (بزع شیعہ) سنت احمدی و ابراہیمی و موسوی پر عمل پیرا نہ ہو سکے
۱۹۷	دورانِ خلافت میں بھی امیر پر تقیہ واجب تھا
۱۹۸	خلافت امیر میں تقیہ کے بہتان کا پس منظر
۱۹۸	حضرت امیر و مسائل رکھتے ہوئے بھی اظہارِ دین نہ کر سکے
۱۹۹	صدیق نے بے سرو سامانی میں اظہارِ حق کیا
۲۰۰	مقربانِ الہی کا طریقہ اظہارِ حق کرنا اور جفائیں اٹھانا ہے
۲۰۰	تقیہ عرف اور دستور کی کسوٹی پر
۲۰۱	حضرت ابو بکر صدیق کو، صدیق نہ کہنے والے کیلئے حضرت جعفر کی بددعا
۲۰۲	امام جعفر پر تقیہ حرام تھا
۲۰۳	امام جعفر کی بددعا سے حقانیتِ اہل سنت اور بطلانِ مذہبِ شیعہ ظاہر ہو گیا
۲۰۵	امام جعفر پر ایک اعتراض جو خود کشی کی نوعیت رکھتا ہے
۲۰۶	نقل خط مولوی عمار علی
۲۱۲	جواب خط
۲۱۲	بناتِ طیبات از روئے کلام اللہ شریف
۲۱۳	بناتِ طیبات کی تعداد از روئے کتبِ شیعہ
۲۱۵	مذکور نہ ہونا معدوم ہونے کی دلیل نہیں ہے
۲۱۶	عمار علی کی تاریخِ دانی
۲۱۷	مسلمان عورت کو قیدِ کفار سے رہائی دلانے کا قرآنی حکم
۲۱۸	ذوالنورین کے فضائل اور واقعہ شہادت کی تفصیل
۲۲۰	عمار علی کی فنونِ عربیہ میں مہارت

۲۲۰	ذی النورین کے بچاؤ کیلئے صحابہ اور اہل بیت کی جانکاهی
۲۲۲	ذوالنورین کے لیے امام کی مدافعت
۲۲۲	حضرت امام کا کوئی معاملہ ظاہر داری نہ تھا
۲۲۳	دفاع عثمان کے لیے دیگر صحابہ کا رویہ
۲۲۳	حضرت علی رضی اللہ عنہ پر یزدلی کا بہتان
۲۲۳	حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام دنیا پر بھاری تھے
۲۲۵	حضرت علی رضی اللہ عنہ شجاعت میں بے مثل اور اپنی موت پر قابو یافتہ تھے (بزمِ عمِ شیعہ)
۲۲۵	حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوری زندگی خوف و ذلت سے گزاری (بزمِ عمِ شیعہ)
۲۲۶	حضرت علی رضی اللہ عنہ باوجود بے مثل شجاعت کے مگر گوشہ رسول کو فدک نہ دلا سکے
۲۲۷	حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کے نکاح کی بحث
۲۲۸	عمار علی کی تلمیس
۲۲۹	قاروق رضی اللہ عنہ سے اُم کلثوم کا نکاح حضرت عباس نے کیا تھا
۲۲۹	بزمِ عمِ شیعہ حضرت عباس اعراف میں ہوں گے
۲۳۰	محبوب رسول اعراف میں اور یہودی و نصرانی جنت میں
۲۳۱	حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خاموشی رضامندی کی وجہ سے تھی
۲۳۱	قاروق اگر کافر ہوں تو امام علی بھی محفوظ نہیں
۲۳۲	تزویج اُم کلثوم کا کتبِ شیعہ سے ثبوت
۲۳۲	شیعہ کو اہل بیت سے محبت نہیں، صحابہ سے عداوت ہے
۲۳۳	حبِ حضرت علی رضی اللہ عنہ کفر کے باوجود اگر جنتی بتاتی ہے تو قرابت بھی بتائیگی
۲۳۳	حضرت اُم کلثوم سے قاروق کی اولاد
۲۳۵	بابِ مباحثہ فدک

۲۳۶	حب الہ بیت وحب صحابہ ایمان کے دو پر ہیں
۲۳۶	حب الہ بیت وحب صحابہ ایمان کی دو آنکھیں ہیں
۲۳۷	شیعوں نے اپنے ایمان کی ایک آنکھ پھوڑ ڈالی
۲۳۷	شیعوں نے عترت میں سے بعض کی نکریم کی اور اکثر پر تہرا کیا
۲۳۸	اہل بیت سے مراد کون ہیں؟
۲۳۹	خاندان امام کو عباد میں لے کر دُعا کرنے کی وجہ
۲۴۰	شیعہ اولاد قاطعہ کی اکثریت کے دشمن ہیں
۲۴۱	اہل شیعہ کی حضرت علی سے محبت جو دشمنی سے بدتر ہے
۲۴۲	انبیاء آئمہ سے بلکہ تمام مخلوق سے افضل ہیں
۲۴۲	افضلیت انبیاء کتب شیعہ سے
۲۴۳	شیعوں نے صدیق کے بارے میں خدا کی گواہی اور آئمہ کی شہادت بھی رد کر دی
۲۴۵	حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہم السلام کا واقعہ کج فہمیوں کیلئے عبرت ہے
۲۴۶	بالفرض اگر صدیق سے گناہ ہوا تو وہ نیکی بن چکا اور نہ آئمہ ان کی تعریف نہ کرتے
۲۴۷	گناہ سے توبہ پر جنت میں داخلہ سب کو مسلم ہے
۲۴۷	توبہ کا ثبوت بروایت شیعہ
۲۴۸	نیکیاں زیادہ ہونے پر جنت میں داخلہ متفق علیہ ہے
۲۴۸	مہاجرین اذلیلین سے جنت عدن، مغفرت، رضا کا وعدہ ہو چکا اور خدا وعدہ خلائی نہیں کرتا
۲۴۹	حضرت کلیم کا پھڑے کو جلانا مبنی بر حکمت تھا
۲۵۰	غصب فدک پر آیت ذالقرنیٰ سے استدلال
۲۵۱	غصب فدک کے بہتان کا تاریخی جائزہ

۲۵۱	یہ آیت مکہ ہے مکہ میں فدک کہاں تھا؟
۲۵۲	کسی آیت کے کئی یا مدنی ہونے سے کیا مراد ہے؟
۲۵۳	ذوالقربیٰ سے سیدہ اور حقہ سے فدک مراد ہو تو کئی محدود لازم آئیں گے، پہلا محدود خویش پروری
۲۵۳	دوسرا بلاغت کی مخالفت تیسرا بقیہ اقربا پر ظلم
۲۵۳	چوتھا آنحضرت کی طرف ادائیگی حقوق میں کوتاہی کی نسبت
۲۵۳	پانچواں بنی ہاشم کے لیے نفس حرام
۲۵۵	چھٹا، بعد وفات سیدہ جو غنائم آئیں وہ انکی ملک نہ تھیں تو حقہ کیوں فرمایا؟
۲۵۶	ساتواں، مال غنیمت آئمہ کیلئے حرام ورنہ دیگر مستحقین کیلئے بھی جائز
۲۵۶	آٹھواں، سیدہ کیلئے صرف فدک اور اغیار کیلئے سب کچھ
۲۵۶	نواں، خدا پر بے انصافی کا الزام
۲۵۷	اہل سنت کے یہاں روایت کے صدق و کذب کا معیار قرآن مجید ہے
۲۵۷	روایت فدک آیت کے سیاق سباق کی مخالف ہے
۲۵۹	وآت ذی القربیٰ میں مخاطب خاص اور خطاب عام ہے
۲۶۰	حَقُّہ کا معنی فدک کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا
۲۶۲	ابن سبیل اور مسکین بھی استحقاق میں ذوالقربیٰ کے ہم پلہ ہیں
۲۶۳	آیت ذوالقربیٰ اگر مدنی ہے تو وہ علموا کی طرف اشارہ ہے
۲۶۳	روایت مذکورہ کے وضعی ہونے کی دلیل خود عمار علی ہے
۲۶۳	فصل، کتاب و مصنف کتاب کے قابل قبول ہونے کی چھ شرطیں
۲۶۵	پہلی شرط
۲۶۵	دوسری شرط

۲۶۵	تیسری شرط
۲۶۶	چوتھی شرط
۲۶۶	پانچویں شرط
۲۶۷	چھٹی شرط
۲۶۸	اہل سنت کی کتب میں اہل تشیع کے الحاقات
۲۶۸	اہل سنت کا نظام حفاظت
۲۶۹	مصنف معتبر ہو تو ضروری نہیں کہ تصنیف بھی معتبر ہو
۲۷۰	مصنف تحفہ کی ایک عبارت
۲۷۲	عمار علی نے بعض کتب شیعہ بھی اہل سنت کی طرف منسوب کر دیں
۲۷۲	علامہ سیوطی کی تصانیف پر مصنف کتاب کی رائے
۲۷۳	واقدی کے بارے میں آئمہ محدثین کی رائے
۲۷۵	عمار علی کی تاریخ دانی
۲۷۵	فدک فنی تھا موہوب و مملوک نہ تھا
۲۷۶	فدک کے مختلف تاریخی دور
۲۷۸	ہبہ اور عطاء میں فرق
۲۷۹	اہل شیعہ کی مستندات رطب و یابس سے زیادہ نہیں
۲۸۰	اہلسنت نے جو روایات بغرض تردید نقل کی ہیں شیعہ ان کو سند بناتے ہیں
۲۸۱	درمنثور کے حوالہ کی حقیقت
۲۸۱	جلالین اور اتقان میں ذالقرنیٰ اور حقہ کی تفسیر
۲۸۲	سیوطی نے اس روایت کو موضوع سمجھ کر نقل نہیں کیا

۲۸۳	فدک کے معاملہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رویہ اس روایت کے بطلان کی بڑی دلیل ہے
۲۸۳	اہل شیعہ کی طرف سے حضرت علی کے رویہ کی پہلی تاویل
۲۸۴	تاویل کا جواب
۲۸۵	از روئے قواعد شیعہ سیدہ رضی اللہ عنہا کا مطالبہ فدک غلط تھا
۲۸۶	قواعد شیعہ کی رو سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خلافت قبول کرنا بھی درست نہ تھا
۲۸۶	حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رویہ کی دوسری تاویل
۲۸۶	تاویل کا جواب
۲۸۷	اقتداء کن افعال میں ہوتا ہے؟
۲۸۷	اہل شیعہ کی تیسری تاویل
۲۸۷	تاویل کا جواب
۲۸۸	اہل شیعہ کی چوتھی تاویل
۲۸۸	تاویل کا جواب
۲۸۹	خلیفہ چہارم کے پاس خلیفہ اول کی نسبت اعموان و انصار کی کثرت
۲۹۰	کتاب اہل سنت میں دعوائے سیدہ برائے فدک بروایت ضعیف بھی مذکور نہیں
۲۹۱	روایت ہبہ کے غلط ہونے کی دودلیں
۲۹۲	کتاب محولہ کے مؤلفین نے صحت کا التزام نہیں کیا
۲۹۳	تقیہ کے پردہ میں اہل شیعہ کی خطرناک خیانت
۲۹۵	لسان المیزان میں چند فریب کاروں کی نشان دہی
۲۹۶	دعوائے فدک کی روایت اگر صحیح بھی ہو تو بھی کام نہیں چلا
۲۹۷	شیعوں کی پیش کردہ روایت سے بشرط صحت بھی ہبہ فدک ثابت نہیں ہوتا

۲۹۹	لفظ عطاء ہبہ اور عاریت میں مشترک ہے، اس پر مسلمہ حدیث سے استدلال
۳۰۲	لفظ عطا کو بمعنی ہبہ بنانے کی ناکام کوشش
۳۰۲	تعیین معانی کے لیے قرآن کی بحث
۳۰۳	فدک کیلئے سیدہ کی شہادت بھی نامکمل تھی
۳۰۴	حضرت زید کے بارے میں دریدہ و فنی اور اس کا جواب
۳۰۵	فدک کے بارہ میں حضرت زید کا قول ہی صحیح ہے
۳۰۶	شیعہ قرآن و حدیث کے کسی لفظ کے معنی متبادر مراد نہیں لے سکتے
۳۰۶	روایت فدک منقطع ہے
۳۰۷	مشکوٰۃ کی روایت مرفوع متصل ہے
۳۰۸	فدک تا دم آخر خاتم الانبیاء کے تصرف میں تھا
۳۰۹	اگر فدک ورثہ تھا تو شخص واحد کا قبضہ بقیہ ورثاء پر ظلم تھا
۳۰۹	دعویٰ ہبہ بغیر قبض مسلم نہیں، علامہ حلی کا فرمان
۳۱۰	دعویٰ ہبہ فدک کے بطلان پر احادیث طرفین سے استدلال
۳۱۲	مسئلہ شہادت اور شاہدین کی تعداد پر محققانہ بحث
۳۱۲	سیدہ تو ضابطہ شہادت کی بہت زیادہ پابند ہوں گی
۳۱۵	منہج الکرامت کی روایت کے مطابق حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فدک سیدہ کو دیدیا تھا
۳۱۶	حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر عمار علی کا بہتان
۳۱۷	حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو بغیر شہادت کے مال دینے کے وجوہ

۳۱۸	حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو نہ دینے میں خلاف وعدہ کا احتمال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف عائد ہوتا ہے
۳۲۲	شیعوں کی اہل بیت سے اور نصاریٰ کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ایک جیسی محبت ہے
۳۲۳	اگر اُم ایمن اور حضرت علی کی گواہی اتنی اہم ہے تو خدا اور رسول و قرآن و آئمہ اہل بیت کی گواہی صحابہ کے بارے میں کیوں کراہم نہ ہوگی
۳۲۶	سیدہ سے گواہی طلب کرنا خطا اجتہادی تھی جو باعث قدح نہیں
۳۲۷	حضرت سجاد اگر باوجود ابلیس کے کلی تصرف کے مؤمن ہیں تو ابوبکر بطریق اولیٰ ہیں
۳۲۷	فصل..... حدیث معاصر کناہ صلفہ کی تحقیق انتق
۳۲۸	گواہوں کی شرعی تعداد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تادم آخر قبضہ فدک، صدیق کی صفائی کا مضبوط سامان ہے
۳۳۰	حدیث مذکور کلام اللہ کے عین مطابق ہے
۳۳۱	اہل شیعہ کا حدیث معاصر کناہ صلفہ پر اعتراض
۳۳۲	اعتراض کا جواب
۳۳۳	”يُؤْصِيكُمُ اللَّهُ“ سے آنحضرت مستثنیٰ ہیں اس کے دلائل
۳۳۶	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے استثناء کی دیگر نظیریں
۳۳۸	حدیث معاصر الانبیاء حصص آیہ توریت ہے نہ کہ معارض
۳۳۹	جیسے آنحضرت فَلْيَكُونُوا مَا طَابَ سے مستثنیٰ ہیں ایسے یو صیکم اللہ سے ہیں
۳۴۱	”يُؤْصِيكُمُ اللَّهُ“ کی حصص دوسری آیت بھی ہے
۳۴۲	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فدک کے مالک نہ تھے متولی تھے
۳۴۳	آیت کے ہر لفظ سے فدک کا مملوک نہ ہونا ظاہر ہے
۳۴۵	لام تملیک کیلئے ہو تو اموال فنی غیر مملوک خدا ہوں گے

۳۴۶	آیت کا مقصد بیان تملیک نہیں ہے
۳۴۸	آیت میں لام کے مختلف معنی مراد لینے پر مفاسد
۳۴۹	آپ کی ملک میں وراثت جاری نہیں ہو سکتی کیونکہ آپ زندہ ہیں
۳۴۹	خدا کی مالکانہ شان آپ کو اتنی مشاہد تھی کہ اپنی ہر چیز کو عاریت یقین کرتے تھے
۳۵۰	ایک شبہ کا ازالہ
۳۵۱	آیت میں لام بیان مصارف کیلئے ہے
۳۵۲	اہل شیعہ کا اعتراض کہ ما الاء اللہ کا معنی زمین کی تقسیم تھا اور آپ آمدنی تقسیم فرماتے رہے؟
۳۵۳	اعتراض کا جواب کہ اموال فنی وقف ہیں نہ کہ ملکیت
۳۵۳	فنی اور صدقات کا ایک لطیف فرق
۳۵۵	معصوم سے خطا سرزد ہونا محال نہیں
۳۵۵	اموال فنی آپ کی ملک نہ تھے اس کی تیسری دلیل
۳۵۶	مصارف مندرجہ آیت کی تعیین و استحقاق کی باریک حکمت
۳۵۶	مصارف فنی کی ترتیب لفظی کی حکیمانہ تشریح
۳۵۷	اموال فنی کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک نہ ہونے کی چوتھی دلیل
۳۵۷	اموال فنی کے غیر مملوکہ ہونے کی پانچویں دلیل
۳۵۸	اموال فنی کے غیر مملوکہ ہونے کی چھٹی دلیل
۳۵۹	اموال فنی کے غیر مملوکہ ہونے کی ساتویں دلیل
۳۶۱	ذوی القربیٰ کو اگر فنی کا مالک مانیں تو دو خرابیاں موجود ہیں
۳۶۱	مَا مَلَکَتْ یَمِیْنُکَ سے دعوائے وقف پر اشکال
۳۶۲	اشکال مذکور کا جواب

۳۶۳	وقف کا معنی کیا ہے اور وقف کے قابل کونسی چیزیں ہیں؟
۳۶۳	اشیائے منقولہ میں سے پھل اور غذا وقف کے قابل نہیں
۳۶۴	سواریاں اور کپڑے بھی وقف کے قابل نہیں
۳۶۵	امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا اشیاء منقولہ کو ناقابل وقف کہنے کی وجہ
۳۶۵	صاحبین کا اشیائے منقولہ کو قابل وقف کہنے کے وجوہ
۳۶۶	صاحبین کی رائے بھی مقصود کے موافق ہے
۳۶۷	اشیائے منقولہ کا وقف فقراء و مساکین کو مفید ہی نہیں
۳۶۸	بعض اشیائے غیر منقولہ جو حاجت برآری نہیں کرتیں مگر ان میں قابلیت ہے
۳۶۹	مَنْعَلْکَ یَمِیْنُکَ کے لفظی فوائد
۳۶۹	اموال فرائے میں آنحضرت کے حصہ کی نوعیت
۳۷۰	مصارف کے مقرر کرنے کی وجہ اہل مصارف کی ناداری ہے
۳۷۲	مِمَّا آتَاہُ اللہ کے قوی فوائد
۳۷۲	فرائے کے معنی کی تفسیر
۳۷۳	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فہم قرآن میں خطاء ناممکن تھی کیونکہ اصلاح کیلئے حق ہماری تھی
۳۷۴	اِنَّہٗ مَا آتَاہُ اللہ، یومِ حُجَّہ کی تفسیر ہے
۳۷۴	یومِ حُجَّہ اللہ فدک کو شامل ہی نہیں
۳۷۵	یومِ حُجَّہ اللہ کی جیسے بہت سی احادیث تھیں، ایسے ہی مائتہ کناہ ہے
۳۷۵	بعض آیات اور روایات شیعہ میں کلی تضاد
۳۷۶	قول قابل اجاع ہے اور فعل میں خصوصیت کے احتمال ہیں
۳۷۷	حدیث لا لورث مفسر و بین آیت ہے اور روایت شیعہ مخالف

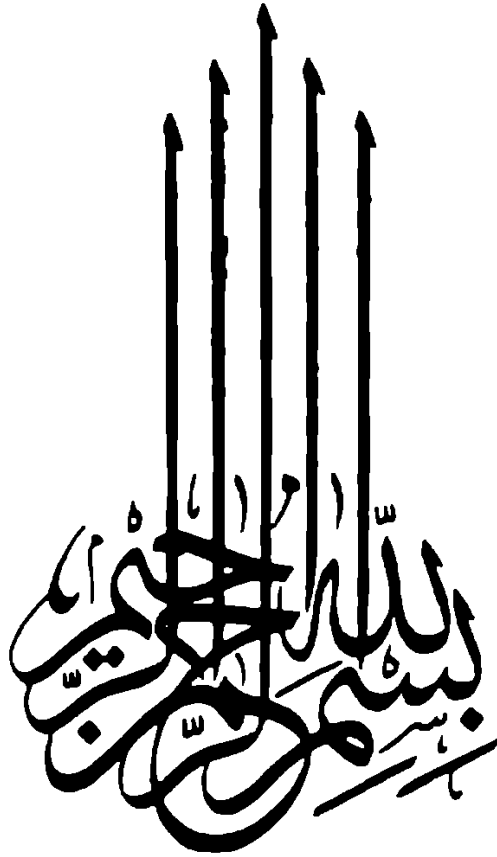
۳۷۷	آئمہ نے روایت فدک اگر بلا علاقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیان کی ہے تو دو خرابیاں لازم آئیں
۳۷۹	حدیث معاشر الانبیاء اگر غلط بھی ہو تو بھی فدک ہاتھ نہیں آتا
۳۷۹	فصل..... وراثت انبیاء پر بحث کہ وہ مالی ہے یا علمی؟ اور مالی مراد لینے پر خرابیاں
۳۸۲	وَوَرِثَ مُسْلِمَانِ میں وراثت مالی مراد نہیں
۳۸۳	وراثت سے مراد علم دین (بروایت آئمہ شیعہ)
۳۸۳	سیاق و سباق آیت سے بھی وراثت علمی ظاہر ہے
۳۸۵	کلام اللہ میں وراثت کو صرف علم کیلئے کثرت سے استعمال کیا ہے
۳۸۵	کلام اللہ میں وارث بمعنی قائم مقام
۳۸۶	وارث بمعنی حادی و مسلط
۳۸۸	وراثت علمی اگر معنی مجازی ہی ہو تو مجاز متعارف ہے
۳۸۸	کلینی کی ایک روایت جس میں وراثت علمی کی صراحت ہے
۳۹۰	سورہ مریم میں حضرت زکریا علیہ السلام صرف خلیفہ نیک چاہتے تھے
۳۹۳	حدیث لَا نُؤَرِّثُ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کیلئے متواتر سے بھی بڑھ کر تھی
۳۹۳	روایت کے درجات ان کیلئے ہیں جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع و روایت حاصل نہیں
۳۹۵	روایت لانورث کے راوی دس بارہ صحابی ہیں
۳۹۶	اہل شیعہ کے نزدیک حضرت علی اور حذیفہ کا اعتبار لازمی ہے
۳۹۶	بخاری شریف میں حدیث لانورث بروایت حضرت امیر
۳۹۸	احادیث و آیات میں کوئی مخالف نہیں بے عقلی سے کہیں وہم ہو جاتا ہے
۴۰۰	روایات شیعہ سے لانورث کی تائید

۴۰۱	وصال کے وقت کوئی چیز آپ کی ملکیت نہ تھی
۴۰۲	صادق اور صدیق کی روایت کا فرق
۴۰۳	کلینی کی دوسری سید حدیث
۴۰۴	تارک الدنیا اور زاہد، عاصب نہیں ہو سکتا
۴۰۴	ترکہ نبوی میں تمام اہل بیت کا عمل
۴۰۸	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ کو یہ حدیث نہ بتائی کیونکہ وہ بزم شیعہ علم غیب جانتی تھیں
۴۰۹	صرف صدیق رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کرنے کی حکمتیں
۴۱۰	پہلی حکمت
۴۱۱	دوسری حکمت
۴۱۱	تیسری حکمت
۴۱۲	چوتھی حکمت
۴۱۴	حسب روایت شیعہ خدا کا حکم چھپانے کی ایک مثال
۴۱۸	سیدہ رضی اللہ عنہا کے سمجھانے پر فدک صدیق رضی اللہ عنہ نے واپس کر دیا تھا
۴۲۰	مسلم شریف کے حوالہ کی حقیقت
۴۲۲	امام کا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو بے دخل کر دینا عدم وراثت پر کھلی دلیل ہے
۴۲۳	حضرت علی و عباس رضی اللہ عنہما نے ہر قسم حدیث صدیق رضی اللہ عنہ کی تصدیق کی
۴۲۵	خائن و عمار مباغض استعمال ہوئے جیسا کہ محاورہ ہے
۴۲۶	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غصہ مباغض کی دلیل ہے
۴۲۶	مباغض کلام اللہ میں بطور محاورہ
۴۲۹	حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہی الفاظ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے کہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی نسبت کہے

۴۳۰	حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما خطا بدگمان ہوئے
۴۳۱	امام کی اتباع میں شیعہ اگر صدیق رضی اللہ عنہ کو برا کہیں تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اتباع میں امام کو بھی کہیں
۴۳۲	ترکہ نبوی کے میراث ہونے پر استدلال اور اس کے جوابات
۴۳۳	جواب اول
۴۳۴	دوسرا جواب
۴۳۵	تیسرا جواب
۴۳۷	حضرت علی و عباس رضی اللہ عنہما نے بھول سے مطالبہ کیا اور بھولنا عیب نہیں
۴۳۷	حضرت آدم علیہ السلام کی بھول
۴۳۷	حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھول
۴۳۸	سید الخلق صلی اللہ علیہ وسلم کی بھول
۴۴۰	صدیق رضی اللہ عنہ سے عم و ابن عم کی بدگمانی کی وجہ بشریت ہے
۴۴۱	قرآن فہمی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام امتی محتاج ہیں
۴۴۱	وَمَا أَوْفَيْتُمْ سِرَّكُمْ دُونَ مَا صَلَّيْتُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَسْتَحْشِينَ
۴۴۲	حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی فہم قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محتاج تھیں
۴۴۲	اگر کسی ایک بات کے جاننے سے کسی کو فضیلت ہو تو حضرت خضر حضرت موسیٰ علیہم السلام سے افضل ہوتے
۴۴۳	سیدہ رضی اللہ عنہا نے سماع حدیث کے بعد عداوت کے سبب بات چیت بند کی
۴۴۳	سماع حدیث کے بعد سیدہ کو کلام کی حاجت ہی نہ رہی
۴۴۴	وَجَدْتُكَ لَفْظًا
۴۴۵	وَجَدْتُكَ لَفْظًا

۴۴۵	اہل کمال کے کلام کا وہ محل تلاش کیا جائے جس سے حسن ظن قائم رہے
۴۴۶	سیدہ رضی اللہ عنہا صدیق رضی اللہ عنہ سے بوجہ غلطی آزرده ہوئیں
۴۴۶	حضرت موسیٰ غلطی سے حضرت ہارون پر ناراض ہوئے
۴۴۷	بالفرض اگر صدیق ہی کی غلطی تھی تو توبہ کر لی (کتب شیعہ)
۴۴۹	بلسلسلہ برأت صدیق رضی اللہ عنہ روایت کے چند قاعدے
۴۵۳	روایات اہل سنت میں سیدہ کی خوشنودی کا بیان موجود ہے
۴۵۴	جنازہ میں شرکت سے روکنے کا افسانہ
۴۵۴	سیدہ کی وصیت میں عام ممانعت تھی تخصیص نہ تھی
۴۵۷	سیدہ کا جنازہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی نے پڑھایا
۴۵۹	خدا اور رسول راضی ہوں تو سیدہ کی ناراضی سے کچھ نقصان نہیں
۴۶۰	بضعة منی سے اشکال اور اس کے جوابات
۴۶۰	بضعة منی کا شان و رود اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سیدہ رضی اللہ عنہا کو بارہا غضبناک کرنا
۴۶۱	پیغام نکاح کوئی گناہ نہ تھا مگر سیدہ النساء رضی اللہ عنہا کو بشریت کی وجہ سے فصا آیا
۴۶۳	خلاصہ جواب طعن فندک





اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ
الْأَمِينِ وَعَلَى آلِهِ وَسَلِّمْ تَسْلِيمًا

تقدیم الکتاب

الحمد لله رب العالمین والصلوة والسلام

علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے جس نے محض اپنے فضل و کرم سے میرے جیسے بے بضاعت اور کم سواد طالب علم کو اس عظیم الشان علمی یادگار کے احیاء کی توفیق بخشی۔ ایک مدت تک تو طباعت کا خیال ہی خیال رہا کیوں کہ طباعت سے پہلے خود کتاب کا موجود ہونا بھی ضروری ہوا اور کتاب کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ”ثَمَّانَ لَمْ يَنْكُنْ“ چنانکہ ایسا ہوا کہ ایک علم دوست بزرگ تشریف لائے اور کچھ کتابیں میرے سامنے رکھ دیں کہ ان کی جلد بندی مطلوب ہے۔ کتابیں دیکھیں تو ان میں وہ مقصود بھی موجود تھا جس کی غلط مرصعہ راز سے دل میں رہتی تھی۔

اس وقت تو ان کو بہت اچھا کہہ کر زخمت کیا اور پھر مختلف مذاہر محل میں لانی پڑیں جن سے وہ بزرگ بہت منت سماجت کے بعد کتاب دینے پر آمادہ ہو گئے۔ کام ہوا تھا جس کے لیے بڑی ہمت درکار تھی اور یہاں ضعف ہی ضعف تھا۔ کتاب پڑی رہی اور سوچ بچار میں کافی وقت گزر گیا۔ اس درمیانی وقفہ میں ایک بڑے ادارہ نے طباعت کا ارادہ کیا اور کتاب بھی لے لی مگر کچھ عرصہ بعد مصروفیت کا ہذرہ کر کے واپس کر دی۔ گویا: قرعہ قال بٹام من دیوانہ وند

جس طرح کتاب ہاتھ آئی، ہاتھ سے لٹی، کل کر پھر ہاتھ آئی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ اب میں وپیش کی حربے نمائش نہیں۔ کام شروع ہونا چاہیے لیکن جب کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ”مشق آساں سوداؤل و لے اتاد مشکھا“ کیونکہ کتاب مسلسل تھی، کوئی پیرا گراف، کوئی عنوان یا فصل اور باب وغیرہ اس میں موجود نہ تھا۔ جیسا کہ حقد میں کا طریقہ تھا اور یہ طریقہ اس

وقت کے لیے ناموزوں بھی نہ تھا، وہ لوگ محنتی تھے، کتابوں کے کپڑے تھے، علوم کے قدردان تھے، عالی ہمت تھے، مطالعہ اور کتب بینی ان کے لیے تفریح و نشاط کے ذرائع تھے۔

مگر اب جبکہ ہستیں پست ہو چکیں، ذہنی سکون و اطمینان بجائے علمی مشاغل کے جھوٹی روایتوں اور قصوں میں تلاش کیا جانے لگا تو ضروری ہوا کہ اب علوم کو سہل و خوبصورت بنا کر پیش کیا جائے تاکہ شائقین کو استفادہ میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اس لیے ایک صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں کہ وہ کتاب کی تجویب و تصحیح کریں مگر شرمندگی کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا "عن ظہور الغیب" ہی لکھا۔ یعنی کتاب دیکھے بغیر اپنی علمی قوت اور زور سے لکھا۔ یہ ایک نئی مشکل تھی جس سے بچاؤ کی یہی صورت نظر آئی کہ دست خود وہاں خود پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ تجویب کا کام خود کرنا پڑا۔ مضامین کی مناسبت سے چند ابواب قائم کیے اور ان کے ذیل میں عنوانات لکھے۔ مگر اس کے باوجود بھی کتاب کے مضامین کا احاطہ نہیں ہو سکا کیوں کہ کتاب کی علمی شان کچھ اتنی وسیع اور عالی ہے کہ ہر دو سطر کے بعد ایک نیا استدلال، نیا نکتہ، نیا مضمون موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کثرت سے عنوانات نہیں لکھے جاسکتے تھے۔ اس لیے کتاب کی وسعت اور جامعیت کو فہرست بھی بنام و کمال پیش نہ کر سکے گی۔ ہاں تثنوی و ترغیب کا کام ضرور دے گی۔

کتاب میں مصنف قدس سرہ کی اپنی ایک خاص شان جلوہ گر ہے۔ سوز و گداز اس درجہ ہے۔ گویا تڑپ رہے ہیں کہ مخاطبین حق کو کیوں قبول نہیں کرتے یا مصنف خود ہی ان کے قلوب میں کسی طرح یہ حقائق کیوں نہیں ڈال سکتے۔ علوم عالیہ کی اس رفعت کے باوجود تنزل کا یہ حال ہے کہ بے انتہا بلند یوں سے اتر کر مشقت کے ساتھ ایک بات کو عام فہم اور سادہ بنا کر پیش فرما رہے ہیں۔ آمد کا یہ حال ہے کہ مضامین ہاتھ باندھے چلے آ رہے ہیں اور بات سے بات پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے مگر اس اعلیٰ علمی شرف کے باوجود ہر جگہ تواضع اور انکسار دکھلا ہوا نظر آتا ہے۔ کہیں تعالیٰ اور اذعان نہیں ہے۔ پھر خاص بات یہ ہے کہ اہل بیت اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق تمام مباحث میں ادب و احترام بہت ہی نمایاں ہے ورنہ آج کل تو یہ توازن جوش و خروش اور قلم کی جولانوں کی نذر ہو چکا ہے۔

کتاب کی خصوصیات کے بارے میں اگر کچھ عرض کیا جائے تو سب سے پہلی اور بڑی خصوصیت تو یہی ہوگی کہ بانی دارالعلوم قدس سرہ کی تالیف ہے اور یہ کسی عقیدت مندی کا اظہار نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے کیونکہ مولانا کی علمی اور تحقیقی رفعت و امتیاز کے اپنے اور

پرائے سب ہی قائل تھے اور ہیں۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ استدلال میں دونوں پہلوؤں کا لحاظ کیا گیا ہے۔ یعنی روایت کے ساتھ درایت اور نقل کے ساتھ عقل کا سلسلہ پوری کتاب میں قائم ہے بلکہ اس سے زیادہ عرف اور محاورہ بھی مد نظر ہے۔

تیسری خصوصیت صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے متعلقہ آیات کی تفسیر و تشریح ہے جو سراپا الہامی ہے۔ آیات کے لفظی اور معنوی فوائد ایسے عجیب و غریب ہیں کہ بڑی بڑی تفاسیر ان سے خالی ہیں اور "مالا عین رات ولا اذن سمعت" کے صداق ہیں۔ چوتھی خصوصیت بعض ایسی آیات اور احادیث پر محققانہ بحث ہے جن کو فریق ثانی استدلال کے طور پر پیش کرتا ہے مگر اس بحث کا امتیاز یہ ہے کہ مصنف قدس سرہ کی تحقیق کے بعد یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث یا آیت کو فریق ثانی نے اپنی دلیل کیسے سمجھ لیا ہے، یہ تو ہماری دلیل ہے۔ نکات و حکم کا بیان اس پر مزید ہے جو انسانی علم و ادراک کا شکار نہیں بلکہ محسوس طور پر عطائے ربانی ہو۔

پانچویں خصوصیت کتاب کے مباحث و مضامین کا تنوع اور توسع ہے جس کے ضمن میں ذیلی علوم و معارف کا کافی مقدار میں آگے ہیں جو بے حد قیمتی اور نادر و نایاب ہیں جن سے کتاب کی افادہ حیثیت بہت زیادہ ہوگئی ہے اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مدظلہ کا یہ ارشاد بالکل سجا اور درست ہے کہ ہدیۃ الشیخہ میں تحفہ بمع زوائد ہے۔ چھٹی خصوصیت کتاب کی سلاست اور سادہ بیانی ہے جو مولانا قدس سرہ کی باقی کتب کے مقابلہ میں بالکل نمایاں ہے۔ کتاب کا اکثر حصہ روزمرہ کی زبان ہے۔ بعض مقامات میں (جو بہت قلیل بلکہ اقل ہیں) علمی زبان کی وجہ سے کچھ دشواری پیدا ہوئی ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ خالص علمی مسائل کے بیان میں یہ دشواری ہر ایک کو پیش آتی ہے۔ آخر میں اپنی اس حقیر کاوش کے متعلق یہ عرض ہے کہ اس امر کی کوشش تو پوری پوری کی گئی کہ عنوانات کو کتاب کے ساتھ کامل ارتباط و مناسبت ہو اور کتاب کی علمی شان کا عکس اور پرتو ہوں۔ مگر چہ نسبت خاک را بعالم پاک؟ کہاں یہ کتاب اور اس کی رفعت اور کہاں ہم اور ہماری کاوش؟ بس مقصد اتنا تھا کہ پڑھنے والے کو کچھ اندازہ ہو جائے کہ کتاب میں کیا ہے۔ وہ کسی قدر ان شاء اللہ ضرور حاصل ہو جائے گا۔ اس کے بعد یوں متی چاہتا ہے کہ سوانح قاسمی میں سے سرسید کا وہ بیان نقل کر دیا جائے جس میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے اظہار عقیدت کیا گیا ہے۔

حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ سرسید کی نظر میں

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر سرسید مرحوم نے "علی گڑھ انسٹی

ٹیوٹ گزٹ“ کی اشاعت سورجہ ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون میں حضرت نانوتوی کے متعلق سرسید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے تاثرات کا جن الفاظ میں اظہار کیا ہے وہ الفاظ معاصرانہ چشمک سے مبرا ہونے کے علاوہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علم و عمل اور صلاح و تقویٰ کا جو مقام متعین کرتے ہیں، اس کے متعلق یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ وہ عقیدت مندانہ جذبات کے غلو سے قطعاً پاک ہیں۔

کسی ایسے شخص کا اپنے کسی ایسے معاصر کے بارے میں اظہار رائے کرنا جو اس شخص کے عقائد و افکار اور رجحانات سے شدید اختلاف رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کسی بے لاگ حیثیت کا حامل ہو سکتا ہے۔ یہ حضرات ایک دوسرے کو ذاتی حیثیت سے کس نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کا اندازہ تصنیف العقائد کی اس مراسلت سے ہو سکتا ہے جو ان حضرات کے مابین ہوئی ہے۔ اس مراسلت میں سرسید اپنے ایک دوست (منشی محمد عارف صاحب) کو خط میں لکھتے ہیں:

”اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لادیں تو میری سعادت ہے، میں ان کی کنش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا۔“ (صلیۃ اللہ علیہ وسلم ۲ مکتوب سرسید نام منشی محمد عارف)

متذکرہ بالا مکتوب کے جواب میں سرسید کے ان ہی دوست کو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا تھا کہ ”ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ سنی سنائی سید صاحب (سرسید) کی اولوالعریٰ اور دروہندی اہل اسلام کا معتقد ہوں اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہار محبت کروں تو بجا ہے مگر اتنا یا اس سے زیادہ ان کے فساد عقائد کو سن کر ان کا شاک اور ان کی طرف سے رنجیدہ خاطر ہوں۔“ (صلیۃ اللہ علیہ وسلم ۶ مکتوب حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نام منشی محمد عارف صاحب ۱۲)

اس مختصر تقریب کے بعد سرسید کا متذکرہ صدر مضمون درج ذیل ہے:

”افسوس ہے کہ جناب ممدوح (حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ) نے ۱۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا، زمانہ بہتوں کو رو دیا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا لیکن ایسے شخص کے لیے رونا جس کے بعد کوئی اس کا جانشین نظر نہ آوے۔ نہایت رنج اور غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دہلی کے علماء میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم و فضل اور تقویٰ اور دروغ میں معروف اور مشہور تھے، ویسے ہی نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بھی بے مثل تھے۔ لوگوں کو خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اعلیٰ صاحب کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا

نہیں ہے مگر مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دینداری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس دہلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اعلیٰ صاحب کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ۔“

بہت لوگ زندہ ہیں جنہوں نے مولوی محمد قاسم صاحب کو نہایت کم عمر میں دہلی میں تعلیم پاتے دیکھا ہے۔ انہوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب مرحوم سے تمام کتابیں پڑھی تھیں، ابتداء ہی سے آثار تقویٰ اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کی ان کے اوضاع اور اطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا:

بالائے سرش زہو شمدی می تافت ستارۂ بلندی
زمانہ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے، ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل و کمال تھے، ان کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی محبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا اور حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فیض محبت نے ان کے دل کو ایک نہایت اعلیٰ رتبہ کا دل بنا دیا تھا، خود بھی پابند شریعت اور سنت تھے اور لوگوں کو بھی پابند شریعت اور سنت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے۔ با-غیمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا بھی ان کو خیال تھا۔ انہیں کی کوشش سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لیے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی۔ علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی اور کوشش سے مسلمانی مدرسے قائم ہوئے۔ وہ کچھ خواہش پیر اور مرشد بننے کی نہیں کرتے تھے لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاع شمال و مغرب میں ہزار ہا آدمی ان کے معتقد تھے اور ان کو اپنا پیشوا اور مقتدا جانتے تھے۔

مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے ہم مولوی محمد قاسم مرحوم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو، خواہ کسی سے خوشی کا ہو، کسی طرح ہوائے نفسانی یا ضد اور عداوت پر محمول نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام کام اور افعال جس قدر کے تھے بلاشبہ للہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے اس کی پیروی کرتے تھے ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے واسطے تھا اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا، کسی شخص کو مولوی محمد قاسم اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا برا نہیں جانتے تھے بلکہ صرف اس خیال سے کہ وہ برے کام کرتا ہے یا بری بات کہتا ہے، خدا کے واسطے برا

جانتے تھے، مسئلہ حب اللہ اور بغض اللہ کا خاص ان کے برتاؤ میں تھا۔ ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں۔ ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہو۔ بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔ اس زمانہ میں سب لوگ حلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے، حلیم کرتے ہوں گے کہ۔ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے۔ ان کا پایہ اس زمانہ میں شاید معطومات علمی میں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ کم ہو، بلا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔ مسکنی اور نیکی اور سادہ حراجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحاق سے بڑھ کر نہ تھا، تو کم بھی نہ تھا۔ درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے اور ایسے شخص کے وجود سے زمانہ کا خالی ہو جانا ان لوگوں کے لیے جو ان کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے۔

افسوس ہے کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے کہ عملی طور پر کوئی کام کرے۔ زبانی عقیدت اور ارادت بہت زیادہ ظاہر کرتی ہے۔ ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت و افسوس کے کہہ کر خاموش ہو جائیں۔ یا چند آنسو آنکھ سے بہا کر اور رومال سے پونچھ کر چہرہ صاف کر لیں بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگار کو قائم رکھیں، دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگاری ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعہ سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جمار ہے۔

(نقل باصلاح علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۳ اپریل ۱۸۸۰ء صفحہ ۳۶۷، ۳۶۸)



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى
رَسُولِهِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ وَالْأَزْوَاجِ وَأَهْلِ بَيْتِهِ وَطَرَفِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ

سبب تالیف

بعد حمد و صلوٰۃ کے بندہ محمد ان گناہ محمد قاسم نام تخلص بنما کیا علماء ناظران اوراق کی خدمت میں
عرض پرداز ہے کہ لو آخر رجب ۱۲۸۳ھ بارہ سوتر اسی ہجری میں مخدوم العلماء مطاع المفصلاء مجمع
الکلمات طبع الحکامات زیب طریقت حامی شریعت فخر احباب انکار اصحاب بلاء انام مرجع خاص و عام
معلم قوانین اطاعت و انتیاد بحر سلسلہ رشد و ارشاد جامع کمالات ظاہری و باطنی مجدد و ممد و مولا نامولوی
رشید احمد گنگوئی دام رشد و ارشادہ نے ایک خط حُضْمَنِ بعض خرافات شیعہ جو مولوی عمار علی صاحب کی
طرف سے بنام میر نادر علی صاحب ساکن کر قتل نواح الور تھا ماس محمد ان کے پاس بایں عرض بھیجا کہ
ان خرافات کے جوابات لکھ کر روانہ خدمت مولانا ممدوح کروں۔ اتفاقات سے ان ایام میں حسب
ایماہ بعض احباب کہ ان سے اشتراک لیبی بھی حاصل ہے۔ اوقات فرصت میں دربارہ اثبات توحید و
رسالت بدلائل عقلیہ اوراق سیاہ کرتا تھا سو کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ بیجہ کالی طبع زاد، اس کے جوابات
کا لکھنا سخت دشوار معلوم ہوا اور پھر بیجہ محمد انی اور بے سرو سامانی اور کثرت مشاغل روزمرہ اس خیال
سے اور بھی دل تنگ ہوتا تھا۔ قصہ بہر طور یہ کار دشوار تھا مگر مولانا ممدوح کے ارشاد سے ناچار تھا۔ لہذا
تحریر مضامین توحید و رسالت کو اور وقت پر موقوف رکھ کر خط مذکور کے پہنچنے سے دو تین روز ہی بعد تحریر
سابق کے عوض میں خط مذکور کے جوابات لکھنے شروع کیے۔ مگر کچھ تو محمد انی اور بے سرو سامانی اور کچھ
فلت فرصت اور کچھ سرگردانی اس لیے ایک دن تو دین پڑا، پر اوقات متفرقہ میں لکھ لکھ کر پانزدہم صفر
۱۲۸۳ھ بارہ سو چھاسی میں تمام کیا اور بعد اتمام ”ہدیۃ الشیعة“ اوراق کا نام رکھا۔

انتخاب نام کاراز

اور وجہ اس نام رکھنے کی (حالانکہ یہ رسالہ بظاہر مؤید اہلسنت ہے اور اس وجہ سے ہدیہ الہی ملت کہنا مناسب تھا) یہ ہے کہ بہ نسبت الہی ملت شیعوں کے حق میں یہ رسالہ زیادہ تر مفید ہے۔ الہی ملت کے لیے تو اس میں اتنا ہی فائدہ ہے کہ کچھوں کے لیے مفید یقین اور کچھوں کے لیے باعث اطمینان ہے۔ پر شیعوں کے حق میں اگر انصاف کریں تو ذریعہ حصول ایمان ہے کیونکہ ان اوراق میں اگر استدلال ہے تو تین چیزوں سے استدلال ہے۔ قرآن مجید یا احادیث صحیحہ کتب معبرہ شیعہ یا دلائل عقلیہ و اخویہ الدلالات سوان تینوں کا مسلم ہونا شیعوں کے نزدیک مسلم۔

کتاب کی کھلی صداقت

مگر یہ سن کر بوجہ گم نامی احقر شاید کسی کو یہ بدگمانی ہو کہ استدلال بھی کرتے ہیں، پر استدلال کرنا کسی کسی کو آتا ہے، سو اس کا جواب یہی ہے کہ یہ رسالہ موجود ہے۔ ہمارا کہنا باور نہ کیجئے، اس رسالہ ہی کو دیکھ لیجئے۔ صاحبو! دیوانہ ہوں لیکن بات کہتا ہوں ٹھکانے کی، ببرکت الہی بیت کرام اور صحابہ مقام امید یوں ہے کہ ان شاء اللہ منصفان فہمیدہ آفریں ہی کریں گے اور کوئی کہے تو یہ کہے گا:

گاہ باشد کہ کودک نادان بخلط بر ہدف زند تیرے

سو یہ سب سچ ہے۔ اپنے آپ کو کون نہیں جانتا۔ غرض اپنی نسبت جو کچھ کہئے بجا ہے پر اس رسالہ کے مضامین کی حقانیت کا دعویٰ بھی بچا نہیں۔ ان شاء اللہ بعد ملاحظہ معلوم ہو جائے گا۔

کتاب کے جواب کی صحیح راہ

ہاں نادان متعصب اگر دو چار باتوں میں ٹکرا کر میں تو نادانوں کا کام یہی ہے ان کی زبان سے قرآن تو چھوٹا ہی نہیں یہ ہچمدان تو کس شمار میں ہے۔ البتہ دانش مند ذی علم ایسا کریں تو ہمیں بھی شکایت ہے کیونکہ کسی رسالہ یا کسی کتاب کے جواب کے یہ معنی ہیں کہ تمام استدلالات کو باطل کر دیجئے۔ جیسا کہ اس ہچمدان نے بہ نسبت خط سلوی عمار علی صاحب کیا ہے۔ چنانچہ ان شاء اللہ واضح ہو جائے گا ورنہ ایک دو بات تو ہر کسی کی قائل گرفت ہوتی ہے۔ جناب من بشر ہوں اور بشر بھی سب سے کم تر خدا نہیں رسول نہیں جو غلطی کا احتمال نہ ہو، بھول چوک سے انکار نہیں کیا جاتا، پر کتاب کی صحت اور اعتبار باعتبار اکثر کے ہوتی ہے۔ سو اگر کسی صاحب کو خیال جواب ہو تو بندہ ہچمدان کی روش پر چلیں۔ یعنی ہر مضمون کے ہر پہلو پر گرفت کریں نہیں تو اس سے بھی کیا کم کہ موافق قواعد علم مناظرہ ہر دعوے کے استدلال پر اعتراض کریں

دوسرے دو چار باتوں کی تعلیل سے کام نہیں چلتا۔ اس کا تو میں بھی خود مقرر ہوں کہ خطا و نسیان سے مبرا نہیں ہوتا۔
عجب ہے کہ کچھ غلطی ہو گئی ہو، ان قصائل انصاف سے امید دئی ہے کہ قطع نظر پریشانی تقریریں دراصل
دو دوس اور دلائل پر حرف گیر نہ ہوں بلکہ آفرین اور تحسین ہی سے پیش آئیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

اور اگر بہ نسبت انبیاء و مرسلین یا بزرگان نال بیت و اصحاب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اس دراصل میں کمال
حرف نامناسب دیکھ کر انہیں تو مجھ سے بڑی الذمہ سمجھیں۔ یہ لکھ کر کہیں کہیں ناچار ہی بغرض ہمارا مشیہ
آگیا ہے اس کا ہمارا نمی کی گردن پر ہے۔ یہ سب نہیں نے ہی کر لیا ہے۔ خدا شاہد ہے کہ ایسے عقائد سے
بہرہ ور جان و ہزار زبان ہزار ہوں۔ محبت بزرگان مذکور کو اپنی سعادت اور ان کے حسن اعتقاد کو ذریعہ نجات سمجھنا
ہوگا مگر مردمان اُمید سے ہیں اُمید ہے کہ سرے غرض سے بیشتر ہی شہادت مذہب مجھے معذور سمجھیں۔

نقل روایات میں مصنف کا رویہ

ہاں بھجے بے سرو سامانی احقر کسی شیعہ کو نقل روایات میں کچھ تامل ہو تو البتہ چند وجہ سے بجا ہے سائل
تو کتب شیعہ کے میسر، سنیوں کو کیا غرض جو فراہم کریں، شیعوں کو بحکم مثل مشہور ”اہل البیت اور کی ممانہ“
یعنی گھروالے گھر کی بات کو خوب جانا کرتے ہیں۔ لحاظ خوبی مضامین سنیوں کے دینے میں دادر گیر اور
طعن و تشنیع اور محکمہ کا اندیشہ، پھر کوئی سنی لائے تو کہاں سے لائے جو کوئی روایت مفید مطلب سنیاں کسی
رسالہ میں درج کی جائے دوسرے یہ کتابیں اگر فرض کر دیں بھی تو مجھ سے بے سرو سامان کے ملنے کی تو
کوئی صورت ہی نہیں کیونکہ اپنی کتابیں جب پاس نہ ہوں تو دوسروں کی کتابیں کیا ہوں گی۔ تیسرے نقل
مشہور ہے ”المرء بقیس علی نفسه شیعوں کی دروغ مذہبی نے شیعوں کے نزدیک سنیوں کا اعتبار
بھی نہیں رکھا، پھر حسب مثل مذکور اگر شیعہ اس سنی شرب کو بھی جھوٹا سمجھیں تو سمجھ کی بات ہے۔ بالحد
بوجود مذکورہ خاص کہ بجا اول اس بات میں کسی شیعہ کو تامل ہو تو بجا ہے خود ہے۔

تحفہ اثنا عشریہ پر اعتماد

سو اس لیے یہ داست ہاں بھی عرض پر راز ہے کہ ”الصدق یُنْجی وَ الْکُذْبُ یُهْلِکُ“ یعنی سچ
میں نجات ہے اور جھوٹ میں جہاں، واقعی اس بے سرو سامان کے پاس اس قسم کا سامان کچھ نہ تھا، پر
ایک تحفہ اثنا عشریہ تھا اور جب تحفہ تھا تو جانے والے جانتے ہیں کہ سب کچھ تھا، موافق مصرعہ مشہور:

کافی ہے تسلی کو تری ایک نظر بھی

اور کتابیں نہ سہی۔ ایک تحفہ ہی بہت ہے کیونکہ مؤلف تحفہ حجۃ اللہ فی العالمین خاتم المحدثین

والفسرین عمدۃ المحکمین زبدۃ المناظرین مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے نام کے سنی تود یوانے ہیں، پر علماء شیعہ بھی (جاہلوں کو میں نہیں کہتا) ان کے تجر و تحقیق کو بہ نسبت دونوں مذہبوں کے اپنے دل میں تو خوب ہی جانتے ہیں۔ زبان سے کہیں یا نہ کہیں، موجود روایت روایات کتب شیعہ میں سے اس رسالہ میں منقول ہوئی ہے، ماخذ اس کا یا متن تحفہ مطبوعہ دہلی ہے یا اس کے حواشی ہیں جو عالمگیری معلوم ہوتے ہیں۔ سو تحفہ کا حوالہ اہل انصاف کے نزدیک خود ان کتب کے حوالے سے کم نہیں جن کا نام اس رسالہ میں لکھا گیا۔ اسی وجہ سے اس احقر نے بتال ان کتب کا حوالہ رقم کر دیا ہے۔

شیعہ کو ہمدردانہ مشورہ

اور صاحب تحفہ کی راست ہاڑی اور تعمیری کے محروم سے منصفانہ شیعہ کی خدمت میں عرض پرداز ہوں کہ فقط میری بے سرو سامانی کے خیال سے بددماغی نہ فرمائیں، نقل کو اصل سے مطابق کر دیکھیں، اکثر کتب منقول عنہا کتب مشہورہ معتبرہ شیعہ ہیں۔ تاہم موجود کیا نہیں، اس کا اندیشہ نہ کریں کہ مطابقت ہوئی تو ماننا پڑے گا۔ خدا نے خود فرما دیا ہے "مَنْ يَضِلُّ اللَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ" پھر کیا اندیشہ ہے خدا کی فرمائی ہوئی باتوں میں تو یہ بات پائی نہیں جاتی کہ کچھ میں آجائے تو ماننا ہی پڑے؟ اس گنگنا رہنچہ اس کی بات میں یہ بات کہاں؟ مع ہذا حق تو ماننے ہی کے لیے ہے۔ اگر حق کو تسلیم ہی کر لیا تو کیا نقصان ہے الغرض تطبیق میں کاہلی نہ کریں، بعد مطابقت اگر فرق نکلے تو وہ میرے مذمہ۔

شیعہ کی دلیرانہ غلط بیانی

مگر میں جانتا ہوں کہ میرے بے کہے شیعہ اس بات کو جانتے ہوں گے، کون نہیں جانتا کہ اہلسنت کے نزدیک جھوٹ بولنا خصوصاً دین کے مقدمہ میں سخت ممنوع اور مجملہ کہار ہے، ہم وہ نہیں کہ مثل مولوی عمار علی صاحب مشارلیہ پیشامد پیش امام شیعہ کہ وہ بظاہر مولوی عمار علی صاحب سونی ہی معلوم ہوتے ہیں، غلط اور موضوع کو صحیح اور ضعیف کو قوی اور غیر معتبر کو معتبر کہہ دیں یا محض بے اصل کے جھوٹ بچ کوئی اصل گھر دیں۔ چنانچہ مناظر ان رسالہ ہذا پر واضح ہو جائے گا کہ مولوی صاحب مصوف نے خط مذکور میں کیا کیا ستم کیے ہیں۔ ہم کو یہ گمان تھا کہ شیعوہ دروغ بندی زمانہ سابق کے علماء شیعہ پر ختم ہو چکا مگر غیبت ہے کہ ان کے خلف الرشید اب تلک بہت ہاتی ہیں۔ دعویٰ یہہ فدک حضرت زہراء کی طرف سے سینوں کی معتبر کتابوں کے حوالے سے بیان کرنا اور حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم اور حضرت زینب رضی اللہ عنہن دختران رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقطع کرنا یہ مولوی عمار علی صاحب جیسے

معتدلوہ پیشوا شیعہ ہی سے ہو سکتا ہے کیونکہ متابعت بزرگان ایسے ہی بزرگواروں کا کام ہے۔ اگر جھوٹ ہی بولنے کو جی چاہتا تھا تو ایسا بولنا تھا کہ پیش کیا جاسکتا اور کسی کے خیال میں آسکتا مگر ایسا طوقان کہیں نہیں سنا تھا کہ ایک شخص کے سنی ہو جانے کے اندیشہ سے نہ خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرمائے اور نہ آخر مصومین کا کچھ پاس و لحاظ کیا۔ حضرت ام کلثوم بنت سیدۃ النساء کے خلیفہ ثانی سے نکاح کو ذکر نہ کرنا تو اس پر بھی جب تک محمول ہو سکتا ہے کہ اگر ایک کو ذکر نہیں کیا تو باقیوں سے انکار بھی تو نہیں کیا، پر یہ بات کہ حضرت دتیدہ وغیرہ رضی اللہ عنہم دختران سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نہ تھیں اور حضرت زہراء کا دعوائے مہذک کرنا اہلسنت کی معجز کتابوں میں ہے۔ ایسا دودغ صریح ہے کہ کسی احتمال پر کسی طرح منطبق نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بعد ملاحظہ رسالہ ہذا ان شاء اللہ میرے اس قول کی صحت بخوبی معلوم ہو جائے گی۔ یہودی مثل ہے:..... "دودغ گویم بروئے تو"

مولوی صاحب کی دودغ گوئی کا ایک دلچسپ پہلو

لیکن بغور دیکھئے تو مولوی صاحب کی بھی اس میں کچھ تقصیر نہیں، آخر مذہب اہل سنت و جماعت کلام اللہ اور عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحیح اور مذہب شیعہ و جماعت کلام اللہ اور عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سراسر غلط ہے اور باوجود اس کے پھر اپنے پیشواؤں کو دیکھا کہ مذہب شیعہ کو حق اور مذہب اہل سنت کو باطل کہتے ہیں تو مولوی صاحب موصوف بحسن اعتقاد بزرگان یہ سمجھ بیٹھے کہ حق غلط ہی باتوں کو کہا کرتے ہیں اور کیونکر نہ سمجھیں۔ آخر مولوی صاحب عمدۃ علماء شیعہ ہیں۔

بعد ازیں کلام اللہ کی تلاوت کا جو بھولے چو کے اتفاق ہوا تو سورۃ احزاب میں یہ آیت نکل آئی "وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٰ مِنَ الْحَقِّ" یعنی اللہ تعالیٰ حق بات سے شرم نہیں کرتا چونکہ مولوی صاحب کو بزم خود کمال اجاع خداوندی مد نظر ہے تو اپنے عندیہ میں غلط باتوں سے پرہیز کرنا خلاف اخلاق خداوندی سمجھ کر جھوٹ بولنے کی شرم طاق میں اٹھا دھری اور بے ساختہ مثل پیشوا پان قدیم (کہ ان کی متابعت بھی بزم مولوی صاحب موجب سعادت ہے اور حضرات آئمہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان کے حق میں بددعائیں کی ہیں اور ان کو جھوٹا بتلایا ہے اور ان کی باتوں سے رنج اٹھایا ہے) انہوں نے بھی افتراء پر مار لیوں پر کربانہ می تاکہ ان کی متابعت کے صدقے حضرات آئمہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ذمہ نہیں تو بددعا ہی میں شریک ہو جائیں۔

رنگی ریں کی اے کسکی تیرے بلوں بد سہائے ٹھنڈی تھی نیر جوں دلوں آگ بجھائے
تعلیٰ کیجئے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی کسی

باب مذہب اہلسنت موافق قرآن مجید

وحدیث پاک ہے اور مذہب شیعہ مخالف ہر دو

اہلسنت اہل حق اور شیعہ اہل باطل ہیں، دلائل

تفصیل اس بات کی کہ اہل سنت کا مذہب موافق عقلین یعنی کلام اللہ اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہے اور شیعوں کا مذہب مخالف عقلین اور یہ بات کہ پیشوایان شیعہ کے حق میں حضرات آئمہ نے کیا کیا کچھ کہا ہے اس رسالہ مختصر میں سامنے نہیں سکتی لیکن بطور نمونہ ایک ایک دو دو باتیں عرض کرنی ضرور پڑیں۔ اہل انصاف اسی سے سمجھ جائیں گے۔ شیعہ نمونہ خرواری بعد از اس خط کی تردید مناسب وقت کی جائے گی۔ مخدوم مں کلام اللہ میں سورہ بقرہ میں پہلے سیاہ میں یہ آیت ہے:

”الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ

لَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ط“

”حاصل اس کا یہ ہے کہ جن کو ہم نے دی ہے کتاب وہ اس کو پڑھتے ہیں جو حق ہے پڑھنے کا، وہی اس پر یقین لاتے ہیں اور جو منکر ہو گا اس سے سوائے کو نقصان ہے۔“

اس آیت کے مضمون کے دیکھنے کے بعد تصور میں نہیں آتا کہ کسی کو دربارہ حقیقت مذہب اہل سنت شک ہے اور جب اس میں شک نہ ہو تو اس کا پہلے یقین ہو جائے گا کہ مذہب شیعہ باطل ہے۔

مضمون آیت پر تفصیلی نظر اور حق تلاوت میں ایمان کا انحصار

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ آیت ہر چند بعض اہل کتاب کے حق میں نازل ہوئی ہے لیکن اس آیت میں گو کسی کی شان میں نازل ہو کتاب اللہ پر ایمان لانے کو انہیں میں منحصر کر دیا ہے جو اسے خوب پڑھتے ہیں حق پڑھنے کا، جب یہ بات انہیں میں منحصر ہوئی تو معلوم ہوا کہ

کتاب اللہ پر ایمان کی علامت یہی ہے کہ اس کو خوب تلاوت کیا کرے، کوئی سی خدا کی کتاب کیوں نہ ہو تورات ہو یا انجیل یا قرآن شریف۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی ذہین آدمی کوئی مشکل بات جلد سمجھ جائے اور خوب سمجھے اور دوسرے اس کی تعریف میں یوں کہیں کہ بات کو ذہن سے سمجھتے ہیں تو گو یہ تعریف اسی کے سنانے کے لیے کی گئی ہے پر حقیقت میں سارے ہی ذہینوں کی تعریف ہے۔ سو بہ نسبت قرآن شریف کے یہ نشانی سوائے اہل سنت کے اور کسی فرقے میں پائی نہیں جاتی۔ خصوصاً شیعوں کہ ان کا تلاوت کرنا تو سب ہی جانتے ہیں۔

اہلسنت سے ادائیگی حق تلاوت اور شیعہ کی اس سے قطعی محرومی

یہاں تک کہ کلام اللہ کے یاد نہ ہونے میں ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ سو اس کا باعث۔ جز اس کے اور کیا ہے کہ جسکی تلاوت چاہیے ان سے وہی تلاوت نہیں ہو سکتی۔ جس قدر کلام اللہ کے پڑھنے میں محنت چاہیے ان سے محنت نہیں ہو سکتی، باقی اہل سنت کا ایسا تلاوت کرنا، جیسا تلاوت کا حق ہے، عیاں ہے اور عیاں راجحیاں، اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ پڑھتے پڑھتے ہرزبان ہو جاتا ہے۔

بروئے آیات قرآنی قرآن کا حفظ ہونا حق ہونے کی نشانی

اس آیت سے اشارہ معلوم ہوا کہ جتنے فرقے اہل اسلام میں محدود ہیں ان میں سے جو نہ فرقہ حقانی ہوگا، اسی کو کلام اللہ یاد ہوگا اور وہ کو یاد نہیں ہو سکا اور نہ لازم آئے کہ باطل پر ہو کہ ممدوح خداوند کریم ہوں۔ سو بحمد اللہ تعالیٰ یہ دولت نصیب اہل سنت ہوئی۔ ماسوا ان کے اور سب فرقے اس نعمت عظمیٰ سے محروم رہے۔ چنانچہ آج تک مسوع نہیں ہوا کہ سوائے اہلسنت کے کسی اور کو ردائض و خوارج میں سے یاد ہوا ہو اور فرقوں کا تو ہندوستان میں وجود ہی نہیں، پر سوائے اہل سنت، ردائض البتہ بکثرت ہیں، کوئی قصبہ اور کوئی شہر نہ ہوگا کہ وہاں ان کے غول کے غول نہ ہوں۔ ملاوہ بریں نواح لکھنؤ اور اطراف دکن اور اضلاع سندھ میں ہاوجود کثرت کے تسلط بھی انہیں کا ہے۔ یہاں تک کہ اسی باعث سے تشیع کو ہندوستان میں کمال درجہ کو شیوع حاصل ہوا، ہزاروں عالم شیعہ مذہب موجود، پر حافظ نام کوئی نہ دیکھا نہ سنا اور کسی کے ذمہ اگر شیعوں نے حفظ قرآن کی نسبت لگا بھی دی تو اسے یوں ہی کہتے ہوئے سنا کہ یاد تو تھا پر آج کل کچھ کچا ہو گیا ہے اس لیے فی الحال سنانے سے معذور ہوں اور جو سنانے پر آمیں بھی تو ایک ایک سپارہ کئے سنانے پڑ آتے ہیں، یہ نہیں کہ ایک جلسہ میں یادو جلسہ میں پڑھ کر ادھر سے ادھر کر دیں۔

شیعوں کے حافظ نہ ہونے کا واقعات سے ثبوت

منجملہ حافظ شیعہ مولوی جعفر علی صاحب پیش امام دہلی جو درع و تقویٰ و علم و فضل میں مجتہد زمانہ نہیں تو مجتہد ثانی تو بیشک و شبہ ہیں ان کے حفظ کی یہ کیفیت ہے کہ رمضان شریف میں غدر سے پہلے چشم خود اس احقر نے دیکھا ہے کہ جلسہ تلاوت قرآن میں جو دن کو نواب حامد علی خان کی مسجد میں ہوا کرتا تھا، محل دیگر حضار شیعہ مذہب حائل میں دیکھ دیکھ کر پڑھتے تھے، اس پر بھی دو جگہ غلط پڑھ گئے اور خداوند کریم کی حق نمایاں دیکھئے کہ اسی جلسہ میں حافظ اہل سنت جو بطور سیر آ جاتے تھے اور اہل تشیع دہ کر ان کو بھی پڑھنے کے لیے کہتے تو وہ بر زبان ہی پڑھتے تھے مگر تاہم دیدہ عبرت شیعہ کشادہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک شخص سنی احمد ہب مولوی حافظ عبدالعزیز نام ساکن نجیب آباد کہتے تھے کہ میں کچھ کتب درسیہ میں سے مولوی جعفر علی صاحب سے پڑھا کرتا تھا۔ اتفاقاً کچھ اس کا ذکر آ گیا کہ شیعوں کو کلام اللہ یاد نہیں ہوتا، سن کر فرمانے لگے کہ تم سنو گے؟ میں نے عرض کیا کیا مضائقہ ہے۔ اگر ایک دو جلسہ میں ہو، یا یوں کہا کہ زیادہ زیادہ پڑھئے تو کیا مضائقہ ہے مگر پھر مولوی صاحب کہاں تھے۔ بجز اس کے نہ بن پڑی کہ ایک ایک سیپارہ ہر روز سن لیا کرو، جائے غور ہے کہ ایک ایک سیپارہ روز تو بعضے بعضے بندگان خدا از سر نو یاد کر سکتے ہیں؟ وہ حافظ ہی کیا ہوا کہ جس نے ایک جلسہ میں کلام اللہ نہ پڑھ لیا اور میں جانوں کہ مولوی صاحب سے ایک ایک سیپارہ بھی نہ سنایا جاتا۔ یہ بھی ایک دھمکی تھی۔ مولوی عبدالعزیز صاحب مذکور یوں سمجھ کر کہ شاید اب یاد کر کے سنا دیں اور پھر یاد نہ رہے سو، اتنی بات میں سر دست میرا دعویٰ تو لفظ ہو جائے گا یا دو چار سیپارہ ان کو یاد ہوں اور ان کو جوں توں سنا کر پھر کچھ چلے بہانے لے دیں اور ان کو کہنے کو جگہ ہو جائے اس بات پر کچھ نہ ہوئے اور نیز یہ بھی مرکوز خاطر ہو گا کہ سب پر عیاں ہو جائے کہ مولوی صاحب کو یاد نہیں، ان کا حافظ کہنا ایک حرف لفظ ہے کہ منجملہ اور دروغوں کے زبان زد شیعہ ہو گیا اور اگر مرام کر ایک دو نے بالفرض بغرض محال کچا پکا یاد بھی کر لیا تو غیرت مند ان شیعہ کے لیے تو یہی بات ڈوب مرنے کو بہت ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ایک ایک شہر بلکہ بعضے بعضے ایک قصبہ میں اہل سنت میں سو سو بلکہ زیادہ زیادہ حافظ ہوتے ہیں اور طرفہ یہ ہے کہ بعضے بعضے قصبات میں اہلسنت ہی کے برابر سراپر شیعہ ہوتے ہیں لیکن اہل سنت میں سینکڑوں حافظ ہوتے چلے جاتے ہیں اور شیعوں میں ایک بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ سہارن پور اور پانی پت اور کرانہ میں یہی حال ہے اور وجہ اس یاد نہ ہونے کی (حالانکہ مقتضائے طعن اہلسنت یہ تھا کہ کلام اللہ چھوڑ شیعہ تفسیر کبیر بھی یاد کر لیتے، یہی بات ہے کہ جیسا تلاوت کا حق ہوتا ہے ان کو میسر نہیں آتا)۔

شیعہ ادائیگی حق تلاوت سے کیوں محروم ہیں؟

شیعوں کو کلام اللہ سے طبعی لگاؤ نہیں

اور باعث اس کا واللہ اعلم یا تو یہ ہے کہ طبائع انسانی و حیوانی باعتبار غذا کے جیسے مختلف ہیں کہ کسی کو میٹھا بھاتا ہے۔ کسی کو ٹمکین کسی کو ایک چیز کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ کسی کو نفرت، انگریزوں کو خطر نہیں سے غر اور پھل کے چارے جسے سگھ بھی لیجے تو دماغ چھوڑ جان کی خیر نہیں، رغبت، پاخانہ کے کیڑے کندگی میں خرم و شاد و عیش و آرام سے رہیں اور خوشبو سونگھیں تو مرجائیں۔ ایسے ہی باعتبار امور دینی کے جو غذائے ارواح ہیں، مادیات ہی آدم مختلف ہیں، کسی کو رغبت ہے کسی کو نفرت، کسی کو لذت آتی ہے کسی کی جان نکل جاتی ہے، سو حضرات شیعہ کو بھی کلام اللہ پر محبت کرتے موت نظر آتی ہے۔

شیعہ اپنے اساتذہ کے حق میں گستاخ اور بے ادب ہیں

اور یا یہ ہے کہ جو شاگرد اُستاد کی خدمت میں گستاخ ہوتا ہے عادت الہی ہوں جاری ہے کہ علم سے بہرہ ور نہیں ہوتا، وجہ اس کی شاید یہ ہے کہ شکر پر وعدہ حریذ نعت ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: "لَنْ يَخْكُوتُمْ لَا زَيْنَتُكُمْ" یعنی اگر شکر کرو گے تو البتہ ہم اور زیادہ دیں گے تو اس صورت میں شہادت عقل کفران پر زوال نعت متفرع ہونا چاہیے۔ ادھر حدیث میں ہے "مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللَّهَ" یعنی جو کوئی آدمیوں کا شکر نہ کرے گا وہ اللہ کا بھی شکر نہ کرے گا اور ظاہر ہے کہ ہر چند منعم حقیقی خداوند کریم ہے پر دولت علم بواسطہ اُستاد ہی حاصل ہوتی ہے اور نعت عظمیٰ کلام اللہ کے اُستاد حضرات صحابہ ہیں جن میں سے خلیفہ اول اور ثالث کو تو بوجہ تالیف مصنف مجازی کہتے تو بجا ہے، پھر ان گستاخوں کو یہ نعت عظمیٰ عطا تو ہو کیوں کر؟

تلاوت کا حق ادا کرنے والوں کے پیر و بھی حصر ایمانی میں شامل ہیں

مگر جیسے اشارہ خداوندی سے یہ نکتہ مذکورہ معلوم ہوا یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ ایمان کا ان لوگوں میں منحصر ہونا جو خوب ہی تلاوت کرتے ہیں اور جو حق تلاوت ہے وہ بجالاتے ہیں، تو بہ نسبت ان لوگوں کے ہے جو کلام اللہ کی تلاوت میں تو مقصر ہیں اور ہاں ہم اپنی ہی سمجھ کے موافق اس پر عمل کرتے ہیں یا ان لوگوں کے حق میں جو ان کے اجماع و توابع ہیں اور مطلق کم پڑھنے والوں کی یا بالکل نہ پڑھنے والوں کی نسبت حصر نہیں کیونکہ وجہ اس حصر کی ان لوگوں میں جو حق تلاوت ادا کریں۔ بجز اس کے اور

کچھ نہیں کہ جو کسی کتاب کو کثرت سے دیکھے بھالے گا وہی اس کو خوب سمجھے گا اور اس کی حقیقت کو پہنچے گا اور کتاب اللہ پر ایمان اسی کا نام ہے کہ اس کے احکام اور مضامین کو حق سمجھے جو لوگ ان لوگوں کے قبیح ہوں گے کہ وہ جیسا تلاوت کا حق ہے تلاوت کیا کرتے تھے اور اس سبب سے اس کی اصل حقیقت کو پہنچ گئے ہیں اور ان کے تاملانے سے موافق عمل کریں گے۔ وہ بھی ایمان سے محروم نہ ہوں گے اور فرقہ مشار الیہا لفظ ”وَمَنْ يَتَكْفُرْ“ میں داخل نہ ہوں گے، ہاں جو شخص اس کی تلاوت میں مقصر رہا اور بے تہلیلہ کسی اور کے اپنی ہی سمجھ کے موافق اس پر عمل کرنے کا ارادہ کیا تو ایسی محنت والے تو قانون انگریزی میں بھی بیکتے ہیں جس میں چنداں دقت نہیں ہوتے، کلام اللہ کو جو محزون تمام علوم اور مجموعہ جملہ دقائق ہے کیا خاک سمجھیں گے بلکہ بالیقین کچھ کا کچھ سمجھ جائیں گے، سوائے لوگ جو کتاب اللہ کچھ کہے اور وہ کچھ کہیں، گو اپنے عندیہ میں کتاب اللہ پر ایمان رکھتے ہوں کتاب اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور ان پر یہ قول خداوندی سراپا مطابق ہے ”وَمَنْ يَتَكْفُرْ بِهِ فَلَاؤُفِكَ هُمْ الْخَاسِرُونَ“ یعنی جو لوگ کتاب اللہ پر ایمان نہ لائے، سو وہی ٹوٹے میں ہیں اور اس آیت میں بھی ان کی طرف اشارہ ہے ”يَهْلِكُ بِهِ كَثِيرًا“ یعنی خدا تعالیٰ اس قرآن سے بہت لوگوں کو بہکا بھی دیتے ہیں۔

آیت کے شان نزول سے بیان مذکور کی شہادت

اور اس تقریر کی صحت کا مؤید قطع نظر اس کے کہ ظاہر ہے ایک یہ بھی ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کی شان میں نازل ہوئی ہے جو کتاب اللہ کو خوب تلاوت کیا کرتے تھے اور اس سبب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علامتیں جو اس کتاب میں تھیں خوب یاد ہو گئی تھیں اور ان کے مطالب کے سب پہلو ان کے ذہن نشین ہو گئے تھے۔ اسی سبب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ یہ وہی ہیں ہر طرح سے ان اوصاف کو آپ پر مطابق پایا اس میں اختلاف ہے کہ وہ کتاب کون سی تھی توریت یا انجیل؟ اور وہ لوگ کون تھے یہود یا نصاریٰ؟

ادائیگی حق تلاوت میں سنی اور شیعہ فرقوں میں اکثریت کا لحاظ

ہاں ہم یہ بھی اہل فہم پر روشن ہے کہ ہیئت مجموعی کی رو سے تمام فرقہ اہل سنت اور علیٰ ہذا القیاس تمام فرقہ شیعہ ایک گنا جاتا ہے۔ سو ہیئت مجموعی اہل سنت کو جہد الحافظ کیجئے اور ہیئت مجموعی شیعہ جدا پیش نظر رکھئے اور دیکھئے کہ اس فرقہ میں کثرت تلاوت اور تلاوت کا جیسا حق ہے پائی جاتی ہے یا فرقہ شیعہ میں اور ہیئت مجموعی کی رو سے سب کا ایک ہی حال ہوتا ہے۔ ایک کی بات

سب ہی کی طرف منسوب ہوتی ہے تو ٹھوڑی ہے تو ٹھوڑی اور بہت ہے تو بہت ہاتھ پاؤں، آنکھ، ناک کے احوال کو تمام عالم مجموعہ کی طرف یعنی اپنی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ ہاتھ میں کچھ تکلیف ہو تو یوں کہا کرتے ہیں کہ میں بیمار ہوں، یا فلانہ بیمار ہے، علی ہذا القیاس، میں نے کسی کو مارا یا مجھ کو کسی نے مارا یا میں نے کسی کو دیکھا یا مجھ کو کسی نے دیکھا یہ ساری اضافتیں جزء کی کل کی طرف باعتبار مجموعہ کے ہوتی ہیں، یعنی مجموعہ کو ایک سمجھ کر جزء کے حال کو کل کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ مع ہذا لاکثر حکم الکمل سب ہی کا سنا ہوا جملہ اور سب ہی کے نزدیک مسلم ہے، اکثر کی بات صفت کل ہی کی طرف منسوب ہوتی ہے سو اکثر دینداران المل سنت بکثرت تلاوت میں مشغول رہتے ہیں بخلاف شیعہ کہ ان کا حال خود عیاں ہے۔

شیعوں کی ایک راہ گریز اور اس کا انسداد

اس تقریر کے بعد شاید قاضیان شیعہ اپنے بچاؤ کی یہ سہیل کریں کہ حق تلاوت کے ہمارے نزدیک یہ معنی ہیں کہ خشوع و خضوع و حضور قلب و تدبیر آیات تلاوت کی جائے۔ سو اس بات کی سنیوں میں ہونے کی اور شیعوں میں نہ ہونے کی کیا دلیل ہے؟ اس لیے بندہ کترین بھی بطور پیش بندی یہ گزارش کرتا ہے کہ موافق مثل مشہور ہمارا اِدھر بھی لکھا ہے اس بات کے تسلیم سے بھی ہمیں انکار نہیں کیونکہ خشوع و خضوع کا باعث بجز حسن عقیدہ یا کثرت تلاوت بہ نسبت کلام اللہ کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ حسن عقیدت کا باعث خشوع و خضوع ہوتا تو ظاہر ہے، رعی کثرت تلاوت سو اس کی یہ وجہ ہے کہ اکثر بنی آدم خدا سے غافل دنیا کی طرف مائل ہوتے ہیں تو ساعت دو ساعت کے ذکر یا تلاوت سے ان کی غفلت اور رغبت زائل نہیں ہوتی۔ ہاں مدت ہائے دراز تک اگر ذکر کی مشق کیجئے تو مثل اور کاموں کے البتہ بعد ویر یادداشت اور حضور کا ملکہ پیدا ہو جائے گا۔ اس وقت خشوع و خضوع آپ پیدا ہو جائے گا مگر ان فرقوں کو ذکر کرنے والے اور تلاوت کرنے والے ہی جانیں تو جانیں، شیعہ کیا جانیں؟

اہلسنت کو کلام اللہ سے حسن عقیدت ہے شیعوں کو نہیں

خیر غرض یہ ہے کہ باعث خشوع و خضوع یا حسن عقیدت سے یا کثرت تلاوت بلکہ دونوں مل کر باعث حصول خشوع و خضوع ہوتے ہیں۔ سو حسن عقیدت کا اُن لوگوں کے دلوں میں ہونا معلوم جو کلام ربانی کو بپاؤں حثانی سمجھتے ہوں۔ ہاں اہلسنت کے لیے جو کلام اللہ کو بلا کم و کاست و تغیر و تبدل حرفاً حرفاً بکلمہ کلام اللہ منزل سمجھتے ہیں، جتنا کہئے تھوڑا ہے۔ مع ہذا موافق نقل عربی "الاناء

حق تلاوت سے خشوع و خضوع مراد لینے میں نہ شیعہ کی مطلب

برابری ہے اور نہ یہ احتمال آیت شریفہ پر چسپاں ہوتا ہے

القصہ اگر علماء شیعہ حق تلاوت کو بمعنی خشوع و خضوع رکھیں تو ہمیں تو کچھ انکار نہیں کیونکہ خشوع و خضوع بھی اگر ہے تو اہل سنت ہی میں ہے، پر اس کو کیا کیجئے کہ نظم و نسق کلام اللہ اسی طرف ہے کہ حق تلاوت سے کثرت تلاوت ہی مراد ہے کیونکہ اول تو حق تلاوت ”یتلونہ“ کا مفعول مطلق ہے اور مفعول مطلق سب جانتے ہیں کہ بمعنی فعل مذکور یا اس کے اقسام میں سے ہوتا ہے سو کثرت تلاوت تو بیشک اقسام تلاوت میں سے ہے پر خشوع و خضوع داخل تلاوت نہیں بلکہ امور خارجہ میں سے ہے، کون نہیں جانتا کہ تلاوت زبان کا کام ہے اور خشوع و خضوع دل کے احوال میں سے ہے اور یہ بھی نہ سہی ”أُولَئِكَ يُؤْمِنُونَ بِالَّذِينَ آمَنُوا“ پر محمول کرنا اس بات کو مقتضی ہے کہ ایمان تلاوت موصوف پر متفرع ہو۔ چنانچہ جو لوگ فنون بلاغت سے آشنا ہیں وہ اس بات سے بھی آشنا ہیں اور اسی واسطے ”یؤمنون“ بصیغہ استقبال فرمایا ”آمنوا“ نہ فرمایا۔

حق تلاوت سے خشوع و خضوع مراد لینے کی

صورت میں ترتیب معانی کا اُلٹ جانا

طرفہ یہ ہے کہ در صورتے کہ حق تلاوت بمعنی خشوع و خضوع ہو معاملہ برعکس ہو جائے گا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایمان سے یا تو معنی مشہور مراد لیجئے یا بمعنی کمال انقیاد و تسلیم جسے ایمان کامل کہتے ہیں۔ رکھئے یا تصدیق معانی مقصودہ جو مراد خداوندی ہے قرار دیجئے۔ سو بہر صورت معاملہ برعکس ہے ایمان بمعنی مشہور یعنی تصدیق ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ“ کا خشوع و خضوع سے پہلے ہونا تو کسی پر عقلی ہی نہیں، سب جانتے ہیں کہ ایمان ہی سے بقدر ایمان خشوع و خضوع پیدا ہوتا ہے نہ کہ برعکس۔ رہا ایمان بمعنی کمال انقیاد سو وہ بھی اسی طرح خشوع و خضوع تلاوت سے مقدم ہے کیونکہ وہ سبب ہے اور یہ مسبب مع ہذا آیت۔

”الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ“

”وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہمیں پاتے ہیں ان کے دل اللہ کی یاد سے، سن لو اللہ کی یاد ہی

سے ہمیں پاتے ہیں دل۔“

بھی اسی طرف مشیر ہے کہ ایمان کامل باعث کثرت ذکر اور موجب حصول اطمینان قلب جو میں توجہ الی اللہ اور حضور قلب ہے ہوتا ہے کیونکہ اطمینان قلب کا حاصل ہونا بجز نفوس مطمئہ کے جو کامل الایمان ہوتے ہیں، متصور نہیں چنانچہ بدیہی ہے باقی رہا ایمان بمعنی تصدیق و علم مراد خدا وندی، سودہ بھی بشہادت آیت: "إِذَا سَجَعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرُّسُولِ قَرَأَ أَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الذَّمِّ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ"..... "اور جب سنتے ہیں اس کو جو اترار رسول پر تو دیکھے تو ان کی آنکھوں کو ابلیتی ہیں آنسوؤں سے، اس وجہ سے کہ انہوں نے پہچان لیا حق بات کو۔"

حال خضوع سے جو اس آیت میں ضمن "قَرَأَ أَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الذَّمِّ" مذکور ہے، مقدم ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ جب سنیں وہ لوگ کہ جن کا اوپر سے ذکر ہے اس کلام کو جو رسول پر نازل کی گئی ہے تو دیکھے تو ان کی آنکھوں کو کہ آنسوؤں سے بہہ رہی ہیں۔ بسبب اس کے کہ جان لیا انہوں نے حق بات کو۔ سو اس سے یہ بات صاف روشن ہے کہ انہوں نے کلام اللہ کو سن کر مضامین حق دریافت کیے، اس سبب ان کا یہ حال ہو گیا کہ آنسوؤں کا تانا بندا گیا ہے یعنی بسبب حق کے دریافت ہو جانے کے ان کے دلوں میں خشوع و خضوع پیدا ہو گیا، نہ یہ کہ رونے اور خشوع و خضوع کے باعث ان کو حق بات معلوم ہو گئی ہے، غرض در صورتی کہ حق تلاوت بمعنی خشوع و خضوع ہو تو بہر طور ترتیب بالعکس ہوئی جاتی ہے۔

حق تلاوت سے کثرت تلاوت مراد لینے کی صورت

میں ترتیب معانی کا ٹھیک اور درست رہنا

ہاں اگر حق تلاوت سے کثرت تلاوت مراد ہو تو تینوں صورتوں میں ترتیب بطور خود رہے گی کیونکہ بے ایمانوں اور ضعیف الایمانوں کو تو کثرت تلاوت موجب آگاہی حقائق و دقائق کلام ربانی ہی ہوتی ہے اور باعث ہدایت اور رفع شکوک اور سبب حسن عقیدت جو عین ایمان ہے ہو جاتی ہے۔ سو اگر ایمان سے بمعنی مشہور مراد ہو تو بایں طور کثرت تلاوت باعث حصول ایمان ہے اور اگر کمال ایمان مراد ہے تب بھی یہی بات ہے کیونکہ کثرت تلاوت سے دم بدم غفلت زائل ہوتی جاتی ہے اور لمحہ بہ لمحہ ملکہ یادداشت اور حضور قلب ترقی پکڑتا ہے اور صفا آئینہ قلب کی زیادتی اور انوار تجلیات کے جھوم کا باعث ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے تصدیق قلبی محکم اور مستحکم ہو جاتی ہے اور کمال انقیاد پیدا ہوتا ہے۔ باقی رہا ایمان بمعنی علم مراد خدا وندی سو اس کا کثرت تلاوت پر متفرغ اور

مترتب ہونا تو سب ہی پر ظاہر ہے، کون نہیں جانتا کہ ایک کتاب کا کثرت سے مطالعہ کرنے والا اس کے مطلب کو نسبت ان لوگوں کے جو اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، اکثر صحیح ہی سمجھتا ہے۔

آیت مذکورہ میں ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اب ایک شبہ باقی رہا وہ یہ ہے کہ آیت ”الَّذِينَ آمَنُوا“ سے ایمان کا تلاوت کا موصوفہ متفرع ہونا ہر چند ظاہر ہے۔ چنانچہ مبتداء کو بقید مذکور مقید کرنا اور ”وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِهِ“ کا اس پر محمول کرنا اور ”يُؤْمِنُونَ“ کہنا اور ”آمَنُوا“ نہ کہنا سب اسی طرف مشیر ہیں مگر احتمال یہ بھی تو ہے کہ بطور معلوم تلاوت کرنا ایمان کی فقط علامت ہو اور ترتب اور تفرع کا کچھ لحاظ نہ ہو اور ظاہر ہے کہ بعضی اشیاء کی علامتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ ان اشیاء ہی کے سبب پیدا ہوتی ہیں جیسے دھواں دور سے جہاں سے آگ نظر نہ آتی ہو، آگ کی علامت ہے اور اس پر آگ ہی سے پیدا ہوتا ہے اور اس کا وجود آگ کے وجود کی فرع ہے، آگ کا وجود اس کے وجود کی فرع نہیں۔ سو ایسے ہی اگر تلاوت (موصوفہ) ایمان کی علامت بھی ہو اور پھر ایمان ہی سے پیدا بھی ہوتی ہو اور بغرض بیان علامت ہی جناب باری نے یہ فرمایا ہو تو کیا حرج ہے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ عمدہ توجیہ کو چھوڑ کر ایسے احتمال ضعیف کو لینا اول تو یہی دلیل کم نہیں ہے۔ خصوصاً خدا کے کلام میں کہ اس میں بالاتفاق اگر ہوگی تو عمدہ توجیہ مراد خداوندی ہوگی۔ دوسرے ”مَسْلَمْنَا“ لیکن اس کا کیا جواب کہ بیان علامت سے تو غرض یہی ہوتی ہے کہ وہ شے جس کی یہ علامت ہے متمیز اور متعین ہو جائے، سو جب تک علامت خود متمیز اور متعین نہ ہوگی تب تک بیان علامت بیکار ہے خدا کے کلام میں بیہودہ بیکار باتوں کا ہونا منجملہ محالات ہے اور چونکہ خشوع و خضوع امر مخفی ہے اس کو علامت ایمان مقرر کرنا تعریف مجہول بالجمول اور تشریح مخفی بالعمی کی قسم میں سے ہے البتہ کثرت تلاوت ایک امر محسوس ہے اس کو اگر علامت کہئے تو زیبا ہے اور پھر قطع نظر اس کے مفید ترتیب مذکور مع ہذا خضوع و خشوع کو باعتبار عادت کے مستلزم، چنانچہ مذکور ہوا۔ سو اس صورت میں علامت ہونا بھی صحیح ہو گیا اور خضوع و خشوع کی طرف بھی اشارہ ہو گیا اور ترتیب و تفریع بھی ہاتھ سے نہ گئی اور حق تلاوت کا مفعول مطلق ہونا بھی صحیح و درست رہا اور کسی طرح کی تکلیف کی ضرورت نہ پڑی۔

آیت مذکورہ کے ذیل میں ایک اور فائدہ

جب اس شبہ کی تردید سے فراغت پائی تو ایک اور فائدہ گوش گزار اہل فہم ہے وہ یہ ہے کہ قید

"آبنہام" سے یوں خیال میں آتا ہے کہ جن لوگوں کو کتاب نہیں دی گئی یعنی اس کو مانتے ہی نہیں، چہ جائیکہ مان کر غلط سمجھ جانا، ان لوگوں میں سے اگر کوئی حافظ ہو جائے تو مضائقہ نہیں، یا یوں کہئے کہ اس کو ایسی تلاوت جسے تلاوت کا حق کہتے ہیں، میسر آ جائے تو آ جائے، پر ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب ملنی ہے یعنی انہوں نے اس کو تسلیم کیا، کثرت تلاوت وہاں ہی ہوگی جہاں حق ہی حق ہوگا کچھ کچی نہ ہوگی کیونکہ کثرت تلاوت جسے تلاوت کا حق کہتے ہیں، علامت ایمان ہے تو فقط انہی کی نسبت ہے جو اس کو تسلیم بھی کرتے ہیں، نہ کہ ہر کسی کے حق میں، اس صورت میں یہ جو مشہور ہے کہ برنس نصرانی کو کلام اللہ یاد تھا کیا عجب ہے کہ صحیح ہووے۔ بہر حال علامت "يَتْلُوْنَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ" یوں معلوم ہوتا ہے کہ بشارت "اُولَئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهِ" فرقہ اہلسنت کے لیے ہے اور حضرات روافض منجملہ "وَمَنْ يُكْفُرْ بِهِ فَاُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ" ہیں جس کے یہ معنی ہیں اور جو لوگ کتاب اللہ سے پھر گئے، سو وہی ٹوٹے میں ہیں۔

اس ایک آیت کی طرح اور بھی آیت قرآنیہ مذہب اہلسنت کو حق اور

مذہب شیعہ کو باطل قرار دیتی ہیں بغرض اجمال صرف ایک پراکتفا کی گئی

اب التماس یہ ہے کہ سو آیت مذکورہ آیات کثیرہ حقیقت مذہب اہل سنت اور بطلان مذہب شیعہ پر دلالت کرتی ہیں اور کیوں کر دلالت نہ کریں، جس قدر عقائد مخصوصہ مذہب شیعہ اور فروغ خاصہ مذہب مذکور ہیں، بجا مبالغہ مخالف کلام اللہ ہیں اور مذہب اہلسنت سرِ اُپا کلام اللہ پر مطابق اور وجہ اس کی یہی ہے کہ بسبب تلاوت کے حق ادا کرنے کے اہلسنت تو مغزِ سخن ربانی کو پہنچے اور شیعہ بسبب اس کے کہ کثرت تلاوت بوجہ مذکورہ ان کو میسر نہ آئی، دقائق کلام اللہ کو نہ سمجھے مگر چونکہ آیت مذکورہ کے ذکر کرنے سے یہ نکتہ معلوم ہو گیا تو اہل عقل بالا اجمال سمجھ جائیں گے کہ بیشک آیات ربانی مخالف مذہب شیعہ ہوں گی اور مذہب اہلسنت بجا مبالغہ موافق قرآن مجید، تو قطع نظر اس کے کہ آیت مذکورہ حقیقت مذہب اہلسنت و بطلان مذہب شیعہ پر جداگانہ بھی دلالت رکھتی ہے۔ چنانچہ ملاحظہ تقریر بالا سے واضح ہو جائے گا اور آیات کے حوالے سے بھی حقیقت مذہب اہلسنت اور بطلان مذہب شیعہ پر دلالت کرتی ہے چونکہ اس وجہ سے یہ آیت اور آیات کی بھی نیابت کرتی ہے تو اس کو کیا بیان کیا گیا سب ہی کو بیان کر دیا۔ اس وجہ سے اور آیات کے بیان سے مقصر ہوں۔ مع ہذا اگر تمام آیات مخالفہ مذہب شیعہ کو لیجئے تو ایک دو نہیں جو سہل ہو بکثرت بلکہ

اکثر آیات کلام اللہ عقائد و احکام و اصول و فروغ مذہب شیعہ کو رد کرتی ہیں اور مذہب اہلسنت کی حقیقت اور حقانیت پر شاہد ہیں۔ اس رسالہ مختصر میں سب کی گنجائش کہاں؟ خصوصاً جبکہ بقدر لہجہ ان کی شرح بھی کیجئے اور ان سے اہلسنت کی حقانیت اور ان کے مذہب کی حقیقت اور اہل تشیع کے مذہب کے بطلان پر استدلال بھی لائیے۔

استدلال آیت مذکورہ پر شیعوں کی طرف سے ایک لچر شک و شبہ

لہذا ایک ہی آیت پر کہ وہ ایک ہی سب کے قائم مقام اور مفید خاص و عام ہے استغنا کر کے اس قدر اور گزارش کرتا ہوں کہ شاید کسی شیعہ المذہب کو اس آیت کی ہدایت کو سن کر بسبب کج طبیعت اور ضلالت طبع زاد اور تعصب نہاد یہ شبہ ہو کہ یہ آیت ہے تو کیا ہوا۔ ایک جملہ قرآنی ہے سو قرآن کا نعوذ باللہ نہ کیا اعتبار ہمارے اعتقاد کے موافق کی کا تو کچھ شارعی نہیں۔ بیشی اور افزائش اور تبدیلی الفاظ بھی ظہور میں آئی ہے۔ پھر عجب نہیں کہ یہ آیت بھی جملہ الحاقات اہل سنت ہو دے۔

شبہ کا ایک پہلو سے جواب

سو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ مذہب محققین شیعہ اس بات میں یا تو یہ ہے کہ کلام اللہ میں نہ کی ہوئی نہ بیشی، چنانچہ استاد علامہ کلینی حضرت صدوق اس کے قائل ہیں، یا یہ ہے کہ کی تو ہوئی ہے زیادتی نہیں ہوئی۔ غرض زیادتی کا نہ ہونا اجماعی اور آیت مرقومہ سے انکار نہیں ہو سکتا مگر یہ چونکہ دونوں مذہب مخالف روایات کلینی ہیں جوامع الکتاب شیعہ ہے اور نیز ذہن نشین اکثر شیعہ بھی یہی ہے کہ کلام اللہ میں کی، زیادتی دونوں ہوئی ہیں۔ ادھر ہمارے بعض مطالب مذکورہ بھی اسی پر مبنی ہیں اس جواب پر قاعدت نہیں ہو سکتی۔

شبہ کا دوسرے پہلو سے جواب

اس لیے دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ اور شیعوں کے مذہب کے بطلان ہی کی دلیل ہے۔ بھرا اللہ باقر شیعہ اتنا تو معلوم ہوا کہ مذہب تشیع کا اعتبار نہیں کیونکہ ماخذ احکام دین سب میں اول کلام اللہ ہی تھا۔ جب اس کا اعتبار نہیں تو جو باتیں شیعہ بزم خود کلام اللہ سے ثابت کرتے ہیں، اگر بغرض محال ہے بت بھی ہو جائیں تو بدعت اولی قابل اعتبار نہ ہوں گی۔

کلام اللہ پر بے اعتباری ظاہر کرنا خود اپنے خیال کی بیخ کنی ہے

مع بذاتہن جو متعلق علیہ طرفین ہیں، اس بات پر شاہد ہیں کہ کلام اللہ اور عزت دلوں کے

ساتھ تمسک رہے گا تو کمر اہی پیش نہ آئے گی۔ پھر جب کلام اللہ سے جو موافق حدیث مذکور دونوں میں اعظم ہے تمسک میسر نہیں تو یہ شہادت عقل سلیم ہدایت بھی نہیں سراپا کمر اہی ہے۔ غرض حضرات شیعہ اگر یہ احتمال پیش کریں تو یہ تو اور اُلٹے اپنے ہی پاؤں میں تیشہ مارتا ہے۔

کلام اللہ پر سے اعتبار اٹھ جانا احادیث پر سے اعتبار کو پہلے کھودیتا ہے اور بالبداہت اور بالاجماع کسی فرقے کی کوئی حدیث اس درجے کو شائع و ذائع نہیں ہوئی جس درجے کو کلام اللہ شائع و ذائع ہوا ہے اور نہ اس طرح سے کسی حدیث کے سارے سداوی اس کی روایت میں متفق اللفظ پھر جب کلام اللہ کا اعتبار نہیں اس کا کاہے کو ہوگا۔ پھر جس میں راویان احادیث شیعہ کے احوال کو اور ان احادیث کے تعارض کو دیکھئے تو بے اعتباری میں نہایت ہی کو پہنچ جائیں گی۔ بہر حال اگر یہ شبہ علماء شیعہ پیش کریں اور اکثر مواقع میں پیش کرتے ہیں تو ہمارے لیے بہت تخفیف تصدیق ہے۔

کلام اللہ میں کمی و بیشی کا خیال تلاوت اور حفظ قرآن کا خاتمہ کر دیتا ہے مع ہذا شیعوں ہی کے اقرار سے ہمارا وہ دعویٰ جو تقریر شرح آیات مسطورہ میں گزرا ہے۔ خدا ساز ثابت ہو گیا کیونکہ جب قرآن میں اس درجہ کو کمی و بیشی ہے تو پھر جسے قرآن کہتے ہیں۔ قرآن ہی نہ ہوا، اب اگر شیعہ اسے یاد بھی کر لیں اور تلاوت کا جیسا حق ہے دہی طرح تلاوت کریں تب بھی فی الواقع تلاوت قرآن اور حفظ قرآن نہ ہوگا۔

حضرات اہل بیت کا عمل قرآن میں کمی و بیشی کے خیال کو لغو ثابت کرتا ہے دوسری تمام روایات امامیہ میں موجود ہے کہ تمام اہلیت اسی قرآن کو پڑھتے تھے اور اسی کے عام و خاص سے تمسک کرتے تھے اور بطور استدلال اسی قرآن کی آیات کو پیش کرتے تھے اور اسی کی آیات کی تفسیر کرتے تھے اور حضرت امام حسن عسکری کی طرف جو تفسیر منسوب ہے تو اسی قرآن کی ہے لفظاً لفظاً اور اہل بیت اپنے لڑکوں اور باندیوں اور خادموں اور اہل و عیال کو بھی قرآن تعلیم فرماتے تھے اور اسی قرآن کے پڑھنے کا ناز وں میں حکم فرماتے تھے۔

قرآن کا حد درجہ شائع ہونا خود اس میں کمی و بیشی کے خیال پر ضرب کاری لگاتا ہے مع ہذا قرآن مجید کا موافق نزول کے لوگوں کو پہنچانا اور ان کو سکھانا باجماع امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ فرض تھا اور یقیناً معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو

کوئی شرف ہا سلام ہوتا تھا، اول کلام اللہ سیکھتا تھا، بعد ازاں لوگوں کے سکھانے میں مشغول ہوتا تھا یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی ہزاروں نے کلام اللہ سیکھ لیا تھا۔ چنانچہ بعضے بعضے غزوات میں ستر ستر حافظ شہید ہوئے ہیں۔ بعد ازاں آج تک تمام اطراف میں یہاں تک کہ دیہات میں اہل اسلام کلام اللہ کی تلاوت کو سب عبادتوں پر بڑھ کر سمجھتے ہیں اور رات دن نماز میں اور نماز سے باہر کلام اللہ کے پڑھنے میں مشغول رہتے ہیں اور ہر لڑکے کو اول جو کتب میں بخلاتے ہیں تو سب سے پہلے کلام اللہ ہی یاد کرانا شروع کراتے ہیں۔ بالجملة قرآن مجید مثل کلینی و تہذیب نہیں کہ براہِ تقیہ کسی کو نے میں صندوق میں مقفل بند رہے، کبھی تنہائی میں ڈرتے ڈراتے کہ مبادا کوئی سنی نہ آ جائے ایک دو صفحہ مطالعہ کر لیا اور اس پر ایسے کثیر الوجود کہ ہر شہر بوندیہ میں سینکڑوں ہزاروں ہیں۔ کلینی و تہذیب کو ہندوستان میں تلاش کیجئے تو کہیں کہیں لکھے گی۔ علیٰ ہذا القیاس ایران میں سمجھئے کیونکہ اول تو رعایا سلطانی میں اہل سنت بکثرت ہیں، سنا تو یوں ہے کہ شیعوں سے زیادہ ہوں۔ آئندہ خدا جانے اور شیعوں میں سے بھی کلینی و تہذیب نہ ہر کسی کے کام کی نہ ہر کوئی اسے سمجھے جو خواہ مخواہ بہم ہی پہنچائے، باقی سوا ان کے اور مالک میں کلینی و تہذیب کا پتہ تو کیا ملے نام بھی کوئی نہیں جانتا ہوگا۔ ہاں ہر ایک اگر ایک دو نسخہ کہیں مل بھی جائے تو بیشتر غلط ملے ہیں۔ صحیح تو قسمت ہی سے ملتا ہے بخلاف کلام اللہ کے ہر دیار میں بکثرت موجود۔ یہاں تک کہ کوئی کتاب کسی مذہب کی ہو یا کسی علم عقل کی۔ ایسی کثیر الوجود نہیں پھر عام و خاص کو اس کی ضرورت ایک ایک گھر میں متحد کلام اللہ رکھے ہوئے ہیں۔ حفظ و صحیح کا یہ اہتمام کہ ہزاروں حافظ حرف حرف گناہ از بر زیر کی تعداد معلوم رسم خط میں بیسیوں کتابیں موجود، پھر ہاں ہر کسی عاقل کی عقل میں آ سکتا ہے کہ کلینی و تہذیب میں تو الحاق نہ ہونے پائے اور شیعوں کے نزدیک من کل الوجوہ معتبر اور معتقد رہا دماغ الکتاب کہلائے اور کلام اللہ میں الحاق ہو جائے اور اس کا کچھ اہتمام نہ رہے۔

قرآن مجید کی بے پناہ شہرت عقل کے نزدیک خلیفہ ثالث

کے دامن کو الزام سے پاک کر دیتی ہے

جس زمانہ فرض کیجئے اس میں لائے انھوں نے کلام اللہ میں سے کم کر دیا یا اس میں کچھ بڑھا دیا، جیسے شیعوں کو خلیفہ ثالث کی طرف ہدگائی ہے تو ایک دو کلام اللہ میں بڑھا یا گھٹایا گیا ہوگا تمام ملک عرب اور ملک روم اور ملک ایران اور یمن کے مصاحف میں (کہ ان کے خلیفہ ہونے سے پہلے یہ

تمام ممالک تحت تصرف اسلام ہو چکے تھے اور سوائے ملک عرب کے کہ وہ سارا کا سارا مسلمان ہو چکا تھا اور ممالک کے باشندوں میں سے بھی لکھو کھا آدی مسلمان ہو چکے تھے اور قرآن کو فرمان خداوندی سمجھ کر ہر کوئی حرز جان سمجھتا تھا اور مجموعہ ایمان تصور کر کے اس کی یادگاری اور تلاوت میں مشغول تھا۔ کی ویشی ہرگز قرین عقل نہیں۔ علاوہ بریں اس زمانہ میں حفاظ کی نوبت لکھو کھا کو پہنچی تھی۔ خلیفہ ثالث نے ان کے سینوں سے کیونکر نکال دیا ہوگا کہ تمام عالم میں قرآن محرف ہی مروج ہو گیا۔ ان وجوہ کے نظر کرنے کے بعد اہل عقل کا تو یہ کام نہیں کہ قرآن مجید کی نسبت اس بات کے قائل ہوں کہ اس میں کچھ کی یا بیشی وقوع میں آئی ہو اور جب قرآن مجید اس درجہ کو صحیح اور مستبر ہوا، کوئی کتاب اس کے ہمسک نہیں اور تفسیر امام حسن عسکری میں اذل سے آخر تک تمام آیات تجسہا موجود ہو دیں تو اول تو آیت ”الَّذِينَ آمَنُوا بِالْكِتَابِ الْخ“ سے استدلال کرنا صحیح اور درست ہوا۔

قرآن کی حفاظت کا ثبوت خود قرآن کی زبانی

دوسرے اگر کلام اللہ ہی کی آیات سے کلام اللہ کے تجسہا محفوظ ہونے پر استدلال کریں تو در صورت یہ کہ طریقہ استدلال صحیح ہو واجب التسلیم ہوگا۔ اس لیے کلام اللہ کو جو ہم نے تجسہ کیا تو آیات کثیرہ اس پر شاہد نکلیں کہ کلام اللہ تا ہنوز موافق نزول کے تجسہا باقی ہے کسی قسم کا تغیر یا تبدل اس میں وقوع میں نہیں آیا، نہ کمی ہوئی اور نہ بیشی ہوئی، نہ کسی لفظ کے عوض میں دوسرا لفظ مشہور و معروف ہو گیا۔ سب کو لکھ کر اس مضمون کو ثابت کیجئے۔ اس کی تو گنجائش نہیں۔ فقط ایک آیت کا لکھنا ضروری سمجھ کر ایک ہی پراکتفا کرتا ہوں۔ سورہ حجر میں ارشاد ہے: ”إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ“ یعنی ہم نے آپ پر اتاری ہے یہ نصیحت اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔ فقط۔ اب جائے غور ہے کہ ہاوجود اس پختہ وعدہ کے جو مؤکد مجدد تاکید ہے۔ چنانچہ واقفان علم معانی واقف ہیں۔ پھر نہ جانے خلیفہ ثالث نے کیا ستم کیے ہیں کہ قرآن اصلی کا بالکل نام و نشان مٹا دیا۔ اللہ اللہ کیا کچھ قدرت و طاقت تھی کہ نعوذ باللہ خدا کی بھی نہ چلنے دی۔ سورئیں کی سورئیں نکال ڈالیں اور آیتیں کی آیتیں بدل دیں، زہے نصیب الہست جن کے ایسے پیشوا ہوں۔

شیعوں کے غلط خیال کے شرمناک نتائج

ہائی رہا یہ اطفال کہ خداوند والجلال وعدہ کر کے پھر گئے ہوں۔ سو یہ خیال ٹوٹا ہوا ہے۔ خداوند صادق القول ایسی تاکیدوں سے وعدہ ٹکڑے فرمائے اور پھر پھر جائے اور حقائق نہ کرے مع ہذا

کلام اللہ ہی میں یہ بھی آیت ہے۔ "إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ" (یعنی اللہ تعالیٰ ہرگز خلاف وعدہ نہیں کرتا۔) مگر شاید کسی شیعہ مذہب کو یہ احتمال پیش آئے کہ خلیفہ ثالث کے زمانہ میں یا جس کو یوں کہئے کہ اس نے کلام اللہ میں کمی و بیشی کی ہے اس کے زمانہ میں خداوند اکرم ٹال گیا ہو یا اپنے وعدہ کو بھول گیا ہو، سو اس کا جواب خداوند کریم نے اپنے آپ کلام اللہ میں فرمادیا ہے۔ آیت الکرسی تو شیعوں کو بھی یاد ہوگی اس میں یہ جملہ موجود ہے "لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ" یعنی نہ اونگھ ہی خدا کو آدباتی ہے اور نہ نیند ہی۔ اور سورہ مریم میں فرماتے ہیں...

"وَمَا كُنَّا رَبُّكَ نَسِيًّا" یعنی تیرا رب بھولنے والا نہیں۔ سورۃ طہ میں یوں ارشاد ہے "لَا يَصْلُ رَّبِّي وَلَا يَنْسَى" نہ بھٹکتا ہے میرا رب نہ بھولتا ہے۔ اس آیت نے اس احتمال کو بھی مرتفع کر دیا کہ خداوند کریم نے نگہبانی قرآن کا قصد تو کیا ہو، پر تدبیر میں غلطی ہوئی ہو، یا بوجہ غلطی قرآن کے بدلے کسی اور چیز کی حفاظت کر بیٹھے ہوں۔ جب یہ سب احتمالات مرتفع ہو چکے تو اب اس غلام خاندان نبوی کی علیہ علی آلہ الصلوٰۃ والسلام حضرات شیعہ کی خدمت میں یہ گزارش ہے کہ بعد اس وعدہ محکم اور عدم موانع کے جو خداوند کریم سے حفاظت نہ ہو سکی تو بجز اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارے نزدیک خلیفہ ثالث میں (نعوذ باللہ من ہذا القول) خدا سے بھی زیادہ زور اور مل تھا کہ خدا کا ارادہ پیش نہ کیا درحالیکہ تم خلیفہ ثالث کے اس قدر معتقد ہو کہ خدا کو بھی اتنا نہیں سمجھتے تو خلیفہ ثالث ہی کے ساتھ ہی کیوں نہیں ہو لیتے (نعوذ باللہ نقل کفر کفر نہ باشد) اگر یہی تمہارے خیال ہیں تو خدا تعالیٰ کے ساتھ ہو کے کیا پورا پورے کامباد اقیامت کو خلیفہ ثالث تمہیں بھی خدا تعالیٰ کی حفاظت سے نکال کر کبھی کبھی کے بدلے لینے لگے اور خدا کو ہیجان علی سے شرماتا پڑے۔

اسی سلسلے میں کلینی کی افتر پردازی اور مرتبہ قرآن میں خلل اندازی

یہاں کہو کہ یہ ہمارا عقیدہ غلط ہے اور کلینی جو تمہارے نزدیک اصح الکتاب ہے، اس کی یہ روایت سراسر بہتان اور دروغ ہے۔

"عن هشام بن سالم عن ابي عبد الله إن القرآن الذي جاء به جبرئيل الى محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم سبعة عشر الف آيات"

"یعنی هشام بن سالم حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ وہ قرآن جو حضرت جبرئیل رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے پاس لائے تھے۔ اس کی سترہ ہزار آیتیں تھیں۔" فقط

اب دیکھئے کہ یہ کلام اللہ جواب موجود ہے اس میں کل قریب چھ ہزار آیتوں کے ہیں تو شیعوں کی اس روایت کے موافق کوئی دو تہائی کلام اللہ چوری گیا، اس سے بہتر تو یہی تھا کہ خداوند کریم ذمہ کش حفاظت نہ ہوتے۔ اس کی حفاظت کے بھروسے اُمّیان محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی بے فکر ہو بیٹھے ورنہ بہت ہوتا تو اتنا ہی نقصان ہوتا جتنا توریت و انجیل میں ہوا تھا سو جو لوگ کہ توریت و انجیل کی تحریف کے اثبات کے درپے ہوئے ہیں وہ بھی یوں نہیں کہتے کہ توریت و انجیل میں اتنا کچھ نقصان ہوا ہے بلکہ بعد تحقیق یوں معلوم ہوتا ہے کہ علماء یہود و نصاریٰ نے قدرِ قلیل کی بیشی کی ہے۔ سودہ بھی جہاں کہیں کوئی بات مسلمانوں کے مفید مطلب دیکھی ہے یا کوئی ایسا حکم ہوا ہے کہ اس کے مروج رہنے میں امراء کو دشواری ہوئی ہے ایسی جگہ امراء سے کچھ لے کر بدل دیا ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔ القصہ حسبِ مقولہ شیعہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس اہتمام اور اس انتظام کے کہ قرآن مجید کی خداوند کریم نے خود حفاظت کی۔ قرآن مجید غیر محفوظ اور غیر محترم ہونے میں توریت و انجیل سے بڑھ گیا حالانکہ ان کا حافظہ محافظ نہ خدا تھا نہ کوئی پیغمبر، ہاں علماء دنیا پرست کہ آیات خدا وندی کا بیج دینا اور احکام کا بدل ڈالنا اور تحریف کا کرنا ان کا کام ہی تھا۔ اس کے نقطہ پڑھنے پڑھانے والے اور جاننے پہچاننے والے تھے۔ حافظ و نگہبان ہونا کجا۔ شاید اس فرقہ کے نزدیک کلام اللہ کے توریت و انجیل سے بڑھ کر ہونے کے یہی معنی ہیں کہ بجا اعتباری میں ان سے بڑھا ہوا ہے۔

حفاظت قرآن کے دو لچر احتمالات اور ان کے دندان شکن جوابات

یہاں علماء شیعہ دو احتمال پیش کریں تو کریں ایک تو یہ کہ کلام اللہ لوح محفوظ میں محفوظ ہے، دوسرا یہ احتمال کہ عارض من رائے میں حضرت امام مہدی حافظ قرآن موجود ہیں۔ سواؤل احتمال کا پوچھ ہونا تو ظاہر ہے اول تو یہ ہے کہ اگر بالفرض ”إِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ“ کا یہی مطلب ہے تو ہمیں کیا ہم سے اس وعدہ کرنے کے کیا معنی، ہمارے مفید مطلب تو یہ بات ہے کہ اس قرآن کی حفاظت کرتے جو ہمارے پاس ہے تاکہ احکام خداوندی کے معلوم ہونے میں شک و شبہ نہ رہتا۔ دوسرے وہاں کی حفاظت کرنے کی کیا ضرورت تھی، اگر لوح محفوظ تک کسی کے دین کی دسترس ہوتی تو البتہ حفاظت کا موقع بھی تھا۔ تیسرے آیت مذکورہ میں اول تنزیل کا ذکر فرمایا۔ بعد ازاں حفاظت کا وعدہ کیا ہے اس ترتیب سے بلاغت شناسان قرآنی کو خود معلوم ہے کہ قرآن منزل کی حفاظت مد نظر ہے نہ کہ اس قرآن کی جو لوح محفوظ میں محفوظ ہے۔ چوتھے اگر یہی مطلب ہے تو یہ فضیلت تو

توریت و انجیل میں بھی موجود ہے۔ قرآن میں کیا فوقیت ہوئی، مع ہذا یہاں حفاظت کا وعدہ کیا وہاں نہ کیا، اس کا کیا ثمرہ نکلا۔ پانچویں یہ ہے کہ اس آیت میں اسماء قرآنی میں ذکر اس کو ذکر کیا۔ لفظ قرآن یا کتاب وغیرہ ذکر نہ فرمایا تو یہ بھی اسی غرض سے ذکر فرمایا ہے کہ قرآن میں امکان کی رہنمائی بغیر تبدل کا کسی کو احتمال باقی نہ رہے۔

قرآن مجید کے نام ذکر کا موقع استعمال اور اسکی مفید تشریح

چونکہ یہ بات تمہید طلب ہے تو ہمیں لازم ہے کہ اس کی تمہید بیان کر کے اصل مطلب کو روشن کر دکھلائیں۔ اس لیے یہ گزارش ہے کہ بسبب اعتبارات اور اوصاف مختلفہ اور حیثیات متعددہ کے ایک ایک چیز کے متعدد نام ہوا کرتے ہیں اور پھر وہ نام اپنے اپنے موقع ہی میں استعمال ہوتے ہیں، ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کرنا صحیح نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک شخص کسی کا باپ بھی ہوتا ہے اور کسی کا بیٹا بھی اور علیٰ ہذا القیاس کسی کا بھائی کسی کا بھتیجا، کسی کا چچا کسی کا بھانجا، کسی کا ماموں ہوتا ہے۔ غرض ایک شخص ہے اور اس کے القاب بہت ہیں، پر وہ سب القاب یکساں برابر نہیں بولے جاتے، اپنے اپنے موقع میں مستعمل ہوتے ہیں۔ بیٹا اپنے باپ کو بیٹا کہہ کے نہیں پکار سکتا، گودہ کسی کا بیٹا ہے اور اسی طرح باپ بیٹے کو باپ کہہ کر نہیں پکار سکتا۔ اگر چہ وہ اپنے بیٹے کا باپ ہے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ ایک حاکم کلکٹر بھی ہوتا ہے، مجسٹریٹ بھی ہوتا ہے مگر چونکہ کلکٹری، مجسٹریٹ کا کام مختلف اور جدا جدا ہے تو کلکٹری کے کاغذات میں بلبق کلکٹر لکھتے ہیں اور مجسٹریٹ کے کام کاغذات میں بلبق مجسٹریٹ اور برعکس نہیں کر سکتے۔

اسی طرح قرآن شریف کے بھی بہت سے القاب اور اسماء ہیں اور ہر ایک لقب کا مدار ایک جدا اعتبار اور نئے نئے اوصاف پر ہے۔ قرآن تو لحاظ مقررہ ہونے کے کہتے ہیں، یعنی قرآن کو قرآن اس لحاظ سے کہتے ہیں کہ اس کی قرأت کا اتفاق ہوتا ہے اور مصحف اور کتاب بایں لحاظ کہتے ہیں کہ اس میں مصحف یعنی اوراق ہوتے ہیں اور ان اوراق میں اس کو لکھتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس ذکر بایں وجہ کہتے ہیں کہ غافلوں اور جاہلوں کے لیے مذکر اور گنہگاروں کے واسطے پند و دلہند ہے یعنی باعث یادگاری باری ہے اور پند خداوند ہے۔ سو اس لقب کا استعمال جب ہی صحیح ہوگا کہ مقابل میں غافل اور جاہل اور گنہگار ہوں مگر سب جانتے ہیں کہ موصوف بوصف غفلت و جہل و گناہ اگر ہے تو یہ انسان ہے۔ ملائک ان مبوب سے مبرا ہیں تو جب تک کلام اللہ لوح محفوظ میں تھا، اس لقب کا بولنا صحیح نہ تھا کیونکہ اس موقع میں نہ کوئی غافل نہ تھا نہ جاہل نہ تھا نہ گنہگار تھا وہاں تک اگر رسائی تھی تو فقط ملائک کو تھی۔ سو

ان کو ان باتوں سے کچھ سروکار ہی نہیں۔ ہاں جب نوبت تنزیل کی پہنچی اور معاملہ حضرت انسان سے پڑا تو البتہ اس لقب کا استعمال صحیح ہوا کیونکہ غرض انزال، تنزیل سے یہی ہے کہ عاقلان نوع بشر کے لیے مذکر اور داعی ہو۔ پھر جب ”إِنَّا لَهُ لَنَحَافِظُونَ“ فرمایا تو ضمیر اسی لفظ کی طرف راجع فرمائی۔ اس لیے لازم پڑا کہ حفاظت بھی اسی موقع میں ظہور میں آئے کہ جہاں اس لقب کا استعمال صحیح ہو۔

دوسرے سوال کا مسکت جواب

باقی رہا دوسرا احتمال، اس کا یہ حال ہے کہ اول تو حضرت امام مہدی کا عار سر من رائے میں مخفی ہونا ہی ایک افسانہ غلط ہے جب کلام اللہ کا باوجود اس قدر تواتر کے کچھ اعتبار نہ رہا ایسی روایات بے سرو پا کا جن کے، راوی فقط دو چار مکار ہوں کیا اعتبار اور در صورت یہ کہ وہ بات بھی قرین قیاس نہ ہو تب تو قابل قبول عقل کسی عاقل کے نزدیک بھی نہیں اور جن روایات سے حضرت امام مہدی کا یہ افسانہ مروی ہے وہ کچھ ایسی ہی ہیں بلکہ اس سے بھی کتر بایں ہمہ یہ بات تو ہرگز متصور ہی نہیں کہ حضرت امام مہدی کو کلام اللہ یاد ہو، یہ کام تو اہلسنت جماعت کا ہے۔ حضرت امام مہدی کو ان کا شبہ کا ہے کو گوارا ہوگا۔ ”مَنْ تَشَبَهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ“ ہاں ان کے پاس کلام اللہ ہوا اور حضرت امام اس کلام اللہ کو لیکر اسی اندیشے سے اس عار میں جا چھپے ہوں کہ مبادا ان کے پاس کلام اللہ معتقدان خلیفہ ثالث کی نظر نہ پڑ جائے تو البتہ ایک ٹھکانے کی بات ہے لیکن اہل فہم سے سوال ہے کہ یہ احتمال پہلے احتمال سے اس بات میں کیا کم ہے کہ ہمارے حساب سے ویسایں لوح محفوظ میں ویسایں عار سر من رائے میں، نقل مشہور ہے ویسایں کنواں ویسی ہی کھائی بلکہ بلحاظ وجہ پنجم اس کلام اللہ کی حفاظت کا وعدہ ہی نہیں جو بزم شیعہ حضرت امام کے پاس ہوا اہل فہم کے نزدیک اس کا ذکر کہنا ہی صحیح نہیں، ذکر کہنا تو جب صحیح ہو کہ امتی اسے پڑھیں پڑھائیں، عار سر من رائے میں کون جائے اور کون اس سے فائدہ اٹھائے بلکہ وعدہ ہے تو اسی کلام اللہ کی حفاظت کا ہے کیونکہ اس کا ذکر ہونا ظاہر ہے۔ پھر حضرت امام کا کلام اللہ اگر اسی کلام اللہ کے موافق ہے تو فیہا ورنہ اس صورت میں حضرت امام ہی کا کلام اللہ غلط ہوگا۔ بالجملة ایسے لغویات کو خدا وعد کریم کی طرف نسبت کر کے مفت دین اسلام کو بٹانگتے ہیں۔ سبحان اللہ! یہ عجب تماشہ ہے کہ جناب باری نے وعدہ حفاظت تو اس لیے کیا تھا کہ امت محمدی کو کل کو دوبارہ علم احکام کچھ وقت نہ پیش آئے دین محمدی میں کوئی رخ نہ پڑے، یہ دین قیامت تک برابر روشن رہے۔ مگر افسوس کہ تاہم وہی خرابی کی خرابی (برسر) رہی (نعوذ باللہ) عار سر من رائے میں محفوظ ہونے کے یہ معنی ہوئے کہ خدا وعد کریم حفاظت کے وقت اتنا بھی نہ سمجھے کوئی اجنبی آدمی سنے گا تو کیا کہے گا۔

شیعوں کا لغو خیال یہود اور نصاریٰ کے مقابلے کیلئے ایک راہ کھولتا ہے
 ہماری صلاح یہ ہے کہ اس بات کو شیعہ کسی یہودی نصرانی کے سامنے تو زبان پر بھی نہ لائیں،
 ہمارے سامنے کہیں تو شاید ہم پاس اتحاد کلمہ گوئی یوں سمجھ کر کہ شیعوں کی خفت فی الجملہ اپنی ہی خفت
 ہے، سکوت بھی کر جائیں کیونکہ اول تو یہودیوں کو اس قسم کی خرافات کو سن کر اس بات کے کہنے کی
 گنجائش ملے گی کہ ہماری توریت بھی آخر لوح محفوظ میں محفوظ ہے۔ سوائے اس کے سورۃ احقاف
 سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جنات کے پاس توریت بجسبہ موجود تھی اور اس میں بنی آدم کی طرح
 انہوں نے کچھ تغیر و تبدل نہ کی تھی ورنہ وہ یوں نہ کہتے:

”إِنَّا سَمِعْنَا كَذِبًا أَنزَلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَى مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ“

”یعنی بیشک ہم نے سنی ہے ایک کتاب جو نازل کی گئی ہے موسیٰ کے بعد تصدیق کرنے والی
 ہے اس کتاب کی جو اس سے پہلے ہے۔ یعنی توریت کی تصدیق کرتی ہے۔“

سو اس بات کا یقین کہ کلام اللہ توریت کی تصدیق کرتا ہے۔ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ان کو توریت
 کے بجسبہ ہونے کا یقین ہو یا کلام اللہ توریت محرف کا مصدق ہو، سو دوسرا احتمال تو شیعوں کے نزدیک
 بھی غلط ہے کیونکہ جنات نے جو کلام اللہ سنا تھا تو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا۔ حضرت عثمان
 رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یا ایسے ہی کسی اور سے نہ سنا تھا اور اگر یہودیوں کی پر خاش کا کچھ اندیشہ نہ ہو اور
 یہ سمجھ کر کہ کچھ توریت بجسبہ باقی ہو اور فقط اس میں تحریف نہ ہونے کا ان کو ایسا یقین ہو جیسے امامیہ کو الحمد
 اور قل حوالہ اللہ کے بجسبہ ہونے کا یقین ہے۔ فخر یہ یوں کہنے لگیں کہ ہمارا قرآن تو غار سرمن رائے میں
 محفوظ ہے، تمہاری توریت بتلاؤ کہاں محفوظ ہے یا اتفاقات سے وہ آیات سنی ہوں جو توریت کی ان
 عبارات کے جواب تک صحیح و سالم ہیں۔ موافق اور مطابق ہیں اور فقط اسی توافق اور تطابق کے باعث
 انہوں نے کلام اللہ کو مصدق توریت سمجھا ہو تو اس صورت میں ہو سکے ہے کہ توریت محرف بھی ہو اور
 کلام اللہ غار سرمن رائے میں محفوظ ہو اور اس وجہ سے کلام اللہ کو توریت پر فوقیت ہو اور یہود سے نہ
 شرمائیں لیکن قطع نظر اس کے کہ یہ فوقیت کس درجہ کتنا کارہ فوقیت ہے مشکل ہی رہے گی۔

اگر یہود سے پالا جیت بھی گئے تو نصاریٰ ان کی نہیں چلنے دیں گے

یہودیوں سے پالا جیت بھی گئے تو انگریزوں سے کس منہ سے بات کریں گے کیونکہ حضرت
 مسیح علیہ السلام حافظ انجیل ہاتھ شیعہ و سنی آسمان چہارم پر زندہ موجود ہیں۔ غار سرمن رائے میں

تو حضرت امام کو اس بات کا بھی شاید اندیشہ ہو کہ مبادا کوئی معتقد خلیفہ ثالث رضی اللہ تعالیٰ عنہ پھر تاتا یہاں نہ آکھلے اور ان کے کلام اللہ کو چھین کر جلادے یا معاذ اللہ دشمنان امام کو شہید کر دے اور جو مصلحت کہ اخفا اور خفا سے تھی، ہاتھ سے نکل جائے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو بے کھلے ہیں چوتھے آسمان تک کس کے مقدور جو جا کے پھلے، ہاں البتہ ایک بات ہو سکتی ہے کہ ان سے یوں کہا جائے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اول تو حافظ انجیل ہونا غیر مسلم ہو کر بھی بعینہ احتمال بہ نسبت حضرت امام موجود ہے بلکہ بدرجہ اولیٰ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر خود انجیل نازل ہوئی، ان کو یاد نہ ہونا نہایت مستبعد بخلاف حضرت امام کے کہ قرآن ان پر نازل نہیں ہوا۔ مع ہذا کلام اللہ کے یاد ہونے میں اہلسنت کی مشابہت لازم انجیل کے یاد ہونے میں کوئی خرابی نہیں۔ دوسرے ہم نے مانا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل بھی ہوں گے اور ان کو انجیل یاد بھی ہو لیکن چونکہ انجیل منسوخ ہو چکی ہے تو بعد نزول عیسیٰ علیہ السلام وہ یاد ہونا کچھ مفید نہ ہوگا بخلاف حضرت امام کے کہ ان کا کلام اللہ کا یاد رکھنا بعد ان کے خروج کے کام دے گا اور ہیجان علی کو جو مدت دراز سے بتا چاری میاض حثانی پر عمل کرتے ہیں کلام اللہ اصلی ہاتھ آئے گا اور دیرینہ تمنا پوری ہوگی۔

عیسائیوں سے نبرد آزما کی کیلئے اس عقیدہ سے دست برداری لازم

ہے کہ حلت و حرمت کی تبدیلی آئمہ کے دست قدرت میں ہے

مگر یہ تدبیر جب مفید ہے کہ شیعہ ہمارا کہنا سر رہیں اور اس اعتقاد سے کہ اماموں کو تبدیل احکام علیحدہ حرمت وغیرہ کا اختیار ہے اول اس سے دست بردار ہوں اور نوادہ کی اس روایت پر قلم بھیر دیں۔

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سَنَانٍ عَنْ أَبِي جَعْفَرٍ قَالَ كُنْتُ بَعْدَهُ فَأُجْرِبْتُ إِنْخِلَافَ الشَّيْخَةِ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى لَمْ يَزَلْ مُنْغَرِّدًا بِالْوَحْدَانِيَةِ ثُمَّ خَلَقَ مُحَمَّدًا وَعَلِيًّا وَفَاعْلَمَهُ وَالْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ لَمْ يَكُنُوا الْف ذَهَبَ فَخَلَقَ الْأَشْيَاءَ وَ أَشْهَدَ هُمْ خَلْقَهَا وَأَجْرَى طَاعَتَهُمْ عَلَيْهَا وَلَوْضَ أَمْرَهُمْ إِلَيْهِمْ يَحْلُونَ مَا يَشَاوُونَ وَيُخَرِّمُونَ مَا يَشَاوُونَ.

”حاصل اس روایت کا یہ ہے محمد بن سنان بیان کرتا ہے کہ میں حضرت امام ابو جعفر یعنی امام محمد

باقر کے پاس تھا، اتفاق سے میں نے شیعوں کے باہم مختلف ہونے کا ذکر پھیرا۔ یعنی یہ پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ عیسان علی دین میں باہم مختلف ہو گئے۔ انہوں نے فرمایا کہ محمد بن سنان سن اللہ تعالیٰ پہلے تو ہمیشہ سے اکیلا تھا کوئی دوسرا تھا ہی نہیں، پھر پچیس کو پیدا کیا، پھر بعد ہزار دہر کے اور اشیاء

کو پیدا کیا اور پنجتن کے سامنے سب کو موجود کیا اور پنجتن کی اطاعت ان کے ذمہ پر رکھی اور ان کے کاروبار سب پنجتن کے حوالے فرمائے۔ سو وہ جو چاہیں حلال کر دیں اور جو چاہیں حرام کر دیں۔" فقط الغرض اس روایت کے سیاق سے اختلاف شیعہ کی وجہ یہ نکلی کہ پنجتن میں کسی نے ایک بات حلال رکھی تو دوسرے نے اسے حرام کر دی، سو کوئی ان کا مقلد ہو گیا کوئی ان کا۔ دوسری روایت کلینی کی بھی اسی روایت سے ہم زبان ہے اس سے بھی دست برداری لازم ہے۔

..... "عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَسَنِ الْمِثْمِيِّ عَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ قَالَ سَمِعْتُهُ يَقُولُ إِنَّ اللَّهَ أَذَبَ رَسُولَهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى قَوْمَهُ عَلَى مَا أَرَادَ ثُمَّ فَوَضَّ إِلَيْهِ دِينَهُ فَقَالَ مَا أَمَّاكُمْ الرَّسُولُ لِيُخْلِدُوهُ وَمَا نَهَيْتُمْ عَنْهُ فَأَنْتَهُوْا فَمَا فَوَضَّ اللَّهُ تَعَالَى إِلَيَّ رَسُولُهُ فَقَدْ فَوَضَّ إِلَيْنَا."

"اس کا حاصل یہ ہے کہ محمد بن حسن مٹھی امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ میں نے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ خدا تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ادب سکھایا اور سیدھا جیسا اپنا جی چاہے تھا بتایا پھر اپنا دین اس کے سپرد کیا اور کلام اللہ میں سورہ حشر میں سب کو حکم دیا کہ جو کچھ رسول دے یعنی جو کچھ فرمائے اسے قبول کرو اور جس سے منع کرے اس سے ہٹ رہو، سو جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا تھا وہی ہمارے بھی سپرد کیا۔"

پہلی روایت سے فقط پنجتن ہی کا اختیار اور باب تبدیل احکام معلوم ہوتا تھا اور اس روایت سے ثابت ہوا کہ وہ اختیار اماموں کو بھی حاصل ہے اس لیے کہ جو تفویض اول روایت میں تھی وہی اس روایت میں بھی ہے، سو وہی معنی بلا شک مراد ہوں گے۔

بے اصل روایات کی بے بنیاد توجیہ

مگر شاید کوئی شیعہ مذہب اس کی یہ توجیہ کرے کہ اس تفویض اور تحریم اور تحلیل کے یہ معنی ہیں کہ وہ اجتہاد کر کے لوگوں کو احکام بتلا دیں، آخر اہل سنت بھی تو انبیاء اور علماء کے اجتہاد کے جید ہونے کے قائل ہیں۔ شیعہ اگر چارہ معصوم کے اجتہاد کے معبر ہونے کے قائل ہو گئے تو کیا گناہ ہوا، یا یہ توجیہ گھڑیں کہ خداوند کریم نے ان کو سب کی استعدادیں اور قابلیتیں دکھلا کر، چنانچہ ظاہر عبارت روایت اول یہی ہے۔ پنجتن کو حکم دیا ہو کہ ان کی استعدادوں کے موافق جو کچھ سمجھ میں آئے احکام مقرر کر دو۔ سو اگر یہ ہو تو کیا خرابی ہے لیکن اہل عقل پر پوشیدہ نہ ہوگا کہ اجتہاد کی تادیل کرنی تعینہ ایسی ہے جیسے کہا کرتے ہیں۔ من چہ میگویم و ظہور من چہ میگوید۔ چنانچہ استعداد والے

خود سمجھتے ہیں کہ اس توجیہ کو عبارت روایت اول سے کچھ علاقہ نہیں۔ نیز مخالف مذہب شیعہ ہے کہ وہ آئمہ کی نسبت اجتہاد کی تہمت لگانی موجب مقصد سمجھتے ہیں ان کی فرمائی ہوئی باتیں سب مجملہ وحی آسانی سمجھتے ہیں۔ باقی رہا استعدادوں کو دکھلا کر کارخانہ دین کا سپرد کر دینا۔ اگر ہم تسلیم بھی کر لیں تو شیعہ تو تسلیم نہ کریں گے اثنا عشریہ چھوڑ تمام امامیہ اس بات پر متعلق ہیں کہ امام کو تمام احکام کی تہدیلی کا اختیار ہے۔ اگر استعداد پر ہی مدار کار ہے تو تبدیل کے اختیار کے کیا معنی۔ جیسی استعداد ہو ویسا ہی حکم ہونا چاہیے، بدلہ کیوں چاہیے بہر حال کوئی توجیہ بن نہیں پڑتی۔

تفویض کے خیال کی قرآن بیخ کنی کرتا ہے

اگر جواب مذکور سے سرخرو ہونا مد نظر ہے تو اس روایت کو زیر قلم کریں اور ہرگز کچھ اندیشہ نہ کریں کیونکہ جناب باری کا بھی یہ حکم اسی طرف ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کلام اللہ کی شان میں کلام اللہ ہی میں یوں فرماتے ہیں: "بَيِّنَاتٍ لِّكُلِّ شَيْءٍ" مطلب یہ ہے کہ کلام اللہ میں ہر چیز کا بیان ہے ہم نہیں سمجھتے تو کیا ہوا سمجھنے والے سمجھتے ہوں گے۔ خاص کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، پھر جب کلام اللہ ہی میں سب کچھ آ گیا تو تفویض کہاں رہی بلکہ اس صورت میں تو لازم ہے کہ جو کچھ حضرت نے یا آئمہ نے فرمایا ہو وہ شرح قرآن مجید ہو، اپنے اختیار سے کچھ نہ فرمایا ہو۔

تفویض کا خیال قرآن کو کتب منسوخہ کی حیثیت دیتا ہے

القصد ہماری صلاح یہ ہے کہ ان دونوں روایات پر قلم پھیر کر پھر جواب مذکورہ بالا سے انگریزوں وغیرہ اعداء دین کے مقابل میں اُمید سرخرو ہونے کی رکھیں، نہیں تو ان کے منہ میں بھی زبان ہے، سنیوں کو تو بوجہ اتحاد ملت کے کچھ لحاظ بھی ہوگا۔ انہیں کیا لحاظ ہے ایسا نہ ہو کہ وہ یوں کہنے لگیں کہ ہماری انجیل اگر کلام اللہ سے منسوخ ہو گئی ہے تو سارے احکام تو منسوخ نہیں ہوئے۔ آخر اخلاق کی باتیں اور بہت سے احکام حلت اور حرمت کے بدستور باقی ہیں اور عقائد میں تو مسلمانوں کے مقولہ کے موافق کچھ فرق پڑا ہی نہیں۔ حضرت آدم کے وقت سے لے کر اب تک وہی عقائد چلے آتے ہیں۔ چنانچہ کلام اللہ میں سورہ مائدہ میں خود موجود ہے:

"وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ"

"یعنی نازل کی ہم نے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تیری طرف سچی کتاب کہ وہ پہلی

کتابوں کی بھی تصدیق کرتی ہے۔"

سو تمہارے کلام اللہ کا بھی یہی حال ہے کہ اماموں نے مناسب وقت دیکھ کر بہت سے احکام تبدیل و تغیر کر دیئے۔ چنانچہ پہلی روایت سے یہ خوب طرح واضح ہوا ہے کیونکہ اختلاف شیعہ کی وجہ حضرت امام باقر نے یہی بیان کی ہے۔ پھر حضرت امام مہدی کے پاس اگر وہ کلام اللہ محفوظ بھی ہو تو کیا حاصل وہ دین تو بدل ہی گیا کوئی اور ہی کلام اللہ بنانا چاہیے، نہیں تو یہ ایسا ہی قصہ ہے جیسا حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمہارے عقیدے کے موافق آخری زمانہ میں نازل ہوں گے اور باوجودیکہ انجیل کے حافظ ہیں، پھر بسبب اپنے دین کے منسوخ ہو جانے کا انجیل پر عمل نہ کریں گے بلکہ کلام اللہ پر عمل کریں گے۔

تفویض کی شکل میں ظہور حضرت امام مہدی کے وقت قرآن کی وہی

حیثیت ہوگی جو انجیل کی بوقت نزول حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوگی

باقی رہا یہ احتمال کہ شاید حضرت امام مہدی انہیں احکام پر عمل کریں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کیے ہوئے ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ محمد بن بابویہ قتی حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت کرتے ہیں:

وَعَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ أَنَّهُ قَالَ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى اخْتَارَ بَيْنَ الْأَرْوَاحِ فِي الْأَوَّلِ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ الْجَسَامَ بِالْفِي عَامٍ فَإِذَا قَامَ قَاتِمُ أَهْلِ الْبَيْتِ وَرِثَ الْأَخَ مِنَ الْبَيْنِ أَخَا يَنْتَهَمَا فِي الْأَوَّلِ وَلَمْ يُورِثَ الْأَخَ مِنَ الْوَلَادَةِ.

”یعنی حضرت امام ابو عبد اللہ نے جو حضرت امام جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا لقب ہے یوں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ازل میں روحوں کے پیدا کرنے سے دو ہزار برس پہلے روحوں میں آپس میں بھائی بندی کرا دی ہے۔ سو جب امام مہدی نکلیں گے ازل کی بھائی بندی کے حساب پر وراثت جاری فرمائیں گے اور جنس کی روح سے بھائی ہوگا اسے وراثت نہیں دلائیں گے۔“

اب دیکھئے کہ اس روایت سے صاف یوں ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت امام مہدی کلام اللہ کے احکام کے موافق بالکل عمل نہ کریں گے اور یہ حکم جو بھائی کے وارث ہونے کا ہے اسے موقوف کر دیں گے اور اس روایت سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ بھائیوں کی وراثت کا حکم جو سورہ نسا میں ”یوصیکم اللہ“ کے رکوع میں ہے وہ کوئی خلیفہ ثالث کی نحوذ باللہ کچھ کر توت نہیں بلکہ عین حکم الہی بعد ناس کے موقوف ہونے کی حضرت امام مہدی کے وقت پر کیا تخصیص تھی۔ الغرض جب تک اثنا عشریہ اس مذہب سے کہ امام کو سب احکام کے منسوخ کر دینے کا اختیار ہے دست بردار

نہ ہوں گے۔ تب تک انگریزوں کے سامنے اپنے کلام اللہ کے محفوظ ہونے کے مقدمہ میں جو آیت
 "إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَخَالِطُونَ" سے مستفاد ہوتا ہے منہ نہ کر سکیں گے۔

تفویض سے انکار میں نصاریٰ و یہود سے

گلو خلاصی ملنے کے علاوہ ختم نبوت پر ایمان پختہ ہوتا ہے

اور ہماری اس صلاح کے ماننے میں فقط ان کا بھی فائدہ نہیں کہ نصاریٰ اور یہود سے جیت
 جائیں، نہیں بلکہ لفظ خاتم النبیین جو سورۃ احزاب میں ہے اس پر بھی ایمان درست ہو جائے گا، نہیں
 تو یہودیوں کی طرح یہ عتاب ان پر بھی رہے گا۔ "اَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ
 بِبَعْضٍ" یعنی کیا تم تھوڑی سی کتاب پر تو ایمان لاتے ہو اور تھوڑی پر نہیں لاتے۔ وجہ اس کی یہ ہے
 کہ یہ بات تو انبیاء میں سے بھی کسی کسی کو میسر آتی ہے کہ نئی شریعت لائے اور پہلے احکام بدل
 جائیں بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے نبی
 ہوئے سب توریت ہی پر عمل کرتے رہے اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ
 السلام کو بھی یہ بات میسر نہیں آئی کہ خدا نے دین کا مقدمہ انہیں سپرد کر دیا ہو بلکہ جو کچھ انہوں نے
 احکام مقرر کیے سب حسب فرمان خداوندی مقرر کیے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام تو
 درکنار کلام اللہ سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ خود سید المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی
 یہ اختیار نہ تھا کیونکہ سورۃ انعام میں یہ آیت موجود ہے "قُلْ لَا أَجِدُ فِیْمَا أُوحِیَ إِلَیَّ مُخْتَلَفًا
 الْآیۃ" جس کا حاصل یہ ہے کہ کہہ دے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ نہیں پاتا ہوں کچھ اس چیز کے جو
 میری طرف وحی کی گئی ہے کوئی چیز حرام کسی کھانے والے پر مگر فلائی اور فلائی، اس آیت کے مضمون
 سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حرام کرنے اور حلال کرنے کا اختیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہ
 تھا، حلت حرمت کا مدار وحی پر تھا، دوسرے کئی جگہ آیا ہے "إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ" حاصل اس کا یہ
 ہے کہ سوائے خدا کے اور کوئی حاکم نہیں اور اگر بالفرض خدا نے امت کے احکام ان کے سپرد بھی
 کر دیئے ہوں۔ تب بھی ہمارے امام کچھ ان سے اس بات میں کم نہ رہے اور بھی احکام کی تبلیغ کے
 لیے رسول اور نبی ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے:

"يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ".....

"یعنی اے رسول پہنچادے جو کچھ تیری طرف نازل کیا گیا ہے۔"

الغرض اس طریق سے یہود اور نصاریٰ کی پرغاش سے بھی نجات ہو جائے گی.... اور اپنا ایمان بھی درست ہو جائے گا۔

حق کے زور سے ابن بابویہ آخرسنیوں کا ہمزبان ہو گیا

اور شاید کچھ بھی سوچ سمجھ کر شیخ صدوق اثنی ابن بابویہ نے کتاب الاعتقادات میں اس عقیدہ سے ہاتھ اٹھایا اور ہمارے نزدیک اس حساب سے وہ صدوق اسم ہاسکی ہو گئے مگر سنیوں سے دامن چھڑانے کے لیے سب اہل تشیع کی طرف سے نیلۂ یوں کہہ اٹھے "مَنْ نَسَبَ إِلَيْنَا أَنَّا نَقُولُ إِنَّهُ أَكْثَرُ مِنْ ذَلِكَ فَهُوَ كَاذِبٌ" یعنی جو یوں کہے کہ شیعہ یوں کہتے ہیں کہ کلام اللہ اس سے زیادہ تھا جواب لوگوں کے پاس ہے اور جس کی ایک سوچوہ سورتیں ہیں وہ جھوٹا ہے۔ انہوں نے چاہا تھا کہ سنیوں کو جھوٹا بنائیں پر خدا بچوں کو سچا ہی کرتا ہے۔ خدا ساز علامہ کلینی نے اس دروغ کا بار اپنے سر اٹھایا یوں کہتے علامہ صدوق کو جھوٹا بنایا۔ چنانچہ ان کی روایت کلام اللہ کے سترہ ہزار آیت ہونے کے باب میں اوپر مرقوم ہو چکی، کسی نے سچ کہا ہے حق بر زبان جاری شود۔ خبر کہاں تک حضرات شیعہ کی نا انصافی اس باب میں بیان کیجئے۔ مصنفوں کے لیے اس قدر بھی بہت ہے ہمیں کوئی عاقل منصف ایسا نظر نہیں آتا جو "إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَنَحَافِظُونَ" سے بجز اس کے کچھ اور مستحق سمجھے کہ اس میں ہرگز کوئی کمی بیشی نہیں کر سکتا۔ خلیفہ ثالث ہو یا خلیفہ اول اور دوم۔

آیت مذکورہ سے سنیوں کی فضیلت کا انکشاف

بلکہ انصاف سے دیکھئے تو شہادت صرف اس آیت میں سنیوں کی بڑی فضیلت نکلتی ہے۔ شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ جو کام کسی کے اہتمام اور انتظام اور حکم سے ہوا کرتا ہے۔ اگرچہ حقیقت میں اسے اور ہی کوئی کرے پر عرف میں وہ مہتمم ہی کی طرف اور تختہ اور حاکم ہی کی جانب منسوب ہوا کرتا ہے۔ مثلاً کوئی بادشاہ کسی رسالہ یا پلٹن کو خزانہ کی حفاظت کے لیے مقرر کرے۔ سو رسالدار یا صوبہ دار ان پانچ سپاہیوں کو پہرہ پر مقرر کر دیتے ہیں اور پھر نوبت بنوبت اور نمبر وار اس پہرہ کو بدلتے رہتے ہیں اور آپ امام کرتے ہیں اور سپاہی پہرہ دار چودوں تفریقوں کو دفع کرتے رہتے ہیں۔

اب دیکھئے کہ حقیقت میں محافظت سپاہی پہرہ دار کرتے ہیں پر چونکہ رسالداروں اور صوبہ داروں کے حکم سے کرتے ہیں تو بڑی سرکاروں میں رسالداروں اور صوبہ داروں ہی کا نام ہوتا ہے اور سپاہیوں کا کیا ہوا، رسالداروں اور صوبہ داروں ہی کا کیا سمجھا جاتا ہے۔ اس واسطے اگر کہیں

ایسے موقع پر کوئی معرکہ کا کام بن پڑتا ہے تو گوسپاہیوں کو بھی قدر قلیل انعام ملنے پر رسالداروں اور صوبہ داروں کو بیش قرار انعام ملتا اور عہدوں کی ترقی ہوتی ہے۔ اسی طرح سنی بھی موافق حکم الہی کے اس خزانہ بیش بہا کی محافظت کرتے ہیں اور چونکہ اوراق میں فقط خوب حفاظت نہ ہو سکتی تھی تو اس لیے اس کو اپنے سینوں میں گویا جان کے ساتھ رکھتے ہیں تاکہ بدینوں اور شیاطین کو اس کے چرانے کی دسترس نہ ہو سوا لے چور کو تو ال کو ڈانٹیں۔ شیعہ سینوں ہی کو چور بتانے لگے سو یہ دعویٰ محل ہے نکل برہاد گناہ لازم۔ اگر شیعوں سے سنی کچھ انعام و اکرام اس خدمت کا مانگتے جب ہی یہ تہمت لگائی ہوتی خدا کے دینے میں اتنا بخل کیوں ہے تل جلع سرکار کا کلیجہ پیچھے مشعلی کا۔ ہم جو دنیا میں دیکھتے ہیں تو کلام اللہ کی محافظت سنی ہی کرتے ہیں، ایک ایک بستی میں بعضی بعضی جاپان (۵۰۰) پانچ سو حافظ موجود ہیں مگر چونکہ یہ ان کی حفاظت موافق ارشاد خداوندی کے ہے تو یہ ان کا کیا خدا ہی کا کیا سمجھنا چاہیے اور سینوں کو ملازم خاص اور محکوم بااختصاص سمجھئے اس لیے خداوند کریم نے اس محافظ کو اپنی طرف نسبت کیا اور یہ فرمایا "وَإِنَّا لَهُ لَنَاصِفُونَ" یعنی ہم ہی اس کے محافظ ہیں لیکن شیعوں کو محکومانہ فرمان کی مانند جائے بلکہ بمنزلہ باغیوں کے یا چوروں کے قرار دیجئے کیونکہ یہ فرقہ محافظان کلام ربانی کے جو ایک خزانہ بے بہا ہے دشمن ہیں اور خزانوں کے محافظوں کے تراق اور ہانی اور چور ہی دشمن ہوتے ہیں۔ فرضیکہ یہ آیت "إِنَّا نَحْنُ قُلُوبُكَ وَنَا لَهُ لَنَاصِفُونَ" بھی ہا واز بلند یہی کہتی ہے کہ مذہب اہل سنت حق ہے اور مذہب شیعہ باطل ہے نہ سننے کے لیے کان شرط ہیں جن کانوں پر "نَحْنُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ" کی مہر لگی ہوئی ہو یعنی یہ مضمون ان پر صادق آتا ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگائی ہے وہ کیا سنیں اور کس کی سنیں مگر ہمیں اپنی طرف سے سمجھانے میں قصور نہ کرنا چاہیے جیسے شیخ صدوق ایک بات مانتے ہیں ایسے ہی شاید مولوی عمار علی صاحب یا کوئی اور عالم یا جاہل اس بات کو بھی مان جائے مگر چونکہ حسب کو حق بات کا ماننا ہر چند کتنی ہی صاف و روشن کیوں نہ ہو بہت دشوار ہوتا ہے تو اس تقریر کو سن کر شاید کوئی شیعہ مذہب یوں کہنے لگے ہم نے مانا کہ کلام اللہ سارا کا سارا صحیح اور سینوں کی روش کی خوبی بھی اس سے ہو یا پر یہ تو کہیں نہیں کہ ابو بکر کو بھی ماننا ہی چاہیے۔ اس لیے یہ آیت سوم مع اپنے ماحصل کے لکھی جاتی ہے۔ تیسری آیت:

"إِنَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذَا أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا"

”یعنی تم لوگ اگر ہمارے پیغمبر کی مدد نہ کرو گے تو کیا ہوگا، اللہ اس کی مدد کرنے والا ہے پلے بھی اس کی اس نے مدد کی ہے جب کہ کافروں نے اسے نکال دیا تھا جبکہ ایک وہ تھا اور ایک ہر کے ساتھ اور تھا جب وہ دونوں غار میں تھے کب جس وقت وہ اپنے ساتھ دینے والے سے ہوں کہ تھا کہ تو ٹھیکین مت ہو، ہمارے ساتھ تو اللہ ہے۔“

اس آیت میں بنظر انصاف غور کیجئے اور منہ زوری کو چھوڑیے، دیکھئے یہ آیت کدھر کو لے جاتی ہے، سنیوں کی طرف کھینچتی ہے یا شیعوں کے گھر کا راستہ بتلاتی ہے ہمیں اس جگہ مرزا کا علم علی صاحب لکھنوی کا مقولہ جو بڑے حبرک علماء شیعہ میں سے تھے اور قدوة الزماں مولوی دلدار علی صاحب مجتہد بھی ان کے معتقد تھے، یاد آتا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اور کسی کو تو جس کسی کا جو کچھ جی چاہے کہے پر خلیفہ اول کا برا کہنے والا تو ہمارے نزدیک بھی کافر ہے۔ اہل محفل میں سے کسی نے عرض کی کہ قبلہ آپ کیا فرماتے ہیں، مذہب تو اس کے خلاف ہے انہوں نے جواب دیا کہ میں کیا کہتا ہوں خدا کہتا ہے صحابی اور صاحب کے معنی میں کچھ فرق نہیں۔ سو خدا بھی خلیفہ اول کے صحابی ہونے کا کلام ہے کیونکہ صاحب کے لفظ سے جو اس آیت میں موجود ہے شیعوں سنیوں کے اتفاق سے ابو بکر صدیق ہی مراد ہیں۔ سبحان اللہ اہل انصاف ایسے ہوتے ہیں جیسے مرزا کا علم علی صاحب تھے اور وہ کچھ ایسے دیسے نہ تھے علم وزہد میں شیعوں کے نزدیک وہ بھی شہرہ آفاق تھے، کونسا عالم شیعہ مذہب ہے جو ان کو نہیں جانتا اور ان کو نہیں مانتا اور ان کا بھی اس بات میں کچھ قصور نہیں، اس آیت کو جس پہلو سے پلٹ کر دیکھئے کہیں گنجائش گفت و شنود کی نہیں ہر طرف سے سنیوں ہی کا مطلب نکلا ہے۔

آیت سوئم کی بصیرت افروز تشریح

شرح اس معما کی یہ ہے کہ اول تو لفظ صاحب جو صاحب میں ہے وہ عربی زبان میں صحابی کے ہم معنی ہے دوسرے لفظ لائحون جس کا یہ مطلب ہے کہ ٹھیکین مت ہو۔ وہ اسی پر دلالت کرتا ہے کہ ابو بکر صدیق عاشق صادق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمن باخلاص تھے ورنہ ان کو ٹھیکین ہونے کی کیا ضرورت تھی بلکہ محل خوشی تھا کہ ان کے دشمن موافق عقیدہ شیعہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت خوب قابو میں آئے ہوئے تھے، کفار جو اس وقت پاس آگئے تھے پکار کے بھی نہیں تو کسی قسم کی کڑکے ہی سے انہیں مطلع کر دیتے تاکہ (نعوذ باللہ منہا) وہ اپنا کام کرتے، اگر کہیں انصاف کی آنکھیں مول لیں تو ہم حضرات شیعہ کے لیے مول لیں اور ان کو دیں تاکہ وہ کچھ تو پاس رفاقت خلیفہ اول کریں۔ جو پاس مہر و محبت یہاں کہیں ملا تو مول لیتے ہم ایک اپنے مہرباں کیلئے

اور جو یہ بھی نہ ہو تو یہی سمجھیں کہ ان کو اس وقت اپنی جان کا خوف نہ ہوا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنہائی کا افسوس رہا اور غم ہوا تو اس بات کا کہ دیکھئے یہ دشمن حق یعنی کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا کر بیٹھیں اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تسلی فرمائی اور فرمایا کہ غم کی کیا بات ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے تو غم کیسے مت ہو۔

حزن کے معنی سمجھنے میں بعض غیر منصفوں کی فاش غلطی

اس جگہ بعض ناانصاف یوں کہتے ہیں کہ ابو بکر صدیق کو اس وقت اپنی جان کا ہر اس تھا کچھ پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تھا غور کرنے کی جگہ ہے اس بات کا یہ مطلب ہوا کہ خداوند کریم کو (نعوذ باللہ) عربی بولنی بھی نہیں آتی۔ فصاحت و بلاغت تو درکنار اور یہ جو کلام اللہ کے اعجاز بلاغت کا شہرہ ہے یہ فقط یاروں کی گھڑی ہوئی بات ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جو کچھ بھی عربی جانتے ہیں وہ بھی اتنی بات تو جانتے ہیں کہ عربی زبان میں حزن کا لفظ غم کی جگہ اور فراق محبوب یا تمنا کے فوت ہو جانے کے محل میں استعمال کرتے ہیں اور جہاں جان پر جنتی ہے اور ڈر کا مقام ہوتا ہے خوف کا لفظ استعمال کرتے ہیں کلام اللہ سے زیادہ تو کوئی کتاب عربی زبان کی فصیح اور بلاغت آئینہ نہیں دیکھئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر گئے اور خداوند کریم نے پوچھا کہ موسیٰ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ انہوں نے عرض کی کہ یہ میری لاشی ہے چلتے پھرتے اس پر سہارا رکھوں ہوں اور بکریوں کے لیے اس سے پتے جھاڑوں ہوں اور اس میں میرے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ ادھر سے حکم ہوا کہ اسے ڈالیو انہوں نے جو ڈالا تو وہ ایک اڑدھاتی، یہ اُلے پاؤں ایسے بھاگے مڑ کے بھی نہ دیکھا۔ اس وقت خداوند کریم نے فرمایا:

”أَقْبَلْ وَلَا تَخَفْ إِنِّي لَا يَخَافُ لَدَيْ الْمُرْسَلُونَ“.....

یعنی تو ادھر آ اور ڈر مت میرے پاس رسول ڈر نہیں کرتے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس اڑدھاتے اپنی جان کا اندیشہ ہوا۔ تب بھاگے اسی لیے خدا نے تسلی فرمائی کہ ڈر مت یوں نہ فرمایا ”لَا تَخْزَنُ“ یعنی رنجیدہ نہ ہو اور اسی طرح جب انہوں نے ایک قبیلے کو مار ڈالا اور فرعون کے لوگوں نے ان کے مار ڈالنے کا ارادہ کیا تو یہ وہاں سے ڈر کے بھاگے، اس موقع میں فرماتا ہے ”فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا“ یعنی نکلے۔ موسیٰ علیہ السلام وہاں سے ڈرتے ہوئے اور سوا اس کے اور بیسیوں جگہ خوف کا لفظ کلام اللہ میں موجود ہے جہاں کہیں ہے، یہی معنی ہیں اور جہاں غم کا مقام دیکھا وہاں یہی حزن کا لفظ استعمال کیا ہے

سورہ یوسف میں جس موقع میں حضرت یعقوب غم فراق یوسف میں ہائے یوسف ہائے یوسف کہا کرتے تھے اور انہیں یاد کیا کرتے تھے اور حضرت یعقوب کے اور بیٹوں نے یوں کہا کہ تم یوسف کو بادی کرتے کرتے مر جاؤ گے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف سے یہ جواب منقول ہے ”إِنَّمَا أَفْكُونَنِي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ“ یعنی میں اپنے رب سے اپنی پریشانی اور اپنا غم کہوں ہوں بلکہ بہت سی آیات سے یوں ثابت ہوتا ہے کہ حزن کے اور معنی ہیں اور خوف کے اور معنی ہیں ایک دوسرے کی جگہ نہیں بولا جاسکتا۔ ”تَنْزِيلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَكُوتُ أَنْ لَا تَخْلَوْا وَلَا تَحْزَنُوا“ یعنی جب کے مسلمان مرنے لگتے ہیں تو فرشتے رحمت کے ان پر اترتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ نہ تم ڈرو اور نہ تم غمگین ہو اگر خوف اور حزن کے دونوں کے ایک معنی ہوتے تو مکرر کہنے کی کیا ضرورت تھی، صحیح یہی ہے کہ غم اور چیز ہے اور خوف اور چیز ہے خوف اسے کہتے ہیں کہ کچھ آگے کو اندیشہ ہو اور غم یہ ہے کہ بالفضل دل کی تمنا ہاتھ سے نکل جائے۔ غم خوشی کے مقابلہ میں بولتے ہیں خوف اطمینان کے مقابلے میں خوشی اور اطمینان اور غم اور خوف کے معنی بیان کرنے میں مجھے یہ شرم آتی ہے کہ کوئی کیا کہے گا یہ کون سی مشکل تخی باتیں ہیں جنہیں کوئی نہ سمجھتا ہو پر کیا کیجئے ایسے نا انصافوں سے پالا پڑا ہے کہ شاید اب بھی ان کی سمجھ میں نہ آئے۔ لہذا اتنا اور کہنا پڑا کہ جب کسی کا کوئی مر جاتا ہے تو اس پر جو حالت پیش آتی ہے اسے غم تو کہتے ہیں پر خوف اور ڈر کوئی نادان بھی نہیں کہتا، ہاں مرنے سے پہلے جس موقع میں موت کا اندیشہ ہوتا ہے اس اندیشہ کو البتہ خوف کہتے ہیں پر رنج کوئی نہیں کہتا اگر کسی کا لڑکا کسی دیوار پر چڑھ جائے اور وہاں سے اندیشہ گر کر مر جانے کا ہو تو اس اندیشہ کو البتہ خوف کہتے ہیں لیکن کوئی نادان بھی اسے غم نہیں کہتا۔ القصہ غم عین مصیبت کے وقت جو حالت ہوتی ہے اسے کہتے ہیں اور خوف مصیبت کی آمد کی کیفیت کا نام ہے۔ ایک کو دوسرے سے کچھ لگاؤ نہیں جو حضرات شیعہ ہٹ دھرمی کر کے ”لا تَحْزَنُ“ کے معنی ”لا تَخَفُ“ گزالیں۔

شیعوں کی کج فہمی کی ایک پُر مذاق توجیہ

مگر ایک طرح وہ بھی سچے ہیں، ان کے یہاں تو قاعدہ کلیہ ہے کہ اُن کے معنی سمجھتے ہیں مولوی عمار علی صاحب نے باحق کے معنی حق سمجھے۔ چنانچہ اس کا بیان گزر چکا اور تمام شیعوں نے محافطوں کا نام چور رکھا۔ غلیٰ ہذا القیاس یہاں بھی اگر وہ ایسا کریں تو سنیوں کو کیا شکایت ہے بلکہ خوش ہونے کی جگہ ہے کیونکہ اصل مطلب میں تو شریک سی لکھے لفظوں اور اصطلاح ہی کا فرق رہا سو یہ کیا بڑی بات ہے۔ مصرع

ہر یکے را اصطلاح دادہ ایم

حاصل تمہارے ان کے اختلاف کا یہ لکھنا حق کا نام ان کی اصطلاح میں ناحق ہے اور محافظ کا نام ان کی اصطلاح میں چور اور حزن کا نام ان کے نزدیک خوف ہے مگر جیسے کوئی انگریز نابینا مسلمانوں کی محفل میں کسی کو کسی کی نسبت بابا کہتے ہوئے سنتا ہے تو اپنی اصطلاح کے موافق اس وقت انگریز بیٹی کے معنی اور بنیاد ادا کے معنی سمجھتا ہے ایسے ہی حضرات شیعہ نے اگر "لَا تَغْزَنَ" کے معنی "لا تَخْفَ" کے سمجھ لیے تو ان کا کچھ قصور نہیں، سنیوں کو لازم ہے کہ ان کی اصطلاح کے موافق ان سے باتیں کریں۔ آخر حدیث میں تو یہ مضمون ہے "تَكَلَّمُوا النَّاسَ عَلَى قُلُوبِهِمْ" یعنی لوگوں سے ان کی عقل و فہم کے موافق گفتگو کیا کرو اور اگر پاس خاطر شیعہ "لا تَحْزَنَ" کو بھی ہم "لا تَخْفَ" ہی سمجھیں، تب بھی ہمارا چنداں نقصان نہیں، ہمارا ادھر بھی لیکھا ہے اس لیے کہ اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ اے ابوبکر مت ڈر۔ سو ظاہر ہے کہ ابوبکر جو خوفناک ہوں گے اور ان کو اپنی جان کا کھٹکا ہوگا تو اسی سبب سے ہوگا کہ کفار کو ان کے ساتھ دشمنی ہوگی اور وہ دشمنی بھی بیحد اسلام اور ایمان ہوگی نہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے کیا معنی اور وہ بھی پھر اس قدر کہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ خدا تو مسلمانوں کی طرف داری اور حمایت کرتا ہے "إِنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُحْسِنِينَ" اور اس قسم کے کلمات سے کلام اللہ بھرا ہوا ہے سب کا حاصل یہی ہے کہ اللہ انہماؤں کے ساتھ ہے۔ مومنوں کے متقیوں کے اچھے کاموں کے کرنے والوں کے ساتھ ہے کہیں اول سے آخر تک کلام اللہ میں یہ نہیں کہ اللہ کافروں کے مردودوں کے منافقوں کے ساتھ ہے۔

اللہ کی معیت کی وضاحت

اور کوئی کہے کہ اللہ سب کے ساتھ ہے، مومن ہو یا کافر کلام اللہ میں موجود ہے۔ "إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ" یعنی اللہ ہر چیز کو محیط ہے۔ جب ہر چیز کو محیط ہوا تو ہر چیز کے ساتھ بھی ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ساتھ ہونا دو طرح کا ہوتا ہے، ایک تو یہی اکٹھے ایک مکان میں رہنا اس میں فقط تن بدن کا ساتھ ہوتا ہے۔ اگر چہ دلوں میں فرق ہو، اس قسم کی ہر اسی تو طوطے اور زاغ کی سی ہے۔ دوسرا دلوں سے ساتھ رہنا جیسے کوئی بادشاہ کسی بے کس کو جس کے سب دشمن ہوں یوں کہے کہ تو اندیشہ نہ کر ہم تیرے ساتھ ہیں اس کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ ہمیں تیرا خیال ہے ہمارے دل میں تیرا دھیان رہے گا ہم تیری حمایت پر ہیں۔ اس صورت میں کچھ لازم نہیں کہ بادشاہ اور وہ ایک مکان میں ہوں تو وہ اس کے ساتھ ہوں نہیں تو نہیں ہاں البتہ تا مقدور امداد اور اعانت چاہیے۔ سو جہاں کہیں "إِنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ" یا اسی طرح اور کچھ آیا ہے تو اس سے دوسرے معنی مراد ہیں۔

چنانچہ سب جانتے ہیں نہیں تو اس میں متقیوں ہی کی کیا تعریف نکلی اور انہیں کی کیا تسلی ہوگی۔ سو خاص کر اس آیت میں تو مخلص تسلی ہی کے لیے یہ کہا گیا ہے اور اوپر سے مددگاری ہی کا بیان ہے۔

آیت معیت سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مدد کا ثبوت

باقی یہ کوئی شبہ کرے کہ اوپر سے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرنے کا بیان ہے، ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدد تو نہیں، سو اس کا جواب یہ ہے کہ اتنی بات تو بازاری بلکہ جولا ہے کی لوٹیاں بھی جانتی ہیں کہ غلام کی اہانت اور اس کی رسوائی وہ میاں ہی کی رسوائی مگنی جاتی ہے، انگریزوں کی رعیت کو اور ملازموں کو اگر ان کے ٹھیم ستاتے ہیں تو انہیں کیوں اتنا برا معلوم ہوتا ہے کہ فوج کشی کرتے ہیں اور ہزاروں آدمیوں کا خون کراتے ہیں۔ مع ہذا ہم نے غدر کے ایام میں دیکھا ہے کہ جس نے تحصیل دار یا پولیس دار کو بچالیا تھا وہ خیر خواہ سرکار گنا جاتا تھا۔

سو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مددگاری بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی مددگاری ہے اسی لیے ہمارے مناتے وقت تو یوں فرمایا: ”فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ“ اور مدد کے وقت دونوں ہی کی مدد کی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو خدا کی مدد کی اطلاع کی تو یوں کی ”إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا“ یعنی خداوند کریم خبر رسانی میں اس قصہ کی توفیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کا ذکر فرماتے ہیں اور یوں کہتے ہیں ”فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ“ یعنی اللہ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی فلا نے وقت مدد کی اور جس وقت کہ مدد کی تو دونوں کی مدد کی چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مدد کی اطلاع کی تو یوں کی ”إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا“ یعنی اللہ تعالیٰ ہم دونوں کے ساتھ ہے اور چونکہ ایک لفظ یعنی معاً سے دونوں کی مددگاری کا بیان فرمایا اور دو لفظ نہ کہے یعنی ”مَعْنِي وَمَعَكَ“ نہ فرمایا جس کے یہ معنی ہوتے کہ خدا میرے بھی ساتھ ہے اور تیرے بھی ساتھ ہے تو اس سے اور بھی واضح ہو گیا کہ جس طرح سے خدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا اسی طرح حضرت صدیق اکبر کے ساتھ تھا، سو اس میں تو ہم جانتے ہیں کہ شیعہ بھی بنا چاری ہمارے شریک ہوں کہ خدا وند کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ امداد اور عنایت اور محبت اور اعانت سے تھا تو حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ بھی اسی انداز سے سمجھنا چاہیے۔ مع ہذا لفظ ”ثَلَاثِي الثَّنِينَ“ جس کا یہ مطلب ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت اکیلے نہ تھے بلکہ ان کے ساتھ ایک اور بھی تھا یعنی ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ضمیر مفعول ”الانصروہ“ سے حال واقع ہوا ہے۔ سو اس صورت میں یہ لفظ بھی بآواز بھی کہتا ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی مددگاری خداوندی میں شریک ہیں۔

آیت معیت میں شیعوں کی طرف ایک عبارتی دھوکا اور اس کا جواب

اور اگر شیعہ ہوں کہنے لگیں کہ یہ لفظ "أَخْرَجَهُ الْبَيْنُ" کے ساتھ مربوط ہے اور اس کی ضمیر مفعول سے حال واقع ہوا ہے اور یہ مطلب ہے کہ جس وقت کفار نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ معظمہ سے نکالا تھا اس وقت وہ اکیلے نہ تھے ان کے ساتھ ان کا ایک رفیق بھی تھا اور اس کو نصرت سے کچھ تعلق نہیں، نصرت سے تعلق جب ہو کہ اس لفظ کو لفظ "نَصْرُهُ اللَّهُ" سے علاقہ ہو تو اس تقدیر پر ہماری طرف سے یہی جواب ہے۔ شکر بدہان تو چشم مارو شن دل ماشاد

اگر یہ مطلب ہو تو ہماری عین تمنا ہے کیونکہ اتنا تو شیعوں کو معلوم ہوا کہ کفار کو جیسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت تھی ویسے ہی ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی عداوت تھی باقی کوئی یوں کہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تو کفار نے نہیں نکالا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہمراہ لے لیا تھا، سو اس کا جواب شیعہ ویں کیونکہ یہ معنی تو ہم نے انہیں کی طرف سے بیان کیے ہیں اور اگر ہمیں سے پوچھتے ہو، تو ہمیں سے سنئے۔ جناب من شہادت کلام اللہ کفار نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس طرح سے نہیں نکالا کہ ہاتھ پکڑ کر باہر کر دیا ہو یا دھکے دینے کا اتفاق ہوا ہو۔ مثلاً

دارالندوہ کے واقعہ کی اصل شکل

بلکہ صورت یہ ہوئی تھی کہ دارالندوہ میں جو ابو جہل کی بیٹھک کا نام تھا اور وہ خانہ کعبہ کے پاس تھی جہاں اب حنفی مصلے بنا ہوا ہے اور اب وہ جگہ داخل حرم محترم ہو گئی ہے وہاں کفار مجتمع ہوئے اور اس بات کا مشورہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قید کرنا چاہیے یا مار ڈالنا مناسب ہے یا کہیں انہیں نکال دیجئے۔ اس مشورہ کی اطلاع خداوند کریم نے اپنے حبیب کرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کر دی، آپ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رفیق ولی سمجھ کر ساتھ لیا اور غار ثور میں تشریف لے گئے پھر تین دن کے بعد سواری اور راہ کا بندوبست کر کے دونوں صاحب مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے۔

چنانچہ اس بات کی طرف بطور اختصار سورۃ انفال میں جناب خداوند کریم اشارہ فرماتے ہیں:

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ

وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ

"یعنی وہ بھی یاد ہے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ کفار تیرے ساتھ مکر کرنا چاہتے تھے اور ان کا یہ ارادہ تھا کہ تجھے قید کر لیں یا قتل کر دیں یا نکال دیں، اور وہ یہ مکر کر رہے تھے اور خدا ان کے ساتھ

مکر رہا تھا، یعنی تجھے اطلاع کر دی، پھر غار میں تیری حفاظت کی یہاں تک کہ مدینہ منورہ خیریت سے پہنچا دیا اور کیوں نہ ہو اللہ تو سب سے زیادہ مکر جانتا ہے۔“

اس قصہ کو غور کیجئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہاتھ پکڑ کر نہیں نکالا تھا اور اگر یوں کہئے کہ ایذا کے درپے ہونا نکالنا ہے تو ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہونے کی انہیں کون سی راحت تھی بلکہ اس سے پہلے بھی انہیں تو نکال دیا تھا نہ ابن دغنے انہیں ہٹا کے لائے اور کفار سے ان کے باب میں گفت و شنود کرے نہ وہ نہیں یہ روایت سنیں کی کتابوں میں تو موجود ہی ہے پر عقل بھی یوں ہی کہے۔ ہے کہ یوں ہوا ہو تو کچھ عجب نہیں کیونکہ خداوند کریم نے ”إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَخْزَنَ إِنَّ اللَّهَ مَنَّكَ“ کے ضمن میں اس بات سے متنبہ کر دیا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی کفار دشمنی رکھتے تھے نہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی کیوں تسلی کرتے اور خدا کیوں ان کے ساتھ ہوتا اور ہمیں تو اتنا بھی بہت ہے کہ خدا ان کے ساتھ اسی طرح ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے۔

اس تقریر کے سننے کے بعد یقین یوں ہے کہ شیعہ اس احتمال کو زبان پر بھی نہ لائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس لیے ساتھ لے لیا تھا کہ وہ کہیں کفار کو اطلاع نہ کر دے کیونکہ اس احتمال کی جڑ بنیاد تو اس آیت کے ہر ہر لفظ نے ایسی اکھاڑی ہے کہ شیعہ اپنے سر کو قیامت تک پیش تو نہ جے گی۔ مع ہذا جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم (نعوذ باللہ) کچھ ایسے کم فہم نہ تھے ان کی عقل کا تو ایک عالم دیوانہ ہے کیا وہ اتنی بھی نہ سمجھے کہ اس اندیشہ کے سود فیہ ہیں کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کی بول سے اطلاع ہی نہ کرتے کہ میں غار ثور میں جا کر چھپوں گا تو ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کچھ شیعوں کے امام تو نہ تھے کہ ان کو علم ”ما کان وما یکون“ یعنی ازل ابد کے سب وقائع کی خبر تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بتلاتے یا نہ بتلاتے، اُن کو آپ اطلاع ہو جاتی۔ ماسوا اس کے تقیہ تو ایسے وقت میں ضرور ہی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ شیعوں کے نزدیک ایک تقیہ کی اصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غار میں چھپ جانا بھی ہے خیر یہ قصہ تو تقیہ کی اصل جیسی ہے سو ہے ان شاء اللہ آگے معلوم ہو جائے گا۔ پر شیعوں کے مذہب کے موافق تو ایسے وقت میں تقیہ فرض ہو جاتا ہے اور جھوٹ پلٹنا مباح، بلکہ ضرور چنانچہ اماموں نے جو اصحاب ثلاثہ یا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعریف کی ہے اسعدہ ان کی کتابوں میں موجود ہے، اس کو شیعہ یوں کہتے ہیں کہ اماموں نے بوجہ تقیہ جھوٹ کہہ دیا تھا (نعوذ باللہ منها) القصہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ جھوٹ بول کر ابو بکر

کے دل۔ بے غار ثور کی طرف جانے کا احتمال نکال دیا ہوتا کہ اس کی کیا ضرورت تھی کہ ان کو ساتھ لیا اور ایک جان کا وبال خرید اتھا ہوتے تو بے کھٹکے ہوتے ان کے ساتھ وہ اندیشہ جس اندیشہ کے لیے انہیں ساتھ لیا تھا اور دو بالا ہو گیا، اگر وہ کسی بہانہ سے وہاں سے نکل کر کفار کو اطلاع کر دیتے تو بظاہر کون مانع تھا یا جس وقت کفار وہاں آ کھڑے ہوئے اس وقت بول اُٹھتے تو وہی شل ہو جاتی کہ مینہ سے بھاگے پرٹالے کے نیچے جا کھڑے ہوئے، دھوپ سے بچے پر آگ میں گر پڑے۔
القصہ اگر ابو بکر کے ساتھ لینے میں یہی مصلحت تھی تو یہ تو مصلحت سے کوسوں دور ہے۔

ملا عبد اللہ مشہدی کی بے اختیارانہ حق گوئی

اسی واسطے ملا عبد اللہ مشہدی نے اظہار الحق میں لاچار ہو کر انصاف کی راہ سے یہی کہا کہ نفس الامر تو یوں ہے کہ یہ احتمال بہت ہی بعید ہے مگر وہ نقل مشہور ہے کہ ستر برس کا رام جی میں بیٹھا ہوا نکلے ہے نکلتے ہی اتنی توفیق نہ ہوئی کہ حق بول اُٹھیں اور اپنے بیگانہ کا کچھ لحاظ نہ کریں، اب ہم سے سنئے کہ ملا عبد اللہ مشہدی کا کہنا سب بجا اور درست اور اس کے حق ہونے میں کچھ شک نہیں اور اس وجہ سے اگر ان کی کتاب مذکور کو اظہار الحق کہیں تو پچھے ہے اور ہم کو بھی اس بات کی تسلیم سے انکار نہیں، اگرچہ ملا مذکور شیعہ مذہب ہیں۔ متاع نیک ہر دوکان کہ باشد

مگر ستم تو یہ ہے کہ شیعہ حتیٰ کہ علماء بھی باوجودیکہ ملا عبد اللہ مذکور کو اپنا مقتدا دین سمجھتے ہیں اس بات میں ان کی بھی نہیں سنتے، ہر چند ملا مذکور آخر کو یہی کہہ اُٹھے کہ عجب کیا ہے جو خلیفہ اول کو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمراہی اور ہمدی کے لیے اس لیے اختیار کیا ہو کہ انہوں نے اپنی بیٹی کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکاح کر دیا تھا اور اکثروں سے پہلے مسلمان ہوئے تھے اور اکثر ملازم خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم رہتے تھے لیکن کیا امکان جو حضرات شیعہ رو بہ راہ ہوں بلکہ عجب نہیں کہ مجتہد الزماں کے یہاں سے ان کے لیے بھی حکم تبرا صادر ہو۔

سفر ہجرت کی حقیقت حال

خیر کوئی مانے یا نہ مانے پر دل سب کا سنی ہوں یا شیعہ یہی گواہی دیتا ہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہمراہ لے جانا فقط اس وجہ سے تھا کہ ان کو کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وزیر مشیر اور معین اور مددگار سمجھتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا محبت خاص اور ہمد با اختصاص جانتے تھے اور کیوں نہ سمجھیں۔ شیعہ سنی کون نہیں جانتا کہ انہوں نے ابتداء سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی رفاقت سے کفار کے ہاتھ سے کیا کیا ایذائیں سہیں اور کس قدر جفائیں اٹھائیں اور کس قدر مال لٹایا اور کیا کیا کر دکھلایا۔ بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مول لیا اور قید کفار سے چھڑا کر آزاد کیا اور علی ہذا القیاس اللہ اور رسول کی خوشنودی کی اور سب اپنا خانماں برباد کیا۔ پس در صورت ان کے مکہ میں چھوڑ جانے کے ایک تو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ یقین کامل تھا کہ کفار ان کو اور مجھے یکساں سمجھتے ہیں جو کفار نابکار نے میرے لیے تجویز کیا ہے ان کے لیے ہے۔ انہوں نے بیشتر کفار سے مقابلہ کیا ہے اور ان کو بارہا یہ وعظ و پند کیا ہے کہ دین اسلام دین حق ہے، بت پرستی چھوڑو، اگر سعادت مد نظر ہے اتباع نبوی اختیار کرو، اگر ان کو یہاں ہی چھوڑ گیا تو کفار ان کو ہرگز زندہ نہ چھوڑیں گے۔ ہاں عمر کو اگر ساتھ نہ لوں تو کچھ مضائقہ نہیں کہ ان سے کفار کو چنداں پر خاش نہیں اور بایں ہمدان کے طرح طرح کے لحاظ پاس ہیں۔ منجملہ ان کے یہ بھی ہے کہ ابو جہل کے جور کس کفار ہیں بھانجے ہیں باقی اور اصحاب کو کفار گنہگار کچھ اس درجہ میں دین و ایمان نہیں سمجھتے۔ پھر اس پر ان کے بچاؤ کے اور بہت وجوہ ہیں پر ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رفاقت کفار کی آنکھوں میں خار ہے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر لہو کے گھونٹ پیتے ہیں، یہ اگر مارے گئے تو بڑا زکن ایمان و اسلام ڈھ جائے گا اور ایسا رفتی شفیق اور ایسا ظلم کہ اس کا اخلاص و محبت دل میں اثر کرتا ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا۔

بایں ہمدانے سفر پر خطر میں بے رفق کے نہیں گزرتی، پھر رفق بھی ایسا چاہیے کہ نہ جان سے دریغ ہونہ پاس آئے و ہوزن و فرزند کی محبت سے خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کے دل پر غالب ہو اور اس پر گرم و سرد زمانہ دیکھے ہوئے تجربہ کار سیر و سفر مرد ہو شیاریگانہ روزگار بلند ہمت عالی فطرت، یار بے تکلف، محبت مصمم راز دار قدیم ہو جس سے دل کی بات کھلے، دل خالی ہو غم و حیرانی و حشت و پریشانی اس کی محبت سے دور ہو۔ سو مجموعہ ان اوصاف کا سوائے جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے کسی اور میں نہ پایا۔ اسی لیے عین دوپہر کے وقت آپ ان کے گھر تشریف لائے اور حاضری پکوا کر دلوں میں مہذب و مہذب عالم اور خادم ہمدان رونق افروز عار و ثور ہوئے اور عبد اللہ بن ابی بکر کو کہ فرزند ارجمند پر کلان حضرت صدیق کے تھے جاسوسی کے لیے مقرر کیا کہ مشورہ کفار سے جو کچھ وہ در باب طلب و تلاش حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کریں، شب کو آگاہ کرتے رہیں۔

واقعہ سے شیعہ کی خام خیالی کا جواب

اگر خاندان صدیقی کو کچھ بھی عداوت ہوتی تو یہ معاملے کہیں ہو سکتے اور اگر بالفرض و التقدیر بغرض محال ایسے مشورے پیش بھی آتے تو اس سے بہتر کینہ کشی کا وقت ان کے پھر کون سا ہاتھ آتا، انعام کفار

جدا لیتے اور اپنا کام جدا کرتے۔ حضرات شیعہ ہی اپنی کتابوں کو دیکھ کر فرمائیں کہ میں نے اس قصہ میں کیا جھوٹ ملا دیا ہے۔ سرواگر فرق پائیں تو جو چاہیں سو کریں، منصفوں کو تو بے اس کے کہنے نہیں بن پڑتی کہ ایسے وقت کی ہمدی اور ہمرای اور اس اہتمام اور انتظام سے ان کا ساتھ لینا ایسی بڑی فضیلت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اس شب بستر پر سو رہنا بھی اس کے ہمسنگ نہیں ہو سکتا۔

غدر میں سب نے دیکھا ہوگا کہ تلاشی کے وقت اگر مجرم نہیں ملا تو حکام نے ان لوگوں سے کچھ پر خاش نہیں کی جو اس مقام پر ملے ہاں جس کو رفیق و مددگار مجرم دیکھا، اس کو بھی مجرم ہی سمجھا، ہائے افسوس کہ خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں مقبول نہ ہو۔ فقط اس شرم سے کہ مسلمان کہلاتے ہیں اگر خدا کے کلام کو نہ مانیں گے تو جواب کیا دیں گے۔ اس آیت کو جبراً کرنا اگر سر دھرتے ہیں تو ہزار طرح کی نامعقول تاویلیں گھڑتے ہیں۔ پر چند مفتر یاں سیہ باطن تیرہ دروں کی گھڑی ٹھڑی باتوں کو ایسا دل و جان سے بے حیلہ و حجت قبول کرتے ہیں کہ اگر اس کے قبول کرنے کو کلام اللہ کے قبول کرنے سے موازنہ کریں تو کلام اللہ کا تسلیم کرنا اس کے پاسنگ بھی نہیں ہوتا۔

آیت معیت کی منصفانہ ترجمانی

ہمیں اس میں شک بھی نہیں کہ حضرات شیعہ کے دل میں اس آیت سے اول وہلہ بھی معنی آتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اگر اس وقت رنج تھا تو یہی تھا کہ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بے بس و بے کس ہیں۔ میں ایک تنہا کیا کر سکتا ہوں، مبادا دشمنان دین جو پاس پاس کو پھرتے ہیں اس طرف کو جھانک اٹھیں اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کو ہلاک کر جائیں اور ہماری حسرتیں اور تمنائیں سب دل کی دل میں رہ جائیں مگر چونکہ کمال درجہ کی بے بسی اور بے سروسامانی کو امداد و اعانت لازم ہے۔ چنانچہ کلام اللہ میں ہے:

حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِّبُوا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا

”یعنی جب کہ ناامید ہو گئے رسول اور انہیں یہ وہم ہوا کہ یہ وعدے جو در باب نصرت اور مددگاری کے ہم سے تھے مبادا خیال شیطانی ہوں ہم اپنی غلط فہمی سے اس کو وعدہ خداوندی سمجھتے ہوں۔ آئی ان کو ہماری مدد۔“

اس مایوسی میں جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو باعتبار ظاہر کے پیش آئی تھی نزول امداد ہوا اور یہ بشارت ہوئی کہ ”لَا تَحْزَنُ إِنَّ اللَّهَ مَعَنا“ اے ابوبکر! مایوس اور غمگین نہ ہو، تسلی رکھ

ہمارے ساتھ خدا ہے۔ اللہ اس وعدہ صادق نے ظہور فرمایا اور کفار مگنوں کے شر سے ان دونوں بندگان خاص کو بچا کر حفظ تمام مدینہ میں پہنچایا اور پھر دین کو یہ رونق دی کہ اظہر من الشمس ہے، سو دعائی چاہیے ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جان کو کہ نہ وہ اتنے غمگین ہوتے نہ اس کا یہ شرہ مرتب ہوتا کہاں ان کے صدقہ سے یہ نصرت ہو کہاں ملک ایران وغیرہ قبضہ کفار سے چھوٹیں اور شیعوں کو ٹھکانہ ملے مگر اس نا اعلیٰ کو دیکھئے کہ شکرانہ کے بدلے ان کے ساتھ وہ کرتے ہیں کہ کوئی اپنے محسن کے ساتھ نہ کرے۔ مرا بخیر تو امید نیست بزم رسان

آیت معیت میں شیعوں کی ایک اور مضحکہ خیز تاویل اور اس کا بطلان
 اس مقام میں بعض متصب لاچار ہو کر بہت بیچ و تاب کھا کر شاید کہیں تو یہ کہیں کہ واقعی اس زمانہ تک تو ابو بکر صدیق ایسے ہی تھے جیسے خدا کے کلام سے سمجھا جاتا ہے مگر وہ بات پھر نہ رہی ہوگی۔ یہ شبہ اس قابل نہیں کہ کوئی اس کے جواب کی طرف متوجہ ہو بلکہ شیعوں کو لازم ہے کہ اس بات کو منہ پر نہ لائیں۔ مبادا کوئی ہندو انگریز سن کر یوں کہنے لگے کہ ایسے خدا ہی کو سلام ہے جسے چار دن کے بعد کی خبر نہ ہو اور اگر بفرض محال حسب گفتار شیعہ نقل کفر کفر نہ باشد خدا کو ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ان اطواروں کی جو ان سے بعد میں ظہور میں آئے، خبر نہیں بھی تھی اور بھولے جو کے منہ سے یہ بات نکل گئی تھی تب لازم تھا کہ اپنی اس بات کی بیچ کرنا اور جوں توں ابو بکر صدیق کو ر اور راست پر لانا، خدا تھا کچھ تا خدا تو نہ تھا کہ بادمخالف میں لاچار ہو کر بیٹھ رہے، بندوں کو تو اپنی بات کی بیچ ہوتی ہے خدا تو خدا، ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں تو یوں کہا کہ ہم اس کے ساتھ ہیں اور ادھر یوں سنا دیا کہ "لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ بِمَا يُنْبَلُ اَقُولُ لَدُنِّي" دلوں آجوں کا بھی مطلب ہے کہ خدا کی بات بدلی نہیں جاتی اور پھر اس پر ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ساتھ چھوڑ دیا یہاں تک کہ شیطان نے اسے آدھایا، یا یوں کہئے (نعوذ باللہ) خدا ساتھ تو تھا پر خدا سے شیطان کے مقابلہ میں کچھ نہ ہو سکا۔ "تَعَالَى اللَّهُ عَنْ ذَلِكَ عَلَوْا كَجَبْرًا" بخوشیوں کے اور کسے یہ دلبری ہے کہ ایسی بات منہ پر لائے۔

آیت معیت کے الفاظ بھی شیعوں کو منہ توڑ جواب دے رہے ہیں
 یہ نہیں سمجھتے کہ اول تو "إِنَّ اللَّهَ مُعْتَدٍ" یہ ایسا جملہ ہے کہ عربی کے محاورہ کے موافق اس میں سے پہچکی کی نو آتی ہے جو لوگ مر رہے ہیں اور فنِ بلاغت کے قواعد سے واقف ہیں وہ

خوب جانتے ہیں بلکہ اتنی بات تو یقین یوں ہے مولوی عمار علی صاحب بھی جانتے ہوں۔ دوسرے ہم نے مانا اس جملہ سے کچھ بیگلی نہیں نکلتی پر اتنی بات تو شیعوں کو بھی تسلیم کرنی ہی پڑے گی کہ اس وقت خاص میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس خدا کی ہر اہی اور ہمدی میں شریک تھے اور یہ ممکن ہی نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خدا کبھی صلح ہو گئے ہوں اور ان کی ہر اہی اور طرف داری چھوڑ دی ہو۔ سو "إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا" میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ تو دائمی نکلا۔ اس صورت میں ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حصہ بھی دائمی ہوگا کیونکہ دونوں کے حصے رلے ملے ہوئے ہیں بٹے ہوئے نہیں۔ ایک مع کا لفظ دونوں کے واسطے ہے، دو لفظ جدا جدا نہیں یعنی "مَعِيَ وَ مَعَكُمْ" نہیں فرمایا، تیسرے ہم اس سے بھی درگزرے۔ ہم یوں کہتے ہیں کہ شیطان کا مقولہ سورہ ص میں یوں منقول ہے:

"لَيَجْزِيكَ لَا غَوْلَىٰ لَهُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ"

"یعنی شیطان قسم کھا کر کہتا ہے کہ اے اللہ! مجھے قسم ہے تیری عزت کی میں سب ہی بنی آدم کو بہکاؤں گا مگر جو تیرے چمٹے ہوئے بندے ہیں تو نے انہیں اپنے لیے چھانٹ لیا ہے۔"

کیونکہ وہ میرے دست قدرت سے باہر ہیں وہ تیری پناہ میں آ گئے ہیں۔ سو چونکہ تو ان کے ساتھ ہے اور وہ تیری پناہ میں ہیں وہاں میرا کچھ قابو نہیں چل سکتا اور سورہ حجر میں "إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ" کے بعد بطور تصدیق کے شیطان کے مقولہ کے جواب میں خداوند کریم کی طرف سے یوں ارشاد ہے "إِنَّ عِبَادِي لَأَنسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ" یعنی شیطان کو کہا جاتا ہے کہ تو اس بات میں سچا ہے جو میری پناہ میں آ گئے ہیں ان پر تیرا بس نہیں چل سکتا۔ اب بعد اس کے غور فرمائیے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پناہ خداوندی میں آ جانا تو اس آیت ہی سے ثابت ہے یعنی "إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا" سے صاف اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ ایک دفعہ تو صدیق اکبر پناہ خداوندی میں آ گئے اور خدا کے دربار میں اور سرحد میں گویا داخل ہو گئے، پھر بعد اس کے جو وہاں سے نکلے تو شیطان کے نکالے تو نکل ہی نہیں سکتے اور کس نے نکالا اور اگر یوں کہئے کہ خدا ہی نے اپنی پناہ سے نکال دیا تو یہ خیال خود غلط ہے کیونکہ خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ

"یعنی اللہ تعالیٰ اپنی راہ و رسم کو کسی قوم کے ساتھ جب تک نہیں بدلتا، جب تک کہ وہ اپنے طور و

انداز کو نہ بدل دیں۔"

معیت حق صدیق کی ذات کے ساتھ تھی

لور خود حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بے غواء شیطانی اور بے استدراج خداوندی اپنی روش بدل لیں، یہ محلات میں سے ہے اس واسطے کہ یہ بدیہات میں سے بلکہ اظہر من الشمس ہے کہ ہر قسم کے کام کے لیے ایک استعداد ہے۔ داد و دہش کے لیے سخاوت چاہیے، مارنے مرنے کے لیے شجاعت چاہیے، سولے ہی برے کام اور گناہ کی باتوں کے لیے بھی ایک استعداد اور قابلیت چاہیے۔ سو وہ قابلیت اگر تھی تو خدا نے چھٹائی تھا کس خوبی پر؟ (نعوذ باللہ) خود کلام ربانی ہی میں یہ موجود ہے:

”تَلَخَّيْنَاهُ لِلْغَيْبِشِيِّنَ وَالْغَيْبُوتِ لِلْغَيْبَاتِ وَالطَّيَّاتِ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيَّاتِ ط“
 ”یعنی بری چیزیں بدوں کے لیے اور برے بری چیزوں کے لیے اور اچھی چیزیں اچھوں کے لیے اور اچھے اچھی چیزوں کے لیے۔“

بلکہ اس موقع میں جو یوں ارشاد ہوا ”إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا“ یعنی اللہ ہمارے ساتھ ہے اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ ان سے جدا نہ ہوگا۔ سو جب اس کی یہ ہے کہ اگر ”إِنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ“ یعنی اللہ مومنوں کے ساتھ ہے بعد لفظ ”لَا تَخْزَنُ“ کے فرماتے تو یوں بھی گمان ہوتا کہ اللہ کی ہمراہی ایمان کے ساتھ مشروط تھی۔ جب ایمان گیا ہر ہی بھی ساتھ گئی اور در صورتیکہ بے کسی شرط کے ہر ہی ہو تو وہ دائمی ہوگی اس میں زوال کا احتمال نہیں، قرابت کی وجہ سے جو ارتباط ہوتا ہے وہ قابل زوال نہیں ہوتا لور آپس کی دوستی میں جو بوجہ اخلاق اور احسانات و ہمد گری کے ہوئے ہیں وہ جب ہی تک رہتے ہیں کہ اخلاق اور احسان باقی رہیں۔ اسی واسطے دوستی ٹوٹ جاتی ہے رشتہ نسبی نہیں ٹوٹتا۔ قصہ نسب کے حقوق جان کے ساتھ ہوتے ہیں اور دوستی کے حقوق احسان کے ساتھ۔ سو چونکہ ”إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا“ فرمایا ہے لور ”إِنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ“ وغیرہ جو کسی وصف پر دلالت کرے نہیں فرمایا تو معلوم ہوا کہ ابو بکر کے ساتھ خدائے تعالیٰ کی ہمراہی جان کے ساتھ ہے کسی وصف کے ساتھ نہیں، پھر اگر خدا کی ہمراہی بدل جائے تو موافق آیت مذکورہ بالا ”إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْيِرُ الْآيَةَ“ کے کسی وصف میں تغیر آنا ضرور ہے لور جب اوصاف کے تغیر اور تبدل پر معیت اور ہمراہی میں بھی تغیر آیا تو معلوم ہوا کہ وہ معیت اور ہمراہی ان اوصاف ہی کے سبب تھی بے وجہ نہ تھی اس صورت میں لازم آوے گا کہ خدا سے بڑی چوک ہوگی کہ اس وصف کا نام نہ لیا یا خداوند کریم بھول گیا اور ”إِنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ“ کی جگہ مثلاً ”إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا“ فرمادیا۔ (نعوذ باللہ من سوء الفہم) خداوند کریم اور چوک جائے یا بھول جائے خدا کی تو یہ یشان ہے جیسے کلام اللہ میں آیا ہے ”لَا يَهْضِلُ رَبِّي وَلَا يَنْسِي“ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میرا رب نہ چوکے نہ بھولے۔

آیت میں معنا کا لفظ حضرت

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے رُتبہ کا آئینہ دار ہے

انصاف اگر ہو تو اس لفظ ”مَعْنًا“ سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رُتبہ کچھ لگ بھگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رُتبہ کے ہے جو ایک قسم کی معیت ان دونوں کے واسطے خداوند کریم نے بیان فرمائی۔ سو یہ بات بجز اس کے نہیں ہو سکتی کہ صدیق اکبر ان کو کہا جائے اور تمام اُمت محمدی اور سوائے اس کے اور اُمت ہائے ماضیہ سے ان کو افضل سمجھا جائے۔ جب کہیں ان کے رُتبہ اور مقام کی سرحد اعلیٰ مقام نبوت کی سرحد اسفل سے متصل ہو اور یہ لیاقت ہم پہنچے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی بات میں شریک ہوں۔ سو یہ بات شیعہ سنی سب جانتے ہیں کہ ایسا مقام جو مقام نبوت سے متصل ہو بجز صدیقیت اور کوئی نہیں کیونکہ کلام اللہ میں بعد انبیاء کے صدیقین ہی کو ذکر کرتے ہیں۔ سو اس سے معلوم ہوا کہ ہر نبی کی اُمت کے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا رُتبہ اس نبی کے رُتبہ سے متصل ہی نیچے ہوتا ہے۔ سو چونکہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تو اور نبیوں کی نبوت سے بالاتر ہے تو اس اُمت کے صدیق اکبر کا رُتبہ اپنی اُمت کے صدیقیوں کے مرتبہ سے تو بڑھ کر ہی ہے اور اُمتوں کے صدیقیوں کے مرتبہ سے بھی بالاتر ہوگا۔ اب بس کیجئے کہ مصنفوں کے لیے یہ بھی بہت ہے اور حصوں کو خداوند کریم اگر سمجھائے تو شاید مانیں ہم جیسوں کی کا ہے کو مانیں مگر ہمیں بطور نصیحت اس قدر کہنا لازم ہے کہ خداوند کریم جس کے ساتھ ہوتا ہے اس کے دشمنوں کی خیر نہیں ہوتی۔

شیعوں کی ایک اور راہ گریز اور اس کی روک تھام

اس کے بعد کوئی کہے گا تو یہی کہے گا ”لَا تَحْزَنُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا“ حقیقت میں خدا کا مقولہ نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقولہ ہے خداوند کریم فقط ناقل اور راوی ہے کچھ اپنی طرف سے نہیں فرماتے جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اس وقت صادر ہوا اسے بحینہ نقل کر دیا۔ جیسے فرعون کا ”أَنَا رَبُّكُمْ الْأَعْلَى“ کہنا یعنی میں تمہارا بڑا رب ہوں، یا اطمیس کا ”أَنَا خَيْرُ مِنْهُ“ کہنا یعنی میں آدم سے بہتر ہوں، بحینہ نقل کر دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر چہ رسول ہیں لیکن پھر بھی انسان ہیں اور یہ مثل مشہور ہے ”الانسان مُرْتَكِبٌ مِنَ الْخَطَايَا وَالْبِسْمَانِ“ سو اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ غلطی ہو گئی ہو تو کیا بعید ہے جواب اس کا یہ ہے کہ واقعی شیعہوں کے لیے یہ بات بڑی مایہ افکار ہے لازم تو یوں ہے کہ عید بابا شجاع سے اس کی

خوشی کم نہ ہو، اگرچہ کسی سنی ہی کی بتلائی سہی، مطلب کے وقت تو گدھے کو بھی باپ بتالیا کرتے ہیں۔ سنی تو ان کے قدیمی اُستاد ہیں اور اُستاد بھی کون سے جن سے کلام اللہ سیکھا جس کا رتبہ حقیقی باپ سے بھی بڑھ کر یہ بات بھی اگر ان سے سیکھ لی تو کیا مضائقہ ہے مگر اتنا کہتا میرا بھی ماننا چاہیے کہ سورہ نحم کو ساری کی ساری نہیں تو اتنے ہی کلمہ کو ساقط کر دو۔

”وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ“..... ”یعنی ہمارا پیغمبر جو کچھ ہمارے حوالے سے کہے ہے وہ کچھ اپنے جی سے نہیں تراش لیتا بلکہ وہ نری وحی ہے۔“

اس میں کسی طرح کا رلاؤ نہیں نہ کچھ دخل فصل ہے نہ وہم کا یا عقل کا کچھ دخل ہے۔ خلیفہ ثالث نے امیر المؤمنین علی مرتضیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کے کلمات اور آیات کیا سورتیں کی سورتیں جو خلافت پر دلالت کرتی تھیں، کلام اللہ سے نکال دیں تم اس کی پاداش میں ایک آیت فی الجملہ اثبات فضیلت خلیفہ اول میں کارآمد ہے۔ اگر نکال ڈالو تو از قبیل ”جَزَاءُ مَسِيحَةٍ مَّسِيحَةٍ مِّثْلُهَا“ کے ہوگی بلکہ اس سے بھی کم کیونکہ اس آیت کے معنی تو فقط اتنے ہی ہیں کہ بدی کا بدلہ دے دیا ہی بدی ہے سو یہاں برابری کیا۔ آدموں آدھ کی بھی نسبت نہیں تقریباً گیارہ ہزار آیت کے بدلے میں ایک آیت کو کون برابر کر دے گا اور پھر وہ بھی ایسی کہ اس کے جاتے رہنے سے کوئی حق ٹٹنی نہیں ہوتا۔ خلیفہ ثالث نے تو یہ کمال کیا کہ اتنی آیتیں بھی نکال دیں اور آیتوں کو نکال کر عوام کی آنکھوں میں حسرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حق بھی نہ رکھا۔ خیر یہ بات تو دور جا پڑی۔ حاصل یہ ہے کہ آیت ”وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ“ صاف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کہا خدا ہی کا کہا ہے خاص کر ایسی بات کہ جو جملہ اخبار غیب ہے کیونکہ خدا کی معیت تو کچھ آنکھوں سے نظر نہیں آتی بلکہ اخبار غیب میں سے بھی اول قسم، اس لیے آیت ”إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا“ سمسک آیات متشابہات ہے ان میں عقل کو کسی طرح دخل نہیں ہو سکتا جو کوئی یونہی کہے کہ عقل کے وسیلے سے بہت سے وقائع آئندہ کی اطلاع ہو جاتی ہے۔ خوف کسوف اکثر واقعات علم ہیئت کو معلوم ہو جاتے ہیں سوا اگر ایک واقعہ بالفعل کی کچھ اطلاع عقل کے وسیلے سے ہو گئی ہو تو کیا عجب، ہاں اگر کوئی حکم ملت حرمت کا ہوتا تو البتہ اس میں اجتہاد کی گنجائش تھی، احتمال ہو سکتا تھا کہ جیسے پچھلے اماموں نے اجتہاد کیے ہیں اگر کسی بات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کیا ہو تو کیا عجب، چنانچہ سنی اجتہاد نبی کے قائل ہیں۔ مضمون ”إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا“ میں کوئی احتمال بجز اس کے نہیں کہ جو کچھ آپ کی زبان پر جاری ہوا وہ سب القائے ربانی تھا کوئی احتمال مفید مطلب شیعہ اس آیت کے

پاس کو بھی نہیں پھٹکتا، چسپید کی تو چیز دیگر، حق یہی ہے کہ اگر ابو بکر حسب اعتقاد شیعہ مقبولان بارگاہ الہی میں سے نہ ہوتے اور انجام ان کا ارتداد اور کفر پر ہوتا تو اڈل تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تسلی ہی نہ فرماتے، کیا ضرورت پڑی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر جھوٹ بولتے۔

تقیہ کا عذر رنگ

اور تقیہ کو کوئی کہے تو اڈل تو تقیہ وہاں ہوتا ہے جہاں اندیشہ کسی قسم کا ہو۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کچھ پہلوان نہ تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ کمزور نہ تھے ان میں تو ایک پہلوان کیا بہت سے پہلوانوں کا زور تھا، تنہائی میں ابو بکر کے مار ڈالنے کا بہت عمدہ موقع ہاتھ آ گیا تھا، وہاں کون پوچھتا تھا مار کر کہیں چل دیتے، دوسرے تقیہ کرنا تھا تو تطف اور اخلاق زبانی کفایت کرتے تھے۔ سودہ کچھ تسلی اور تشفی ہی کے الفاظ میں منحصر نہیں، ہم جیسے جنہیں گفتگو کا سلیقہ نہیں بہت سے تطف کے الفاظ تراش سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو فصیح العرب والعمم تھے اور اگر تسلی ہی کے الفاظ کی ضرورت تھی تو اور بہت سی صورتیں تھیں، اس جھوٹ کی کیا ضرورت تھی اور (نعوذ باللہ منها) ہم سے تو نہیں کہا جاتا، اگر شیعوں کے کہے موافق جھوٹ ہی بولنا تھا تو کچھ تو یہ کر لیتا تھا، اگر ”ان اللہ معنا“ کی جگہ ”إِنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ“ فرما دیتے تو تسلی کی تسلی ہو جاتی، بات کی بات بن جاتی ان کی تسلی ہو جاتی، آپ جھوٹ سے بچ جاتے۔ ابو بکر (نعوذ باللہ) اگر منافق تھے تو یوں سمجھ جاتے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مؤمن اور اپنا رفیق سمجھتے ہیں اور اگر مؤمن تھے اور پھر مرتد ہو گئے تو ایسے کلام میں سچے رہتے خدا کی طرف بھول چوک کا احتمال نہ ہوتا کیونکہ جب تک وہ مؤمن رہے جب تک اللہ تعالیٰ بھی ان کے ساتھ رہے۔ جب ان کے دل سے ایمان نکل گیا، خدا نے بھی ان کی ہر اسی چھوڑ دی۔

لصاحبہ سے متعلق لطیف و دقیق تشریح اور صحابی و صاحب کا مفہوم

اس تقریر کے بعد ایک تنبیہ پر خاتمہ کرتا ہوں۔ اتنا یاد رہے کہ شاید بعض عقل کے دشمنوں کو یہاں یہ خلجان پیش آئے کہ کلام اللہ میں یوں ارشاد ہے: ”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رُّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ“..... ”یعنی نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس کی زبان وہی تھی جو اس کی قوم کی زبان تھی۔“ سو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بھی موافق اس قاعدہ کے عرب کے محاورہ میں گفتگو کرتے ہوں گے اور چونکہ اس بات کی علت یہ معلوم ہوتی ہے کہ تفہیم مطالب میں فرق نہ ہوں تو یوں سمجھ میں آتا ہے کہ کلام اللہ بھی عرب کے محاورے میں ہو اور یہ ظاہر ہے کہ صاحب عربی

زبان میں فقہ بمعنی امرای ہے۔ اس کو صحابی کے ہم معنی سمجھنا ایک طرح کی نا انصافی ہے کیونکہ صحابی تو اصطلاح شرع میں اس شخص کو کہتے ہیں کہ ایمان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قہوڑی دیر یا بہت دیر رہا ہو اور لفظ علماء کا یہ مذہب ہے کہ طول صحبت بھی شرط ہے، بہر حال ایمان داخل مہم صحابی ہے۔ سو لفظ صاحب اول تو اصطلاح میں معروف نہیں بلکہ اصطلاح شرع میں لفظ صحابی مستعمل ہوتا ہے۔ دوسرے "مُتَلَمَّنًا" کہ صاحب بھی مستعمل ہو لیکن کلام اللہ تو عرب کے محاورہ کے موافق اترا ہے اصطلاح کے موافق نہیں اترا، تیسرے ہم نے مانا کلام اللہ سے ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا صحابی ہونا بھی ثابت ہوا اور اس وجہ سے بدالمت التزامی ان کے ایمان کا بھی پتہ لگا مگر کوئی یہ تو تملائے کہ اس آیت سے تادم مرگ ان کا ایمان پر قائم رہنا کہاں سے نکلا۔ سو جو شخص ان کے ارتداد کا قائل ہو۔ اس آیت سے اس کا التزام معلوم۔

صاحب بمعنی صحابی نہ ہو تو بھی کچھ قدح نہیں

جواب اسی وہم کا یہ ہے ان کا ایمان اور پھر ایمان پر قائم دائم رہنا تو بایماء کلمات طیبات "إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ" اور "إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ" اور پر مرقوم ہو چکا۔ حاجت نکرانہ نہیں پھر جب ایمان تو یوں ثابت ہوا اور ہمدی اور مصاحبت لفظ "صاحبہ" سے ثابت ہوئی تو صحابیت میں کیا کسر باقی رہ گئی جس کا انتظار ہے اس صورت میں اگر صاحب مراد صحابی بھی نہیں تو نہ سو مخ ہذا لفظ صاحب کا مشہور ہونا اور صحابی کا اصطلاح شرع میں مشہور ہونا تو باہتیار اس زمانہ کے ہے اور اگر اس زمانہ میں بھی یوں ہی تھا تو یہ ایسا قصہ ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنام محمد مشہور تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو آپ کی بشارت دی تو احمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے بشارت دی۔ چنانچہ سورہ صف میں مذکور ہے قصہ جب دو لفظ مرادف اور ہم معنی ہوا کرتے ہیں گو ایک مشہور ہو مگر گہرے بے گاہ اس کی جگہ دوسرا لفظ بھی بول دیا کرتے ہیں۔ باقی یہ کہنا کہ کلام اللہ عربی محاورہ میں ہے اس کا کسے انکار ہے پر اس کے یہ معنی نہیں کہ جو لفظ کلام اللہ میں ہے اس کے وہی معنی مراد ہیں جو عرب کی زبان میں اس کے معنی تھے۔ صلوٰۃ زکوٰۃ، صوم حج یہ جتنے اس قسم کے الفاظ ہیں سب کے سب اپنے معانی باطل سے متحول ہیں اور اصطلاح شرعی مراد ہے سو ایسے ہی لفظ صاحبہ کو سمجھنا چاہیے۔

نقل معنی کی حقیقت صورت

اور قاعدہ کلیاس کا یہ ہے کہ جب کوئی رسول آتا ہے تو وہ کچھ نہ کچھ نئے احکام لاتا ہے اور ایک

کارخانہ ہی لیا ہو جاتا ہے اور اگر ایسے نئے نئے مضمون ملتے آتے ہیں تو ان سے متعلق ان کی تفہیم کی اکثر ضرورت پڑتی ہے مگر یہ کلمہ احکام اور مضامین پہلے سے چھو نہیں ہوتے تو ان کے مقابلہ میں کوئی لفظ موضوع اس زبان میں نہیں ہوا کرتا چاہا پہلے نہ پڑتا ہے نہ زبان کا دستور ہے کہ جب اس زبان کے مشاقوں کو کسی نئی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو پہلے ہی الفاظ مستعملہ میں سے کسی ایسے لفظ کو مقرر لیتے ہیں کہ اس کے معنی اول سے نئے معنی کو سمجھا سکتے ہو۔ چنانچہ واقفان فن عربیت کو لفظ صوم صلوٰۃ کے دلوں معنوں قدیم بعد جدید کے قصص یہ مقدمہ اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔ سو ایسا ہی لفظ صاحب اور لفظ صحابی کو سمجھنے کے لئے لفظ صاحب کے اصلی معنی کی تفہیم کی بھی اکثر ضرورت پڑتی ہے اور علیٰ ہذا القیاس اس لفظ کے معنی شرعی کی بھی اہل زبان کو اکثر ضرورت ہوتی ہے تو بایں لحاظ فرق کے لیے صاحب کو اکثر پہلے معنوں میں بولتے ہیں اور صحابی کو اکثر دوسرے معنوں میں مگر بایں ہمہ صاحب دوسرے معنوں میں بھی اطلاق کیا جاتا ہے لیکن اضافت کے وقت چونکہ تو ہم التباس نہیں رہتا تو لفظ صاحب ہی کو اصطلاح شرع میں استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ احادیث پر اور خطبہ آئمہ پر عبور رکھتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں۔ القصہ اصطلاحات شرع سے کلام اللہ خالی نہیں بلکہ جو لفظ کہ شرع میں کسی معنی کے لیے مقرر ہے۔ جب وہ کلام اللہ یا حدیث میں پایا جائے گا تو معنی شرعی ہی مراد ہوں گے۔ احتمال معنی اصل کا کرنا محض سفاہت ہوگی، صوم صلوٰۃ زکوٰۃ سے کلام اللہ میں معنی شرعی کے مقابل میں مستعمل ہوا ہے۔ اس سے معنی لغوی مراد لینے روایت سے بہت دور ہیں اور سلمنا کہ لفظ صاحب سے جو صاحبہ میں ہے معنی شرعی مراد نہ ہوں تب عربی معنی اس لفظ کے کو فتیکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مضاف ہو معنی شرعی کے مطابق ہوں گے کیونکہ کفار زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جو اہل زبان تھے جب اس لفظ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مضاف کرتے تھے اور اس سے کسی کی طرف اشارہ کرنا نہ نظر ہوتا تھا تو یہی معنی مراد لیتے تھے کہ فلاں شخص ہمارے ساتھ سے نکل گیا اور وہ خبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہولیا اور ان کے کذمرہ میں داخل ہو گیا ہمارے دین سے نکل بھاگا مجھ ہی دین اختیار کر لیا۔

اس مضمون کا ماہر حاصل علماء شیعہ فرمائیں کہ کیا ہوتا ہے۔ پھر جائے حیف ہے کہ کفار تک اس لفظ سے وقت اضافت یہی معنی سمجھتے ہوں حالانکہ ان کی اصطلاح نہیں، نہ سمجھیں تو حضرات شیعہ نہ سمجھیں مگر ہم جانیں بزم خود اچھا کرتے ہیں۔ کفار سے مطابقت اور موافقت تو آخر ممنوعات شرعی میں سے ہے اور یہ کیا ابھی تو شروع ہے رفتہ رفتہ کفار سے یہ خلاف پیدا کریں گے کہ

برخلاف ان کے صوم و صلوٰۃ وغیرہ الفاظ سے بلکہ سارے کلام اللہ سے حتی المقدور کچھ اور ہی معنی سمجھا کریں گے اور ہم اس سے بھی درگزر صاحب کے لغوی ہی معنی ہیں اور کسی طرح معنی شرعی کے مراد لینے کی گنجائش نہیں۔ تب لفظ "لَا تَحْزَنْ" اور "إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا" کو کہاں کھودیں گے۔ صاحب کے لفظ سے نہیں ان دونوں سے ایمان ثابت ہو گیا۔ چنانچہ اوپر مذکور ہو چکا، بہر حال ان کا صحابی ہونا بطور اصطلاح شرع کے اس آیت سے ثابت ہو گیا۔

لفظ صاحبہ میں بہ نسبت لفظ صحابی زیادہ فضیلت ہے

بلکہ ہمارے نزدیک اس صورت میں اور ذمہ فنی فضیلت ہو جائے گی۔ لفظ صاحب سے اصطلاح شرعی مراد ہوتی تو وہ بات ہرگز نہ ہوتی۔ شرح اس کی یہ ہے کہ اس صورت میں صاحب کے لفظ سے جو ہمراہی مراد ہوگی تو اسی ہمراہی کی طرف اشارہ ہوگا جو "إِذْ هَمَّا بِبَيْتِ الْغَارِ" سے ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ لفظ "إِذْ" جو "إِذْ يَقُولُ" میں ہے وہ پہلے "إِذْ" کا جو "إِذْ هَمَّا" میں ہے بدل ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ یہ ہماری نصرت اس وقت ہوئی جب وہ دونوں غار میں تھے اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ہمراہی سے یوں کہہ رہے تھے اور یہ تو ظاہر ہے کہ ایسے وقت کی ہمراہی اسی کا کام ہے کہ اس سے زیادہ کوئی مخلص نہ ہو اور سچ بھی تو ہے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانبازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں خاص کر اس وقت دشواری کی ہمراہی اور رفاقت ایسی نہیں کہ اس کا انکار کیا جائے۔ اگر خداوند کریم اس کی طرف اشارہ نہ فرماتے تب کچھ حاجت نہ تھی۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ رفاقت اور ان کا اخلاص ایسا شہرہ آفاق ہوا ہے کہ ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ شیعہ زبان سے انکار کریں تو کیا ہوا، دل میں ان کے بھی یہی ہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے برابر دنیا میں کوئی کسی کا رفیق نہیں ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے رفیقوں میں کچھ ان کا رتبہ بڑھ کر نہیں دیکھتے، نہیں بلکہ جس کی رفاقت اور اخلاص نہایت کو پہنچ جاتے ہیں تو عرف میں اسے شیعہ سنی ہندو مسلمان سب یا رعا کہتے ہیں رفاقت میں ایسا رتبہ کے ضرب المثل اور مشہ بہ ہو جائے۔ بجز اس کے نہیں ہو سکتا کہ اوروں کی رفاقت کو ان کی رفاقت کے ساتھ ایسی نسبت ہو جیسے نور چہرہ کو نور قریانا نور خورشید کے ساتھ نسبت ہے کون نہیں جانتا کہ کجا آفتاب کجا آدمی کا چہرہ۔ آدمی کیسا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو آفتاب کے نور سے لاکھوں درجہ کم اس کا نور رہتا ہے۔ اس کے شرف کے لیے یہی بہت ہے کہ اس کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔ ایسا ہی اوروں کی رفاقت اور دوستی کو ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رفاقت اور دوستی سے بدارج کم سمجھنا چاہیے، ان کو یہی

شرف بہت ہے کہ ان کے ساتھ اوروں کو تشبیہ دیتے ہیں اور جس کی رفاقت اور دوستی کی تعریف کرتے ہیں تو اس کو یارِ غار کہتے ہیں۔ القصہ اس تقدیر پر وہ صحابہ میں بھی فردا کمل ہوں گے اور کیوں نہ ہوں۔ زبانِ خلق نقارۂ خدا، ان کا یارِ غار ہونا اور صدیق ہونا سب عام و خاص پر روشن ہے دوست و دشمن سب ان کو اسی لقب سے پکارتے ہیں اب یہاں بس کیجئے۔

شیعوں کی طرف سے خلافت صدیقی پر نکتہ چینی

مگر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر افضل بھی ہوئے تو کیا ہوا، خلافت تو بظاہر علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کا حق تھا کیونکہ وہ چچا کے بیٹے اور داماد تھے اور مشہور ہے کہ داماد بمنزلہ فرزند ہوتا ہے تو اس صورت میں خلافت بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اگر پہنچی تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہنچی، ابو بکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کون ہوتے تھے جو خلافت دبا بیٹھے اور اس سے بھی قطع نظر کیجئے، اپنے بعد ہی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ کر دینا تھا وہ بھی نہ ہوا۔ وصیت کی تو خلیفہ ثانی کے لیے کی۔

جواب: سو اس تو ہم کا جواب اول تو یہی ہے کہ خلافت کو سلطنت پر قیاس کیجئے تو البتہ یہی تو ہم پیدا ہوتا ہے لیکن الہام پر پوشیدہ نہ ہوگا کہ خلافت نبوت ارکان دین میں سے بھی رکنِ عظیم اور سلطنت دنیا کے امور میں سے بھی نہایت درجہ کو قبیح، پھر جب حقیقت دنیا اور دین ہی میں اتنا تفاوت ہو کہ اس سے زیادہ اور کیا ہوگا تو اس کے اعلیٰ درجہ اور اس کے اعلیٰ درجہ میں کچھ لگاؤ ہی نہ ہوگا جو ایک کو دوسرے پر قیاس کیا جائے۔ بہین تفاوت وہ از کجاست تا کجا

ہاں خلفائے انبیاء کو اگر خلفاءِ علماء اور خلفاءِ فقراء پر قیاس کیا جائے تو البتہ قیاس کا موقع بھی ہے، علم و فقر بھی امور دینی میں سے ہیں مگر یہ بھی سب جانتے ہیں کہ خلافت علم اور خلافت فقر میں یکانگت اور قرابت کی وجہ سے ترجیح نہیں ہوتی، فضیلت اور کمالات کے باعث ترجیح ہوتی ہے۔ چنانچہ لفظ خلافت ہی خود اس بات پر دلالت کرتا ہے اس لیے خلافت بمعنی نیابت ہے اور نیابت کا استحقاق اس کے لیے ہوتا ہے جو کہ فیہ کا کام دے سکے اور اگر چند آدمی موصوف ہاں صفت ہوں تو وہ ان میں مقدم ہوگا جس میں کمالات اور فضائل فیہ اوروں سے زیادہ تر ہوں گے۔ بموجب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت مابعد انبیاء کے سب پر ثابت ہو گئی تو پھر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق کے ہونے کے کیا معنی، ہاں یہ مسلم کہ خلافت کی لیاقت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی رکھتے تھے لیکن افضل پھر افضل ہے، باقی رہا دبا بیٹھنا، ہم پوچھتے

ہیں کہ جب سب میں زیادہ استحقاق خلافت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی میں ہوا تو خلافت کو اگر دبا ہی لیا تو کیا بجا کیا؟ اپنا حق تھا دوسروں کا حق چھیننے تو جائے گرفت بھی تھی۔

مع ہذا اتفاقاً فن سیر جن کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلیفہ ہونے کے قصے کی خبر ہے خود جانتے ہیں کہ انہوں نے خلافت خود دبا لی تھی یا بکھر دیا ان کے سر دھرنی پڑی۔ باقی رہا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خلیفہ کر دینا اس کا جواب بھی یہی ہے کہ خلافت میں قرابت کو مد اعلیٰ نہیں دینا۔ حضرت فاطمہ زہرا اور حسین رضی اللہ عنہم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مقدم تھے۔ رہا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا عورت ہونا اور علی ہذا القیاس حضرات حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا لڑکا ہونا موافق آئین سلطنت کچھ مانع جانشینی حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ تھا، سلطنت میں بوقت ضرورت اکثر عورتوں اور لڑکوں کو قائم مقام کر دیتے ہیں گو اور ہی کوئی نگرہاں حال رہے۔ قصہ اگر حال نبوت مثل حال سلطنت دُنیا ہے اور قرابت باعث ترجیح ہے تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی مستحق نہ تھے نہ وقت وقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا حق تھا نہ اپنی خلافت کے وقت اس وقت حق تھا تو حضرات حسین رضی اللہ عنہما کا تھا اور اگر حال نبوت مثل حال سلطنت نہیں اور قرابت کو اس میں کچھ دخل نہیں بلکہ افضلیت باعث تقدیم ہونی چاہیے تو پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ کر دیا تو کیا بجا کیا۔ کسی اپنے کو کر دیتے یا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے نزدیک اوروں سے افضل نہ ہوتے تو البتہ جائے اعتراض تھی۔

باب وعدہ خلافت و استخلاف

مع ہذا کلام اللہ سے بھی یہی لگتا ہے کہ جو کچھ ہوا بجا ہوا اور یہی عین صواب تھا۔ اگر یقین نہ

ہو آیت چہارم موجود ہے:

وَعَلَلَهُ الْبَیِّنَاتُ وَغَمَّلُوا الصَّلِیْبَ لِيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اَسْتَخْلَفَ الْبَیِّنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰ لَهُمْ وَلَيُخْلِفَنَّهُمْ فِیْهَا. وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ

”یعنی وعدہ کیا ہے اللہ نے بعینہ ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور اچھے اچھے

عمل کیے اس بات کا کہ ان کو زمین کا خلیفہ اور بادشاہ بنا دے گا، جیسا ان سے پہلوں کو اور ان کے لیے اس دین کو جو ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے چھانٹ رکھا ہے اور پسند کر رکھا ہے خوب جمادے گا اور ان کو بعد اس کے کاندیش اور خوف رہا کرتا تھا، امن دے گا کہ وہ پھر میری ہی عبادت کیا کریں

کے اور کسی کو ذرہ برابر عبادت میں میرا شریک نہ کریں گے اور جو لوگ بعد اس نعمت کے کفران نعمت کریں اور ناشکری کریں وہی ہیں اصلی فاسق طاعت سے نکلے ہوئے۔“

اس آیت کا حاصل یہ ہوا جو کلام اللہ کو سمجھتے ہیں وہ تو سمجھتے ہی ہیں اور جو نہیں سمجھتے وہ ترجموں سے مطابق کر دیکھیں، آج کل سینکڑوں ترجمہ کے کلام اللہ ملتے ہیں کچھ کی نہیں۔

آیہ تمکین معقدمات شیعہ سے کسی طرح مطابق نہیں

اب میری سنئے یہ وعدہ ہر کسی سے نہیں ہوا، اس زمانہ کے مؤمنوں سے ہوا ہے یعنی صحابہ سے ہوا ہے کیونکہ ”الَّذِينَ آمَنُوا“ کے بعد ”مِنْكُمْ“ بھی بڑھایا ہے۔ اس کا حاصل یہی ہوا کہ یہ وعدہ انہیں سے ہے کہ جو تمہارے زمانے میں مؤمن ہیں، پچھلوں کو اس لفظ کے ذکر کرنے سے اس وعدہ سے علیحدہ کر دیا ہے تو اب حضرت امام مہدی کا تسلط روئے زمین پر اس وعدہ سے علیحدہ ہے اور پھر اس پر یہ وعدہ بھی اس زمانہ کے تمام مؤمنوں سے نہیں ہوا بلکہ بعض سے چنانچہ لفظ ”مِنْ“ جو ”مِنْكُمْ“ میں ہے اس کا حاصل یہی ہے بلکہ جب لفظ ”مِنْ“ ضمیر کے اوپر داخل ہوگا، اس کا یہی مطلب ہوگا یا ابتداء کے معنی ہوں گے جو اس جگہ ابتداء کے معنی کسی کے نزدیک بن ہی نہیں سکتے تو بیشک بعض ہی کے معنی ہوں گے کیونکہ بیان کے لیے تو فصحاء کے کلام میں ضمیر پر آتا ہی نہیں اور اگر بالفرض بغرض محال یوں ہی کہیں کہ ”مِنْ“ یہاں بیان کے لیے ہے اور اس کا ہم ہرگز خیال نہ کریں کہ کلام اللہ خدا کا کلام ہے اور وہ بھی معجز نظام کسی ایسے گنوار ہندوستانی کا نہیں کہ ہدایت الخو وغیرہ رسالے عربی زبان کے پڑھ کر عربی کی ٹانگ توڑنے لگے تب بھی شیعوں کی مشکل ہی رہے گی اس صورت میں تمام صحابہ مراد ہوں گے۔

حتیٰ کہ خلفاء ثلاثہ بھی اس لیے کہ جب تک تو وہ بھی مسلمان ہی تھے مرتد نہ ہوئے تھے اور اگر وہ منافقین میں سے تھے اور کبھی مسلمان ہوئے ہی نہ تھے تب بھی وہ تو داخل ہی رہیں گے جو ان کے عقیدہ کے موافق بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرتد ہوئے ہیں اور جو آیات مرتدین کے بیان میں آئی ہیں شیعوں کے نزدیک ان کے حق میں وارد ہوئی ہیں اس صورت میں اوّل تو یہ لازم آئے گا کہ جو جو مرتد ہو گئے ان سے اس بات کا وعدہ تھا کہ ان کے لیے دین پسندیدہ کو جمادیں گے، وعدہ کر کے خدا نے خلاف وعدہ کیا کیونکہ اگر خدا دین کو جمادیتا تو پھر نفس اور شیطان سے کہیں اکٹھا نہ ہوگا۔ وہ مرتد ہو گئے۔ مع ہذا ان کے حال میں یوں بھی بیان فرماتے ہیں کہ جب ان سے یہ وعدہ پورا ہوگا، اس وقت وہ میری ہی عبادت کریں گے یہاں تک کہ ذرہ برابر کسی کو میری طاعت میں شریک نہ کریں گے یا یوں کہئے کہ یہ بھی ایک وعدہ ہے اخبار نہیں۔ بہر حال اس صورت میں لازم آئے گا کہ تادم باز

بسمین وہ اسی حال پر تھے جس کے انعام میں یہ وعدہ ہوا تھا یعنی ایمان اور عمل صالح۔ چنانچہ اہل ایمان "وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ أَتُؤْمِنُوا بِكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ" سے یہی معنی سمجھتے ہیں کہ باعث اس وعدہ کا ایمان اور عمل صالح ہیں۔ پھر نہ معلوم کہ باوجود ان سب باتوں کے وہ کیونکر مرتد ہو گئے دو حال سے خلی نہیں بیاہوں کہ جو کہ خدا نے خلاف وعدہ کیا یا خدا سے آئندہ کی خبر میں غلطی ہوئی۔

جن سے وعدہ تھا ان کو تمکین ہی حاصل نہ ہو سکی لہذا وعدہ پھر بھی غلط نکلا

اور یہ سب نہ کبھی "مُؤْمِنِينَ أَتُؤْمِنُوا بِكُمْ" سے وہ چار پانچ صاحب ہی مراد ہیں جو بزم شیعہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان رہے اور مثل دیگر صحابہ مرتد نہ ہوئے اس صورت میں "مِنْ" اگر "بِكُمْ" میں بیان کے لیے ہوگا تو بیچک ان سب کے ساتھ اس وعدہ کا پورا ہونا چاہیے کیونکہ وہ سب صاحب اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے مسلمان ہو لیے تھے حالانکہ ان میں سے یہ سب وعدے سے حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اور کسی کے لیے پورے نہیں ہوئے۔ حضرت ابوذر غفاری اور سلمان فارسی اور حضرت بلال بلکہ حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم تک یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حال تو ظاہر ہی ہے اور حضرت امام سبط اکبر کا حال یہ ہے کہ چھ مہینہ کے لیے وہ خلیفہ تو ہو گئے پر چاہیے ان کو کسی طرح کی تمکین دین حاصل ہوئی ہو ہرگز تمہور میں نہیں آئی۔ خاص کر شیعوں کے نزدیک کیونکہ امیر معاویہ جو ان کے نزدیک بالاتفاق کفار اور مکررین امامت آئمہ میں سے ہیں تمام خلافت پر غالب اور مستولی تھے اور پھر اس تو ہرگز میسر ہی نہیں آیا نہیں تو خلافت ہی کیوں ان کے حوالہ کرتے اور کیوں ساری عمر تقیہ میں گزارتے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی سنیوں کے نزدیک خلافت اور تمکین کچھ حاصل تھی۔ شیعوں کے نزدیک تو ہرگز حاصل نہیں کیونکہ یں شیعہ اس زمانہ میں بھی غفلت ہی رہا اور حضرت کو تقیہ ہی کیے بنی۔ شیخین کی تعریف ہی کیا کیے یہ کبھی نہ ہوا کہ کل کھلیں اور بے کھٹکے ہو کر خلوت جلوت میں برابر یکساں گزاریں۔ چنانچہ اس کی سند آگے ان شاء اللہ تعالیٰ معلوم ہو جائے گی اور علیٰ ہذا القیاس اس موعود یعنی کفار کے شر سے حضرت امیر کو بھی بطور شیعہ حاصل نہیں ہوا وہی امیر معاویہ ہمیشہ تنگ کرتے رہے اور آپ کے ہاتھ سا کڑا ملک نکال لیا۔ بہر حال سب سے آگروعدہ ہو تو کلام بالکل انہی ہو جائے گا۔

استحلاف بمعنی توطن کسی طرح موزوں نہیں

اور اگر من کے یہاں ہونے کے ساتھ استحلاف کو بھی بمعنی توطن لیتے جیسا کہ بعض علماء شیعہ

نے تاویل کی ہے اور بمعنی تسلط نہ لیجئے تو قطع نظر اس کے کہ من کا ضمیر پر بیانیہ ہونا خلاف استعمال عرب ہے اول تو یہ مشکل ہے کہ استخلاف کے ساتھ جب لفظ ”لِی الْأَرْضِ“ ہوتا ہے تو تسلط ہی کے معنی مراد ہوتے ہیں، دوسرے اس صورت میں قید ”وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ“ محض بے معنی ہو جائے گی، زمین میں توطن تو صالح اور فاسق کو برابر حاصل ہوتا ہے بلکہ فاسق کو بوجہ احسن بلکہ آمنوا کی قید بھی بیکار ہی نظر آتی ہے کیونکہ کفار کے توطن میں کیا کمی ہے۔ القصہ ان لغویات سے کلام اللہ کی تفسیر کی جاتی ہے یہ نہیں جانتے کہ لغو کلام کا کلام اللہ میں ہونا منجملہ محالات ہے۔

استخلاف بمعنی تسلط ہے بدالالت فی الارض

اور بعض علماء شیعہ بہت کوشش کر کے یہ بات نکال کر لائے ہیں کہ ”الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ“ سے حضرت امیر مراد ہیں اور جمع کا صیغہ تعظیم کے لیے ہے یا حضرت امیر اور ان کی اولاد مراد ہیں مگر ہم کہتے ہیں کہ قطع نظر اس بات کے کہ جمع سے واحد مراد لینا بے ضرورت بیجا ہے اور باوجود یکہ جمع کے معنی بن سکیں، واحد کے معنی مراد لینے اہل سخن کے نزدیک بالقطع ممنوع، شیعہ اس کا کیا جواب دیں گے کہ تمکین دین اور زوال خوف تو کسی کو بھی میسر نہیں آیا اس لیے ضرور ہوا کہ ”مِنْكُمْ“ کے من کو معیضیہ قرار دیجئے اور استخلاف سے تسلط مراد لیجئے مگر چونکہ ”الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ“ کے من تو کم سے کم تین تو ہونے ضرور ہوئے اور زیادہ ہوں تو نبھا۔

القصہ ابتداء سے اس آیت کے اتنی بات نکلی کہ صحابہ سے خداوند کریم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ تم میں سے کم سے کم ایسے تین شخصوں کو کہ وہ ایمان اور عمل صالح رکھتے ہوں گے، ضرور ہم خلیفہ بنا کر روئے زمین کو ان کے تسلط میں کر دیں گے اور اس دین کو جو علم الہی میں اس سے بہتر کوئی دین نہیں اور خدا نے ازل سے انہیں کے لیے چھانٹ کر رکھا، ان کے واسطے جمادیں گے کہ ان کے جیتے جی اس میں رخنہ نہ پڑے گا اور ان کے خوف و ہراس کو کہ جو کفار سے رکھتے تھے بالکل امن اور اطمینان سے بدل دیں گے، پھر بعد اس کے یا تو وعدہ میں داخل ہے یا فقط بطور اخبار بالغیب کے بیان کرتے ہیں کہ وہ باوجود ان فرخشوں کے جو ایسی خلافتوں کو لازم ہیں ہرگز عبادات میں سستی نہ کریں گے اور پھر وہ عبادت بھی ایسی اخلاص کی ہوگی کہ ہرگز اس میں بوئے شرک اور ملّاؤ ریا کا نہ ہوگا۔

آیت استخلاف کی صحیح تفسیر

اب اس کترین کی التماس حضرات شیعہ کی خدمت میں یہ ہے کہ وعدہ الہی میں تو مخلف ہو ہی

نہیں سکا۔ سو جن کے ساتھ اس وعدہ کا ایسا ظہور میں آئے وہی مصداق ان اوصاف مذکورہ کے ہوں گے اور وہ بیشک بشارات خداوندی ایمان کامل اور اعمال صالح رکھتے ہوں گے بلکہ سب اقران و امثال میں ان دو باتوں میں بڑھے ہوئے ہوں گے کیونکہ جب ایمان اور عمل صالح کے انعام میں یہ نعمتیں ملی ہیں تو انہیں کو ملی ہوں گی جن کا ان دو کمالوں میں نمبر اول ہوگا ورنہ (نور باللہ) خدا کے یہاں بھی بڑا اندھیر ہے کہ استحقاق کسی کا ہو اور انعام کسی کو مل جائے۔ سینوں کے طور پر تو خدا کو اختیار بھی ہے کہ کسی کا حق کسی کو دے دے لیکن اس کی حکمت کی شان یہی ہے کہ جس چیز کو کسی کے لائق دیکھے اسے ہی دے اور یہی معنی ہیں اس کے کہ خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا اور اس آیت کے معنی بھی مختصین کے نزدیک یہی ہو سکتے ہیں۔ ”أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ“ یعنی ہر چیز کو اسی کے مناسب طور پر پیدا کیا، پھر آئندہ مناسب ہی مناسب کاموں کی انہیں سوجھائی لیکن شیعوں کے نزدیک خدا کو اختیار نہیں کہ کسی کا حق کسی کو دے دے، اس لیے کہ ان کے نزدیک خدا پر عدل واجب ہے، اس صورت میں ممکن ہی نہیں کہ جن کو خدا نے خلیفہ بتایا وہ اوروں سے خلافت کے استحقاق میں کم ہوں بلکہ ان کا قائل ہونا استحقاق خلافت میں ضرور پڑا۔

نہ صرف استحقاق خلافت بلکہ ترتیب خلافت کا پتہ بھی اس آیت سے چلا اور نیز اسی تقریر سے یہ بھی نکل آیا کہ ان میں سے جو ایمان میں اور عمل صالح میں دوسروں سے بڑھ کر ہوگا وہ اس انعام میں مقدم رکھا جائے گا کیونکہ تقسیم انعام کی خوبی یہ ہے کہ اول نمبر والے کو اول دیں مگر چونکہ یہ انعام خلفائے راشدین پر ہوا اور یہ وعدہ خلفائے اربعہ کے ساتھ بہ ترتیب معلوم و قائل آیا تو بشارات خداوندی معلوم ہوا کہ یہ اصحاب اربعہ ایمان اور عمل صالح میں اوروں سے بڑھ کر تھے اور وہ بھی اس قدر کہ ان کے ہوتے قابلیت اس انعام خاص کی ان کے سوا کسی میں نہ تھی اور باہم ترتیب خلافت ایک دوسرے سے ایمان اور عمل صالح میں مقدم تھا۔ اول اول اور دوم دوم اور سوم سوم اور چہارم چہارم۔

آیت استخلاف کا مصداق صرف خلفاء اربعہ ہیں

اور بعد اس کے ہر چند حضرت سید اکبر امام ہمام امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلفاء راشدین میں محدود ہیں مگر ان کو جو خلافت پہنچی تو اس وعدہ کے سبب نہیں پہنچی کیونکہ ان کو قبل نزول اس آیت کے کس دن خوف ہوا تھا وہ زمانہ ان کے لڑکپن کا تھا، دشمنوں سے اندیشہ بڑوں کو ہوتا ہے لڑکوں کو نہیں

ہوتا بلکہ وصول اس نعمت کا ان ملک زائد از قدر وعدہ تھا، اسی لیے ان کی خلافت کے لیے حکمین اور جماؤ لازم نہ ہوا، باقی رہے امیر معاویہ ہر چند ان کو بظاہر حکمین میسر آئی لیکن حقیقت میں وہ حکمین دین نہ تھے حکمین ملک و سلطنت تھی۔ چنانچہ واقفان فن سیر پر پوشیدہ نہیں کہ خلفاء اربعہ کے اطوار اور انداز اور امیر معاویہ کے اطوار اور انداز میں زمین آسمان کا فرق تھا، ان کی گزران فقیرانہ اور زاہدانہ تھی اور امیر معاویہ کا طور ملوک کا سا تھا اس لیے اہل سنت ان کو باوجود یکہ صحابی سمجھتے ہیں خلفاء میں نہیں گنتے، ملوک میں شمار کرتے ہیں لیکن ملوک ملوک میں بھی فرق ہے، ایک نو شیرواں تھا ایک چنگیز خان۔

سو یہ ہر چند ملوک میں سے تھے لیکن اس کے یہ معنی ہیں کہ خلفاء راشدین کے مقابلے میں دنیا دار معلوم ہوتے تھے۔ جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام اور انبیاء کے مقابلہ میں مالدار معلوم ہوتے ہیں نہ یہ کہ ظلم و ستم کے روادار تھے غرباء کے حق میں ستمگار تھے ان کا علم اور رعایا پروری اور دلجوئی خلاق شہرہ آفاق ہے۔ مع ہذا یہ ان لوگوں میں سے نہیں کہ جن کو قرآن واقعی کفار سے کبھی خوف ہوا ہو۔ یہ بات فقط مہاجرین اولین کے حق میں صادق آتی ہے نہ حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ بات پیش آئی کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اور مہاجرین اولین میں سے بھی جیسا خوف خلفاء اربعہ کو ہر تیب ہوا ہے اور کسی کو پیش نہیں آیا۔ چنانچہ کتب تاریخ سے خوب واضح ہے۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ انعام مذکور خاص انہیں کو ملا اور یہ وعدہ انہیں کے ساتھ ظہور میں آیا کیونکہ یہ خوف اصل سے بوجہ ایمان اور عمل صالح تھا، کفار کی دشمنی کی بناء دیکھتے تو انہیں دو باتوں پر تھی پھر جس میں ایمان اور عمل صالح زیادہ ہوگا، دشمنی کفار بھی اسی کے ساتھ زیادہ ہوگی خوف کفار بھی اسی کو زیادہ ہوگا، دوسرے محبت اور اخلاص جو ایمان اور عمل صالح کا خلاصہ ہیں خوف ہی کے وقت معلوم ہوتے ہیں اور خوف ہی سے پرکھے جاتے ہیں تو جس کو اس قسم کا خوف زیادہ ہوگا۔ اسی میں ایمان اور عمل صالح بھی زیادہ ہوگا۔ القصہ خوف کفار مہاجرین اولین کو ہوا ہے۔ حضرت امام ہمام امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو کفار سے کیا اندیشہ تھا۔ حضرت امام ہمام رضی اللہ عنہ اس زمانہ تک لڑ کے تھے امیر معاویہ جب تک مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے۔

آیت استخلاف کی بنیاد مہاجرین کی قربانیاں ہیں

اس آیت کے مضامین میں غور کیجئے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ باعث اس وعدہ کا فقط یہ ہوا ہے کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصاً مہاجرین اولین نے باوجود بے سروسامانی اور ذلت اور خواری کے جو ابتداء اسلام میں تھی ایک جم غفیر اور گردہ اعظم کفار کی مخالفت محض خدا کی رضا

سعدی اور دین کی ترویج کے لیے اختیار کر کے اپنی جانیں جلائیں اور ان کو اپنا دشمن بنا کر طرح طرح کی ایذائیں ان کے ہاتھ سے اٹھائیں، سالہا سال خوف و خطر میں گزارے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ نوبت اس کی آئی کہ گھر سے بے گھر ہوئے زن و فرزند سب کو چھوڑ کر جلاوطن ہوئے، پھر اس پر بھی صحن نہ ملا نوبت قتلِ قتال کی پہنچی مدت ہائے دراز تک کفار مگنوں سا رنوج کشی کرتے رہے اور جو چہ کر نہیں آئے تو مسلمانوں کے گھر سے تو خالی بھی نہیں رہے۔ اس میں بہت سے مہاجرین میں سے نورنیزہ کی مہر اسی میں بہت سے انصار شہید ہوئے۔ جب خداوند کریم عالم الغیب والشہادت کو ہن کا کامل امتحان ہو گیا تو رحمت الہی کو ان کی اس جان کا ہی اور جان گدازی پر جوش آیا، لازم پڑا کہ ہن کی اس جاں نثاری اور جانبازی کی مکافات اس دایرۂ دنیا میں بھی کی جائے، اس لیے جس جس قسم کی کھتیشیں انہیں پیش آئی تھیں اس کے مقابل کی نعمتیں ان کو ملیں اور اس کے مکافات کی راحتیں ہن کو عطا ہوئیں تسلط کفار جو ان کے حق میں باعث تمام آزار اور سبب ہمہ تکلیفات تھا۔ استخلاف سے مبدل ہوا کفار کے تسلط کے باعث جو نماز، روزہ ادا نہیں کر سکتے تھے اور ذکرِ خداوندی سے ممنوع تھے اور اس سبب سے حسرت ہائے گونا گوں دل میں رکھتے تھے بلکہ باعث جلاوطنی کا بھی حقیقت میں بھی تھا اس کے عوض میں حکمین دین ملی اور خوف کے عوض میں امن عطا ہوا۔ اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر چند شرف گونا گوں رکھتے ہیں لیکن فقط اس شرف کو استحقاق خلافت میں دخل نہیں۔ یہ اس جان کا ہی اور جان گدازی کا ثمرہ ہے جس کا مذکور ہوا۔

آیت مذکورہ سے مشیت خلافت قریش کا راز بھی کھل گیا

اور خلافت کے مخصوص ہونے کی وجہ بھی بنسبت قریش کے معلوم ہو گئی۔ یعنی یہ جو حدیث شریف میں آیا ہے کہ خلافت حق قریش ہے، انصار کو اس میں کچھ دخل نہیں، وجہ اس کی یہی ہے کہ خلافت حقیقت میں انعام اور مکافات میں مہاجرین کی جانفشانیوں کے ملی ہے چونکہ مہاجرین قریش میں سے ہیں اس لیے انہیں میں منحصر دینی چاہیے ہاں جو کہ انصار اور احوال خلفاء ہوا کرتے ہیں جیسے قاضی وغیرہ وہ البتہ نصرت کے صلہ میں انصار میں سے ہونے چاہئیں اور یہ بھی مکرر روشن ہو گیا کہ حضرت امام حسن اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کو جو خلافت ملی ہے تو وہ خلافت نہیں جو وعدہ کے سبب ملی ہے بلکہ یہ بھی اہل فہم و انصاف پر صاف روشن ہو گیا کہ ان کے زمانے میں ان کے ہاتھوں سے جو کچھ دین کے مقدمہ میں ظہور میں آیا اور اس نے رواج پایا جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حضرت فاطمہؑ ہر ارضی اللہ عنہا کو فدک کا بند بٹا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا منہ کا منع کرنا

اور تراویح کی تاکید اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جمعہ میں ایک اذان کا پڑھنا وہ سب من جملہ دین پسندیدہ اور مصداق مضمون "إِذْ نَقُصُّ لَهُمْ" ہے علیٰ ہذا القیاس جس مسئلہ پر ان کے زمانہ میں ان کی وجہ سے اجماع اور اتفاق ہو گیا ولا ریب حق و صواب ہے اس سے جو منحرف ہے وہ دین پسندیدہ خداوندی سے منحرف ہے اور جو اس کا منکر ہے وہ حق کا منکر ہے۔

آیت مرقومہ حضرت فاروق کی نزاہت کی دلیل ہے

اور نیز قطع نظر اس کے کہ جملہ "وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ" حقیقت خلافت خلفاء ثلاثہ پر بوجہ احسن دلالت کرتا ہے اور شیعوں کے اس توہم کو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ایام مرض وفات میں کاغذ، قلم، دوات منگایا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نہ آنے دیا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے فرمان ہی کے لکھنے کو منگایا تھا بخ و بنیاد سے اکھاڑتا ہے۔ جملہ "وَلَيَمَكَّنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الْإِلٰهِي اَرْقَضِي لَهُمْ" سے بھی المل فہم کے نزدیک یہ توہم زائل ہو گیا کیونکہ خلافت خلفاء ثلاثہ جب خلافت موعودہ ہوئی تو ان کی خلافت کی حکمیں بھی منجملہ حکمیں دین پسندیدہ ہوگی۔ ہاں اگر خلافت امور دینی میں سے نہ ہوتی تو البتہ اس استدلال کی گنجائش نہ تھی۔ سو شیعہ اس کا انکار نہیں کر سکتے ورنہ حضرت امیر اور ان کی اولاد رضوان اللہ علیہم اجمعین کو طالب دنیا کہنا پڑے گا۔ (نعوذ باللہ منہا) غرض یہ طعن اور نیز اور بہت سے مطاعن جو شیعہ اور خارجی بسبب اپنی تیرہ درونی کے حضرات خلفاء راشدین پر کرتے ہیں مندرج ہو گئے۔ اگرچہ یہ طعن اور سوا اس کے اور مطاعن بنظر غور اہل بصیرت کے نزدیک معترضوں کی تیرہ درونی سے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ دربارہ فدک تو اوراق مابعد سے ان شاء اللہ یہ حال واضح ہو جائے گا۔ تفصیل اس اجمال کی بہ نسبت جملہ مطاعن کے اس جاہ پر اگر بے موقع اور بے جا نہ ہوتی تو بقدر گنجائش وقت درج اوراق کرتا مگر چونکہ کاغذ، دوات، قلم کے نہ آنے دینے کا طعن بھی بزم شیعہ کلا ترین مطاعن خلفاء راشدین ہے تو بنظر تسکین خاطر بعض بنی نوع اگرچہ اس بحث میں بے موقع ہے مختصر مختصر عرض کرتا ہوں تاکہ اس بڑے طعن کا اندفاع موجب اندفاع دیگر مطاعن صغیرہ ہو جائے۔

فرمان نبوی کی تعمیل نہ ہو سکنے کے اسباب

حضرت من اول تو کسی روایت میں یہ نہیں کہ کاغذ، قلم، دوات کے آنے کے مانع اول حضرت عمر ہی تھے۔ البتہ جب سرور کائنات علیہ علی آلہ الصلوٰات والتسلیمات نے کاغذ، دوات، قلم منگائے تو

فرمایا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اس محفل میں موجود تھے۔ حاضرین مجلس کی رائے اس وقت مختلف ہوئی، کسی نے کہا کہ احتمال امری کیجئے، کوئی بولا کہ اس شدت مرض میں یہ تکلیف نہ دیجئے۔ اس رد و کد میں ایک شور برپا ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے میں یہ آیا کہ یہ ارشاد مریدانہ اور مشفقانہ ہے بطور ایجاب نہیں جس کی تکمیل واجب ہو کیونکہ خداوند کریم اس سے پہلے فرما چکا ہے۔
 ”الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتِمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي“ ”یعنی حجۃ الوداع کے دن خداوند کریم کی طرف سے یہ بشارت آئی کہ آج کے دن میں نے اپنے دین کو تمہارے لیے پورا کر دیا اور تمام کام کر دی میں نے تم پر اپنی نعمت۔“

پھر جب خداوند کریم دین کو کامل کر چکا ہو تو اب یہ امر کسی نئے امر دینی کے لکھوانے کے لیے تو نہیں ہے ہونہ ہو اسی کی تفصیل ہوگی۔ سو یہ بات چنداں ضروری نہیں جو اس امر کی تعمیل واجب ہو بلکہ بوجہ شفقت کاملہ آپ یہ ارشاد فرماتے ہیں۔ سو جب باوجود شدت مرض کے آپ نے ہمارے لیے یہ تکلیف گوارا فرمائی تو کیا اس کی مکافات یہی ہے کہ ہم بھی آپ کے لیے اس تکلیف کو گوارا کریں بلکہ مقصیٰ ادب یہی ہے کہ آپ کے فرمانے کا کچھ خیال نہ کیجئے اور اس قصہ کو جانے دیجئے اور سچ بھی تو ہے اگر کسی کا باپ بھوک کی شدت میں آپ تو نہ کھائے اور بیٹے کو بوجہ شفقت اپنے حصے کے کھانے کو فرمائے تو کیا مناسب ہے کہ فرزند عاقل دیدہ دانستہ پدر مہربان کو بھوکا چھوڑ کر سب نکل گئے بلکہ ایسے وقت میں مقصیٰ ادب یہی ہے کہ والد مہربان کا کہنا نہ مانے اور اس نا فرمانی ہی کو اپنی سعادت جانے، غرض حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بوجہ مذکور اور نیز بایں غرض کہ کسی طرح یہ شور موقوف ہو جائے ”حَسْبُنَا كِتَابُ اللَّهِ“ کہا۔ یعنی کافی ہے ہم کو قرآن شریف، پھر اس تکلیف کے دینے کی کیا ضرورت؟ اور اگر کسی کتاب نا درالوجود کی کوئی ایسی روایت جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مانع اول ہونے پر اس طرح دلالت کرے کہ اس میں گفت و شنید کی گنجائش باقی نہ رہے، کوئی شیعہ پیش بھی کرے تو قطع نظر اس کے کہ وہ روایت واقعی صحیح ہے۔ کوئی جلسازی نہیں تب بوجہ مذکور کوئی گرفت کی بات نہیں، بہر حال منشاء اس اعتراض کا قلت فہم و فراست اور نقصان عقل و درایت ہے اور انجام کو دیکھا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے ٹھیک تھی۔ آخر جب یہ شور ہوا تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تمام مجمع کی نسبت یہ ارشاد فرمایا کہ یہاں سے کھڑے ہو جاؤ، اگر کاغذ، دوات، قلم کے منگانے کا ارشاد پیام خداوندی ہوتا اور ضروری اور واجب ہی ہوتا تو مکرر آپ بتا کید فرماتے اور علیٰ ہذا القیاس اگر یہ شور جیسا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سمجھا، موجب آزار خاطر حضرت سیدالامراء صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتا تو کھڑے ہو جانے کو نہ فرماتے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے کا وزن

بلکہ یوں کہئے کہ جیسے اور بہت مواقع میں باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے خدا کی مرضی کے موافق نکلی ہے اور اسی وجہ سے ان مواقع میں ان کی رائے کے موافق وحی آئی اگر وحی نہ آتی تو بوجہ مخالفت رائے نبوی اہل اسلام کے نزدیک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے برا کوئی نہ تھا یہاں بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے خداوند کریم علیم حکیم کی مرضی کے موافق تھی ورنہ جیسے کفار کی تکذیب کے وقت وحی آسانی شاہد صدق رسول ربانی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوتی تھی یہاں بھی وحی آتی اور آپ کی رائے کی تصدیق ہو جاتی، ہاں اتنی کمی رہ گئی کہ بعد اس واقعہ کے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصدیق کے لیے وحی نازل نہ ہوئی۔ غالباً چند روزہ واقعہ کی تصدیق کو کافی سمجھ کر ایک اس واقعہ میں بغرض تصدیق عمری وحی نازل نہ فرمائی اور نیز یہ واقعہ بد لالت آیت مذکورہ ”اٰكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ“ چہاں ضروریات دینی میں سے نہ تھا۔ چنانچہ مذکور ہوا اور بایں ہمہ آخر زمانہ حیات نبوی میں جو وقت کمال توجہ الی اللہ اور استغراق تام کا ہے کیا مناسب تھا کہ ایسے امور غیر ضروریہ کی طرف اپنے نبی کو مصروف کیا جائے۔ بایں وجہ غالباً اس واقعہ میں وحی ربانی جو صدق عمر اور شاہد حقیقت قول خلیفہ دوم ہو جائے نہ آئی ورنہ یہ وہامات خود مندفع ہو جاتے۔ بالجملہ یہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بولنا تو عقل سلیم کے نزدیک قابل تعریف ہے اور اس پر بھی بوجہ تیرہ درونی اور بغض ذاتی کے اگر کوئی برا کہے جائے تو اس کا جواب بجز اس شعر کے اور کچھ نہیں۔

چشم بد اندیش کہ برکنده باد عیب نماید ہنرش در نظر

کاغذ، قلم، دوات نہ لانے میں بھی شریک تھے صرف فاروق کیوں؟

اور اگر ارشاد نبوی کو دربارہ طلب کاغذ و قلم و دوات شفقت پر محمول کرنا کسی تعصب کو بحکم ”المراء یقیس علی نفسہ“ کے تعصب نظر آئے اور باوجود اس توضیح کے اس ارشاد کو ارشاد وجوب ہی کہے جائے تو یہ اعتراض فقط حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی پر نہ ہوگا بلکہ اس کے یہ معنی ہوئے کہ تمام اہل بیت اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اس جرم میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شریک نکلے اور وہ قصہ ہو گیا۔ مرگ انبوہ مشنہ دارد بلکہ اہل بیت اس تقصیر میں اول درجہ کے تقصیر دار ہوئے کیونکہ اول تو مریض کی امر و نہی کے مخاطب اس کے گہروالے ہی ہوا کرتے ہیں۔ دوسرے

حضرت عمر تو غیر تھے، عبادت کے لیے ساعت دو ساعت کے لیے آگئے تھے، اگر ان کی لاشت کے وقت کچھ اندیشہ تھا تو جب وہ اٹھ کھڑے ہوئے پھر کون مانع تھا، آخر اس قصے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کئی روز زندہ رہے بلکہ غور سے دیکھئے تو در صورتیکہ اس ارشاد کو ارشادِ اجمالی اور امر و جوبی کہئے جیسے شیعوں کا جی چاہتا ہے تو پھر جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی (نعوذ باللہ) اس جرم کے شریک ہوئے کیونکہ جس قدر ہم پر اطاعت خدا و رسول واجب ہے، اس سے زیادہ نبی پر تبلیغ احکام واجب ہے۔ چنانچہ آیت:

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ لَمَّا يَبْلُغْتَ رِسَالَتَهُ
 ”اس پر دلالت کرتی ہے اس لیے کہ حاصل اس آیت مذکور کا یہ ہے کہ اے رسول! پہنچا دے جو کچھ تیری طرف نازل کیا گیا ہے اور اگر یہ کام نہ کرو گے تو پھر تم نے کوئی پیغام بھی خدا کا نہ پہنچایا۔“ اچھی اور ادھر سب نے سنا ہوگا کہ ”نزدیکیاں را بیش بود حیرانی“ چنانچہ اشارات کلام اللہ و حدیث بھی اس پر شاہد ہیں تو اب لا جرم ہی کہنا پڑے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تبلیغ احکام اس سے زیادہ واجب ہے کہ ہم تم پر قبیل احکام اور ادھر یہ بھی ظاہر ہے کہ تبلیغ جب ہی کہہ سکتے ہیں کہ احکام کا بیان بھی کیا جائے۔ اتنی بات کو کہ کاغذ، دوات، قلم لاؤ، میں تمہیں وہ باتیں لکھ دوں کہ اگر ان پر عمل کرو تو گمراہ نہ ہو، تبلیغ حکم کہنا اسی کا کام ہے جو برائے نام ہی انسان ہے اور عقل سے محروم اور دانش سے ناکام ہے۔ الغرض اس صورت میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اگر قصیر بھی ہوئی تو اتباع نبوی پھر بھی ہاتھ سے نہیں گیا۔ اگر حضرات شیعہ جناب سرور کائنات علیہ علی آلہ افضل الصلوٰت والتسلیمات اور اہل بیت کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی نسبت اس قصیر کو (نعوذ باللہ منہ) تجویز کر سکیں تو ہمیں بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قدر گناہ گاری کا چنداں رنج نہیں، اول تو مرگ انبوہ شے دارد۔ دوسرے:

شام کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتے گوشت خاک ماہم برباد رفتہ باشد

شیعوں کو یہ خواب کہاں سے آ گیا کہ فاشا نبوی

تحریر مسئلہ خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ تھا

مع ہذا دوات، قلم، کاغذ کے منگانے سے یہ کہاں لازم آ گیا کہ فرمان خلافت حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی تحریر فرماتے۔ ظاہر مہارت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تو اس کو

تقاضا کرتا ہے کہ دین اسلام کی باتوں کا خلاصہ جو تمام ارکان کی جڑ ہو، تحریر فرماتے یا احکام دین میں سے وہ احکام کہ ان کی تعمیل کو تمام احکام کی تعمیل لازم ہو، لکھواتے۔ چنانچہ آپ کا یہ فرمانا کسان پر عمل کرو گے تو گمراہ نہ ہو گے، اس بات پر گواہ ہے، سو کسی ایک کی خلافت معین کرنے میں یہ بات ظاہر ہے کہ حاصل نہیں ہوتی، یوں تاویل میں گھڑنے کو ہر کسی کے منہ میں زبان ہے اور اگر جھکے اس مضمون کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کو لازم بھی سمجھتے تو پھر کب تک؟ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد پھر کچھ نہیں حالانکہ روایت کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ پھر کبھی گمراہی پیش ہی نہ آئے گی اور یہ بھی نہ سہی، پیاس خاطر شیعہ ہم نے اس پر بھی خاک ڈالی اور اسی کو تسلیم کیا کہ فرمان خلافت کی تحریر ہی مد نظر تھی لیکن پھر بھی یہ کہاں سے نکل آیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی تصریح کے لیے حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اضطراب تھا کہ بدلیل نقلی و عقلی فرمان خلافت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مرکز خاطر حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تھا۔ نقل کی بات پوچھتے تو صحاح اہل سنت میں کچھ ایسا موجود ہے کہ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ میرے جی میں تھی کہ ابوبکر کے لیے لکھ دوں تاکہ کسی تمنا والے کو پھر تمنا باقی نہ رہے مگر نہ خدا کو سوا ابوبکر کے کسی کی خوشی ہے نہ مؤمنین اُن کے سوا کسی اور کے روادار! اچھی

فرمانِ نبی سے خلافت صدیقی کی طرف اشارہ

سمجھا جائے تو عین قرین قیاس ہے

غرض اس روایت کا حاصل اسی پر دلالت کرتا ہے کہ اگر لکھنے کا ارادہ تھا تو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے تھا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے نہ تھا اور عقل سے پوچھتے ہو تو سنئے کہ دستور کے موافق آپ کو غالباً یہ اندیشہ ہوگا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بوجہ قربت شاید خیال جانشینی ہو اور اُن کے احباب و اقارب اس باب میں سماعی ہوں تو اس صورت میں حق حقدار یعنی ابوبکر کو نہ پہنچے گا اور اس قسم کا خیال بہ نسبت ابوبکر رضی اللہ عنہ اہل عقل کے نزدیک متصور نہیں نہ قرینہ ہے نہ احتمال و راہت ہی ہو تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسبت ہو۔ بالجملة اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بیچ تاب تھا اور اس قدر اس کی ممانعت میں اضطراب تھا سو بحمد اللہ بزمِ شیعہ آپ کا یہ خیال بھی راست ہوا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خواستگار خلافت ہے۔ پھر اس پر آپ کی پیشین گوئی بھی صحیح ہوئی، خدا تعالیٰ کو اور مومنوں کو سوا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اور کوئی پسند ہی نہ آیا۔ القصہ اگر لکھنے کا

ارادہ تھا تو حضرت ابو بکر کے لیے تھا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شکایت کریں تو صدیقی کریں
 شیعہ بیان حضرت علی کو کیا کام؟ مگر وہ قتل ہے کہ بھوکے کو دو اور دو چار روٹیاں ہی سمجھ میں آتی ہیں اور علی کو
 خواب میں چھبڑے ہی نظر پڑتے ہیں، کوئی بات کیوں نہ ہو، حضرات شیعہ کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ
 عنہ کی خلافت اور اماموں کی امامت ہی نظر آتی ہے۔ خیر اس جگہ یہ بات اتفاقی تھی مطلب اصلی یہ تھا
 کہ جملہ ”وَلَيَمْلِكُنَّ“ سے بالا جمال تمام مطاعن خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم کا جواب نکلتا ہے۔ اب یہاں
 بس کیجئے کہ خلافت خلفاء ثلاثہ بوجہ احسن اس آیت سے ثابت ہوگئی اور ان کا فضل و کمال اور ان کی
 بزرگی ”کما ینبہی“ اس آیت سے ظاہر ہوگئی۔ اُدھر سنیوں کے مذہب کی حقیقت اور ان کی حقانیت
 اور شیعوں کے خیال و گمان کا بطلان اور ان کے طریقہ کی مذمت بخوبی روشن ہوگئی۔

خلفاء نعمت خلافت سے اصالتاً نوازے گئے دوسرے انکے طفیلی تھے

مگر حبیہ کے لیے اس قدر اور گزارش ہے کہ اس آیت میں اوّل کلمہ ”لَهُمْ“ اس بات پر دلالت کرتا
 ہے کہ اصل حقیقت میں دین پسندیدہ انہیں اشخاص کے لیے جمایا جائے گا جو خلیفہ بنائے جائیں
 گے اور یہ نعمت عظمیٰ اولاً بالذات انہیں کو عطا ہوگی جو خلیفہ ہوں گے۔ مقصود اصلی وہی محبوب ہوں گے
 لوہوں کو وہ دولت اگر ملے گی تو انہیں کے تصدیق ملے گی مگر اختلاف اور تبدیل خوف میں ان کا اصل
 لا حصول ہونا عام فہم سمجھ کر الفاظ موجودہ پر اکتفا فرمایا پر دین کا ایک کے لیے اصلی ہونا اور باقیوں کے
 لیے اُس کا تصدیق ہونا چونکہ ایسا عام فہم نہ تھا کہ شیعہ بھی مان جائیں تو ”لَيَمْلِكُنَّ“ کے بعد لفظ ”لَهُمْ“
 بھی بڑھایا، فرض اُس مہم میں اور بھی اگر اُس دین پر ہوں گے تو وہ انہیں کی جوتیوں کا صدقہ ہوگا۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ تسلط اہل اسلام اور تمکین دین پسندیدہ اور ازالہ خوف اور تبدیل امن جو
 کچھ مناسب کا سب اصل میں انہیں چار یار کے لیے تھا لیکن جیسے کسی امیر کی کوئی دعوت کرتا ہے تو
 اُس امیر کے اقربا اور اُس کے حشم خدم کی دعوت بھی اُس امیر کے طفیل میں کر دیتا ہے، پھر جو امیر
 مذکور کو کھلاتے پلاتے ہیں اُس کے اقربا اور حشم خدم کو بھی وہی کھلاتے ہیں۔ فرق ہوتا ہے تو اصالت
 اور جمعیہ کا اور اعزاز و اکرام کا ہوتا ہے۔ ایسے ہی یہ نعمت عظمیٰ اور دولت جلیلہ خلافت وغیرہ بھی
 ہر چند اصل میں انہیں چار یار کے لیے ہیں لیکن ان کے طفیل میں اس نعمت عظمیٰ سے تمام اصحاب
 ہمہ در ہوئے جو صحابہ کہ کبھی غرباء عرب اور فقراء صحابہ میں معدود تھے، وہ بھی مناصب حکومت پر
 مامور ہوتے تھے اور کفار پر حکم اور عکرائی تو ہر کسی کو حاصل تھی ادنیٰ ادنیٰ صحابی کا ناز امر اور اہل کتاب
 کو اٹھانا پڑا، القصد نعمت خلافت ہر چند بالا اصالت چار یار ہی کے لیے تھی مگر سب ہی اُس میں شریک

تھے اور ساری نعمتوں سے جو اس آیت میں مندرج ہیں صحابہ اور غیر صحابہ بطفیل خلفاء اربعہ حسب لیاقت بہرہ ور ہوئے۔ اس میں صحابہ کو بمنزلہ اقربا سمجھئے اور اُن میں بھی ان کو جو وقت نزول اس آیت کے مشرف باسلام و ایمان ہوئے تھے زیادہ تر قریب سمجھئے، پھر مہاجرین و انصار کو سب سے اقرب بلکہ بمنزلہ حقیقی بھائیوں کے مقرر رکھئے اور تابعین کو بجائے اتباع اور خدام کے تصور کیجئے۔ اس صورت میں یہ نعمت کو سب میں مشترک ہوگی لیکن اعزاز و اکرام میں درجہ بدرجہ فرق ہوگا۔

”وَمَنْ كَفَرَ“ سے شیعہ کے کفرانِ نعمت کی طرف اشارہ ہے جو اعجازِ قرآنی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ خویش و اقارب اگر بطفیل امیر کے نعمت سے کامیاب ہوتے ہیں تو امیر کچھ ان سے خواستگار شکرگزاری یا طالب خدمت گاری نہیں ہوتا ہاں غلام اور خدام اور زلہ برداروں کی طرف البتہ جو یہ نظر رہتی ہے سو اُن میں سے قدر شناس اور عاقل اور سلیم الطبع ہوتے ہیں وہ خدمت گزاری اور شکرگزاری سے پیش آتے ہیں اور جو بداصل اور نادقہر ہوتے ہیں وہ شکرگزاری تو درکنار اُلٹے آئے نعمت اور وسیلہ راحت کی جڑ کاٹنے کے درپے ہوتے ہیں۔

سو اس نعمتِ عظمیٰ خلافت کا حال بھی یہی ہوا کہ ہر چند خلفاء اربعہ کے صدقہ میں اس زمانہ تک کے اہل اسلام کامیاب ہیں جس قدر دین کو وسعت اور شوکت ہوئی یا اب ہے، حقیقت میں یہ سب انہیں کی خلافت کا پھول پھل ہے لیکن صحابہ کے زمانہ سے لے کر آج تک جیسے اس نعمت کے شکر گزار ہیں ویسے ہی اس زمانہ سے لے کر آج تک کافرانِ نعمت بھی برابر چلے آتے ہیں مگر چونکہ علم الہی تو واقع گزشتہ اور واقع آئندہ کو برابر محیط ہے تو بطور اخبار بالغیب کے اُن کافرانِ نعمت کی طرف بھی اشارہ کرنا ضرور پڑا تا کہ خلفاء اربعہ کی بزرگی اور ان کے اعداء کی برائی قرار واقعی ثابت ہو جائے اور اُن کا اور اُن کے اعداء کے مرتبہ کا حال سب کو بخوبی واضح ہو جائے۔ اسی واسطے بعد اتمام وعدہ اور بیان حال خلفاء اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے جو آگے ہونے والا تھا اتنا اور ارشاد فرمایا: ”وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ“ یعنی جو کہ طفیلی اور تابع خلفاء کے اس نعمت میں ہوں اور پھر حق نعمت نہ پہنچائیں اور خدمت گزاری اور اطاعت فرمان تو درکنار زبان سے شکر گزار تک نہ ہوں بلکہ اُلٹے بدی سے پیش آئیں تو وہ اصل فاسق ہیں کہ کوئی فاسق ان کے برابر نہیں اور یہ تو خود ظاہر ہے کہ اس آخر آیت کے مصداق بجز شیعہ اور نو اصب اور خوارج اور قاتلِ خلیفہ ثانی اور قاتلانِ خلیفہ ثالث اور قاتلِ حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اور کوئی معلوم نہیں ہوتا مگر چونکہ شیعہ ان کے دشمن ہیں جو اس نعمت کے حق میں اصل اصول ہیں تو اس فسق میں جو اس ناشکری کا

شمرہ ہے سب میں وشرو ہوں گے، اگرچہ کسی اور وجہ سے وہ دو فرقتے اوروں سے بڑھ جائیں۔
 اور امیر معاویہ اور بعضے اور صحابہ کو مخالف حضرت امیر رضی اللہ عنہ رہے لیکن ان کا بگڑنا ایسا تھا جیسا
 بھائیوں کا بگڑنا کیونکہ وہ اور چار یا اس نعمت خلافت میں بمنزلہ امیر اور غریب بھائیوں کے ہیں کہ
 باوجودیکہ سب اپنے امیر بھائی کے طفلی ہوتے ہیں، پھر اس سے بگڑتے رہتے ہیں، غرض شکر رنجی
 برادرانہ کو ہر چند ایک دوسرے کا طفلی ہو، کفر نعمت نہیں سمجھا جاتا۔ اُس کو عرف میں ناز کہتے ہیں۔ اسی
 واسطے اگر ایک بھائی کو دنیا میں ثروت ہو جاتی ہے اور اس کے اور بھائیوں کو اس کے طفیل سے ہم چشموں
 میں عزت اور گونہ ثروت حاصل ہو جائے تو خوبی اسی کی سمجھتے ہیں کہ وہ بھائی جس کے سب طفلی ہوتے
 ہیں اپنے اور بھائیوں سے بہ منت اور ساجت پیش آیا کرے نہ کہ غرور اور تکبر کیا کرے بلکہ اُس کے
 بھائی اگر اُلے تحکم کریں تو سب سبے اور عداوت سے پیش آئے اور مکافات کے درپے نہ ہو اور نہ ان
 سے انتقام لے بلکہ اگر کوئی شخص اس کے متوسلوں میں سے ان سے کسی قسم کی پر خاش کرے تو یہ سمجھا
 دے کہ مرے بھائی ہر چند مجھ سے منحرف ہیں پھر بھائی ہیں اور تم ہر چند دوست ہو پھر غیر ہو۔

القہ حق شناسوں کا دستور یہی ہے کہ باہم کی شکر رنجیوں کی وجہ سے یہ گوارا نہیں ہوتا کہ غیر
 (خاص کر اپنے نوکر غلام) اُن کو ایذا پہنچائیں بلکہ خدا اگر کچھ لیاقت دین یا دُنیا کی دیتا ہے تو اس کی
 جھاٹھاتے ہیں اور زبان پر نہیں لاتے بلکہ اُلے احسان کیا کرتے ہیں، ہاں اگر اپنا نوکر یا غلام اُن
 کی اہانت یا ایذا کے درپے ہوتا ہے تو اس کو البتہ سزا دیا کرتے ہیں۔

شیعوں کا شیوہ تبر ابازی امیر کی اتباع سے نکال کر

ان کا قدم امیر معاویہ کی تقلید پر جماتا ہے

یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جب حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ سنا کہ اصحاب امیر
 معاویہ ہم پر لعن طعن کرتے ہیں تو آپ نے اپنے لشکریوں کو ان کی لعن کرنے سے منع فرمایا۔
 چنانچہ شیعوں کی محبر کتابوں میں موجود ہے۔ افسوس کہ شیعوں نے امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ
 کی تقلید اختیار کر لی اور تبر ابازی شیوہ بنایا۔ حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اتباع نہ کیا کہ کسی کو برا
 نہ کہیں مگر ان کے کہاں نصیب جو حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اتباع اختیار
 کریں، اس نعمت کے لائق سنی ہی تھے۔

شہر زاغ و زغن زبائے صید و قید نیست ایں کرامت ہمو شہباز و شاہین کردہ اند

سبحان اللہ! کیا کلام معجز نظام ہے کہ کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ صحابہ سے وعدہ کیا اور ان کے فضائل، اشارت اور نیز صراحت سے بیان کر کے منکران صحابہ کی جدا خبر لی، پھر وہ بھی کچھ ایسی طرح کہ دشمنان صحابہ پر سر سے لے کھ پاؤں تک برابر مطابق آئے۔

الفاظ آیت تحفظ فضیلت صحابہ کیلئے سنگین حصار کھینچتے ہیں

ہاں اگر ”يَعْبُدُونِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا“ نہ ہوتا یا ”وَمَنْ كَفَرَ“ کے پیچھے لفظ ”هَذَا الْكُفَرِ“ نہ ہوتا تو بظاہر تاویل کی گنجائش رہتی کہہ سکتے کہ صحابہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمارے عقیدہ کے موافق مرتد ہو گئے تھے۔ ”وَمَنْ كَفَرَ“ سے وہی مراد ہیں اور کفر سے کفر حقیقی مقصود ہے کفر ان نعمت مراد نہیں مگر خدا سے کہیں کوئی بات رہ سکے ہے اہل فہم تو پہلے ہی سمجھتے تھے کہ ایسا ایمان اور عمل صالح جو خداوند کریم کو بھی پسند آئے اور اس کے امتحان میں عمدہ نکلے، یہاں تک کہ اس پر انعام دے مبدل نہ ہو سکتا کیونکہ ایسا ایمان اور عمل صالح بجز ان لوگوں کے میسر نہیں آتا جن کے حق میں شیطان تو یوں کہے ”إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ“ یعنی اے خدا! میں سب کو گمراہ کر دوں گا، سوا تیرے چھٹے ہوئے بندوں کے اور خداوند کریم کا یوں ارشاد ہوا ”إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ“ یعنی اے الیہ! میرے جو کمال اور چھٹے بندے ہیں ان پر تیرا قابو نہیں بلکہ کلام اللہ سے تو یوں ثابت ہوتا ہے کہ مخلصین یعنی چھٹے ہوئے مومنوں کا گناہوں سے محفوظ ہونا یا معصوم ہونا لازم ہے کیونکہ آیت ”لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلِصِينَ“ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے گناہوں سے بچا دینے اور بچے رہنے کی وجہ یہی فرمائی کہ وہ مخلصین میں سے تھے، پھر جب خلفاء اربعہ جن کا مخلصین میں سے ہونا ابھی مرقوم ہوا محفوظ یا معصوم ہوئے تو مصداق ”وَمَنْ كَفَرَ“ کیوکر ہو سکیں گے۔

اس کے بعد جو لوگ کچھ قلیل مایہ فہم رکھتے ہیں ان کے لیے ”وَلَيَمْلِكُنَّ لَهُمْ وَبَيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ“ بڑھایا۔ تاکہ صحابہ کی نسبت اپنی زبان و دل کو آلودہ گستاخی نہ کریں اور اس طرح اپنے دین و ایمان کو برباد نہ کریں اور ان کی لعنت کی سزا میں ہماری لعنت کے مستحق نہ ہوں لیکن انبیاء اور جہال کے سمجھانے کے لیے بھی کوئی بات ضرور چاہیے تھی۔ اس لیے جملہ ”يَعْبُدُونِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا“ زیادہ فرمایا تاکہ احتمال ارتداد بھی باقی نہ رہے اور بسبب اپنی تیرہ درونی اور کم فہمی کے اپنی جھو کو جو ”وَمَنْ كَفَرَ“ سے شروع ہے صحابہ کے اوپر مطابق نہ کر لے لگیں۔ واقعی ”يَعْبُدُونِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا“ نے احتمال ارتداد کو جو

بطور فرض محال پیش آتا تھا بخ و بنیاد سے اکھاڑ دیا کیونکہ اس میں ان کے آخر حال تک کی خبر دے دی، سو جو کچھ خداوند کریم نے ارشاد فرمایا وہ سب خلفاء اربعہ میں بوجہ اتم ظہور میں آیا۔ یہاں تک کہ شیعہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ خلفاء ثلاثہ خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہر شریعت کی پاس داری اور ترویج دین اور زہد و تقویٰ کی رعایت بہت کرتے تھے۔ چنانچہ شریف مرتضیٰ نے تزیۃ الانبیاء والائمہ میں بلکہ اور علماء نے بھی اس بات کو واضح لکھا ہے اگرچہ اپنی بدی سے باز نہیں آئے اور موافق مثل مشہور المرء یقیس علیٰ نفسہ کی وجہ اس کی یہ تراشی ہے کہ یہ سب لوگوں کے دکھانے کو تھا لیکن جملہ ”یَعْبُدُونَنی“ اور نیز اس جملہ کا ماقبل جب اُن کے اخلاص پر دلالت کرے تو پھر موافق مثل مشہور الرافضی فوارہ لعنت از دی خیزدو بردی ریز دیہ برائی اور بد گوئی انہیں کے سر رہے گی۔

خلفائے ثلاثہ پر ارتداد کی تہمت خدا تعالیٰ پر دروغ گوئی کی تہمت ہے مع ہذا القیاس ”ہَذَا الْقَوْلُ“ نے امامیہ کے منہ کو بالکل سیاہ ہی کر دیا ہے کیونکہ اگر بالفرض بغرض محال خلفاء ثلاثہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرتد بھی ہوئے تو (نعوذ باللہ) خدا نے اتنا بھی نہ سمجھا جتنے شیعہ سمجھے، چاہیے تھا ”وَمَنْ كَفَرَ“ بعد وفات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہتا اور کہہ دیا ”وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ“ جس سے دروغ گوئی کی تہمت اپنے ذمہ لگی اور اگر ”وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ“ بجائے خود ہے تو شیعوں کے مفید مطلب نہیں بلکہ مضر ہے کیونکہ اگر ”وَمَنْ كَفَرَ“ سے اصحاب ثلاثہ ہی خطا ملے ہیں تو ان کا کفر بعد اتمام نعمت موعودہ ہونا چاہیے تو اس صورت میں انکار امامت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو شیعوں کے نزدیک بحر دو فوات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ خصوصاً خلفاء ثلاثہ سے ظہور میں آیا کفر لازم نہ آوے، سوا ازل تو یہ شیخ علی کا گمراہ بنانا یا ڈھ جائے گا کہ انکار امامت لہذا ثلاثہ سالہ دلوں سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ دوسرے خلفاء ثلاثہ کے استحقاق خلافت کے انکار سے محال آیت سے ثابت ہوتا ہے خود کافر بننا پڑے گا، خیر اس صورت میں ہمیں بھی شکایت نہیں۔

شام کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتے کو مشت خاک ماہم بر باد رفتہ باشد

وَمَنْ كَفَرَ کے اصلی مصداق

بالجملہ صحیح یہی ہے اور صحیح کیوں نہ ہو، سیاق یہی کہتا ہے کہ مصداق ”وَمَنْ كَفَرَ“ اعداء خلفاء ہیں، خلفاء نہیں ہو سکتے اور ”کَفَرَ“ سے کفر ان نعمت مراد ہے کفر حقیقی نہیں، گو جکلف بن سکے

کیونکہ اس وقت مطلب یہ ہو جائے گا کہ جو شخص ایسی ایسی امدادیں خدا کی طرف سے بہت دین
 محمدی کے دیکھے اور پھر بھی کفر ہی اختیار کر لے تو وہ اصلی فاسق ہے لیکن لعنت کے مقابلہ میں کفران
 لعنت ہی ہوا کرتا ہے کفر حقیقی کا موقع نہیں ہوتا۔ غرض صحیح یہی ہے کہ ”مَنْ كَفَرَ“ کے مصداق اعداء
 خلفاء ہیں لیکن ہم نے رعایت کی تھی کہ کفران لعنت مراد رکھا، وہ اس کی سے ناخوش ہیں تو اس گھائے
 کو پورا کر لیں اور اپنے آپ کو کافر حقیقی ہی سمجھیں: ع..... رضاء ماہمآ لت کان رضاء شامت

باب مناقب صحابہ بدیل تفسیرات آیہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

یہاں پہنچ کر شاید بعض شیعہ مذہب یوں حجت کریں کہ ہم نے مانا اصحاب ثلاثہ خلیفہ برحق اور اپنے
 اپنے زمانہ میں افضل الناس تھے لیکن بعد ان کے جب حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وقت آیا تو
 اس وقت موافق اشارات آیہ ”وَعَدَ اللَّهُ الْخ“ کے وہ افضل الناس اور خلیفہ برحق ہوں۔ چنانچہ اس
 بات کے سنی بھی معتقد ہیں تو اس صورت میں ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُن کے مخالفین کیوں کر
 مقبولان بارگاہ الہی ہوں حالانکہ اہلسنت سب صحابہ کے خواہ انہوں نے حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ
 کی مخالفت کی یا نہ کی معتقد ہیں۔ خصوصاً طلحہ اور زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ
 تعالیٰ عنہا کو تو مبشر بالجہیزہ بھی جانتے ہیں اس لیے لازم پڑا کہ کلام اللہ کی شہادت ان بزرگواروں کے
 لیے ادا کی جائے اور منشاء غلطی حضرات شیعہ کا بیان کیا جائے۔ سورۃ فتح میں خداوند کریم رسول اللہ صلی
 اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے باب میں یوں ارشاد فرماتا ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا
 سُجَّدًا يَتَذَكَّرُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا مِمَّا هُمْ لِي وَجُوهِهِمْ مِنْ أَمْرِ السُّجُودِ ط

”حاصل اس آیت کا یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رسول ہیں، ساحر، کاہن نہیں اور ان
 کے ہمراہی کافروں پر تو بڑے تیز و تند اور ایک دوسرے کے ساتھ نرم اور ایک دوسرے کے دوست،
 تو انہیں دیکھے تو رکوع میں جھکے ہوئے سجدے میں پڑے ہوئے اللہ کے فضل اور اس کی رضا مندی
 سے، غرض ہے ان کے چہروں میں علامتیں موجود ہیں سجدہ کے اثر سے۔“

اس اُمت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد

صحابہ رضی اللہ عنہم کا درجہ ہے اور رسالت کے بعد بغض فی اللہ کا

یہاں تک کہ آیت کے معنوں کا بیان تھا اب اس مچھان کی سنئے کہ اول جناب باری تعالیٰ

نے جو خبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف فرمائی۔ بعد میں اصحاب کی، تو قرینہ عقلیہ سے معلوم ہوا کہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اُمت میں اصحاب کا رُتبہ ہے علیٰ ہذا القیاس جو وصف کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں ہوگا اس کے بعد اس وصف کا رُتبہ ہوگا جو صحابہ کی مدح میں بیان ہوا ہوگا مگر ہم نے جو دیکھا تو حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظ ہے اور اصحاب کی مدح میں ”اشداء علی الکفار رحماء بینہم“ تو اس نف و نشر سے معلوم ہوا کہ بعد رسالت کے رُتبہ بغض فی اللہ اور حب فی اللہ کا ہے کیونکہ بغض فی اللہ یعنی خدا کے سبب کسی سے عدوت کرنی یہ بعینہ وہی شدت علی الکفار ہے اور حب فی اللہ بعینہ ”رحماء بینہم“ کا ترجمہ ہے۔ اس اشارہ سے زیادہ تر تعقیب اس حدیث کی ہوگئی جو سنیوں کی کتابوں میں پائی جاتی ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص نے خدا واسطے دیا اور خدا واسطے کسی سے ہاتھ کو کھینچ لیا اور خدا واسطے کسی سے محبت اور خدا واسطے کسی سے بغض رکھا تو بیشک اُس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا۔ واقعی سنیوں کی حدیثیں سب کلام اللہ پر مطابق آتی ہیں، پر شیعوں کی حدیثوں کا حال یہ ہے کہ کلام اللہ کچھ کہتا ہے اور ان کی حدیثیں کچھ ایک دو حدیثیں جو بیان کی گئیں ان کا حال ناظرین رسالہ ہذا پر پوشیدہ نہ رہے گا۔

صحابہ کی منقبت میں اشداء علی الکفار کو باقی اوصاف پر مقدم کرنے کی حکمت
 پر یہاں ایک لطیفہ قابل بیان ہے وہ یہ ہے کہ حدیث میں جہاں کہیں حب فی اللہ بغض فی اللہ کا بیان آیا ہے تو حب فی اللہ کو مقدم کیا ہے اور کلام اللہ میں بغض فی اللہ پر جو لفظ دلالت کرتا ہے یعنی اشداء علی الکفار اسے مقدم بیان کیا حکمت اس میں کیا ہے؟ اس کم فہم کے فہم میں یوں آتا ہے کہ حب فی اللہ اور بغض فی اللہ دونوں آثار کمال محبت خداوندی میں سے ہیں یعنی جب کسی کو خداوند کریم سے محبت کمال درجہ کی ہوگی تو وہ محبت چاروں طرف کو پھیلے گی جہاں جہاں خدا کے ساتھ کسی چیز کو کچھ خصومت ہوگی تو اس خصومت ہی کے موافق اس چیز سے بھی محبت ہوگی۔

محبوب کے متعلقین کی محبت محبوب ہی کی محبت ہے

مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بنی آدم میں سے خدا کے ساتھ زیادہ علاقہ اور اختصاص ہے تو جس شخص کو خدا کے ساتھ محبت کامل ہوگی اور اس علاقہ کو سن لے گا تو بیشک اس کو بعد خدا کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے محبت ہوگی علیٰ ہذا القیاس، جس کو بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خدا سے زیادہ اختصاص ہوگا تو محبت خداوندی کو بھی اس

سے اسی قدر محبت ہوگی علیٰ ہذا القیاس، مکانات میں مثلاً خانہ کعبہ کو زیادہ تر اختصاص ہے تو محبت خداوندی کو بیشک سب مکانات سے زیادہ خانہ کعبہ سے محبت ہوگی۔ پھر اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسجد کا رتبہ ہے اس کے بعد بیت المقدس کا تو اس شخص کو بھی علیٰ حسب المراتب محبت ہوگی۔ اسی طرح اعمال اور اخلاق اور عادات میں خیال کر لو، القصہ جتنا کسی چیز کو جناب باری سے قرب ہوگا اتنا ہی عجبان خداوندی کو اس چیز سے علاقہ ہوگا۔

متعلقین محبوب کی محبت محبوب کی محبت کا جزو ہے

مثلاً ظاہر کی محبت میں ظاہر ہے جب کسی کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کے اقربا اور خیر خواہوں بلکہ کوچہ کے رہنے والوں کے ساتھ بھی محبت ہو جاتی ہے۔ سو جیسے روشندانوں میں گودھوپ بمقدار روشندان کے آتی ہے ایسے ہی محبت بھی بمقدار علاقہ محبوب متعلقان محبوب سے پیدا ہو جاتی ہے مگر جیسے گودھوپ باہر ہوتی ہے اسی کا ٹکڑا اندر ہوتا ہے اور جو نور خارج از دیوار ہے اسی نور کا شعبہ اندر ہے ایسے ہی حلقوں کی محبت بھی محبوب ہی کی محبت کا شعبہ ہوتا ہے اور اسی کا ٹکڑا اس کو سمجھنا چاہیے۔

بدخواہان محبوب کی دشمنی محبت کا جزو نہیں اس کا لازم ہے

بخلاف بدخواہان محبوب کی عداوت کے کہ وہ محبوب کی محبت کو لازم ہوتی ہے اس کا ٹکڑا اور اس کا شعبہ نہیں ہوتی یعنی جو لوگ کہ محبوب کے بدخواہ ہوتے ہیں ان سے بمقتضاء محبت محبوب عداوت ہونی لازم ہے مگر یہ عداوت محبوب کی محبت کا ٹکڑا اور اس کا شعبہ بلکہ ہم جنس تک نہیں ہاں اس کو لازم ہے جیسے دھوپ کو بشرطیکہ دیوار وغیرہ کوئی شے نور کے روکنے والی حائل ہو۔ سایہ لازم ہے حالانکہ اس کے ہم جنس تک نہیں۔ اس قیاس پر جو لوگ اعداء خدا ہوں گے عجبان خداوندی کو ان سے عداوت لازم ہوگی لیکن بہر حال یہ عداوت غیر محبت ہے۔ اگرچہ اس کو لازم ہے ہاں اولیاء خدا اور مقرران الہی کی محبت وہ حقیقت میں خدا ہی کی محبت کا ٹکڑا ہے کوئی غیر شے نہیں اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاں حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کی مدح اور ثناء بیان فرمائی وہاں تو مقدم کو مقدم رکھا مؤخر کو مؤخر اور خداوند کریم حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کی تعریف نہیں فرماتے بلکہ ان لوگوں کی تعریف کرتے ہیں جن میں یہ وصف پائے جاتے ہیں۔

کسی کی مدح میں پہلے ہلکی پھر برہمیا پھر اور برہمیا خوبی بیان کرنا صحیح ترتیب ہے اور دستور یوں ہے کہ کسی صاحب کمال یا موصوف باوصاف مختلفہ کی اگر تعریف کیا کرتے

جس تو اس کے مکاتبات میں سے کتر کو پہلے لیا کرتے ہیں، بعد میں اس سے زیادہ کو، پھر بعد میں اس سے زیادہ کو، ہر وصف کی قدر اور عزت ہو ورنہ اگر ترتیب کو بالعکس کر دیتے تو بعد میں اوصاف کے سن لینے کے کتر اوصاف کی کیا قدر رہ جائے گی جو عمل تعریف میں بیان کیا جائے۔ غرض یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اوصاف کی خوبی اور برائی تو اصلی ہے اور اوصاف والوں کی بھلائی برائی اوصاف کے سبب سے ہے در صورتیکہ اوصاف کی بھلائی برائی بیان کی جائے تو اول کو اول میں کیا جائے اور دوم کو دوم اور در صورتیکہ اوصاف والے کی بھلائی برائی مد نظر ہو اور اس شخص کے اوصاف ترتیب ذکر کیے جائیں تو ترتیب مذکور کو منکس کر دینا چاہیے ہاں جہاں دو چیز کا فرق مرتب بہ اعتبار مجموعہ اوصاف کے دریافت کیا جائے یعنی کس میں زیادہ اوصاف ہیں اور کس میں کم جھوٹا کس میں عمدہ تر چیز اور کس میں نہیں؟ تو یہ حقیقت میں اوصاف ہی کی تعریف ہے، اس لیے ان کی ترتیب دی ہوگی جو اوصاف کی ترتیب ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قول ذکر کیا، بعد میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذکر شروع کیا، اقصیٰ صحابہ کی تعریف میں ادنیٰ وصف جو یہاں یہاں علی الکفول ہے یعنی وہ کافروں پر بڑے ہی تیز دستہ ہیں۔

محبت کرنا آسان ہے اور دشمنی دشوار خصوصاً اقربا سے

ہر چیز سے محبت کرنا آسان ہے کیونکہ طبعی بات انسان کی یہ ہے کہ جب کوئی اس سے محبت کرے تو یہ بھی اس کی طرف مائل ہو تو اس صورت میں خدا واسطے کی محبت سے ایمان خوب نہیں پر صاحبِ تائب عداوت کرنی بہتہ دشوار ہے کہ عداوت کے ثمرہ میں دوسرا بھی عداوت ہی سے پیش آئے گا محبت تو کر، مصلحت تو اگر کسی کو خدا واسطے کسی سے بغض ہو تو یہ نشان کمال ایمان سمجھا جائے گا خاص کر خدا واسطے کی عداوت بھی اقربا سے کہ یہ دشوار و دشوار ہے۔ سو در صورت یہ کہ مطلق عداوت نہ ہو مگر اقربا کی عداوت تو نشانِ کمالات سمجھنا چاہیے۔

یہ حقیقت ہے کہ پہلے ذکر کرتے ہیں تو مکمل قریبی کی عداوت کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ ماستی کی آیت میں قَدْ ضَلَقَ اللَّهُ ذِمَّتَهُ لِرَبِّهِمَا سَابِ كَرَامَتِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمُ كِتَابِی اور تسکین خاطر کے لیے کہ ان میں سے جو جس قسم کی جاتی ہے وہ فہم بھی تھا کہ غزوہ حدیبیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ حکم سے صلح کر کے مراجعت فرمائی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی محبت بابت جہاد کا فریاد میں لبرختمیں دلوں کی دلوں میں مد گئیں بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدہ میں اس سفر کے یہ خواب دیکھا تھا کہ ہم

جمع جماعت امن مہین سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے اور اس خواب کے باعث ہاں خیال کسی سال میں ہم مکہ میں داخل ہوں گے صحابہ رضی اللہ عنہم کے دل میں سرور بھرے ہوئے تھے کہ کچھ کہا نہیں جاتا وہ سب کا سب حسرت و غم سے بدل گیا۔

اس وقت صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ حال تھا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہ ہوتی تو آپ تیغ صحابہ کفار مکہ کو گرفتار کر دیتی، پاس قرابت کس کا اور شفقت کبھی کہا، وہی مہاجرین جو مکہ والوں میں سے کسی کے بھتیجے تھے، فقط جوش محبت خداوندی اور نیاز مندی رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں انہیں اپنے اقربا کے خون کے پیاسے نظر آتے تھے اور آیت ماسبق اور آیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں سب باہم چسپیدگی میں دست و گریباں ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کو یوں تو ہر کافر دشمن خدا و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر غیظ و غضب آتا تھا لیکن اس آیت میں زیادہ تر اسی غیظ و غضب کی طرف اشارہ ہے جو ان کو کفار مکہ پر اس قصہ میں پیش آیا سو ان میں سے مہاجرین انہیں کفار کے اقربا میں سے تھے تو ان کے حق میں لفظ اشداء علی الکفار نشان اکملیہ ایمان کا سمجھنا چاہیے اور در صورت یہ کہ ادنیٰ وصف ان کا اس بات پر گواہی دیتا ہے کہ ان کا ایمان کامل تو کیا اکمل ہے تو اعلیٰ اوصاف تو اعلیٰ ہیں اور چونکہ مومنان کامل الایمان گنے چنے ہوئے ہوتے ہیں کچھ ایسی سہل بات نہیں کہ دخل و معقولات کی طرح ہر کوئی کمال ایمان حاصل کر لے۔

صحابہ بشہادت کتاب اللہ نفس و شیطان پر بھی اشد تھے

لہذا ان کی گمراہی کا خیال بھی گمراہی ہے

مع ہذا قرینہ اس بات کا کہ اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر فرمایا، پھر صحابہ کا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس امت میں اول نمبر ہے اور صحابہ کا دوم تو ہم با یقین سمجھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اول قسم کے تخلصین میں سے تھے کہ شیطان بھی ان کے اغواء سے کانوں پر ہاتھ دھرتا تھا بلکہ بایں نظر کہ شیطان اس وریس کفار ہے اور صحابہ اشداء علی الکفار ہیں تو شیطان پر اور بھی اشد ہوں گے۔ علیٰ ہذا القیاس نفس اعدائے دین میں سے بلکہ سب میں بڑھ کر ہے۔ شیطان بھی اسی کے سہارے اپنا کام کرے ہے وہ اگر نہ مانے تو شیطان کیا کرے۔ بہر حال نفس و شیطان سے ان کی عداوت اور بھی زیادہ ہوگی اور ان دونوں پر وہ اور بھی اشد ہوں گے کیونکہ بغض فی اللہ یعنی خدا کے دشمنوں سے عداوت بقدر دشمنی ہوتی ہے جتنی

دشمنوں کی دشمنی زیادہ اتنا ہی بغض فی اللہ زیادہ ہو اور مخلصین پر شیطان کا فقط بس نہ چلتا تھا مگر کچھ اندیشہ بھی نہ تھا، صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس کی کور بھی دیتی تھی۔ عجب نہیں کہ اُن سے بھاگتا پھرتا ہو۔ سو یہی وجہ ہوگی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سایہ سے بھی شیطان بھاگتا تھا کیوں کہ وہ سب صحابہ رضی اللہ عنہم میں کافروں کے باب میں زہر قاتل تھے۔ ان کے حق میں اشداء علی الکفار ہوتا سب میں زیادہ صادق آتا تھا۔ بھلا شیطان جن سے خود بھاگے انہیں کیا گمراہ کرے گا، شیطان کو ایسی جگہ اپنی ہی پڑ جاتی ہے اور نفس جن سے دبوہ کس سے دہیں گے آدمی..... اوروں سے جو دتا ہے تو اس نفس ہی کے پتے دیتا ہے۔ اسی واسطے یہ لازم پڑا کہ ایسے لوگوں کی عبادات میں کچھ فرق نہ پڑے اور ان میں کسی قسم کا رلا ڈریا وغیرہ کا نہ ہو کیونکہ ان سب بیماریوں کی جڑ یہی دوا سیب تھے جب یہی قابو میں آگئے پھر کیا کسرا تکی رہ گئی۔

نفس و شیطان کی آمیزش بغیر غلط فہمی سے کوئی غلطی ہو تو اُمیدِ ثواب ہے

ایسے وقت اگر برا کام ہوتا ہے تو فقط بسبب غلط فہمی کے ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں بھی ثواب ملنا چاہیے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کے جو سر کے بال غصے میں پکڑ کر کھینچے حالانکہ حضرت ہارون علیہ السلام کی کچھ تقصیر نہ تھی ہرگز عقل سلیم کے نزدیک داخل جرائم نہیں، یہ نہیں کہ اس پر کسی قسم کا مواخذہ ہو بلکہ اُمیدِ ثواب ہے کیونکہ باعث اس کا فقط خدا کی محبت اور بغض فی اللہ ہوا اور چونکہ یہ دونوں اوصاف محمودہ میں سے ہیں بلکہ اعلیٰ اقسام میں سے اور ادھر اعمال کا مدار فقط صورت پر نہیں ورنہ سب کی نمازوں کا برابر ہی ثواب ہوتا تو ہم کو یقین کامل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اس پر ثواب ملے، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ بعد اطلاع غلطی کی وجہ غلطی ندامت ہونی ضرور ہے سو اس ندامت سے یہ نہیں لازم کہ وہ کام ایسا برا ہو کہ ان کو اس پر عذاب ہو بلکہ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ کام تو حقیقت میں برا ہوتا ہے پر نیت کے غلبہ سے اچھا ہو جاتا ہے جیسے دھول دھوپ اصل سے برا ہوتا ہے لیکن یارانِ غمگسار کا دھول دھوپ بھی بسبب اس کے کہ ازراہ محبت ہوتا ہے موجب نشاط خاطر محزون ہوتا ہے۔

مشاجرات صحابہ کا باعث نفس و شیطان نہیں بلکہ بغض فی اللہ تھا

الغرض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے سامنے جب نفس و شیطان مغلوب ہوئے تو اس وقت اگر کوئی کاربے موقع ان سے صادر ہوا ہو تو وجہ غلط فہمی صادر ہوا ہوگا، اس صورت میں گو وہ کام برا تھا لیکن چونکہ بری طرح سے نہیں ہوا اور شیطان و نفس کو جو برے کاموں کی اصل اور بنیاد ہاندھنے والے ہیں،

اس میں دخل نہیں ملا بلکہ قوت ایمانی ہی باعث اس کا ہوئی ہے تو اب بوجہ غلبہ نیت اور قوت ایمانی ان کاموں کی برائی ایسی مغلوب ہو گئی ہے جیسے ماشہ دو ماشہ برابر ٹھٹھے یا نمک کا اثر کنویں یا دریا میں۔

سو جیسے حضرت موسیٰ کو حضرت ہارون علیہم السلام پر غصہ ہونے اور ان کے بال پکڑ کر کھینچنے کا باعث فقط بغض فی اللہ تھا ایسے ہی مشاجرات صحابہ بھی بغض فی اللہ پر مبنی ہوں لیکن جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ غلطی ہوئی کہ اُس بغض فی اللہ کو بے موقع صرف کر دیا ایسے ہی صحابہ سے بھی یہ غلطی ہوئی ہو کہ جوش بغض فی اللہ میں مثلاً چوک گئے اور بگاڑ بیٹھے اور حقیقت الامر کو نہ سمجھے تو اس صورت میں ان پر مواخذہ نہ ہوگا بلکہ ماجور ہوں گے۔ ہاں اگر بغض فی اللہ یا کوئی اور صنف محمود باعث اس فعل کا نہیں ہوا کہ بلکہ کوئی ایسا امر ہے کہ اس پر ثواب نہیں ہو سکتا۔ فقط اس قسم کے افعال مباح ہوتے ہیں تو البتہ ثواب تو مترتب نہ ہوگا لیکن بسبب غلط فہمی کے ماخوذ بھی نہ ہوں گے۔

نفس دب سکتا ہے لیکن اس کا مزاج نہیں بدل سکتا

اور احتمال یہ بھی ہے کہ گہرہ دریگاہ اقل قلیل بہ مقتضائے بشریت کوئی حرکت ناسزا صادر ہووے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر چند شیطان کو تخلصین پر قابو نہیں رہتا اور نفس بھی مغلوب اور مقہور ہو کر ان کا اس طرح مطیع فرمان ہو لیتا ہے جیسے ہاتھی باوجود اس عداوت کے کہ اس کو آدمیوں سے ہے مغلوب اور مقہور ہو کر آدمیوں کی ہر طرح سے اطاعت کرتا ہے لیکن جیسے ہاتھی پھر ہاتھی ہے آدمیوں کے غلبہ سے آدمی نہیں بن گیا، کبھی نہ کبھی اپنی عادات اصلی پر آ جاتا ہے ایسے ہی نفس کو غلبہ ایمان اور صولت محبت الہی کے باعث مقہور اور مغلوب ہو گیا ہے لیکن پھر نفس ہے وہ طبع زاد برائی اور گناہوں کی رغبت کہاں جائے۔

نیکی کی اصل روح اور بدی کی اصل نفس ہے

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جیسے بدن میں چاروں قسم کی کیفیات یعنی حرارت برودت یوست رطوبت کے پائے جانے سے یہ دریافت ہوا ہے کہ بیشک بدن ان چاروں کیفیات کی اصلوں سے یعنی آگ ہوا پانی خاک سے مرکب ہے ایسے ہی ملحوظ اس بات کے کہ آدمی کے دل میں کبھی نیکی کی طرف رغبت ہوتی ہے کبھی بدی کی جانب، یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی حقیقت ان دونوں کی اصلوں سے مرکب ہے لیکن جیسے اربع عناصر میں سے ہر ایک میں ایک کیفیت خاص ہے کہ اس کے مخالف اس میں نہیں پائی جاتی اور اگر پائی بھی جائے تو عارضی ہوتی ہے جیسے پانی کا گرم ہو جانا ایسے ہی نیکی اور بدی کی اصل میں بھی ان دونوں میں سے ایک ایک ہونی چاہیے اور دوسری آ جائے تو وہ عارضی

ہے جب یہ بات مسلم ہو چکی تو ہم کہتے ہیں کہ نیکی کی اصل کا نام ہم روح کہتے ہیں اور بدی کی اصل کا نام نفس اور روح میں کیفیت اصلی نیکی ہوگی مغلوب ہو کر اگر بدی اُس سے صادر ہو تو وہ عارضی ہے اور نفس کی اصلی خاصیت بدی ہوگی اور مغلوب ہو کر نیکی کرنے لگے تو وہ عارضی سمجھی جائے گی۔

روح عالم ملائکہ کی ایک چیز ہے اور نفس طبقہ شیاطین میں سے ہے اس جگہ سے ہم یوں قیاس کرتے ہیں کہ جیسے حرارت غریزی کے وسیلے سے ہم یوں دریافت کرتے ہیں کہ آدمی کے بدن میں ایک جزء ناری بھی ہے اور پھر اس کو یوں کہتے ہیں کہ اس کی اصل کرہ ناری ہے، خدا نے اپنے زور قدرت سے اسے یہاں لا کر قید کر دیا ہے ایسے ہی نیکی کے ارادہ کے وسیلے سے اول تو ہم یہ دریافت کرتے ہیں کہ آدمی میں کوئی چیز ایسی بھی ہے کہ اس کی اصلی خاصیت نیکی ہے اور دوبارہ یوں سمجھتے ہیں کہ اس کی اصل طبقہ ملائکہ ہے جن کی شان میں خدا وند کریم یوں ارشاد فرماتا ہے: ”لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ“ یعنی خدا کی نافرمانی کرتے ہی نہیں جو حکم ہوتا ہے وہی کرتے ہیں۔ سو اس کا ماحصل یہی ہے کہ ان کی اصلی خاصیت نیکی ہے، ایسے ہی انسان کے دل میں بدی کے ارادہ اور خواہش کے وسیلے سے اول تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں کوئی جز ایسا ہے کہ اس کی اصلی خاصیت بدی ہے اور پھر یوں خیال میں آتا ہے کہ اس کی اصل طبقہ شیاطین ہے جن کے حق میں جناب باری تعالیٰ یوں ارشاد فرماتے ہیں ”وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا“ حاصل یہ کہ شیاطین اپنے رب کے قدیمی نافرمان ہیں۔ سو اس کا ماحصل یہی ہے کہ ان کی اصلی خاصیت بدی اور نافرمانی ہے۔ القصہ روح عالم المملکت کی ایک چیز ہے اور نفس طبقہ شیاطین سے ہے۔ خداوند کریم نے اپنے زور قدرت سے ان کو ایک جگہ ایسا جمع کر دیا ہے۔ جیسا طوطی اور زاغ کو ایک نفس میں بند کر دیں۔

انسان میں نیکی و بدی کے مختلف دور ملائکہ اور

شیاطین کی تقویت و تاثیر سے ہوتے ہیں

پھر جیسے بدن کے اہل عناصر میں ہر ایک کو اس کے ہم جنس سے تقویت ہوتی ہے ایسے ہی روح اور نفس کو بھی اپنے ہم جنس سے یعنی ملائکہ اور شیاطین سے تقویت ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض احادیث بھی اس پر شاہد ہیں اور بزرگ عقل بھی ہم یوں ہی یقین کرتے ہیں کہ اوقات مختلفہ میں یہ نیکی اور بدی کے خیال کا غلبہ بعد ملائکہ یا بعد شیاطین ہو تو ہو ورنہ جو انداز طبع زاد تھا وہی رہتا۔ غرض طبعی کیفیت

اگر جاتی ہے تو کسی خارجی شے کے غلبہ سے جاتی ہے سونکی کے خیال کا غلبہ بظاہر سامان بجز اعانت ملائکہ متصور نہیں ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کبھی کی جانب توجہ کی زیادتی بجز تاثیر شیطانی معقول نہیں۔

نفس دب جائے تو اشداء علی الکفار کا مقام ہاتھ آتا ہے

سوا کر کسی وقت نیکی کا خیال غالب ہو اور اس وجہ سے اعمال صالحہ صادر ہوں اور اس ترکیب سے روح کی تاثیر نفس پر ایسی طرح عارض ہو جائے جیسے برتن کے نیچے آگ جلانے کی ترکیب سے آگ کی تاثیر پانی پر عارض ہو جاتی ہے اور اس کی تاثیر اصلی کو جو ٹھنڈک ہے دبا لیتی ہے تو اس صورت میں نفس بھی روح کے کام ایسے ہی دینے لگے گا جیسے بہت گرم پانی آگ کا کام دے یعنی بدن کو جلادے۔ علیٰ ہذا القیاس اگر نفس روح پر غالب آجائے گا تو روح نفس کی تبعیت میں نفس کے کام دینے لگے گی کیونکہ ترکیب میں یہی ہوتا ہے کہ یا یہ غالب ہو یا نہ ہو چنانچہ اجسام میں یہی حال رہتا ہے کبھی کسی خلط کا غلبہ کبھی کسی خلط کا غلبہ بہر حال اگر روح غالب ہوگی تو ایسے وقت میں روح کو بسبت نفس کے اشداء علی الکفار میں سے سمجھنا چاہیے اور اس وقت میں شیطان کا بالکل اختیار اٹھ جاتا ہے اور وہ تسلط اور حکومت جو پہلے نفسی باقی نہیں رہتی۔

نفس دب جائے تو بھی قابل اعتبار نہیں

لیکن جیسے کسی شخص پر ہمیں ایسا اختیار تو نہ ہو جیسے نوکر یا غلام پر ہوتا ہے مگر تاہم اپنی طرف سے اپنے جی کی بات سوچایا کرتے ہیں وہ مانے یا نہ مانے ایسے شیطان بھی اپنی حسب مرضی کہنے سے یعنی وسوسہ ڈالنے سے باز نہیں آتا۔ بہر حال جن کا نفس مقہور اور مغلوب ہو جاتا ہے وہ روح کی تبعیت میں اچھے کام کرنے لگتا ہے لیکن پھر نفس نفس ہی ہے جیسے پانی کتنا ہی گرم کیوں نہ ہو آخر پھر پانی ہے۔ اول تو آگ کے بجھانے میں ویسا ہی ہے جیسا ٹھنڈا پانی، دوسرے یہ حرارت عارضی ہے اور عارضی چیز کا کیا اعتبار، ابھی آگ جلانی چھوڑ دو یا چولہے پر سے اُتار کر ذرا رکھ دو، پھر وہی ٹھنڈا کا ٹھنڈا ہے، اسی طرح جہاں نفس کی خبرداری سے ذرا غفلت ہوئی۔ پھر وہی لاپرواہی پر آ جاتا ہے۔

انسان ہمیشہ ایک ہی حال میں نہیں رہ سکتا

اور ہر وقت ایک سا حال رہنا محالات عادی میں سے ہے خصوصاً انسان سے جس کی شان میں جناب ہاری تعالیٰ یوں ارشاد فرماتے ہیں "وَلَمْ نَجْعَلْهُ عَزْمًا" یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی شان میں یوں ارشاد ہے کہ آدم بھول گئے اور ہم نے ان میں پختگی نہ پائی کیونکہ جو جو اوصاف

حضرت آدم علیہ السلام میں تھے۔ تھوڑے بہت سب بنی آدم میں ہونے چاہئیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ تو والد اور تاسل میں نوعیت باقی رہتی ہے۔ اسی واسطے آدمی کے آدمی اور گھوڑی کے گھوڑا اور گدھی کے گدھا پیدا ہوتا ہے اور جب نوعیت باقی رہے تو جو وجہ نوعیت کے باقی رہنے میں نظر آتی ہے یعنی تو والد تاسل وہی بھیہنہ اور اوصاف کے حق میں بھی سمجھنی چاہیے۔ بالجملہ سب اوصاف آدم علیہ السلام نسلًا بعد نسلًا کم و بیش سب آدمیوں میں ہوتے ہیں۔ چنانچہ مشہور بھی ہے ”أَلَوْلَا بَرُّ لَا بَيْتِهِ“ اور جب بے ثباتی بھی سب آدمیوں میں ہوئی تو پھر ایک حال پر رہنا کجا اس صورت میں لازم پڑا کہ ہمیشہ نفس کی محافظت یکساں نہ ہو بلکہ کبھی کبھی اس کی نگاہداشت میں فرق پڑے اور نفس اپنی خاصیت کی طرف مائل ہو اور کوئی نہ کوئی قصور سرزد ہو، باقی رہی یہ بات کہ کوئی نفس کی حقیقت کو بدل کر روح بنالے، یہ خود محالات میں سے ہے۔ خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے: ”لَا تَبْدِيلَ لَخَلْقِ اللَّهِ“ یعنی خدا کے پیدا کیے کو کوئی نہیں بدل سکتا۔

غلبہ نفس اور مغلوبیت نفس سے سرزد ہونے والی خطاؤں میں بے حد فرق ہے الغرض کوئی صورت ایسی نہیں کہ انسان خطا اور قصور سے بے اندیشہ ہو جائے لیکن اس حال کا قصور اس قصور کے برابر نہیں کہ نفس اپنی خاصیت اصلی پر ہو اور اس پر روح کا ذرہ برابر اثر نہ ہو بلکہ اس کا روح پر اثر ہو کیونکہ پہلی صورت میں آدمی کا کچھ قصور نہیں، اس کا کام اتنا ہے کہ روح کو غالب کر دے اور نفس کو مغلوب، روح کی خاصیت نفس کی خاصیت کو دبا بیٹھے، یہ اس کے اختیار میں نہیں کہ نفس کو بدل کر روح بنادے، یہ اس کے اختیار میں نہیں کہ مدام یکساں حال رہے۔ پھر جب اس کے اختیار میں یہ دونوں باتیں نہ ہوں اور جس قدر اس کا اختیار تھا اس قدر گزرا تو پھر لائق اس کے ہے کہ معاف کیا جائے۔ چنانچہ خداوند کریم خود فرماتا ہے: ”لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا“ یعنی اللہ کسی کو اس کی طاقت اور وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ اس لیے ہمیں یقین کامل ہے کہ اس وقت کی خطائیں ہر چند خطائیں ہیں لیکن بسبب عموم رحمت اور وعدہ مذکور کے معاف کی جائیں۔

اب سنئے کہ انبیاء سے جو لغزشیں ہوئی ہیں تو شاید اس قسم کی ہوں جن پر عتاب ہوا ہے اور احتمال ہے کہ بسبب ان کے علورتبہ کے موافق مثل مشہور، نیکان را بیش بود حیرانی، ان کی زلات سب از جسم غلطی ہوں اور اوروں کو اس پر ثواب ملے پر ان کو اس پر عتاب ہو لیکن صحیح اول ہی بات معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال ہرچہ ہا دہا دہ انبیاء کے اسرار کو خدا جانے یا انبیاء؟

اشدء علی الکفار سے خطاء ممکن ہے لیکن شیطان کا تسلط ممکن نہیں

پر یہاں تو فقط اتنی بات سے غرض ہے کہ یہ وصف کہ جو "اَشْدَاءُ عَلٰی الْکُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ" کا خدا نے معرض تعریف میں بیان کیا اور پھر تعریف بھی ایسے وصف کے ساتھ کہ بعد رسالت اسی کا رتبہ ٹھہرا، یہ وصف ایسا نہیں کہ صدور گناہ یا صدور خطا اس کے ساتھ محال ہو۔ محال البتہ جب ہوتا کہ اس وصف والوں کو حقیقت نفسی کے تبدیل کا اختیار ہوتا۔ سو یہ تو معلوم، یہ بھی اس وصف والوں کو میسر نہیں آ سکتا کہ ایک حال پر برقرار رہیں اور کیونکر رہ سکیں، دو چیزیں مخالف ایک دوسرے کی دشمن سے ان کو پالا پڑا، ایک شے ہو تو ایک حال پر رہے۔ ان کے واسطے یہی بہت ہے کہ شیطان کا ان پر تسلط نہیں ہو سکتا، خداوند کریم ان سے برائیوں کو ہٹاتا رہتا ہے۔ چنانچہ حضرت یوسف سے برائی اور قحش کے ہٹانے کی وجہ بھی بیان فرمائی ہے کہ وہ چنے ہوؤں میں سے ہیں، فرمایا ہے:

"كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْءَ، وَالفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ"

"یعنی یوں ہی ہوا، اس واسطے کہ ہٹادیں، اس سے برائی اور بے حیائی البتہ وہ ہے ہمارے

چنے ہوئے بندوں میں سے۔"

القصد یہ لازم نہیں کہ جو "اَشْدَاءُ عَلٰی الْکُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ" ہوا کریں ان سے لغزش

کا ہونا محالات میں سے ہو۔

"اَشْدَاءُ اور رُحَمَاءُ" کیلئے اخلاص لازم اور ریانا ممکن ہے

ہاں البتہ یہ لازم ہے کہ عبادات میں فتور نہ ہو، ان کے کام میں ریا کو دخل نہ ہو۔ طالب اگر ہوں تو رضاء خداوندی کے ہوں نظر ہو تو اس کے ایک افضال پر ہو، سو اسی لیے بعد ان دونوں وصفوں کے بطور علامات کے اور دلائل کے یوں بیان فرمایا: "وَرٰهُمْ رَكْعَا الْخ"

غلط فہمی کے سبب بڑوں بڑوں سے خطا ہو جاتی ہے

جب یہ بات مقرر ہو چکی تو اب ہماری عرض علماء شیعہ کی خدمت میں یہ ہے کہ اول تو بجا اوقات یوں ہوتا ہے کہ بڑے بڑے کسی غلطی کے سبب سے بھلی بات کو بری سمجھ جاتے ہیں، خضر کی کشتی توڑنے کو حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے نبی اور العزم نے برا سمجھا اور خلاف شریعت سمجھ کر یوں فرمایا "لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِشَيْءٍ اَمْرًا" حاصل یہ ہے کہ تو نے برا کام کیا حالانکہ انہوں نے کچھ برا نہیں کیا تھا بلکہ بھلا کیا تھا، اگر نہ توڑتے تو وہ کشتی پکڑی جاتی۔ سو اسی طرح حضرات شیعہ بلکہ حضرات آئمہ

بعض اصحاب کے افعال کو مثلاً فذک کے نہ دینے کو اور سوا اس کے اور افعال کو سردست اگر برا سمجھ گئے ہوں اور حقیقت میں وہ برے نہ ہوں تو شیعہ حضرات ہی لقل کی رو سے فرمائیں کیا محال ہے۔ اور یہ بھی نہ سہی شاید کسی کو یہ گمان ہو کہ حضرت خضر اہل مکافہ میں سے تھے۔ ان کی بات اگر سمجھ میں نہ آئی تو بجا ہے، ابو بکر کو ہم اہل مکافہ میں سے نہیں سمجھتے۔ اس لیے یہ التماس ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی باہم جو شکر رنجی ہو گئی اور منشاء اس کا یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حقیقت الامر کو نہ سمجھے اور اس سبب سے دست و گریباں ہو گئے اور ایسے ہی حضرت زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا حقیقت الامر کو سردست نہ سمجھی ہوں تو کیا حرج ہے حالانکہ یہاں کوئی مکافہ کی بات بھی نہ تھی، اس لیے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے تو کچھ خطا کی ہی نہ تھی۔ اگر معصوم ہونے کی وجہ سے اس بات کو مستبعد سمجھتے ہو تو حضرت زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا تو فقط شیعوں ہی کے نزدیک معصوم تھیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو بالاتفاق معصوم ہیں۔

اور مُسْلِمًا یہ بھی نہیں تو یہنا کارہ ابھی عرض کر کے آیا ہے کہ اولیاء اور مخلصین سے چوک ہو ہی جاتی ہے اور خطا کا ہونا کچھ ان سے محال نہیں جو اس وجہ سے ان کی بزرگی کے منکر ہو جائے، بزرگی اور چیز اور صدور گناہ اور چیز، وہ گناہ جو مخالف ولایت ہے وہ یہ ہے کہ نفس اپنی خاصیت اصلی پر باقی ہو اور روح اس کے مظلوم ہو جائے، نہ یہ کہ بمقتضیٰ بشریت بھی نہ ہو ورنہ ہم تو نہیں کہہ سکتے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی شان میں جو یہ آیا ہے "وَعَصَى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَى" یا حضرت یونس علیہ السلام کی طرف تعریض ہے۔ "لَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ" یا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا جاتا ہے "مَا تَكُنْ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَى خَتَى يَخُنَ فِي الْأَرْضِ" ان سب کے کیا معنی ہوں گے۔ حالانکہ یہ سب وقائع کلام اللہ میں مذکور ہیں، گنجائش کا انکار بھی نہیں اور صحابہ کے ذلالت اگر ذلالت بھی ہوں اور از قبیل غلط نہیں نہ ہوں تب وہ کچھ کلام اللہ میں مذکور نہیں۔ کسی حدیث متواتر میں نہیں ممکن ہے کہ غلط ہوں اور نہ سہی ہم کہتے ہیں کہ غلط نہیں لیکن جو تم جواب انبیاء کی طرف سے دو گے وہی صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف سے سمجھ لو بلکہ ان کی طرف سے سہی عذر بہت ہے کہ وہ معصوم نہیں نئی نہیں، اگر خطا ہو گئی تو بلا سے، جب بایں ہمہ خاتمہ ان کی تعریف کر دی تو پھر کیا حاجت جواب اور کیا عذر کی ضرورت۔

مصرع: ہر عیب کہ سلطان بہ پند و ہنر ست

امکان خطا کے باوجود اتنی تعریف دلیل غفران و رضا ہے
التماس ہم کے قصور قابل گرفت نہیں اور عقل سلیم ہرگز تسلیم نہیں کرتی کہ ان پر مجاہد اور مواخذہ

ہو بلکہ ان اوصاف کے بیان ہی میں اس بات کی طرف اشارہ فرمادیا۔ اس لیے کہ ”اَجْلَاءُ عَلٰی الْكَفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ“ ہونا کچھ اس بات کو نہیں چاہتا کہ ان سے کوئی خطانہ ہوئی ہو اور جب اس بات کا التزام نہ ہو اور خداوند کریم نے باوجود امکان صدور خطا ان کی تعریف فرمائی تو یہ معنی ہوئے کہ یہ وصف ایسے نہیں کہ ان کے سامنے اس قسم کی باتوں کا حساب کیا جائے بلکہ یہ خوبی فقط اس قدر ہی ہے کہ سب کو محو کیے دیتی ہے تو گویا ضمناً اشارہ ان کی مغفرت کی طرف ہو اور جواب بھی وہ مضرب ہو سکیں تو پھر کیا تعریف جہنمی سے تو سو رہے بلکہ پاخانہ پیشاب بھی اچھے ہیں۔ چنانچہ ظاہر ہے۔

القصد نظر انصاف چاہیے خدا کی تعریف کے بعد پھر کہیں ہو سکتا ہے کہ صحابہ جہنم میں جائیں، پھر اس صورت میں ایک کیا لاکھ گناہ ان کے ذمہ لگا دو جو کرے گا وہ اپنی عاقبت خراب کرے گا اور سمجھنے والے اسی کو تعریف سمجھیں گے۔

امکان خطاء کے باوجود اتنی تعریف اعدائے صحابہ کے منہ پر طمانچہ ہے اور حق بھی تو ہے جب کوئی بادشاہ دانش مند جسے انتظام مملکت کا خیال ہو اور وہ ملازموں کے حال کا نگران ہوا اپنے چند ملازموں کو باوجود خطاؤں کے کچھ نہ کہے تو ظاہر میں یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ کوئی بہت ہی پیارے ہیں کہ اس حال پر بھی ان سے مواخذہ نہیں اور جو الٹی تعریف کرے اور ان کے غمازوں اور دشمنوں سے جو ان سے کینہ رکھتے ہوں، بری طرح پیش آئے اور ان کے ان کمالات کو جو اپنے نزدیک اور ان کے دشمنوں کے نزدیک ان کی خوبی مسلم الثبوت ہو ان کے دشمنوں کو سنا سنا کر کہے کہ ان میں سے جس میں یہ اوصاف پائے جائیں۔ ہم نے اس کی سب خطائیں معاف کیں بلکہ اس کے لیے اور انعام قرار واقعی تیار کیا ہے تو اس صورت میں بجز اس کے اور کوئی احتمال نہیں ہو سکتا کہ بادشاہ کو ان ملازموں سے محبت ہے اور اس کو ان کی مچ ہے جو ان کا دشمن ہے وہ اس کا دشمن جو ان کا دوست وہ اس کا دوست ہے۔

تعریف صحابہ کا ایک مقصد آنے والے دشمنوں کا چڑاانا اور جلانا بھی ہے سو بفضلہ تعالیٰ یہ سارا قصہ بعینہ ان آیات کے ملاحظہ سے سمجھ میں آتا ہے کیونکہ اول تو صحابہ کی تعریف ایسی بڑھ کر کرے کہ اس سے زیادہ کوئی تعریف کی صورت اہل حق میں سمجھ میں نہیں آتی۔ پھر بعد ازاں فرمایا: ”لِيُحِيطَ بِهِمْ الْكَفَّارُ“ یعنی یہ جو کچھ صحابہ کے حق میں کہا گیا تو کفار یعنی ان کے دشمنوں کے جلانے اور چڑانے کے لیے کہا گیا ہے۔ سبحان اللہ! کیا علم محیط خداوندی ہے کہ بعد

کے تمام احوال کی طرف اشارہ فرمادیا۔ خدا کو تو پہلے ہی معلوم تھا کہ شیعہ اور نو اصحاب اور خوارج صحابہ کے حق میں عمازیان کریں گے اور ان کی قدر و منزلت کا جو خدا کی درگاہ میں ہے کچھ خیال نہ کریں گے۔ باقی رہی یہ بات کہ ”لیعبط بہم“ کے ساتھ تو ”اعداء ہم“ کا لفظ ہونا چاہیے تھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کافروں کو ہی ان سے دشمنی ہو تو ہو مسلمانوں کا کام تو یہ نہیں کہ خدا ان کی تعریف کرے اور ان کی سب خطائیں معاف کرے اور پھر بھی ان سے حسد ہی کیے جائیں، جن کی خدا تعریف کرے اور خدا کی بات بات سے ان کی محبت ٹپکے پھر کب سختی ہے یا نہیں کہ ان کی بدی کرے اور برائیاں گائے اور خدا کو اپنا دشمن بتائے۔

صحابہ کرام شیعوں کے بھی محسن ہیں

یادوں کہئے کہ منکران صحابہ کو جو نبوت کلمہ گوئی کی آئی اور بزم خود مسلمان ہوئے تو یہ صحابہ ہی کی جوتہیں کا صدقہ ہے نہ وہ جہاد کرتے نہ اس طرح اسلام پھیلتا اور نہ یہ کلام اللہ کا رواج ہوتا کہ شیعہ تک باوجودیکہ کلام اللہ کو ان سے کیا نسبت، کلام اللہ کی تلاوت سے مستفید ہوتے ہیں۔ پھر یاس ہمساکر ان کے شکر گزار نہ ہوں تو پھر کس کے ہوں گے اور ان کے حق میں گستاخی کریں گے تو پھر کس کا ادب کریں گے ان سے زیادہ بڑھ کر اور کون کافر نعمت ہوگا ماس لیے جناب ہاری تعالیٰ نے دشمنان صحابہ کو کافر فرمایا۔

صحابہ کی تعریف قرآن کی پیشین گوئی ہے کہ آئندہ صحابہ کے دشمن پیدا ہونگے پھر چونکہ علم غیبی میں صحابہ کی نسبت بد گوئی اور گستاخی کا ہونا متحقق تھا تو جیسے مثال مذکور میں غمازوں کے لیے بیان کیا گیا تھا ایسے ہی غمازان صحابہ کو بھی سنا کر یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ”وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا“ یعنی حاصل اس کا اس صورت میں یہ ہوا کہ اے منکران صحابہ یہ جماعت صحابہ جن کی ہم تعریف کرتے ہیں اور تم پھر بھی ان کی بد گوئی سے باز نہیں آتے اور تسہر بھی نہیں سمجھتے۔ اگر بالفرض ایسے ہی ہیں جیسے تم کہتے ہو اور واقعی ان سے یہ خطائیں ہوئی ہیں جن کو تم گاتے پھرتے ہو، تب کیا ہوگا؟ ہم نے تو یہ وعدہ کر لیا ہے کہ ان میں سے جو ایمان رکھتا ہوگا اور اس نے اچھے اچھے عمل کیے ہوں گے ہم اس کی خطائیں بھی معاف کر دیں گے اور ان کو اجر عظیم بھی دیں گے، پھر جب وہ سب کے سب کافروں کے ساتھ تیز و تند ہوں اور آپس میں محبت رکھتے ہوں نماز میں ہمیشہ مشغول رہیں، سوائے خدا کی رضا مندی اور اس کے افضال کے اور کہیں طلبگار نہ ہوں تو

ہم ان کے گناہ کیونکر معاف نہ کریں اور انہیں کسی عذر سے ان کے ایمان اور اعمال صالحہ کا اجر کیوں نہ دیں، اس سے زیادہ ایمان اور اعمال صالحہ کی اور کیا ضرورت ہے۔

صحابہ سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ غیر مشروط ہے

اگر یہ شرط ہوتی کہ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ گناہ بھی کسی قسم کا نہ کریں تب بھی ایک بات تھی۔ اس وعدہ میں تو یہ شرط نہ تھی اہل فہم اس سے سمجھ گئے ہوں گے کہ "منہم" جو بعد "عملوا الصلحت" کے بڑھایا ہے تو اس کی یہ وجہ ہے کہ یہ وعدہ حقیقت میں منکروں کے جواب کے لیے بیان کیا گیا ہے اور اس کی یہ صورت ہے جیسے مرقوم ہوئی ورنہ یہ معنی اگر ہوں کہ کوئی ان میں سے ایمان لایا اور عمل صالح کیے اور کوئی کافر ہی رہا (نعوذ باللہ) تو اس کو ہم جانتے ہیں، شیعوں بھی ہا ورنہ کریں گے۔ اس لیے کہ خدا کے اتنے تو یہ بھی معتقد ہیں کہ خدا جسے مؤمن بتلا دے وہ مؤمن ہی ہے کافر نہیں۔ سو خدا نے ان کے ایمان اور اعمال صالحہ کی پہلے ہی گواہی دے دی بلکہ ایمان اور اعمال صالحہ میں سے بھی اول قسم کے ایمان اور اول قسم کے اعمال صالحہ کی گواہی دی کیونکہ ایمان میں تو اس سے بڑھ کر کوئی ایمان نہیں کہ خدا سے محبت اس درجہ کو پہنچے کہ اس کے دشمنوں سے کسے ہاشد اپنا ہو یا بیگانہ عداوت ہو جائے اور اس کے دوستوں سے کسے ہاشد محبت ہو جائے کیونکہ سب کے نزدیک بالاتفاق اعلیٰ مقامات ایمان میں سے ہے اور پھر وہ بھی اس قدر۔

ایمان کے معنی اور مراتب یقین

اور جیسا کہ ظاہر ہے اس لیے کہ ایمان کہتے ہیں کسی چیز کے یقین کر کے تسلیم کر لینے کو۔ سو اصطلاح شرع میں خاص خدا کے کلمات پر یقین کر لینا اور پھر ان کو تسلیم کر لینا یعنی مثلاً خدا اعلم الخا کہیں ہے تو اس کا ایمان کے یہ معنی ہوئے کہ اول تو خدا میں اس وصف کو یقینی سمجھے پھر تسلیم بھی کر لے، سو حاکم کی حکومت کے تسلیم کرنے کے یہی معنی ہیں کہ اس سے منحرف نہ ہو جائے۔ علیٰ ہذا القیاس سب کلمات کو سمجھو۔

علم الیقین

مگر یقین کے چند مرتبے ہیں۔ ایک تو علم الیقین یہ تو ادنیٰ مرتبہ ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی معتبر آدمی سے ہم سنیں کہ فلانی جگہ فلانی چیز ہے۔ ایسا یقین تو ہر ادنیٰ مسلمان کو حاصل ہے اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بالاتفاق سچے ہیں، ان کی خبر سے معلوم ہوا کہ خدا میں سب کلمات ہیں، اگر اتنا یقین بھی نہ ہو تو ایمان ہی نہیں۔

عین الیقین

دوسرا رتبہ عین الیقین یعنی جو کانوں سے سنا تھا وہ آنکھوں سے دیکھ لیا۔ سو اس مرتبہ میں یقین پہلی مرتبہ سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ سن کر گو کسی چیز کا یقین ہو جائے لیکن وہ بات نہیں ہوتی جو آنکھوں سے دیکھنے میں ہوتی ہے اسی واسطے خوبصورتوں کے قصے اکثر کانوں سے سنتے ہیں اور محبت نہیں ہوتی اور آنکھوں سے دیکھنے میں جو کچھ ہوتا ہے سب جانتے ہیں۔ لیلیٰ اور شیریں اور حضرت یوسف علیہ السلام سے ان کے مرنے کے بعد کسی کو محبت نہ ہوئی حالانکہ شہرہ ان کے حسن و جمال کا جتنا اب ہے جب نہ ہوگا بلکہ اس سے صاف یوں معلوم ہو گیا کہ سننے سے کسی کو محبت ہوتی ہی نہیں ورنہ حضرت یوسف علیہ السلام سے کسی کو تو محبت ہوتی اپنے زمانہ کے خوبصورتوں سے تو محبت ہو جائے اور ان سے نہ ہو، وجہ اس کی اور کچھ نہیں کہ سننے سے بوجہ صورت محبت پیدا نہیں ہوتی ورنہ حضرت یوسف علیہ السلام تو حضرت یوسف علیہ السلام ہی تھے۔

اور جو کہیں سننے سے ہو بھی تو وہ بھی دیکھنے ہی کا طفیل ہے یعنی آنکھوں سے جو خوبصورت نظر آتے ہیں اور ان کے دیکھنے سے ایک کیفیت ہوتی ہے تو پھر اگر سنتے ہیں کہ فلا نا خوبصورت ہے تو اسے اپنے تجربہ سابق پر قیاس کر لیتے ہیں اور اس وجہ سے گو نہ اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے ورنہ فطرت سننے سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے مادرزاد اندھے کو جسے شکل و صورت کا تصور ہی نہیں ہوتا اور خوبصورت اور بد صورت کو ہرگز نہیں سمجھتا اس کو بوجہ صورت کسی سے محبت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ سب جانتے ہیں بالجلد عین الیقین کے درجہ میں اگر کوئی چیز جمیل اور مجموعہ کمال ہوتی ہے تو اس سے شرط مناسب طبیعت محبت ہو جاتی ہے۔

حق الیقین

پھر ایک مرتبہ یقین کا حق الیقین ہے وہ یہ ہے کہ جس چیز کو آنکھوں سے دیکھا ہے اس کا استعمال ضرورت کے کامی اتفاق ہو جسے پانی کا ایک ٹود دیکھنا پھر دیکھ کر اسے پی بھی لینا، اب پینے کے بعد یہ احتمال ہے کہ شاید سیراب ہو یا دیکھنے میں کچھ غلطی ہوئی ہو باقی نہیں رہتا۔ غرض یہ مرتبہ یقین ہونے میں عین الیقین سے بڑھ کر ہے اس مرتبہ میں وہ محبت جو دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

محبت حق الیقین کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے

بلکہ محبت میں دیکھنے سے محبت اس سے بھی پیدا ہوتی ہے اس لیے کہ پانی سے جو محبت ہے تو اسی

وجہ سے ہے کہ وہ پیاس کو بجھاتا ہے۔ سو یہ بات تو پینے ہی سے معلوم ہوئی۔ اگر کوئی شخص ایسا فرض کر دے کہ اس نے نہ کبھی پانی دیکھا ہو نہ سنا ہو نہ اس کی تاثیر معلوم ہو اور نہ اسے کبھی پانی کی ضرورت ہوئی ہو۔ پھر اسے ایک دفعہ ہی پیاس لگے۔ اس وقت اس کے سامنے اگر پانی آ جائے تو وہ کیا جائے کہ اس میں یہ تاثیر ہے اور اس سے میری پیاس بجھ جائے گی۔ بجز اس کے کہ یا تو خدا اس کے جی میں ڈال دے کہ اسے استعمال کیجئے یا کوئی اسے تلا دے، اسے ہرگز پانی کی طرف یہ گمان نہ ہوگا۔ لیکن خوبصورتوں کو دیکھنا اس وجہ سے برتنا ہی ہے کہ جیسے گلزار کے دیکھنے سے جی کو راحت ہوتی ہے ویسے ہی ان کے دیکھنے سے جان و دل کو آرام ہوتا ہے۔ بالجملہ عقل سلیم یوں کہتی ہے کہ محبت حق الیقین کے مرتبہ میں ہوتی ہے۔ چنانچہ واضح ہو گیا۔ اگر اندیشہ تطویل نہ ہوتا تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس بحث کو پورا بیان کرتا مگر ناچار ہوں فرصت کم، پھر اپنا حرج اوقات، ادھر جواب خط کی جلدی۔ لہذا ان ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

صحابہ حق الیقین کے مراتب پر فائز تھے اور حب فی اللہ اور بغض فی اللہ میں بھی راسخ تھے

بالجملہ محبت مرتبہ حق الیقین میں پیدا ہوتی ہے اور یہ اعلیٰ قسم یقین کی ہے اور پھر محبت میں اعلیٰ قسم یہ ہے کہ محبوب کے لواحق و توابع تک محبت پہنچ جائے اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کے دشمنوں سے عداوت ہو جائے، سو جب جناب باری تعالیٰ نے سب صحابہ کے حق میں اس بات پر گواہی دی کہ ان کے دل میں ہمارے دشمنوں کی دشمنی اور ہمارے دوستوں کی دوستی ہے تو صاف واضح ہو گیا کہ ان کے دل میں خدا کی محبت پہلے ہے۔

باقی کوئی یوں کہے کہ مسلمانوں سے محبت ہونے کو کیا لازم ہے کہ خدا ہی کے سبب سے ہو، محبت کے بہت اسباب ہیں، نسب کی وجہ سے ہوتی ہے احسان اور سلوک اور دوستی کے سبب سے ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے اور بہت صورتیں ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس دشمنی کی بہت وجوہ ہیں، جب تک یہ تحقق نہ ہو کہ وہ محبت اور دشمنی خدا کے سبب ہے، تب تک مطلب ثابت نہیں ہوتا۔

جواب اس کا اول تو یہ ہے کہ جب کسی وصف کے ساتھ محبت اور دشمنی کو متعلق کرتے ہیں تو عرف میں وہ محبت اور دشمنی اس وصف ہی کی وجہ سے لگی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی یوں کہے کہ مجھے خوبصورتوں سے محبت ہے یا عالموں سے محبت ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کوئی یوں کہے کہ مجھے متکبروں سے عداوت ہے یا کافروں سے عداوت ہے تو کوئی ناانصاف بھی اس کے کھٹنے میں تامل نہیں کرتا

کہ یہ محبت اور یہ عداوت ان اوصاف ہی کی وجہ سے ہے اور یوں کسی کو احتمال بھی نہیں ہوتا کہ شاید کسی اور وجہ سے ہو۔ سو خدا نے بھی ”امضاء علی الکفار“ کہا ہے یعنی کافروں پر بڑے چیز و نعم ہیں اور کافر کے یہی معنی ہیں کہ خدا کا دشمن ہو تو معلوم ہوا کہ ان کی عداوت بوجہ کفر ہے۔ کسی اور وجہ سے نہیں اور جب بوجہ کفر ہوئی تو خدای کی محبت کے سبب ہوئی، ایسے ہی ”رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ“ کو بکھنے، یعنی ایک دوسرے کو جو آپس میں محبت ہے تو فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت اور آپ کے زمرہ میں داخل ہو جانے کے باعث ہے اور اس کا حاصل بھی وہی ہے کہ خدا کے محفلوں میں سے ہیں اور جب یہ کچھ کر ہوئی تو وہی خدا واسطے کی محبت ہوئی۔

صحابہ کا مقصود صرف رضائے الہی تھا

مع ہذا یتستغون فضلاً من اللہ ورضواناً“ نے اس بات کو خوب ثابت کر دیا کہ ان کے ہر کام میں خدا کی رضا مندی مد نظر ہے، سو کفار سے سختی کی باتیں اور آپس کی عنایتیں سب خدا کی رضا مندی کے لیے کرتے ہیں اور خدا کی رضا مندی کی طلبگاری عین نشان محبت ہے۔ سوائے محبت کے اور کوئی وجہ رضا کی طلبگاری کی ممکن ہی نہیں اور بہشت کی تمنا میں جو لوگ خدا کی مرضی کے کام کرتے ہیں تو وہ حقیقت میں مرضی کی طلب نہیں ہوتی، جنت کی طلب ہوتی ہے جیسے فقیر روٹی کی وجہ سے محل داروں کی خوشامد کرتے ہیں تو وہ حقیقت میں ان کی رضا کے طالب نہیں۔ مقصود اصلی ان کا روٹی ہی ہوتا ہے، بالجملہ رضا جوئی محبت ہی کا کام ہے۔ الغرض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جو کفار سے عداوت اور اپنے لوگوں سے محبت تھی تو وہ فقط خدای کی محبت کا ثمرہ تھا۔

صحابہ کی محبت اور تسلیم سے اوپر کسی محبت و تسلیم کا درجہ ہی نہیں ہے

بہرحال محبت مرتبہ حق یقین میں ہوتی ہے اور وہ اعلیٰ درجہ یقین کا ہے تو لازم آیا کہ سب صحابہ کو خدا کی عظمت اور جل جلالہ اور کمال اور جمال کا اتنا یقین تھا کہ اس سے اوپر کوئی یقین کا مرتبہ ہی نہیں۔ ادھر تسلیم اس وجہ کو بھی کہ اس کے آثار خود موجود تھے۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے خود اس کی خبر دی اور کہا ”وَتَوَّاهُمُ رُحْمًا مُّجَلًّا“ مگر تسلیم ہوتی تو یہ اعمال کیوں کرتے اور یہی الفاظ بمعیت جملہ ”یتستغون الخ“ ان کے اعمال صالحہ کی بھی خبر دیتے ہیں تو اب بعد اکل ان کا ایمان کامل اور اعمال صالحہ جن پر وعدہ مغفرت اور اجر عظیم تھا ثابت ہو گیا تو پھر یہ احتمال کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہیوں میں سے کوئی مسلمان تھا اور کوئی نہ تھا اس وجہ سے ”بَيْنَهُمْ“ فرمایا تو یہ شیعوں ہی سے ہو سکتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک اگر

ہدایات کا انکار اور محال کی تسلیم ممنوع ہوتی تو سنیوں کے مذہب سے روکریاں ہو کر مذہب شیعہ پر کیوں مستقیم ہوتے، اگر اندیشہ تطویل نہ ہوتا تو اس دعوے کی دو چار دلیلیں بیان کرتا مگر سمجھنے والے اسی رسالہ میں سے اس مطلب کو سمجھ جائیں گے ان کے لیے یہی دلیل بہت ہے۔

حق الیقین کے مراتب میں تفاوت ہے

باقی کوئی یوں کہے کہ صحابہ کو اگر مرتبہ حق الیقین تھا اور وہ اعلیٰ مراتب یقین ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے انہوں نے کوئی مرتبہ ہی نہ چھوڑا۔ صحابہ کیوں کہتے ہو رسول کہو تو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ علم الیقین میں سو آدمیوں سے اگر ایک خبر سنیں اور اس پر یقین ہو جائے تو وہ بھی علم الیقین ہے اور ہزار سے سنیں تب بھی علم الیقین ہے لیکن ہاں ہمہ دوسرا یقین قوی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کوس بھر سے ایک شے دیکھئے وہ بھی عین الیقین ہے اور ایک ہاتھ کے فاصلے سے دیکھئے وہ بھی عین الیقین ہے لیکن دوسری صورت میں جو وضاحت ہے وہ پہلی صورت میں نہیں، اسی طرح ایک دفعہ پانی پیجئے یا تھوڑا سا پیجئے، وہ بھی حق الیقین ہے اور کئی بار پیجئے یا بہت سا پیجئے وہ بھی حق الیقین ہے۔ مع ہذا دوسری صورت میں جو بات ہے وہ پہلی صورت میں نہیں ایک دفعہ میں بسا اوقات چنداں حال معلوم نہیں ہوتا ہاں کئی بار میں البتہ خوب معلوم ہو جاتا ہے۔

الغرض حق الیقین میں شریک ہونے سے مساوات لازم نہیں آئی۔ ہاں ہمہ مدار افضلیت کا محبت پر ہے معلوم ہونے پر نہیں، بسا اوقات ایک خوب صورت کو دو آدمی برابر دیکھتے ہیں، ایک کو محبت ہوتی ہے، ایک کو نہیں اور جو ہوتی بھی ہے تو برابر نہیں ہوتی سو صحابہ کو خدا تعالیٰ سے اتنی محبت نہ تھی جتنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا سے تھی۔

باہمی مناقشات ”رُحَمَاءَ بَيْنَهُمْ“ کے منافی نہیں ہیں

اب ایک بات قابل بیان کے اور باقی ہے وہ یہ ہے کہ شاید حضرات شیعہ کو موافق مثل مشہور۔ خوئے بدرابہانہ ہاں بسیار۔ صحابہ کی بزرگی کے تسلیم کرنے میں یہ حیلہ اور باقی ہو کہ صحابہ میں باہم اکثر مناقشات ہوئے اور ان کے باہم اکثر رنج رہے اور نزاع ظہور میں آئے۔ چنانچہ طرفین کی کتابوں میں موجود ہے۔ پھر ان کو ”رُحَمَاءَ بَيْنَهُمْ“ کیونکر ہم کہیں اور جب یہ نہیں تو پھر کس وجہ سے یوں کہا جائے کہ وہ کامل الایمان تھے بلکہ یوں احتمال ہوتا ہے کہ جن سے حضرت امیر کو رنج پہنچایا، وہ ان سے لڑے نہ وہ ”رُحَمَاءَ بَيْنَهُمْ“ کے مصداق تھے نہ ان پر ”آمنوا و عملوا

”الصلحت“ صادق آتا تھا اور لفظ ”مِنْهُمْ“ جو بعد ”عملوا الصلحت“ بڑھایا ہے تو انہی کے اخراج کے لیے بڑھایا ہے، اس شبہ کا جواب ہر چند فقط ہمارے ہی ذمہ نہیں کیونکہ بھیدہ بھی احتمال خوارج ہو اور نو اصب بھی پیش کر سکتے ہیں، شیعوں کو بھی اس اعتراض کا فکر جواب لازم ہے۔

صحابہ کی رنجش کی بناء بھی محبت تھی

مگر بغرض تسکین خاطر شیعہ دینی یہ معروض ہے کہ رنج دو وجہ سے ہوتا ہے ایک بوجہ عداوت، ایک بوجہ محبت، بوجہ عداوت کی تو صورت اظہر ہے، دشمنوں کو جو دشمنوں سے رنج ہوتے ہیں وہ اسی قسم کے ہیں، باقی بوجہ محبت کے یہ صورت ہے کہ کسی کا دوست اس کے خلاف مرضی اور خلاف توقع کرے تو یہ رنج بوجہ محبت ہے اس لیے کہ اگر اجنبی ایسی باتیں کرتے ہیں تو ان سے کچھ رنج نہیں ہوتا۔ اس سے خوب معلوم ہوتا ہے کہ یہ رنج فقط محبت کا ثمرہ ہے، اگر محبت نہ ہوتی تو یہ رنج نہ ہوتا۔ ایسے ہی اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی کچھ لو تو بہت ہو گا تو یہی ہو گا کہ خدا کے کلام کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ سو (نعوذ باللہ) مثل زرارہ بن اعین اور احوال طلق وغیرہ مقتدایان شیعہ جو بشہادت آئمہ اور کتب جمعوں نے اور کذاب ہیں۔ چنانچہ ان شاء اللہ مذکور ہو گا۔ کچھ خداوند کریم تو جموٹا اور کذاب نہیں؟ جو اتنا دشوار معلوم ہو مگر جن کو جموٹی باتوں کے تسلیم کرنے کی خواہش ہو وہ سچے کلام کو اگرچہ خدایا کیوں نہ ہو کیونکر تسلیم کر لیں۔

جن روایات پر تشیع کی بنیاد ہے ان کے راویوں کی ثقاہت کا حال

مع ذہابم یوں پوچھتے ہیں کہ سنی تو حسب اعتقاد شیعہ اس قابل ہی نہیں کہ ان کی کتابوں کی روایات کو تسلیم کیا جائے۔ باقی رعای شیعوں کی روایتیں ان کا حال یہ ہے کہ جن راویوں سے شیعہ اپنے دین ایمان کی باتیں لیتے ہیں اور مابین شیعہ اور حضرات آئمہ رضوان اللہ علیہم اجمعین وہ واسطے ہیں ان کا حال یہ ہے کہ ہشام بن سالم اور میثمی اور صاحب طلق یعنی احوال طلق وغیرہم جو ان کے مقتداء اور پیشوا اور احادیث معمول بہا کے راوی ہیں ان کی جو کچھ خوبیاں اور بزرگیاں ہیں اور حضرات آئمہ نے ان کے فضائل بیان کیے ہیں وہ سب تو اس رسالہ میں نہیں آ سکتے، پر بطور نمونہ کچھ معروض ہے کلینی جامع الکتب شیعہ ہے اس میں یہ حدیث ہے:

عن ابراهیم محمد بن الخزار و محمد بن الحسنین قالا دَخَلْنَا عَلَى اَبِي الْحَسَنِ الرَّحْمٰنِ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَقَلْنَا اَنَّ هِشَامَ بْنَ سَالِمٍ وَ الْمِثْمِیَّ وَصَاحِبَ الطَّلُقِ

يَقُولُونَ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى أَجُوفٌ إِلَى الشَّرِّ وَالْبَاقِي ضَمَدٌ لَخَرُّ لِلَّهِ سَاجِدًا ثُمَّ قَالَ
سُبْحَانَكَ مَا عَرَفُوكَ وَلَا وَحْدُوكَ لِمِنْ أَجَلٍ ذَلِكَ وَضُفُوكَ.

”حاصل اس روایت کا یہ ہے کہ ابراہیم بن محمد خزار اور محمد بن حسین بیان کرتے ہیں کہ ہم امام
ابو الحسن رضا علیہ السلام کے پاس گئے ہم نے کہا کہ ہشام بن سالم اور یحییٰ اور صاحب الطریق
کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ناف تک تو کھوکھلا ہے اور باقی ٹھوس ہے، آپ سنتے ہی سجدے میں جا پڑے
اور یہ فرمایا کہ الہی تو پاک ہے، ان عیوب سے نہ ان لوگوں نے تجھے پہچانا اور نہ انہوں نے تجھے
وعدہ لاشریک نہ جانا، اس سبب سے جو کچھ ان کے منہ میں آتا ہے بک دیتے ہیں۔“
دوسری روایت بھی کلینی ہی کی ہے:

عن علي بن حمزة قال قلت لابي عبد الله عليه السلام سمعت هشام بن
الحكم يروي عنكم ان الله جسم صمدى نورى معرفة فرورى يمتن بها على
من يشاء من عباده فقال سبحان من لا يعلم اخذ كيف هو الا هو ليس
كمثله شيء وهو السميع البصير لا يحل ولا يحس ولا يحيط به شيء ولا
جسم ولا صورة ولا تخد يد.

”حاصل اس روایت کا یہ ہے کہ ابن حمزہ کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے کہا کہ
ہشام بن حکم تم سے روایت کرے ہے کہ خدا جسم ہے ٹھوس، سو اس کے جواب میں حضرت امام ہمام رضی
اللہ تعالیٰ عنہ نے کچھ ویسا ہی فرمایا جیسا امام ابو الحسن رضا نے فرمایا تھا، مطلب قریب قریب ہے۔“

اب ان روایتوں کو دیکھئے کے مقتدایان امامیہ نے کیا کیا معرفتیں تراشی ہیں، پھر تسہل اماموں کا
حوالہ دیتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس بعضے ان کے مقتداء اور پیروا خدا کی نسبت یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ
خدا ازل میں جاہل تھا، جیسے زرارہ بن اعین اور بکر بن اعین اور سلیمان جعفری اور محمد بن مسلم
وغیرہم اور کہاں تک بیان کروں۔ ایسے ایسے بزرگواروں سے دین کی باتیں روایت کرتے ہیں اور
پھر ان روایتوں کو صحیح سمجھتے ہیں اور ان کا نام صحاح رکھتے ہیں اور یہ افسانے انہی کی معتبر کتابوں سے
معلوم ہوتے ہیں۔ یقین ہے کہ علماء سب تسلیم کریں گے۔

اور اگر موافق عادت بزرگان (دروغ پسندی) سنیوں کے سامنے جھوٹ بول جائیں اور انکار کر جائیں تو
اپنے دل میں تو ضرور ہی منفعل ہوں گے۔ سبحان اللہ! اس بات کی رعایت تو سنیوں میں ہے کہ جن کتابوں
کا صحاح نام رکھتے اور انہیں معتبر سمجھتے ہیں ان میں بجز پارساؤں اور متقیوں اور دین داروں کے اور کسی سے

روایت نہیں لاتے اور جولا تے بھی ہیں تو اس غرض سے کہ کوئی اس روایت کی وجہ سے دھوکا نہ کھا جائے اس لیے بتلا جاتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے یا موضوع یعنی بنائی ہوئی جھوٹی روایت ہے۔

الغرض شیعوں کے دین کی روایتوں کا جب یہ حال ہے تو کتب تواریخ تو نور علی نور ہی ہوں گی اور سنیوں کی روایت خود قابل اعتبار نہیں تو اس صورت میں جو روایتیں کہ نزاع صحابہ اور باہم کی چپقلش پر دلالت کرتی ہیں۔ کلام اللہ کے مقابلہ میں کیونکر قابل اعتبار ہوں گی۔ بہر حال کلام اللہ متواتر تو ہے جس صورت میں کلام اللہ میں ”رُحَمَاءَ بَيْنَهُمْ“ ہو اور اس کے تمہارے نزدیک یہی مسیحی ہوں کہ ان میں ہرگز کبھی رنج ہوتا ہی نہیں تو موافق قاعدہ اصول کے ان روایات کا اعتبار نہ ہوگا جو کلام اللہ کے مخالف ہیں، اب بفضلہ تعالیٰ جمیع امور متعلقہ آیت مرقومہ بالا سے فراغت پائی لازم یوں ہے کہ ایسی آیت بھی جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی بزرگی پر ایسے دلالت کرے کہ اظہر من الشمس ہو اور بسہولت فہم میں آجائے اور اس روایت سے ان کا حسن خاتمہ بھی معلوم ہو جائے بیان کی جائے، شاید کوئی راہ پر آجائے۔ لہذا آیت ششم معروض خدمت ہے۔

وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝

”حاصل اس کے معنوں کا یہ ہے کہ جو لوگ قدیم ہیں پہلے وطن چھوڑنے والے اور مدد کرنے والے اور جو ان کے پیچھے آئے نکی سے، اللہ راضی ان سے اور وہ راضی اس سے اور تیار کر رکھے ہیں اللہ نے ان کے لیے باغ جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں، رہا کریں وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ، یہی ہے بڑی مراد۔“

اس آیت کے بعد ہم جانتے ہیں کہ اگر حق پرستی مد نظر ہوگی تو مولوی عمار علی صاحب تو کس گنتی میں ہیں، شیعہ صد سالہ بھی جس کی رگ و پے میں تشیع سما گیا ہو حق بول اٹھے اور کیونکر حق نہ بولے، جناب باری تعالیٰ نے اس آیت میں مکران اکابر صحابہ کے لیے حیلہ و حجت کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

آیت ہجرت میں رضائے الہی کا مدار صرف ہجرت پر ہے

لہذا ارتداد کا الزام بھی مفید مقصد نہ ہوگا!

اگر ایمان کا ذکر نہ کیا اعمال صالحہ کا ذکر ہوتا تو شیعہ اور خوارج اور نواصب آنکھیں بند کر کے یوں بھی

کہہ سکتے کہ صاحب اس میں مؤمنوں اور اچھے عمل والوں کے لیے خدا کا وعدہ ہے۔ سو ہم کہتے ہیں کہ وہ دائرہ ایمان ہی سے خارج تھے سبقت ہجرت خلفاء ثلاثہ اور حضرت زبیر اور حضرت طلحہ وغیرہم مہاجرین اولین کچھ ڈھکی چھپی بات نہیں جو انکار کر سکیں اور کہہ دیں کہ صاحب کسی نے تہمت لگا دی ہوگی۔ خصوصاً خلیفہ اول کی ہجرت کہ وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہجرت سے بھی سابق ہے اور مہاجرین اولین تو انہیں لوگوں کی نسبت اول گنے جائیں گے جو بعد جنگ بدر کے آئے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو مہاجرین اولین میں سے بھی مہاجر اول نکلے۔ اس صورت میں تو اسی آیت سے ان کی افضلیت نکل آئی کیونکہ در صورت یہ کہ اس آیت میں جتنے وعدے ہیں وہ سب سبقت ہجرت پر (مثلاً) موقوف ہوئے تو جو کوئی سبقت میں بھی سابق ہوگا وہ استحقاق و فاء وعدہ میں بھی اول نمبر ہوگا اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو البتہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اتنے پہلے گھر چھوڑ کر آئے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر تک پہنچے، باقی سب ان سے پیچھے ہی نکلے۔

ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ منورہ کے درمیان عجیب و غریب فرق

اور ہجرت حبشہ اگرچہ ہجرت مدینہ منورہ سے سابق ہے لیکن اس کی وجہ سے سابق ہونا چنداں موجب افضلیت نہیں۔ اس ہجرت کی اباحت کا باعث تھا تو فقط قلت مبر تھا۔ مکہ معظمہ میں رہ کر پکا رہنا اور احکام خداوندی کا بجالانا بہت دشوار تھا، ثبات ایمان اور حفظ جان کے لیے ضعفاً کو رخصت ہو گئی تھی اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہجرت حبشہ نہ ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حکم نہ ہونے کی اگر کوئی وجہ جکلف نکال بھی لیجئے تو اس کا کچھ جواب ہی نہیں کہ جس نے حبشہ کی جانب ہجرت نہ کی اس پر کچھ عتاب نہ ہوا اور مدینہ منورہ کی ہجرت بغرض امداد دین تھی، اس کو رخصت نہیں کہہ سکتے۔ عزیمت ہی کہئے تو اول درجہ کی عزیمت کہئے۔ اسی لیے اس کے تارکین مورد عتاب رہے۔ ہر چند ہجرت حبشہ کا رخصت ہونا اور ہجرت مدینہ منورہ کا عزیمت ہونا قطع نظر ظاہر ہونے کے اس تقریر سے اور بھی واضح ہو گیا مگر مزید توضیح کے لیے اس قدر اور بھی ملحوظ خاطر رہے کہ ہجرت مدینہ میں جان پر کھیلنا تھا اور ہجرت حبشہ میں جان کا بچانا، اس میں دین کا بڑھانا تھا۔ اس میں اپنی نماز روزہ کا بجالانا، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد و نصرت تھی، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تنہا چھوڑ جانا۔ اس میں مارنا مرنّا، اقرباء سے رؤسا سے جہاد کرنا، اس میں اعداء کے ہاتھوں سے چھوٹ کر سلامت گزرتا: ”نہیں تفاوت رہ از کجاست تا کجا“ غرض ہجرت حبشہ کوئی فضیلت قابل تعریف نہیں، خصوصاً تعریف خداوندی۔

آیت السابِقون میں ہجرت سے مراد صرف ہجرت مدینہ منورہ ہے اسی لیے فریقین میں سے کسی نے اس ہجرت کو مصداق آیات تاکید ہجرت یا آیات فحائل ہجرت نہیں سمجھا اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ آیت اور نیز آیات ہجرت مدینہ منورہ کی ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہیں اور پھر اس آیت میں اور نیز اور آیات میں مہاجرین کے فحائل میں انصار کو پھر ذکر فرمایا اور سورہ حشر میں مہاجرین کے حال میں لفظ "يَنْصُرُونَ اللَّهَ" بڑھایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ فضیلت ہی ہجرت کے لیے ہے جو انصار کی نصرت کے ہمدوش اور ان کے کام سے ہم آغوش ہے، سو ایسی ہجرت اگر ہے تو مدینہ منورہ کی ہجرت ہے۔ حبشہ کی ہجرت میں نہ انصار تھے نہ نصرت تھی، بہر حال حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر اور حضرت عثمان اور حضرت علی اور حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہم کی سبقت ہجرت میں کچھ کلام نہیں۔

آیت ہجرت سے صرف رضائے الہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کا ایمان

اور اعلیٰ درجہ کے اعمال صالحہ بھی ثابت ہوتے ہیں

پھر اس سبقت ہجرت ہی کے سبب خداوند کریم یوں فرماتا ہے کہ اللہ ان سے راضی ہوا، سواؤل تو یہی کفایت کرتا تھا کیونکہ رضا سے آگے کوئی مقام ارفع نہیں۔ جب خدا ان سے راضی ہوا تو ان میں کمال ایمان بھی اس درجہ کو ہوگا کہ کہا نہیں جاتا اور اعمال صالحہ بھی ان کے قرار واقعی صالح ہوں گے۔ سواؤل تو موافق آیت "وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا" مرقومہ بالا کے ان کی مغفرت میں کلام کی گنجائش نہ رہی کیونکہ بزرگان مذکور سب کے سب غزوہ حدیبیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔

دوام جنت کی خوشخبری سے بڑھ کر حسن خاتمہ کی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے

مع ہذا پھر یوں بھی ارشاد فرمایا کہ ان کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہیں، پھر وہ بھی ہمیشہ کے لیے، اس پر بھی کوئی ان کی بزرگی میں شک کرے تو بجز اس کے نہیں ہو سکتا کہ بزرگی کے معنی اس کے نزدیک یہ ہوں کہ خدا اس سے ناخوش ہو اور اس کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہو، سو حضرات شیعہ جو ان بزرگواروں کی بزرگی میں کلام کرتے ہیں اور ان کے دشمنوں کو اکثر بزرگ سمجھتے ہیں تو شاید اسی اصطلاح کے موافق سمجھتے ہیں لیکن اس صورت میں لازم آئے گا کہ حضرت امیر سے بھی دست

مردار ہوں کیونکہ وہ بھی بشارت میں داخل ہیں۔ بہر حال ان اولیاء اللہ کے ہما کہنے والے ان کو کیا کہتے ہیں، خدا کو جھٹلاتے ہیں، سوان کا کافریا فاسق کہتا، اپنا کافریا فاسق کہتا ہے۔ آفتاب کو کوئی بے نور بتلائے تو وہ آفتاب کو کیا اپنی آنکھوں کو بے نور بتلاتا ہے۔

آیات فضائل صحابہ میں جو شبہات شیعہ پیش کریں گے، وہی بعینہ

خارجی بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں پیش کر سکتے ہیں

اس کے بعد اتنی اور گزارش ہے کہ بعضے ہٹ دھرم شاید یوں تکرار کریں کہ خدا پہلے راضی ہو گیا ہو، اور پھر جب حضرت امیر سے مخالفت کی ہو تو ناراض ہو گیا ہو اور ان کے لیے جو جہنم تیار کر رکھی ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کو عذاب نہیں ہونے کا بلکہ ہو سکتا ہے کہ اول عذاب ہو لے اور پھر وہ جہنم میں چلے جائیں تو اس کا جواب ہر چند قابل جواب نہیں۔ خصوصاً شیعہ کے مقابلے میں کیونکہ خوارج بھی بہ نسبت حضرت امیر کے اس قسم کی آیات میں بعینہ یہ احتمال پیدا کر سکتے ہیں یہاں تک کہ جن آیات میں مغفرت کا ذکر آیا ہے اسے بھی یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ مغفرت ہے جو بعد عذاب کے ہوگی لیکن نقل مشہور ہے کہ ”حیلہ جو راتا پڑوا زہ باید رسانید“

صحابہ کیلئے قیامت میں رسوائی نہیں اور کفار اور فاسق کیلئے رضائے الہی نہیں

اس لیے کہا جاتا ہے کہ اول تو سورہ تحریم میں یوں ارشاد ہے ”يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ“ یعنی ”جس روز کہ نہ رسوا کرے گا اللہ نبی کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں“ سوان کے ایمان میں تو شیعہ بھی کلام نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ کلام اللہ موجود ہے۔ ”إِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ“ یعنی اللہ راضی نہیں ہوتا کافروں سے بلکہ یوں بھی آیا ہے ”إِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ“ یعنی اللہ راضی نہیں ہوتا فاسقوں سے سو جب خدا ان سے راضی ہوا تو ان کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لانے میں تو کچھ شک نہ ہوا بلکہ اس بات میں بھی تردد نہ رہا کہ وہ ایک زمانہ میں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زمان حیات میں سے) صالحین میں سے تھے، فاسق تک نہ تھے تو بیشک موافق وعدہ الہی کے وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قیامت کو معزز اور محترم رہیں گے۔ پھر عذاب آخرت کے کہ اس سے بڑھ کر کوئی رسوائی نہیں کیا معنی۔ مگر شاید ان اُلوں سمجھ کے ماروں کے نزدیک بھی معنی عذاب کے ہوں۔ دوسرے یہ کہ سورہ انبیاء میں یوں ارشاد پاک ہے:

إِنَّ الَّذِينَ مَبَّتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ ۚ لَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَلَٰكِنَّهُمْ يُعَذَّبُونَ ۚ وَمَنْ لِّى مَا اسْتَهْتِ أَنْفُسُهُمْ يَخْلُدُونَ ۚ لَا يَخْرُجُ لَهُمُ الْفَرْعُ الْآخِرُ ۚ وَتَلْقَاهُمُ الْمَلَكَةُ ط هَٰذَا يَوْمُكُمْ الَّذِى كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ۝

”حاصل اس کا یہ ہے جس کے لیے ہمارے یہاں عمدہ مرتبہ مقرر ہوا ہے وہ اس دوزخ سے دور ہیں گئے نہیں سننے کے اس کی آہٹ تک اور وہ اپنی جی چاہتی چیزوں میں ہمیشہ رہیں گے، نہ غم ہوگا ان کو اس بڑی گھبراہٹ میں گھر لینے آویں گے ان کو فرشتے یوں کہتے ہوئے یہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ تھا۔“
اب خیال کیجئے کہ جن سے خداوند کریم وعدہ ”ظہور عظیم“ فرمائے اور تسلی آمیز کلام سے ان کو اطمینان دلانے، رسول کو سختی عذاب جاننا نا اہلوں کا کام ہے اور وعدہ کا پہلے سے مقرر ہونا آپ ظاہر ہے کہ ابھی سے وعدہ ہو لیا اور وہیں وعدہ کے موافق تسلیاں ہو لیں، پھر ان کے لیے عذاب کا ہونا جس کے نہیں ہو سکا کہ (نعوذ باللہ) خدا اپنے وعدے سے ہٹ جائے؟ سو خدا تعالیٰ ہی عیان علی کی طرح سے تو ہے ہی نہیں۔ (نعوذ باللہ منها) کما آج تقیہ کر کے سب کچھ کہہ لیا پھر وقت پر آنکھیں بدل لیں۔

صحابہ کے مشاجرات نہ کفر تھے نہ فسق کیونکہ دونوں رضاء کے منافی ہیں اس تقریر سے یہ واضح ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محاربہ یا شکر رنجی نہ موجب کفر ہے جیسا کہ شیعہ کہتے ہیں نہ موجب فسق نہیں تو خدا لوگوں سے کیوں راضی ہوتا، اس لیے کہ وہ خود فرماتا ہے ”إِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ إِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ“ بلکہ انکار امامت حضرت امیر بھی موجب کفر و فسق نہیں کیونکہ تمام جماعت مہاجرین و انصار سوا دو چار آدمیوں کے سب ان کی امامت کے شیعوں کے نزدیک منکر تھے اور اسی کی موید نبی البلاغت میں جوامع الکلب شیعہ ہے حضرت امیر سے دوبارہ محاربہ امیر معاویہ یوں مروی ہے ”أَضْحَا نَقَابِلُ إِخْوَانَنَا لِي الْإِسْلَامَ عَلَىٰ مَا دَخَلَ فِيهِ مِنَ الزَّيْبِ وَالْأَعْوَجَاجِ“ یعنی ”ہم اچھے مسلمان بھائیوں سے اس سبب سے لڑتے ہیں کہ اسلام میں کچھ کجی کی باتیں داخل ہو گئی ہیں۔“ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ منکر امامت حضرت امیر اور ان سے لڑنے والے کافر نہیں اور امیر معاویہ باوجود اس مخالفت اور انکار امامت کے چنانچہ سب کو معلوم ہے حضرت امیر کے نزدیک مسلمان ہی تھے۔ اب اگر شیعہ مذہب کو قہر ماننا چاہیں تو ان روایات کی تغلیط اور تکذیب کریں جن سے محاربات صحابہ اور مشاجرات ان کے حضرت امیر کے ساتھ ثابت ہوتے ہیں۔ نہی تو یہی کریں کہ کلام اللہ میں سے ان آیات کو مین پڑے تو آزادیں۔ آخر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ

عہ نے حضرت امیر کے استحقاق امامت کے مخفی کرنے کے لیے گیارہ ہزار آجوں کے قریب اڑا دیں حالانکہ واجبات کا مخفی کرنا سخت گناہ ہے۔ شیعہ تو بزم خود نیک ہی کام کریں گے اور جب حضرت امیر سے لڑنا اور ان کی امامت کا انکار تک موجب کفر و فسق نہ ہوا حالانکہ امامیہ کے نزدیک محل شہادتیں اقرار امامت حضرت امیر بھی جزء ثالث ایمان ہے تو اور گناہ جو اس سے کتر ہیں وہ کا ہے کہ موجب کفر و فسق ہوں گے۔ اس صورت میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے اصحاب بھی اس طعن سے شیعوں کے عقائد کے موافق بری ہونے چاہئیں۔

بہر حال آیت السابقون نے شیعوں کو جواب دندان شکن سنایا نہ بن پڑے ہے کہ اصحاب ثلاثہ وغیرہم مذکورین کی نسبت یوں کہیں کہ وہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد مسلمان ہوئے کیونکہ یہ آیت سورہ توبہ میں ہے اور سورہ توبہ کل ایک دو برس پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے نازل ہوئی ہے۔ یہ سب صاحبان مکہ میں مسلمان ہوئے تھے نہ اس کی گنجائش کہ لفظ باحسان ہی کو (طے یا نہ طے) دھینگا دھینگے سے مہاجرین اور انصار کے ساتھ ملا کر کچھ باب گنگو کشادہ کریں کیونکہ ”ابجواہم“ کے متعلق ہے اور پھر وہ جملہ ہے اور جملہ بھی موصولہ ماقبل تک کیونکر لے جائیں؟

عقیدہ تفصیل آئمہ پر آیت ”اعظم درجۃ“ کی ضرب کاری

مع ہذا طرفہ تماشایہ ہو گیا کہ اس آیت اور دو تین دوسری آجوں کے ویلے سے جو اس آیت کے ذیل مذکور ہوئیں سنی اصحاب ثلاثہ کیا بلکہ تمام مہاجرین اور انصار کا ایمان ثابت کر کے امامیہ کے ایک اور عقیدہ کو خاک میں ملا سکتے ہیں۔ وہ عقیدہ یہ ہے کہ حضرات آئمہ سب کے سب اُمتوں سے تو کیا انبیاء سے افضل ہیں اور وجہ اس عقیدہ کی پامالی کی یہ ہے کہ سورہ توبہ ہی میں (ان صحابہ کے حق میں جو ایمان بھی لائے اور ہجرت بھی کی اور جان و مال سے خدا کی راہ میں جہاد بھی کیا) یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ ان کا مرتبہ اور اُمتوں سے اعلیٰ ہے۔ پھر اس میں کچھ تخصیص امام اور غیر امام کی نہیں تو معلوم ہوا کہ سوائے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اور آئمہ اطہار اس رتبہ کو بھی نہ پہنچے تھے جو ان صحابہ کا ہے۔ نبی کا رتبہ تو درکنار۔ تسکین خاطر کے لیے وہ آیت مرقوم ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهًا لِلّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ فَرَجًا
عِنْدَ اللّٰهِ ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاٰزِزُوْنَ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوا
لِشَرِّهِمْ رِبٰۤيْهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَاَرْضُوْا ۚ وَجَنَّبَ
لَهُمْ فِيْهَا نَعِيْمًا مُّقِيْمًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ط اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝

”یعنی جو لوگ کہ ایمان لائے اور انہوں نے وطن چھوڑ دیا اور خدا کی راہ میں مال و جان سے

جہاد کیا وہ سب میں بڑے درجہ والے ہیں اور وہی لوگ مراد کو پہنچنے والے ہیں، بشارت دیتا ہے ان کو رب ان کا، اپنی رحمت اور اپنی رضامندی اور ہانگوں کی جن میں ان کے لیے دوام کی نعمت ہے، وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کور ہیں گے کیوں نہ ہو اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔“

باب عقیدہ بداء کی تفصیل میں!

بداء کی پر خارداری اور علمائے شیعہ کا اضطراب

اب حضرات شیعہ سے بجز اس کے کچھ نہیں بن پڑتی کہ یا تو حق بول انھیں یا یہ موافق مثل مشہور ”الضرورة تبیح الممحظورات“ بحکم ضرورت پھر مذہب قدیم کی طرف رجوع کریں اور یوں کہیں کہ ہمیں کلام اللہ سے وہی ثابت ہوتا ہے جو سنیوں کا مطلب ہے لیکن خدا کا کیا اعتبار؟ جیسے اور بہت سے امور میں۔ (ہمارے عقیدہ کے موافق آج کوئی مانے یا نہ مانے) خدا کو بداء واقع ہوا ہے۔ صحابہ کی شان میں اور سنیوں کے حق میں اور کلام اللہ کی حفاظت میں بھی بداء واقع ہوا۔ پہلے یوں ہی ارادہ ہو جیسا کلام اللہ میں فرمایا، بعد میں رائے بدل گئی ہو اور یہی معنی بداء کے ہیں۔

بداء کے ایک معنی

چنانچہ نظام الدین جیلانی نے جن کو آج کل کے شیعہ شاید منافق بتلاتے ہیں، رسالہ علم الہدایہ میں تحقیق البداء میں لکھا ہے ”يُقَالُ بَدَأَ لَهُ إِذَا ظَهَرَ لَهُ رَأْيٌ مُخَالَفٌ لِلرَّأْيِ الْأَوَّلِ“ یعنی کہا کرتے ہیں کہ فلان نے کو بداء واقع ہوا جب اس کو پہلی رائے کے مخالف کوئی دوسری رائے سوچے، ملا نظام الدین جیلانی مذکورہ رسالہ میں لکھتا ہے کہ شیخ ابو جعفر طوسی اور شیخ ابوالفتح کراچکی کا بھی بداء کے معنوں میں یہی مذہب ہے اس لیے کہ شیخ طوسی نے عدۃ میں اور شیخ کراچی نے کنز الفوائد میں یہی تحقیق کی ہے۔

بداء کے دوسرے معنی

مگر شریف مرتضیٰ نے ذریعہ میں جو کچھ تحقیق کر کے لکھا ہے (اور طبری کے کلام میں سے بھی کچھ اس کی توثیق ہے) وہ اس کے خلاف ہے کیونکہ وہ لکھتے ہیں معنی ”قولنا بدأه تعالیٰ اللہ ظہر له من الأمر ما لم يكن ظاهراً“ یعنی ”ہم جو کہتے ہیں کہ خدا کو بداء ہوا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا کو کوئی ایسی بات معلوم ہوئی جو پہلے نہ تھی۔“ پھر اس کے بعد ملا نظام الدین لکھتے ہیں کہ یوں لکھتا ہے کہ حاصل یہ ہے کہ خدا کو اشیاء نو پیدا کا علم ان کے وجود کے بعد حاصل ہوتا ہے اور پھر

اس کے بعد اپنی تحقیق لکھتا ہے اور وہ تحقیق دوسرے معنوں پر منطبق آتی ہے وہ یہ ہے کہ خبر میں بھی بدا ہوتا ہے یعنی یوں بھی کہی ہوتا ہے کہ آئندہ بات کی خبر دی کہ یوں ہوگی اور وہ اس طرح نہ ہو۔

بدا کے تیسرے معنی

اب سنئے کہ متاخرین امامیہ کو کچھ بدا کے باب میں بھی ہوش آئی ہے اور سنیوں کے اعتراضوں کو سننا کر کچھ فکر آبرو ہوا ہے۔ اس لیے بات بدل کر اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ یہ بات فقط خاص اس علم میں ہوتی ہے جس کی کسی کو خبر نہیں کرتے اور جو علوم کہ انبیاء کو بھیجے جاتے ہیں، اس میں خدا جھوٹ نہیں بولتا، سوا اگر اس بات پر امامیہ جم جائیں تو سنیوں کی طرف سے ان کو مرہب اور آفرین اس صورت میں کلام اللہ کی بات تو ہاں تو لے پاؤرتی کی ہوگی۔ پھر ہمیں کیا ضرورت کہ بداء کے عذر کی وجہ سے کسی اور طرح سے اثبات مدعا کریں۔

مگر مانتے ہیں ملا نظام الدین کو کہ سنیوں کے طعن اٹھانے اور مذہب کے بٹالک جانے سے گھبرائے مذہب کو سنبھالا اور متاخرین کی نہ مانی۔ اس تخصیص میں جو متاخرین بسبب علم مخصوص کے کرتے تھے ان کی تکذیب کی اور بہت سی روایات احادیث مذہب شیعہ نقل کر کے متاخرین کی بات کو خاک میں رُلا دیا اور کیوں نہ رُلاتے آخر شیعوں میں بڑے محقق ہیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ اس باب خاص میں رسالہ لکھا۔ مع ہذا اس کا کہنا بھی صحیح ہے، جھوٹ بولنا تو جب ہو جب خدا جان بوجہ کر کچھ کا کچھ کہہ دے اور جب (نعوذ باللہ) خدا اسی کو غلط معلوم ہو تو پھر خدا کا کیا قصور؟ جو متاخرین کہتے ہیں کہ خدا اپنے دوستوں سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔

بدا کی تین قسمیں

بالجملہ ان سب روایات سے جو محقق مذکور نے اثبات مدعا کے لیے نقل کیں۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ بدا کی تین قسمیں ہیں۔ ایک تو بدانی العلم یعنی خدا نے پہلے سے کچھ جان رکھا تھا مگر بعد میں حقیقت الامر کچھ اور معلوم ہوئی۔ دوسرے بدانی الارادہ یعنی پہلے کچھ ارادہ تھا، پھر یوں معلوم ہوا کہ یہ ارادہ ٹھیک نہیں، تیسرے بدانی الامر یعنی پہلے کچھ حکم دیا۔ پھر بعد ازاں یوں معلوم ہوا کہ پہلے حکم میں کچھ غلطی تھی، اس حکم کو بدل کر دوسرا ایسا حکم جس میں وہ نقصان نہ ہو بلکہ مصلحت وقت معلوم ہوتی ہو، صادر فرمائیں۔

بدا اور نسخ میں ایک اشتباہ کا ازالہ

یہ معنی آخر خوب ذہن نشین رکھنے چاہئیں، ایسا نہ ہو کہ نسخ سے مشتبه ہو جائیں کیونکہ نسخ حقیقت

میں اسے کہتے ہیں کہ ایک حکم کا زمانہ آخر ہو جائے اور دوسرے حکم کا زمانہ آجائے۔ مثلاً رمضان میں روزہ رکھنے کا حکم ہے۔ جب عید ہوئی وہ زمانہ آخر ہو اور افطار کا زمانہ آ گیا۔ اسے یوں نہیں کہتے کہ پہلے حکم میں کچھ غلطی تھی اس لیے موقوف کیا گیا بلکہ وہ حکم اسی زمانہ تک تھا، اس کے بعد دوسرے حکم کا زمانہ آ گیا۔ اتنا فرق ہے کہ کہیں پہلے سے زمانہ کی مقدار کی اطلاع ہو جاتی ہے۔ جیسے مثال مذکور میں اطلاع ہے اور کہیں نہیں ہوتی وقت ہی پر ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک تھی۔ یہ بات سوائے خداوند کریم کے کوئی نہیں جانتا تھا اور جو کوئی جانتا بھی تھا تو یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ زمانہ کس وقت آئے گا۔ القصہ بدانی الامر جسے شیعہ بدانی الحکلیف کہتے ہیں اور ہے اور نسخ اور ہے بدائی کی یہ صورت ہے کہ رمضان کے مثلاً روزے رکھنے کا حکم دیا اور جب تک کوئی نقصان اس میں معلوم نہ ہوتا تھا اور اسی لیے جب تک یوں نہ ٹھہرایا تھا کہ یہ حکم فلاں وقت تک رہے گا۔ پھر کا ایک یہ سوچیں کہ مصلحت وقت اس کے خلاف میں ہے، اس لیے اس کو بدل دیا۔

بدائی تینوں قسمیں ایک دوسرے کو لازم ہیں

جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اس ہچمدان کی گزارش بھی سنئے کہ در صورت بدانی الحکلیف کے واقع ہونے کے بدانی الارادہ بھی جسے بدانی التوین بھی کہتے ہیں لازم ہوگا کیونکہ بدانی الارادہ تو اسے ہی کہتے ہیں کہ بسبب کسی مصلحت تازہ کے پہلے ارادہ سے پلٹ جائیں تو جب مصلحت ہی کے لحاظ سے حکم بدلا گیا تو پہلا ارادہ جو اس حکم کی پیشگی کا تھا وہ آپ بدلا گیا اور اسی طرح بدانی الارادہ کو بدانی العلم جسے بدانی الاخبار بھی کہتے ہیں لازم ہے اس لیے کہ ارادہ تو نئی مصلحت کے معلوم ہونے پر بدلتا ہے، پھر جب مصلحت تازہ معلوم ہوئی تو لازم ہے کہ اسے صحیح ہوئی کہ جو علم اب حاصل ہوا وہ پہلے نہ تھا اور جو پہلے تھا وہ اب غلط معلوم ہوا۔ اسی کو بدانی العلم کہتے ہیں۔

سو اگر شیعوں میں سے کوئی بدانی الامر اور بدانی الارادہ کا تو قائل ہو اور سنیوں کے سامنے بدائی الاخبار سے مکر جائے تو یہ مکر جانا پیش نہ جائے گا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ شیعوں کے نزدیک مسئلہ بدائع علیہا ہے۔ اگر وہ آیات مذکورہ کے دباؤ سے سنیوں سے دامن چھڑانے کو یوں کہنے لگیں کہ اگر تم اپنے پیرواؤں کی بزرگی کلام اللہ سے ثابت کرتے ہو تو ہم نے مانا کلام اللہ میں ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو لیکن کلام اللہ کا (نعوذ باللہ) کیا اعتبار؟ خدا کی رائے گھڑی گھڑی بدلتی رہتی ہے اور (نعوذ باللہ) غلط صحیح رطب یا بسبب اس کے کلام میں ہوتا ہے، ہمارے آئمہ کو البتہ علم "ما کان ما یکون" تھا ان کے اقوال سے اگر ان کی بزرگی ثابت ہو تو بیشک ہم تسلیم کر لیں۔

عقیدہ بداء کے نتائج (۱) چاروہ معصوم کی مغفرت مشکوک

اس صورت میں ہمیں بھی یوں لازم ہے کہ شیعوں کی اس حجت کو بھی ختم کر دیں۔ اس لیے سامعہ خراش اہل انصاف ہوں کہ اگر یہی بداء ہے تو اوّل تو ہمیں چاروہ معصوم کی مغفرت میں کلام ہے۔ (نعوذ باللہ) اور شیعوں کا تو کیا ذکر؟ جیسے اصحاب کرام سے وعدہ ہائے مغفرت کر کے بعد بداء پھر گئے، اگر حضرات آئمہ کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی ہو تو فرمائیے اماموں کا خدا پر کیا دباؤ ہے؟ خاص کر یہ بہانہ بھی موجود ہو کہ ان کے تقیہ اور نامردہ پن نے تمام دین کا ستیاناس کر دیا۔

امام آخر الزماں کی طویل روپوشی اندیشناک ہے

پھر اس پر امام آخر الزماں نے تو (نعوذ باللہ) یہ ستم ڈھائے ہیں کہ باوجود یکہ دوست دشمن کی خبر ہے یہ بالیقین معلوم ہے کہ تمام ملک ایران میں مخلصان شیعہ سالہا سال سے خنجر زیارت اور مشتاق ملازمت بیٹھے ہیں۔ جان و مال فدا کرنے کو تیار ہیں، ادھر ہندوستان میں روز بروز ترقی تشیع ہے، امام کے انتظار میں مرے جاتے ہیں، اگر حسب حال ان کے یہ شعر کہا جائے تو بجا ہے:

اے اشتیاق رویت دلہا کباب کردہ سیلاب اشتیاقات جانہا خراب کردہ
مع ہذا اپنی موت اپنے اختیار میں ہے اور اس پر یہ معلوم کہ میں فلاں وقت سے پہلے نہ مروں گا، باوجود اس فراہمی اسباب اور انتظار احباب کے خدا جانے کیا نامردانہ پن ہے کہ روز بروز زیادہ ہی چھپتے جاتے ہیں اور باہر نہیں آتے۔ اگر خدا نخواستہ کچھ اندیشہ ہوتا تو کیا ہوتا، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کل تین سو تیرہ ہی آدمی مجتمع ہونے پائے تھے جو جہاد شروع کر دیا، پھر وہ بھی بزم شیعہ اکثر منافق اور منافق بھی نہیں تو ایسے قلعے بھی نہ تھے جیسے امامیہ زمانہ امام زماں سے اخلاص و محبت رکھتے ہیں اور قلعے نہ تھے جہی تو شہادت امامت حضرت اس پر چھپالی بلکہ خلافت اور سوا اس کے اور حقوق اہل بیت دبا بیٹھے، بہر حال جائے حیرت ہے کہ بایں ہمہ سامان و امن و اطمینان غیبت امام کا انتہائی نہیں، کہیں اماموں کا بسبب ”ماکان ما یکون“ کے عالم ہونا غلط ہے؟ یا شیعوں کی دوستی غلط؟ اور ہم جانتے ہیں کہ یہی صحیح ہے ایک دوستی کی آڑ میں ہزار عیب اماموں کے ذمے لگاتے ہیں، چنانچہ کچھ کچھ تو اس رسالہ کے دیکھنے والوں کو بھی واضح ہو جائے گا۔

پس امام کو امام بنانے میں بھی شاید خدا سے بداد واقع ہو گیا ہو

الحاصل امام زماں بایں ہمہ انتظار احباب اور فراہمی اسباب ادھر، پھر ہر طرح سے بے اندیشہ غار

سرمن مائے سے ہا ہر تشریف نہیں لاتے اور دین محمدی اور اُمت احمدی کی خبر نہیں لینے کہ کس گریہ میں پھنسی ہوئی ہے دین ابو بکر بجائے دین محمدی اور یحیٰی عثانی بجائے کلام ربانی دوازہ امام کے بدلے ابو حنیفہ شافعی اور اس گمراہی سے زیادہ اور کیا گمراہی ہوگی جس کا انتظار ہوگا۔ الغرض ماسوں کو یہی طرز تھا کہ ہم بے بس و بے کس ہیں، امام زماں جو ہا ہر تشریف نہیں لاتے تو ان کو کیا عند ہے صحت یہ کہ بداکو ہم تسلیم کر لیں تو جیسا ہے بھانٹکامی بدین کی امامیہ کے عقائد کے موافق مجاہد کے سمجھ میں نہیں آتی کہ خدا سے دوازہ امام کے مقرر کرنے میں بڑی چوک ہوئی ہو کہ مصلحت کو مقرر رکھا جو دین کو رونق دیتے اور بھانٹکامی نہ ہونے دیتے۔ انصاف امامیہ سے مجاہد کے اور کچھ جہن نہیں پڑتی۔ ہاں اگر اس کے قائل ہو جائیں کہ خدا کے ذمہ یہ واجب نہیں کہ جو بندہ کے حق میں اسلحہ ہولے کیا کرے تو البتہ ہوں بھی کہہ سکتے ہیں "لَا يُنْفِلُ عَمَّا يُفْعَلُ وَهُمْ يُسْتَلَوْنَ" یعنی خدا سے کوئی ہول نہیں پوچھ سکتا کہ یوں کیوں کیا اور خدا سب سے پوچھ سکے ہے کہ تم نے یوں کیوں کیا؟

امام زماں کو شاید بداک کی وجہ سے خدا معزول کر چکا ہو

بہر حال عجب نہیں جو بداد واقع ہوا اور امام زماں کی معزولی کا حکم صادر ہو چکا ہو اور شاید یہی وجہ ہے کہ تحقیق سے زیادہ امام کو غیبت میں گزری اور یہ جو امامیہ کے ذہن نشین ہے کہ ابو بکر مر وغیرہم آخر زمانہ میں پیدا کیے جائیں گے یہ بالکل غلط نہ ہو بلکہ امام زماں کو معزول کر کے شاید ان کو پھر نئے سرے سے پیدا کر کے مامور کریں۔ پر امامیہ نے باجماع خداوندی اس بات میں غلطی کھائی ہو کہ وہ مزادینے کے لیے پیدا کیے جائیں گے۔ خیر یہ بات تو شاید شیعوں کو ناگوار ہو۔

عقیدہ بداک کا استیصال قرآن مجید سے

سوچاں خاطر شیعاں بات سے عرض کر کے یوں متمسک ہوں کہ اگر خدا سے چوک ہوتی ہے تو انبیاء سے تو نہ ہوتی ہوگی اور اتنا ہم جانتے ہیں کہ شیعوں بھی نہ کہیں گے کہ خدا اخبر گزشتہ میں بھی غلطی کھاتا ہے کیونکہ یہ تو صاف مہوٹ ہے۔ جب یہ بات ذہن نشین ہوگئی تو ہم کہتے ہیں کہ خداوند کریم سواطط میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں جو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے بہت پہلا قصہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقولہ فرعون کے سوال کے جواب میں یوں نقل فرماتا ہے: "لَا يَجِئُ رَّبِّي وَلَا يُنْصَىٰ" یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میرا رب نہ ہو کے نہ ہولے ہے، اس آیت کو غور کیجئے کیا ارشاد کرتی ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو ہم جانتے ہیں،

میں بھی ہوں، بالکل اس کے کہ وہ چوک جائے۔ یہ تو اس لڑکے کے بیٹاؤں کے لئے اسی کے لئے
 ایک بھائی، یہ وہی ازم آ، یہ گا کہ معصوم بھی خطا کرے، پھر یہ طعن جو سینوں پر کرتے ہیں کہ ان
 کے امام اور علیہ معصوم نہ تھے حالانکہ امام اور علیہ کو چاہیے کہ معصوم ہو، طحانہ کرے اور نہ حق اور باطل کی
 گزشتہ کی جائے کی اور جو فرض کہ ان کے مقرر کر کے ہوئی ہے یعنی احکام شریعت معلوم ہونا اور
 ان کا عمل اور آدہ وہ وہ حاصل نہ ہوگی، سب یہ طعن کس منہ سے کریں گے۔

تو اعد عطا کہ شیعہ کی رو سے خدا سے خطا ممکن معصوم سے ناممکن

الغرض تو اعد عطا کہ شیعہ سے یوں ثابت ہوتا ہے کہ خدا سے کو خطا ہو جائے، پر معصوم سے طحانہ
 ہو، سو حضرت موسیٰ علیہ السلام جو بالاطلاق معصوم تھے، انہوں نے جو یہ فرمایا کہ میرا رب نہ بہکتا اور
 پکا کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے تو اس میں تو ہرگز احتمال غلط نہیں اور خدا نے جو یہ قصہ نقل فرمایا تو ایک قصہ
 گزشتہ ہے کچھ آئندہ کی بات نہیں جو بدلتی الاخبار کی گنجائش ہو، پھر کیا معنی کہ خدا بہک جائے کچھ نعوذ
 باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ عقل و حواس میں اختلال آ گیا مابو بکر و عمر ہر چند صاحب
 رعب اور مرد ہمت تھے مگر نہ اتنے کہ خداوند کریم کے بھی عقل و حواس میں فرق آ جائے یا سوا اس کے
 اور کچھ سبب ہے موصوفہ باللہ من ہذہ الصفات تعالیٰ اللہ عن ذالک علوا کثیرا ایک
 سینوں کے اثر اس کے لئے خدا کی عظمت بھی تو ہاتھ سے دے بیٹھے۔ مذک چھینا تھا تو ابو بکر نے چھینا تھا
 اور قرطاس و حوات کو نہ لانے دیا تو عمر نے نہ لانے دیا، ان پر تمرا کیا تو کیا خداوند کریم کو جو ان برائیوں
 سے رات بیا تو کیا یہی سبب سے کہ باوجودیکہ نصر المظلوم حق (یعنی مظلوم کی مددگاری حق) ہے اور پھر
 مظلوموں کی مددگاری نہ کی۔ خیر خداوند کریم ان بیا کوں کا منہ سیاہ کرے کہ سخت بلباب ہیں اور جس
 اش یہ چیز انکس وہیں ہی پہنچائے۔ بالجلہ کلام اللہ میں بد کو نفع و نیا دے کا ٹاڑ دیا ہے۔

بدا کا عقیدہ رکھنے والوں کے لئے حضرت جعفر کی بددعا

اور اگر شیعہ خدا کا اعجاز بھی اعتبار نہ کریں اور اخبار گزشتہ میں بھی غلطی فہم کے احتمال سے (نعوذ
 باللہ) اسیت کے طالب ہوں کہ ہم کلام اللہ کی گواہی پر بد اسے اتار نہیں کرتے جب تک کہ کلینی
 نہ کہ حدیث باب میں نہ ہو کلینی کی حدیث بھی لیجئے۔

هو لكافي عن منصور بن حازم عن ابي عبد الله قال منصور سألته قل يَكُونُ
 سَوْءٌ ثُمَّ يَكُونُ فَيَوْجِبُ عَلَيْهِ اللَّهُ قَاتِلًا لَا مَنْ قَاتِلٌ هَذَا فَأَعَزَّهُ اللَّهُ قُلْتُ لَوْ بَثَّ مَا كَانَ

وَمَا هُوَ كَاتِمٌ إِلَى يَوْمِ الْفِتْنَةِ لَسَنَ لِي عِلْمُ اللَّهِ لَالْ بَلَى قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ الْخَلْقَ
 ”بلکنی کافی میں منصور بن حازم سے روایت کرتا ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ
 عنہ سے پوچھا کوئی چیز ایسی بھی ہوئی کہ کل خدا کو معلوم نہ تھی اور آج ہو گئی ہو؟ آپ نے فرمایا کہ کوئی نہیں
 ، جو یہ کہے خدا سے رسوا کرے، پھر میں نے پوچھا کہ یہ تو بتائیے جو ہو لیا اور جو ہونے والا ہے قیامت
 تک، کیا خدا کو معلوم نہ تھا؟ انہوں نے فرمایا کیوں نہیں خلق کے پیدا کرنے سے پہلے معلوم تھا۔“

اس روایت سے دو قاعدے حاصل ہوئے، ایک تو یہ کہ بد ایک عقیدہ غلط ہے کیوں کہ ہدای کی آفتوں
 میں جو تحقیق گزر چکی اس سے صاف ثابت ہے کہ بد اب اس کے ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی نیا علم پیدا ہو دوسرا
 یہ ہے کہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بد کے قائلوں کے لیے بد دعا فرمائی، سو حضرات
 شیعہ کو ہماری طرف سے بھی مبارک باد۔ یہ ساری خرابیاں کلام اللہ کے نہ سمجھنے کی ہیں اور ان کا بھی کیا
 قصور؟ اپنی دہشتوں کے معنوں کو نہیں سمجھتے، مگر سمجھتی تو پہلے انہیں ہی سمجھتے، کلام اللہ تو سنیوں کا ہے۔

حق واضح ہونے کے بعد مانتا ضروری ہے پھر کسی اور بات کا انتظار حماقت ہے

اس وقت لازم یوں ہے کہ فتنہ اس غلطی کا بیان کیا جائے تاکہ مزید اطمینان ہو جائے اور
 مفسرین کو یہ خطا نہ باقی نہ رہے کہ ”تہاروی پیش قاضی آئی راضی“ محرر رسالہ کے طعنا کی باتیں
 فتنہ کریم یوں کیونکر بد سے دستبردار ہوں، ہمارے علماء شیعہ بھی تو آخر کسی وجہ سے کہتے ہوں
 گے جب تک ان کی نہ سن لیں، تسلی نہیں ہوتی۔ ہر چند یہ عذر اس قبیل کا ہے کہ مشہور ہے ”عذر گناہ
 بدتر از گناہ“ کیونکہ جب کسی آدمی کو کسی وجہ سے حق واضح ہو جائے تو پھر اسے اس کا کیا انتظار کہ
 دوسروں کی بھی سن لوں، اگر کوئی شخص قریب شام کے درود یوار پر دھوپ دیکھے یا خود آفتاب کو چشم
 خود دیکھے اور دوسرا پردہ میں بیٹھا ہوا، گھڑی گھنٹے کے ویلے سے یوں کہے کہ دن چھپ گیا تو آفتاب کا
 یا دھوپ کا دیکھنے والا کتنا ہی جاہل کیوں نہ ہو اور گھڑی سے وقت کا بتلانے والا کتنا ہی علامہ روزگار
 اور حساب میں پرکار کیوں نہ ہو لیکن اس پر بھی آفتاب یا دھوپ کے دیکھنے والے کو دن کے یقین
 ہونے میں اس کا انتظار نہ ہوگا کہ میں اس کی تو سن لوں کہ جو گھڑی کے ویلے سے رات بتلاتا ہے۔

اسی طرح جب یہ بات خوب واضح ہو گئی کہ بدوئے کلام اور نیز بدوئے احادیث شیعہ بد اقلط ہے،
 پھر اس کا کیا انتظار ہے کہ بد کے قائلوں کی بات بھی سن لیتی چاہیے بلکہ ایسے وقت میں مناسب یوں
 ہے کیسے آفتاب کا چشم خود دیکھنے والا باوجود جاہل ہونے کے بے تامل یوں سمجھ جاتا ہے کہ گھڑی والا
 ہر چند حساب اور بڑا ہوشیار ہے، اس کے علم میں کچھ شک نہیں لیکن اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اس کی

کھڑی بگڑی ہوئی ہے یا اس وقت اتفاق سے بمقتضاء بشریت کچھ غلطی ہوگئی ہے ایسے ہی بدا کی غلطی کا سمجھنے والا بھی بے تامل مان اُٹھے کہ ہر چند قائلین بدا بڑے بڑے عالم اور فاضل تھے لیکن تاہم آدمی تھے، غلطی کھا گئے نہ اس آیت پر انہیں دھیان ہوا ”كَانَ اللَّهُ عَلِيمًا خَبِيرًا“ یعنی اللہ ہمیشہ سے علم ہے اس کا علم کچھ اب پیدا نہیں ہوتا اور نہ آیت مذکورہ ”لَا يَهْدِلُ زَيْبِي وَلَا يَنْسِي“ ان کے خیال میں گزری اور نہ حدیث کلینی کا کچھ خیال کیا بلکہ ادب کی بات تو یوں ہے کہ یہ کہتے ان لوگوں کو کلام اللہ تو یاد نہ تھا کیونکہ یہ تو سنیوں کا کلام ہے۔ کلینی بعد میں تصنیف ہوئی۔ مع ذلک ان کا کیا قصور؟ سب جانتے ہیں ”دروغ گورا حافظہ نباشد“ القصہ یہ عذر کہ شیعوں کی دلیلیں معلوم ہونی چاہئیں (یہ عذر بعد کلام اللہ اور حدیث مذکور کے جن کے معنوں میں کچھ تاویل نہیں ہو سکتی اور خدا کے علم کے قدیمی ہونے پر خل آفتاب روشن کے گواہی دیتی ہیں) عقلا کے نزدیک قابل سماعت نہیں۔

بدا جیسے واہی عقیدے کی غلط بنیادیں

مگر بایں ہمہ پاس خاطر مولوی عمار علی صاحب یہ معروض ہے کہ فناء غلطی شیعہ اس قسم کی آیتیں ہیں ”لَيَسْلُوَنَكُمْ اَيْتُكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا“ حاصل یہ کہ خدا نے موت حیات کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ تمہیں آزمائے کہ کون سا تم میں اچھے عمل والا ہے سو اس آیت سے اور ایسی ہی مضمون کی اور آیتوں سے علماء شیعہ کو یوں دھوکہ پڑا کہ امتحان اور آزمائش تو وہاں ہوتی ہے جہاں حقیقت امر پہلے سے معلوم نہیں ہوتی، پھر اس پر یہ تماشا ہوا کہ ایک جگہ خداوند کریم یوں بھی ارشاد فرماتے ہیں: ”يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُنْثِبُ“ یعنی اللہ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے، اس آیت کے مضمون کو جو پہلی آیت کے مضمون سے ملا کر دیکھا تو علماء شیعہ کو بجائے خود اس بات کا یقین ہو گیا کہ خدا کو پہلے سے تو حقیقت الامر خوب معلوم تھی ہی نہیں یونہی اٹکل اور رائے سے ایک بات مقرر کر رکھی تھی، سو اس میں جہاں کہیں کچھ غلطی معلوم ہوتی ہے اسے بدل دیتے ہیں اور یہی معنی بدا کے ہیں۔ الحاصل اس وجہ سے شیعوں کے نزدیک عقیدہ بدا مستحکم ہو گیا اور یہ غلطی جو اول کسی کو بوجہ کوتاہی عقل کے پڑی تھی خوب مضبوط ہوگئی اور کیوں نہ ہو۔

بے استاد کی ٹھوکریں

بے استاد ہمیشہ خراب رہتا ہے، اگر ماہران کلام اللہ کی کفش برداری اختیار کرتے تو اس آیت کے معنوں میں ایسے کیوں ہو سکتے مگر یہ فرقہ تو ایسا کم نصیب ہے کہ کلام اللہ کے جاننے والوں کے دلی

دشمن ہیں۔ جناب من "ہر کارے ہر مردے" صحابہ کرام جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگرد تھے۔ کلام وہ کہتے تھے، پھر جو ان سے مستفید ہو گا وہ کلام اللہ کو کہے گا یا شیعہ سمجھیں گے؟

بتلاؤ امتحان سے مقصود خداوندی قطع محبت ہے نہ کہ تحصیل علم

اگر آیت "لَتَلَوْنَكُمْ" سے یہ بات نکالی ہے کہ خدا کو پہلے کسی چیز کے پیدا ہونے کے علم اس کا نہیں ہوتا ہے تو اس میں تو کچھ شک نہیں کہ اس وقت تو ضرور ہی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اول تو شیعہ اس کے قائل ہی ہیں۔ مع ہذا کلام اللہ میں رمیوں جبکہ "إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ" موجود ہے۔ یعنی خداوند کریم جو کچھ تم کرتے ہو سب دیکھتا ہے، پہلے پیدا ہونے سے تو ہم نے مانا، نہیں دیکھتا تھا لیکن یہ تو فرمائیے کہ بعد پیدا ہونے کے بھی کیا کچھ اس میں تامل باقی ہے؟ نور آفتاب خدا کا محتاج نہیں، شمع چراغ کی اس کو ضرورت نہیں آگے پیچھے ہونا اس کے نزدیک سب یکساں ہے کیوں کہ وہ فرماتا ہے "إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ" یعنی اللہ ہر چیز کو محیط ہے۔ القصہ بعد وجود اشیاء کے ان کے پیش نظر ہونے میں کچھ شک نہیں اور پھر بایں ہمہ بھول جانے کا اندیشہ نہیں کیونکہ سورۃ میں "لَا يَنْسِي" موجود ہے یعنی خدا بھولتا نہیں، پھر کیا ضرورت ہوئی کہ کراما کا تبین مقرر کیے گئے؟ اور حساب کتاب قیامت کو ہونا ضرور پڑا اور ملکہ اعمال اور صحیفہ ہائے کردار بنی آدم لکھے گئے جو عناد شیعہ اس کا جواب دیں گے وہی ہماری طرف سے نوازش فرما کر قبول فرمائیں۔

اُریوں جواب دیں کہ ہر چند خداوند عالم الغیب کو ہر لکھی چھپی بڑی چھوٹی چیز کی خبر ہے لیکن شوکت اور عظمت اور حکمت خداوندی کے مناسب یہی ہے کہ یہ سارا کارخانہ برپا ہو تو ہمیں تسلیم، پر یہی جواب ہمارا ہے اور اگر شیعوں کو نسبت نامہائے اعمال اور حساب کتاب اور ہاتھ پاؤں کی گواہی کے جو قیامت میں ہوگی، یہ عذر ہے کہ یہ سب تعلیم بنی آدم کے لیے ہے تو ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ امتحان خداوندی بھی تعلیم بنی آدم کے لیے ہے۔

باقی کسی کو ہاتھ پاؤں کی گواہی اور حساب کتاب اور وزن اعمال میں شک ہو تو یہ کلام اللہ کی آیتیں موجد ہیں۔ آیت "يَوْمَ نَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ" جس کا یہ حاصل ہے کہ فلاں لوگوں کو اس روز عذاب ہو گا جس روز ان کی زبان، ہاتھ پاؤں ان پر گواہی دیں گے اور آیت "قَالُوا لَبِئْسَ مَا كُنَّا فِيهِ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ" یعنی قیامت کو جب کفار کے کان، آنکھیں، کھالیں ان کے کربوت کی گواہی دیں گے تو وہ ان کو ملامت کریں گے سو اس کا بیان ہے کہ کہیں گے کفار اپنی کھالوں کو کہ تم نے کیوں ہمارے حق میں بری

کو ای دی؟ تو وہ کہیں گے کہ جس خدا نے سب کو بلایا تھا اور بولنا سکھایا تھا اسی نے ہمیں بھی بلا دیا۔ اور سو اس کے اور بہت سی آیتیں وزن اعمال پر اسی طرح دلالت کرتی ہیں۔ "وَالْوِزْنُ يُوْزَنُ" یعنی تول اس دن ٹھیک ہے "وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَمَةِ" حاصل اس کا یہ ہے کہ رکھیں گے ہم ترازوئیں انصاف کی قیامت کے دن "لَا مَآءَ مِنْ ثَلَاثَةِ مَوَازِينَهُ فَهُوَ مُنْعَبِثٌ رَاضِيَةً" حاصل یہ ہے کہ جس کے اعمال تول میں بھاری ہوں گے ان کی اچھی گزران ہوگی، ایسی ہی حساب کے مقدمہ میں کثرت سے آیتیں وارد ہیں۔ مجملہ ایک دو لکھے دیتا ہوں "إِنْ تُبْذَرُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخَفُّوهُ يُخَاسِبُكُمْ بِهِ اللَّهُ" خواہ ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلی میں ہے یا چھپاؤ، خدا حساب ضرور لے گا۔ "وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ" یعنی جو کوئی منکر ہوگا اللہ کے حکموں سے تو اللہ حساب شتاب لینے والا ہے۔ الغرض ان باتوں سے انکار نہیں ہو سکتا اور ہمیں کسی سے کیا کام، امامیہ اور اشاعریہ سے غرض ہے سو وہ منکر ہی نہیں الٰہی سنت اور وہ دونوں باتوں کے ایمان میں متفق ہیں، زید یہ اسامیہ ہوتے تو یوں بھی سہی۔

الحاصل جو کچھ شیعہ تجویز فرمائیں، ہمیں کچھ درلغ نہیں اگر وہ یوں کہیں کسی آدم کی حجت ختم کرنے کے لیے حساب کتاب وغیرہ ہے ورنہ کچھ حاجت نہ تھی تو ہماری طرف سے بھی یہی جواب معروض خدمت سہی بلکہ اس کے ساتھ میں اکتا شکرانہ ہم سے لیں کہ ہمیں ان آیات کے معنی کی تحقیق میں تخفیف ہاتھ آئی۔ غرض بہر حال "چشم مارو شن دل ماشاد" صلاح ماہمان ست کان صلاح شہاست۔

امتحان بغرض قطع حجت کی ایک قرآنی مثال

اور کسی مثال سے سمجھنا نظر ہے تو ایسی مثال لیجئے جسے مولوی عمار علی صاحب بھی مان جائیں، الم کا پہلا سپارہ تو شیعوں کو غالباً یاد ہو؟ نہیں تو قریب یاد کے ہوگا کیونکہ اکثر دستمال اطفال رہتا ہے۔ چہ جائیکہ بڑے بوڑھے عالم فاضل، سو پہلے سپارہ میں رکوع "وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ" میں کچھ یہ بیان ہے کہ جناب باری تعالیٰ نے فرشتوں سے حضرت آدم علیہ السلام کے زمین میں خلیفہ بنانے کی خبر دی تو فرشتوں نے یہ اعتراض کیا کہ آپ آدم اور آدم کی اولاد کو زمین میں خلیفہ بناتے ہیں جو زمین میں فساد کریں اور خونریزیاں مچائیں حالانکہ ہم اس بات کا استحقاق رکھتے ہیں۔ آپ کی تسبیح ہم کرتے ہیں، آپ کی تقدیس میں ہم مشغول رہتے ہیں تو اس کے جواب میں سر دست تو جناب باری تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے مگر ان کی حجت قطع کرنے کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کو سب چیزوں کے نام یا حقیقت تعلیم فرما کر پھر فرشتوں سے ان

چیزوں کے نام یا حقیقت دریافت کیے اور فرمایا کہ اگر تم دعوائے استحقاق میں سچے ہو تو ہمارے سوال کا جواب دو چونکہ فرشتوں کو معلوم نہ تھے تو انہیں بجز یوں کہہ نہ بن پڑی کہ ”سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ“ حاصل اس کا یہ کہ الہی تو پاک ہے ہمیں تو جتنا تو نے بتا دیا اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں تو ہی اسرار کا جاننے والا اور حکمتوں والا ہے۔

جب ان سے نہ بتایا گیا تو حضرت آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ تو انہیں ان چیزوں کے نام بتا دے، جب حضرت آدم علیہ السلام نے ان کے نام بتا دیئے تو خداوند کریم نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں آسمان زمین کی سب لکھی چھپی باتیں جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرو اور جو چھپاتے ہو وہ سب مجھے معلوم ہیں۔ برائے خدا علماء شیعہ اس قصہ میں غور فرمائیں۔ یہ امتحان فرشتوں اور حضرت آدم علیہ السلام کا جو لیا تو کیا اس لیے لیا تھا کہ اپنے آپ کو حقیقت الامر معلوم ہو جائے یا فرشتوں ہی کی حجت قطع کرنے کے لیے؟ در صورت یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کو پہلے سے اپنے سوال کا جواب بتا چکے ہوں اور فرشتوں کو نہ بتایا ہو تو کسی نادان کو بھی یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ جناب باری تعالیٰ کو یہ معلوم نہ تھا کہ کون استحقاق رکھتا ہے کون نہیں، سو جیسے یہ امتحان فقط فرشتوں کی حجت قطع کرنے کے لیے اور ان کے اعتراض کو اپنے ذمہ سے اٹھا دینے کے لیے تھا ایسے ہی یہ امتحان جو ”لَيَسْئَلُوْكُمْ“ اور اسی مضمون کی آیتوں سے ثابت ہوتا ہے تو فقط اسی لیے ہے کہ بنی آدم بوجہ حسد ایک دوسرے کے درجہ بڑھانے پر خدا کے ذمہ نا انصافی کی تہمت نہ لگانے لگیں اور ان کو گنجائش گفت و شنود اور جائے اعتراض و انکار جو ان کی جبلت میں رکھی ہوئی ہے، باقی نہ رہے۔

بعثت انبیاء اور تکالیف شرعیہ کی وجہ بھی قطع حجت بنی آدم ہے

اور واقعی اس حکم احکام کے قصہ اور رسولوں اور انبیاءوں کے بھیجنے کے سلسلہ کی وجہ اور حکمت یہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ جب ملائکہ بایں ہمہ عصمت اور فرمانبرداری کے جو آیت ”لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَا أَمَرَهُمْ وَنَفَعُونَ مَا يُؤْمَرُونَ“ سے (جس کا حاصل یہ ہے کہ فرشتے خدا کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو کچھ نہیں حکم ہوتا ہے وہی کرتے ہیں) ثابت ہوتی ہے خدا کی بات میں دخل دے بیٹھا اور بوجہ حسد بنی آدم اعتراض کر گزرے۔ بنی آدم تو بنی آدم ہیں، پھر باوجودیکہ گناہوں سے ان کا خمیر ہے، ان کی شان میں یہ تعریف بھی آئی ہے۔ ”وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا“ یعنی انسان سب میں زیادہ جھگڑالو ہے، پھر اگر خداوند کریم موافق اپنے علم ازل کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جنت میں اور ابوجہل اور فرعون کو دوزخ میں داخل کر دیتا تو ابوجہل

اور فرعون کا ہے کوٹھنڈے چولہے بیٹھتے اعتراض پر اعتراض کیے جاتے اور اپنے استحقاق جنت کے دعوے میں کیا کیا کچھ نہ کرتے، اسی لیے خداوند کریم علیم حکیم نے کلام اللہ میں اکثر مواقع میں وجہ اس سلسلہ ہدایت کی بھی بیان فرمائی ہے۔ تسکین خاطر ناظرین کے لیے ایک آیت گزارش کرتا ہوں۔

وَاتَّبِعُوا أَحْسَنَ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُاتِيَكُمْ الْعَذَابُ بُعْثَةً وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ۝ أَنْ تَقُولَ نَفْسٌ يُحَسِّرَتْنِي عَلَى مَا فَرَطْتُ لِيْ جَنْبَ اللَّهِ وَإِنْ كُنْتُ لَمِنَ السَّخِرِينَ ۝ أَوْ تَقُولَ لَوْ أَنَّ اللَّهَ هَدَانِي لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ۝ أَوْ تَقُولَ حِينَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ أَنَّ لِيْ كَرَّةً فَأَكُونَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ۝ بَلَىٰ لَقَدْ جَاءَتْكَ آيَاتِي فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ۝

حاصل اس کا یہ ہے کہ ”چلو بہتر بات پر جو تم پر نازل کی گئی تمہارے رب کی طرف سے، پہلے اس سے کہ پہنچے تم پر عذاب اچانک اور تم کو خبر نہ ہو کہیں کہنے لگے کوئی جان ہائے افسوس میں نے قصور کیا اللہ کے مقدمہ میں اور میں ہنستا ہی رہا، کوئی کہنے لگے اگر اللہ مجھ کو بتاتا تو میں متقی ہوتا یا کوئی کہنے لگے جب دیکھے عذاب کسی طرح مجھ کو پھر جانا ملے تو میں نیکی والوں میں سے ہو جاؤں، کیوں نہیں پہنچ چکے تھے تجھ کو میرے حکم، پھر تو نے ان کو جھٹلایا اور غرور کیا اور تو کافروں میں سے تھا۔“

دوزخی اور جنتی پہلے ہی سے طے ہیں

یہاں تک ترجمہ تھا اب اس آیت کے مطالعہ کرنے والے فرمائیں کہ یہ جو حکم ہوا کہ خدا نے جو تمہاری طرف عمدہ بات نازل کی ہے اس کا اتباع کرو اور اس پر چلو خدا نے اس کی کیا وجہ فرمائی ہے۔ بجز اس کے اور بھی کچھ ہے کہ یہ اندیشہ تھا کوئی یوں نہ کہنے لگے کہ خدا اگر مجھے راہ بتلاتا تو میں متقی، پرہیزگار ہوتا اور یہ اندیشہ جب ہو سکتا ہے کہ اپنی طرف سے پہلے تجویز کر رکھا ہو کہ اس کو دوزخ میں پہنچائیں گے اس کو جنت میں، سو اسی تجویز کے موافق اگر کار بند ہوتے اور جس کو برا بھلا جیسا سمجھ رکھا تھا، اس کے مناسب اسے جگہ دیتے تو بیشک دوزخی بھی اپنا استحقاق جتاتے اور دعویٰ اپنی بھلائی کا کر کے کہتے کہ ہمارا امتحان کیوں نہ لیا، ہم کو راہ دکھائی ہوتی، ہم بے شک متقی اور پرہیزگار نکلتے۔ مع هذا ”کُنْتُ مِنَ الْكَافِرِينَ“ فرمایا اور ”كَفَرْتُ“ نہ فرمایا عربیت میں جو مہارت ”كَمَا يَنْبَغِي“ رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر ”كَفَرْتُ“ فرماتے تو یہ معنی ہوتے کہ جب آیات آئیں اور ان کا انکار کیا تب کافر ہو گیا۔ پہلے سے نہ تھا اور اب یہ معنی ہیں کہ ازل سے تیرا چہرہ کافروں میں اور نمک حراموں میں لکھا ہوا تھا، سو تو موافق اس لکھے ہوئے ہی کے نکلا باوجودیکہ ہماری آیات تیرے پاس آئیں، پھر تو نے انہیں نہ مانا اور اٹنا غرور کیا۔

ایسے ہی سورہ اعراف میں ہے "أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَمَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ" عہد الست جو لیا گیا تو خط اسی لیے کہ تم عذاب کے وقت یوں نہ کہنے لگو کہ ہمیں تو اس کی خبر ہی نہ تھی۔ القصہ چونکہ صورت حال بنی آدم سے چنانچہ مذکور ہوا، اعتراض اور جھگڑا چلتا تھا، جناب باری تعالیٰ نے یہ امتحان اعمال مقرر کر دیا تاکہ ان کی حجت منقطع ہو جائے اور کل کو غل نہ محامیں اور نا انصافی کی تہمت نہ لگائیں۔ اسی لیے ان کے سنانے کو فرماتے ہیں: "لَيَسْأَلَنَّكُمْ أَتُحِبُّونَ أَحْسَنُ عَمَلًا وَلَنَسْأَلَنَّكُمْ حَتَّى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِينَ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ أَخْبَارَكُمْ" حاصل یہ نکلا کہ اگر تم کو ہماری طرف سے بدگمانی ہے اور یوں سمجھتے ہو کہ خدا کو کیا معلوم کون اچھا ہے کون برا ہے آزما کے دیکھا تو ہوتا جو اچھے برے کا فرق معلوم ہوتا ورنہ فقط انکل سے کسی کو برا بھلا سمجھ لینا اور پھر اس کے موافق دوزخ و جنت میں داخل کر دینا کار انصاف نہیں تو اب ہم بھی امتحان ہی لیں گے تاکہ معلوم تو ہو کون بھلا ہے کون برا ہے، کون مجاہد ہے، کون صابر ہے۔ غرض یہ امتحان قطع حجت بنی آدم کے لیے ہے، خداوند عظیم کو تحصیل علم مد نظر نہیں۔

اَخْبَارَكُمْ کے تفسیری فوائد

چنانچہ دوسری آیت میں جو لفظ "اَخْبَارَكُمْ" ہے وہ بھی بآواز بلند، اس بات پر شاہد ہے کہ خداوند عظیم پہلے سے بے خبر نہیں، اچھے برے نیک و بد سب کے حال سے خبردار ہے کیونکہ اس صورت میں حاصل اس آیت کا یہ ہے کہ ہم کو جو تمہاری حقیقتوں کی خبر ہے اور تم کو اس میں شک ہے ہم بھی اسے جانچیں گے۔ اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ خدا کو پہلے سے ہر چیز کی خبر ہے، بھلے اور برے کو جانتا ہے ایسا نہیں جیسا امامیہ کہتے ہیں کہ جب کوئی چیز پیدا ہوتی ہے، خدا کو جب ہی خبر ہوتی ہے۔ چنانچہ ملا نظام الدین جیلانی کے حوالے سے اوپر گزر چکا لیکن بنی آدم کی حجت قطع کرنے کے لیے یہ سارا بکھیرا کیا جیسے فرشتوں کے ساکت کرنے کے لیے سوال جواب مذکور کی نوبت پہنچائی ورنہ جیسے خداوند کریم پہلے سے جانتا تھا کہ حضرت آدم خلافت کے لائق ہیں اور فرشتوں میں وہ بات نہیں جو حضرت آدم علیہ السلام میں ہے ایسے ہی ازل سے جنتیوں کا جنت کے لائق ہونا اور دوزخیوں کا دوزخ کے لائق ہونا خداوند کریم اس طرح جانتا تھا جس طرح ہم تم لکڑیوں کا چولہے کے لائق ہونا اور روٹی کا کھانے کے قابل ہونا سمجھتے ہیں۔ سو اگر خداوند کریم علم ازلی کے موافق جنتیوں کو جنت میں اور دوزخیوں کو دوزخ میں پہنچا دیتا تو کچھ ظلم نہ تھا۔ لیکن بنی آدم کا جھگڑا پلے بندھنا تھا فرشتوں نے تو کیا کھرا کیا تھا جو یہ کرتے؟ اس لیے یہ سارے کارخانے اور امتحان مقرر کیے۔

جیسے بعض جگہ بالاتفاق ماضی سے مجازاً مستقبل مراد ہے
اسی طرح بعض جگہ مستقبل سے بھی ماضی مراد ہے

اب بفضلہ تعالیٰ وہ دھوکہ جو بوجہ آیات امتحان علماء شیعہ کو واقع ہوا تھا مرتفع ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ کلام اللہ یوں سمجھا کرتے ہیں نہ یہ کہ ایک آیت کو پہنچ گئے اور جو کچھ فی الفور سمجھ میں آ گیا اس پر جم گئے اور یہ نہ دیکھا کہ اور آیات سے مل کر اس آیت کے کیا معنی ہوتے ہیں، اگر یہی تفسیر دانی ہے تو ہم جانتے ہیں کہ علماء شیعہ کل کو ”وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابُ النَّارِ“ اور ”وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ“ اور ”وَنَادَىٰ أَصْحَابُ النَّارِ“ وغیرہا۔ اس قسم کی آیات کے معنوں میں فرمانے لگیں گے کہ یہ سب قصے ہو چکے ہیں۔ اس لیے کہ قطع نظر ان آیات اور احادیث کے جن سے قیامت کا آئندہ کو ہونا ثابت ہوتا ہے سر دست ان آیات کے بھی معنی معلوم ہوتے ہیں کہ یہ باتیں سب ایام گزشتہ کے افسانے ہیں کیونکہ ”نادی“ ماضی کا صیغہ ہے جب تک یوں نہ کہیں کہ جو چیز ہونے والی ہے اور اس کے ہونے میں کچھ شک نہیں ہوتا اسے عرف میں یوں ہی کہا کرتے ہیں کہ ہوئی چکی۔ چنانچہ جو شخص لب مرگ ہوتا ہے اس میں کیا رہا ہے مری چکا۔

جب تک ان آیات کے معنی اور آیات کے موافق نہ ہوں گے ادنیٰ سے ادنیٰ عربی خوان بھی یوں جانتا ہے کہ باعتبار لغت کے ”وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابُ النَّارِ“ کے یہ معنی ہیں کہ عدا کی جنتیوں نے دوزخیوں کو اب تک دوزخ اور جنت میں گیا ہی کون ہے جو یہ سوال اور جواب ہونے لگے۔ البتہ یہ سب سرگزشتیں بروز قیامت ظہور میں آئیں گی۔ چنانچہ سیاق اور سباق سے ظاہر ہے اور نیز امامیہ اور اثنا عشریہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ سو جیسے ان الفاظ کو بقرینہ دیگر آیات اپنے معنی حقیقی یعنی زمانہ ماضی سے پھیر کر معنی مجازی یعنی زمانہ مستقبل مراد لیتے ہیں ایسے ہی اگر ”تَنْبَلُونَكُمْ“ وغیرہ کلمات کو جو زمانہ مستقبل پر دلالت کرتے ہیں، ان آیات کے قرینے سے جن سے خداوند علیم کے علم کا قديم ہونا ثابت ہوتا ہے اپنے معنی اصلی یعنی زمانہ مستقبل سے پھیر کر زمانہ ماضی مراد لیں تو کیا گناہ ہے؟

حوادثِ آئندہ یقینیہ کو ماضی اور وقائع ماضیہ مخفیہ کو

مجازاً مستقبل سے تعبیر کرنا صحیح ہے اس کی مثال

اور صحیح مجاز کی وجہ درکار ہو تو سنئے جیسے امور آئندہ میں سے ان امور کو جن کا آئندہ کو واقع ہونا یقینی

ہوتا ہے بایں وجہ کہ ان کا تحقق ضروری اور یقینی ہے الفاظ ماضی سے تعبیر کر دیتے ہیں ایسے ہی امور گزشتہ میں سے ان امور کو جن کا تحقق اور وقوع اور ان کا وجود ایک نوع سے غلطی ہو اور بایں ہمسان کا اثر بھی ہنوز ظاہر نہ ہوا ہو تو بایں لحاظ کہ ایسے امور کا ہونا نہ ہونا اکثر اثر کے ہونے نہ ہونے سے معلوم ہوتا ہے الفاظ مستقبل سے تعبیر کر دیا کرتے ہیں مثال کی ضرورت ہو تو سنئے کہ اگر کوئی بیمار بوجہ احتیاج مرض اور شدت بیماری صاحب فراش ہو جائے یعنی چارپائی کا سوار بن جائے اور پھر شانی مطلق اس بیمار کو ایک دفعہ ہی شفا عطا فرمائے تو ظاہر ہے کہ وہ طاقت رفتہ مرض کے جاتے ہی نہ آ جائے گی بلکہ آئے گی تو رفتہ رفتہ آئے گی، سو اگر کچھ دزوال مرض عطار وغیرہ قرض خواہ اگر اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے لگیں تو وہ مرد ضعیف و نقیہ اگر مفلس ہوتا ہے تو باوجود اطلاع اس امر کے کہ میرا مرض زائل ہو گیا اور میں اچھا ہو گیا، اکثر یہی جواب دیتا ہے کہ میں اچھا ہو جاؤں تو کہیں سے فکر کر کے آپ کا حق پہنچاؤں۔

یا فرض کرو بیمار کو تو زوال مرض کی اطلاع نہ ہو۔ چنانچہ اکثر ہوتا ہے پر طبیب کامل آثار و دلائل سے اس کی صحت سے مطلع ہو کر خواستگار انعام ہو اور بیمار بسبب بقائے آثار مرض مثل نقاہت وغیرہ کے اعطائے انعام میں متردد ہو تو طبیب اکثر کہا کرتے ہیں کہ اچھا جب تم اچھے ہو جاؤ گے جیسا دینا، سو جیسے طبیب یا مریض مذکور بایں لحاظ کہ اب تک ظہور اثر صحت کچھ نہیں ہوا یعنی طاقت نہیں آئی، صحت کو جو واقع ہو چکی بمنزلہ غیر واقع سمجھ کر صیغہ استقبال سے تعبیر کرتا ہے۔

ایسے ہی جناب باری بھی اپنے اس علم قدیم کو (کہ صحابہ مجاہد و صابر ہیں اور اعداء صحابہ قاسق و فاجر، اصحاب کرام بوجہ سعادت ازلی اور شرافت لم یزلی اور خوبی ذاتی اور کمال صفاتی اس لائق ہیں کہ ان سے اچھے کام لیے جائیں اور اس کے ثمرہ میں کمالات کسی دیئے جائیں اور اعداء صحابہ بسبب شقاوت ازلی اور ذات لم یزلی اور زبونی ذاتی اور نقصان صفاتی اس قابل ہیں کہ ان سے برے کام لیے جائیں اور اس کی پاداش میں ان کے قلوب سیاہ کیے جائیں، بایں نظر کہ قبل تکلیف اعمال اس علم پر کوئی ثمرہ متفرع نہیں ہوا اور اس کا اثر یعنی اچھے برے کاموں کا ان سے لینا ہنوز ظاہر نہیں ہوا۔ یا بایں خیال کہ بہت سے نابکاروں کو خدا کے اس علم کے صحیح ہونے میں ایسا تردد ہے جیسا بیمار مذکور کو قول طبیب میں، اگر بصیغہ استقبال بیان فرمائے تو شیعوں کو اس قدر حیرت کیوں ہے؟

ازلی سعادت و شقاوت کی عام فہم مثال

رہی یہ بات کہ یہ فرق نیک و بد ازلی اور خلقی ہے کسی اور عارضی نہیں، سو یہ ہر چند ایک امر دینی ہے لیکن اہل فہم کے نزدیک یہ فرق بعینہ ایسا ہے جیسا ذکی و غبی اور حلیم و خونخوار اور بخیل و خبی اور شجاع

و نامرد، عالم و جاہل کا فرق ہے جیسے بادشاہانِ عاقل عالم سے کارِ علم اور جاہل سے کارِ جہل لیتے ہیں، ایسے ہی جناب باری بھی ہر کسی سے اُسی کے لائق کام لیتا ہے۔

تینوں زمانے مجسمۂ موجود ہیں فنا نہیں ہوئے

بلکہ تحقیق تو یوں ہے کہ زمانہ تمامہ ازل سے لے کر اب تک ایک شے موجود ہے نہ زمانہ ماضی نہ ہو اور نہ زمانہ آئندہ معدوم ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی یوں کہے ”اِنْ زِلْنَا فَلَا قِيَمَ“ یعنی زید قائم ہے تو بحرِ داس کلام کے سننے کے ہر کوئی یہ سمجھ جاتا ہے کہ زید موجود ہے اور اس کا یہ حال ہے اور ظاہر بھی تو ہے کہ کوئی حال تو جب ہو کہ جب وہ خود پہلے ہو لے، جب یہ بات ذہن نشین ہو چکی تو گزارش یہ ہے کہ قیامت کے باب میں جو وقائع آئندہ میں سے ہے خداوند کریم یوں فرماتا ہے اور سب جانتے ہیں کہ خدا سچا ہے ”اِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ“ یعنی بیشک قیامت آنے والی ہے یا دوسری جگہ یوں فرماتا ہے ”اِنْ زُلْزَلَتِ السَّاعَةُ فَسَيَّةٌ عَظِيمٌ“ یعنی بیشک قیامت کا زلزلہ بڑی چیز ہے، سو موافق قاعدہ مذکورہ کے ہم بھی یونہی سمجھتے ہیں کہ قیامت بالفعل موجود ہے اور اس کا یہ حال ہے کہ ہماری طرف آنے والی ہے اور وہ بہت بڑی چیز ہے اور ہم اس پر بے تکرار ایمان لاتے ہیں اور چون و چرا نہیں کرتے، اور اگر کوئی نیم ملا یوں چون و چرا بھی کرے کہ بہت اوصاف ایسے ہیں کہ ان سے اس چیز کا وجود معلوم نہیں ہوتا جس کا وہ وصف ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی یوں کہے کہ فلا نامرگیا یا فلا نامعدوم ہو گیا تو ہر چند یہ شبہ قابلِ جواب نہیں اور اس کا جواب بھی یہ ہے کہ یہ باتیں اوصاف نہیں بلکہ اوصاف کا نہ ہونا ہے لیکن ”مسلمنا“ یوں کہنا کہ فلانی چیز آنے والی ہے یا فلانی چیز بڑی ہے یہ تو ایسی نہیں جن سے ہونا معلوم نہ ہو بلکہ یہ باتیں تو کوئیوں کے نزدیک بھی وجودی پر دلالت کرتی ہیں۔

سو در صورت یہ کہ یہ اوصاف وجود پر دلالت کرتے ہوں ہم قیامت کے بجائے خود موجود ہونے میں کیوں تامل کریں اور یوں جب مقرر ہو چکا تو ہم ایک اور بھی التماس کرتے ہیں کہ جیسے قیامت آنے والی ٹھہری اور وہ اس وصف کے قرینے سے موجود معلوم ہوئی تو زمانہ گزشتہ بشہادت تمام عالم گزرنے والا ہے۔ اسی واسطے اس کا نام گزشتہ رکھا گیا۔ مع ہذا جب قیامت وغیرہ اجزائے زمانہ متحرک ٹھہرے تو ایک روز ہم تک پہنچ کر گزر بھی جائے گی اور یوں کہنا کہ فلا نامفخص جاتا ہے وجود پر دلالت کرنے میں کچھ اس سے کم نہیں کہ یوں کہے کہ فلا نامفخص آتا ہے اور جب دونوں طرفیں زمانے کی گزشتہ اور آئندہ برابر بجائے خود موجود ٹھکیں۔

سب زمانے احاطہ خداوندی میں ہیں

تو موافق فرمودہ باری تعالیٰ اِغْنِ آیت "إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ" سارا زمانہ اوّل سے لے کر آخر تک احاطہ خداوندی میں داخل ہوا، سوا احاطہ خداوندی کے جو کچھ کوئی معنی لے ہمیں کچھ انکار نہیں کم سے کم یہ معنی تو ضرور ہوں گے کہ اللہ کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ جیسا کہ دوسری آیت صمدیہ اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔ وہ آیت یہ ہے "إِنَّ اللَّهَ لَذُوْ اَحْاطٍ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا" یعنی اللہ کا علم ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس صورت میں کیفیت سارے زمانہ کے وجود کی باوجود اس رواگی کے کہ ایک جز آتا ہے اور ایک جاتا ہے ایسی ہوگی جیسے اجزاء آب رواں کہ سب کے سب بجائے خود موجود ہیں لیکن جب اگلے اجزاء گزر جاتے ہیں تب پچھلے آتے ہیں۔

اور خدا کے پیش نظر اور معلوم ہونے کے ایسی مثال سمجھئے جیسے کوئی اب دریا جا کر کھڑا ہو تو ادھر سے ادھر تک تمام دریا کا پانی اور جو اس پانی کے اندر ہوتا ہے حباب یا خس و خاشاک اس کے پیش نظر ہوتا ہے اور اس کو سب ایک شے واحد نظر آتا ہے، گو اجزاء آب اور جو کچھ ان میں ہے باہم مقدم اور موخر ہیں۔

ماضی و مستقبل بھی خدا کیلئے حال کا حکم رکھتے ہیں مگر باہم مقدم موخر ہیں

الغرض اجزاء زمانہ از ر جو کچھ زمانے میں واقع ہوتا ہے سب کا سب بتما خداوند کریم کے پیش نظر ہے اور سارا مجموعہ اس کو بمنزلہ شے واحد معلوم ہوتا ہے اور معاسب کے سب اس کو یکساں نظر آتے ہیں، اس کے حساب سے سب زمانہ حال کا حکم رکھتے ہیں مگر آپس میں ایک دوسرے کی نسبت مقدم اور موخر مقرر کیے جاتے ہیں اور فرق حال اور استقبال اور ماضی کا بہ نسبت ایک دوسرے کے ہے سو جیسے کوئی کسی مکان میں ہوتا ہے تو اس کے سوا جو مکان کے سامنے ہوتا ہے اس کو آگاہ کہتے ہیں اور جو اس کے پیچھے ہوتا ہے اسے پیچھا کہتے ہیں، ایسے ہی جس زمانہ میں کوئی چیز ہوتی ہے اس کے پہلے زمانہ کو بہ نسبت اس کے ماضی کہتے ہیں اور اس کے اگلے زمانہ کو بہ نسبت اس کے مستقبل اور خاص اس زمانہ کو جس میں وہ چیز ہوتی ہے اس کی نسبت زمانہ حال کہتے ہیں۔ سو ہر چند خداوند کریم کے پیش نظر ہونے میں اور اس کے سامنے موجود ہونے میں سب یکساں ہیں لیکن باہم مقدم اور موخر ہیں اور ایک دوسرے کی نسبت ماضی اور مستقبل اور حال ہے۔

کلام الہی میں ماضی و حال و استقبال کے استعمال کی ترتیب

سو خداوند کریم کبھی تو موقع دیکھ کر لحاظ اپنے معلوم ہونے اور اپنے پیش نظر ہونے کے کلام کرتا

ہے اور کبھی مناسب وقت ان وقائع کے تقدم اور تاخر کا لحاظ ہوتا ہے۔ پہلی صورت میں تو ہمیشہ ماضی کا صیغہ یا حال کا صیغہ مستعمل ہوتا ہے اور دوسری صورت میں ماضی کے موقع میں ماضی اور حال کے موقع میں حال اور استقبال کی جگہ استقبال اور باوجود سب کے یکساں پیش نظر ہونے کے ماضی کا صیغہ جو استعمال کرتے ہیں اور حال کا لفظ نہیں بولتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی کسی فعل کے صدور اور حدوث سے خبر دینی مد نظر ہوتی ہے اور کبھی اس فعل کے استمرار وجود کی خبر۔ سو جن افعال کی خبر دیتے ہیں وقت خبر جو وہ حاضر ہوتے ہیں تو باعتبار استمرار وجود کے حاضر اور پیش نظر حکلم ہوتے ہیں ورنہ باعتبار صدور اور حدوث کے وقت خبر حاضر نہیں رہے بلکہ غائب ہو جاتے ہیں کیونکہ صدور اور حدوث آنی ہے زمانی نہیں اور قبل وجود کسی فعل کے جو اس فعل کی خبر دی جاتی ہے تو وہ لاجرم بصیغہ استقبال ہونی چاہیے۔ غرض حدوث کے لیے صیغہ حال ممکن نہیں یا لفظ ماضی ہو گا یا لفظ استقبال، اگر قبل حدوث کسی وجہ سے مطلع ہو کر خبر دیں گے تو بصیغہ استقبال خبر دیں گے اور بعد حدوث معائنہ کر کے خبر دیں گے تو بصیغہ ماضی خبر دیں گے، حال جب ہو سکتا تھا کہ حدوث بھی مثل استمرار یعنی حاصل مصدر زمانی ہوتا، آنی نہ ہوتا، بہر حال بنسبت علم خداوندی کے سب بمولہ حال کے ہے۔ سو جہاں کہیں وقائع آئندہ کو ماضی کے الفاظ سے بیان کیا ہے جیسا ”وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ“ یا اور سو اس کے تو وہاں رعایت اس کی ہے کہ خدا کو سب محض اور پیش نظر ہے اور جہاں اُمور گزشتہ میں صیغہ استقبال کا مذکور ہے۔ جیسا ”حَتَّىٰ نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ“ یا ”وَلَتَبْلُوَنَكُمْ“ وغیرہ تو وہاں یہ مد نظر ہے کہ بنسبت اپنے ماقبل کے مستقبل ہے۔

وقائع عالم قدیم نہیں ہو سکتے کیونکہ مستمر نہیں

اس بحث کو اہل انصاف انصاف سے ملاحظہ فرمائیں اور پھر فرمائیں کہ یہ بیچداں ہر چند دیوانہ ہے لیکن کس قدر ٹھکانے کی بات کہتا ہے مگر برائے خدا ذرا سوچ سمجھ کر دیکھیں مبادا اپنی جلدی میں میرے ذمے یہ تہمت نہ لگادیں کہ فلا نے رسالے والا وقائع عالم کے قدیم ہونے کا قائل ہے۔ حبیہ کے لیے میں ابھی سے کہہ دیتا ہوں کہ کسی واقعہ کے قدیم ہونے کے لیے یہ ضرور ہے کہ اس کا استمرار وجود اعنی حاصل بالمصدر بقدر تمام زمانہ من اولہ الی آخرہ ہو، یعنی ازل سے لے کر اب تک اس کا استمرار وجود موجود ہو۔ اس سے قدم ثابت نہیں ہوتا کہ ایک زمانہ محدود الطرفین پر منطبق ہو، اگرچہ وہ زمانہ قطع نظر حرکت لازمہ کے بذات خود ایک شے مستقر ہو، یعنی مثل حرکات ایسا نہ ہو کہ ایک جز حادث ہو تو ایک فانی ہو گیا۔ ”اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْهَادِی لَا هَادِیَ اِلَا اَنْتَ“

حصول علم کے دو طریقے بالواسطہ و بلا واسطہ

اور اگر کوئی عقل کا پورا اس تقریر میں کچھ اُلجھنے لگے اور اس طریق سے مطلب تک پہنچنا اس کے دشوار معلوم ہو تو ایک دوسرا طریق جس سے یہ وضاحت خدا کے علم کا قدیم ہونا اور ان آیات کا بھی بلا تکلف اس پر مطابق آجانا ثابت ہو جائے جو درج اور اراق ہیں پر توجہ خاطر ناظرین ضروری ہے۔ اپنے علوم کے بحس کرنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو علم اشیاء دو طریق سے حاصل ہوتا ہے ایک تو بے واسطہ دوسرا بواسطہ لوازم یا بواسطہ ملزومات، مثلاً آفتاب کا یا دھوپ کا علم کبھی تو بے واسطہ ہوتا ہے آنکھ سے دیکھا معلوم ہو گیا اور کبھی بواسطہ ہوتا ہے آفتاب کا علم دھوپ کے وسیلہ سے یا دھوپ کا علم آفتاب کے وسیلہ سے۔ اگر آدمی گھر میں ایسی جگہ بیٹھا ہو جہاں سے آفتاب نظر نہ آتا ہو پر دھوپ نظر آتی ہو تو دھوپ کے وسیلہ سے معلوم ہو جائے گا کہ آفتاب آسمان پر نکلا ہوا ہے۔ سو یہ علم جو آفتاب کا حاصل ہوا تو بواسطہ لازم حاصل ہوا اور اگر آفتاب کو محض میں بیٹھے ہوئے دیکھیں اور یوں سمجھیں کہ چمت پر دھوپ ہوگی تو یہ دھوپ کا علم بواسطہ ملزوم حاصل ہوا۔ علیٰ ہذا القیاس آگ اور دھوئیں کے علم کو سمجھئے کہ کبھی بے واسطہ حاصل ہوتے ہیں جیسے آگ کو یا دھوئیں کو خود آنکھ سے دیکھ لیا کبھی بواسطہ یک دیکر ہوتا ہے مثلاً دھوئیں کو دیوار کے پیچھے سے دیکھ کر آگ کو سمجھ جانا، یا دور سے جہاں چراغ کا دھواں نظر نہ آتا ہو چراغ کے شعلہ کو دیکھ کر دھوئیں کو جان لیتا۔

اکثر ایک چیز کا علم بواسطہ اور بے واسطہ دونوں ساتھ آتے ہیں

لیکن ایک شے کے علم بے واسطہ کو اس کا علم بواسطہ بھی بیشتر لازم ہوتا ہے اور دونوں ساتھ ہی پیدا ہوتے ہیں اور کسی طرح کا تقدم اور تاخر نہیں ہوتا۔ مثلاً آگ کو قریب سے دیکھئے تو دھواں بھی اس کے ساتھ ہی نظر آئے گا۔ سو اس صورت میں آگ کا علم دو طرح حاصل ہو سکتا ہے ایک تو بے واسطہ کیونکہ آنکھ سے خود نظر آتی ہے دوسرا دھوئیں کے واسطے سے کیونکہ اگر آگ نظر نہ آتی اور دھواں ہی نظر آتا تو بیشک آگ کا علم حاصل ہوتا۔ سو در صورتیکہ آگ بھی نظر آئی تو بطریق اولیٰ آگ کا علم دھوئیں کے واسطے سے ہونا چاہیے اور ظاہر بھی تو ہے اب دھوئیں میں کیا کی آگنی ہے جو دلالت نہ کرے۔

کبھی علم بواسطہ علم بے واسطہ میں محو ہو جاتا ہے کہ اس کا خیال بھی نہیں رہتا بلکہ غور سے دیکھئے تو تلامذہ جس سے علم بالواسطہ حاصل ہوتا ہے اسی صورت سے معلوم ہوتا ہے

مگر آگ کا علم جو بواسطہ دھوئیں کے اس صورت میں حاصل ہوتا ہے ہر چند علم بے واسطہ ہی کے ساتھ حاصل ہوتا ہے لیکن علم بے واسطہ میں ایسا متشعل اور محو ہے کہ اس کی خبر بھی نہیں ہوتی اور کسی کو اس طرف دھیان بھی نہیں گزرتا۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ دن کو ستاروں کا نور بھی ہوتا ہے مگر آفتاب کے نور میں ایسا محو ہے کہ معلوم بھی نہیں ہوتا۔

کبھی دو چیزوں کا علم بے واسطہ یا ایک کا بواسطہ دوسری کا

بے واسطہ بھی اکٹھے ہی حاصل ہو جاتے ہیں

جب یہ بات ذہن نشین ہو چکی کہ ایک شے کا علم بے واسطہ اور بواسطہ بسا اوقات دونوں ساتھ ہی پیدا ہوتے ہیں ایسا ہی یہ بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ کبھی دو چیزوں کا علم بے واسطہ بھی ساتھ ہی حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً آگ کو اور دھوئیں کو ایک ساتھ دیکھتے علیٰ ہذا القیاس، ایک شے کا علم بے واسطہ اور دوسری شے کا علم بواسطہ پہلی شے کے واسطے سے بھی اکٹھے ساتھ ہی حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً دھوئیں کا علم بے واسطہ اور آگ کا علم بواسطہ دھوئیں کے واسطے سے اور ایسے ہی آگ کا علم بے واسطہ اور دھوئیں کا علم بواسطہ آگ کے واسطے سے دونوں ساتھ ہی پیدا ہوتے ہیں اور اکثر کچھ تفاوت نہیں ہوتا جو ایک کو یوں کہیں کہ یہ علم تو فلابانی ساعت میں حاصل ہوا اور یہ علم اس سے پہلی ساعت یا اس کے بعد کی ساعت میں حاصل ہوا۔

بے واسطہ اور بواسطہ حاصل ہونے والے علم الہی میں کوئی تقدم تاخر نہیں

لیکن تاہم عقل کے نزدیک ایک ترتیب ہے کہ اس کی رو سے مقدم مؤخر کہہ سکتے ہیں یعنی ایک شے کے علم بے واسطہ کو دوسری شے کے علم بالواسطہ سے جو بواسطہ پہلی شے کے حاصل ہوتا ہے عقل ایک طرح سے مقدم سمجھتی ہے یعنی ہر کوئی یوں سمجھتا ہے کہ دوسری شے کا علم اس صورت میں پہلی شے کے علم پر موقوف ہے۔ سو جیسا ہاتھ میں کسی چیز کو لے کر ہلایے تو گودہ چیز ہاتھ کے ساتھ ہی ہلتی ہے لیکن پھر یوں کہتے ہیں کہ ہاتھ اوّل ہلتا ہے ایسا ہی اس صورت میں گودہ دونوں چیزوں کا علم برابر ہی حاصل ہوتا ہے لیکن جس کا علم بے واسطہ ہے بہ نسبت اس علم کے جس کا علم اسی کے واسطے سے حاصل ہوتا ہے مقدم گنا جاتا ہے اور جیسا یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہاتھ کو اس لیے ہلایا تا کہ وہ چیز ہلے جو ہاتھ میں ہے۔ ایسا ہی یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ دھوپ کو اس لیے دیکھا تا کہ آفتاب بھی معلوم ہو جائے۔

کلام الہی میں ماضی و حال علم بے واسطہ سے

تعبیر ہے اور استقبال علم بالواسطہ سے

جب یہ تمام مقدمات ذہن نشین ہو چکے تو اب التماس یہ ہے کہ خداوند کریم کے علم کو اگر قدیم کہئے تو ”حتی نعلم“ وغیرہ کے استقبال میں کچھ فرق نہیں آتا اور ”حتی نعلم“ وغیرہ کے استقبال سے اس کے علم کے قدیم ہونے میں کچھ تفاوت نہیں پڑتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ خداوند عظیم کو ہر چیز کا علم دو طرح سے حاصل ہے بے واسطہ اور بواسطہ یک دیگر، کیونکہ تمام موجودات کے ساتھ لوازم لگے ہوئے ہیں۔ سو جیسا لوازم اور طرزومات دونوں کا علم بے واسطہ اسے حاصل ہے ایسا ہی لوازم کا علم طرزومات کے واسطہ سے، طرزومات کا علم لوازم کے واسطہ سے بھی اسے حاصل ہے اور دونوں ازل سے برابر ساتھ ہیں۔ گو علم بالواسطہ کسی چیز کا اس کے علم بے واسطہ میں محو اور مشغول ہو اور ایسا ہی کسی چیز کا علم دوسری چیز کے علم کے واسطے سے اور اس دوسری چیز کا علم برابر ساتھ ہی ازل سے خداوند علم یزل کو حاصل ہیں اور دونوں قدیم ہیں مگر کسی چیز کے علم بالواسطہ کو بہ نسبت اس چیز کے علم کے جس کے واسطہ سے یہ علم حاصل ہوا ہے، مؤخر گنیں گے اور یہ علم بہ نسبت اس علم کے مقدم سمجھا جائے گا۔ سو جہاں کہیں علم خداوندی کے ذکر میں صیغہ استقبال کا یا معنی استقبال کے پائے جاتے ہیں وہ باعتبار علم بالواسطہ کے ہے ورنہ باعتبار زمانہ کے کچھ تفاوت نہیں اور جہاں کہیں ماضی یا حال مستعمل ہے وہاں علم بے واسطہ مراد ہے۔

بنی آدم کے علوم چونکہ بواسطہ ہیں اس لیے بصیغہ استقبال (بواسطہ) تکلم فرمایا

اور باعتبار علم بالواسطہ کے کلام کرنے کی وجہ یہ پیش آئی ہے کہ کلام اللہ کے مخاطب آدمی ہیں اور تمام آدمی بلکہ تمام ذوی العقول کو اکثر چیزوں کا علم بالواسطہ ہی ہے بے واسطہ نہیں۔ روح بنی آدم یا بنی آدم کے کمالات نفسانی جیسے سخاوت، شجاعت، خلق، مروت، اگر ہیں تو دل میں ہیں آنکھوں سے یا کانوں سے یا سوا اس کے اور حواس خمسہ سے معلوم نہیں ہوتے، ان کو اگر کوئی دوسرا معلوم کرتا ہے تو ان کے آثار اور لوازم سے معلوم کرتا ہے۔ سخاوت دینے دلانے سے جو ہاتھ کا کام ہے، شجاعت مارنے مرنے سے جو ہاتھ پاؤں سے تعلق رکھتا ہے، خلق شیریں زبانی سے جو زبان سے متعلق ہے معلوم ہوتی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس روح کا ہونا نہ ہونا دوسروں کو حرکات سکنت سے جو بدن سے متعلق ہیں معلوم ہوتا ہے۔

اگر علوم بے واسطہ سے تکلم فرماتے تو وہ بنی آدم پر

حجت نہ ہوتے کیونکہ ان کے بس میں نہیں

اور جہاں کہیں جناب باری تعالیٰ نے اپنے علم میں میخذ استنبال استعمل کیا ہے وہ ایسے ہی امور ہیں جو بنی آدم کو بے واسطہ معلوم نہیں ہو سکتے۔ سو ان سے باعتبار علم بے واسطہ کے اگر کلام کرتے تو ان پر کچھ حجت نہیں ہو سکتی تھی اور نہ ان کو الزام دے سکتے تھے اس لیے الزام دینے کے موقع میں باعتبار علم بالواسطہ کے کلام کی ہے اور جہاں یہ غرض نہیں وہاں باعتبار علم بے واسطہ کے کلام کی ہے اور وہاں میخذ ماضی کا یا حال کا مستعمل ہے مگر بنی آدم کو چونکہ ان اشیاء کا علم بے واسطہ ہو ہی نہیں سکتا اور اس پر ان واسطوں کا علم قیل ان کے وجود کے بنی آدم کے حق میں ممکن ہی نہیں ہو سکتا اس وجہ سے ان کے تمام علوم برابر حاصل نہیں ہوتے تو وہ خدا کو اپنے اوپر قیاس کر کے میخذ استنبال سے حدوث سمجھ جاتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں کہ کلام اللہ میں ایک جاتو یوں مذکور ہے کہ خداوند علیم کو تمام اشیاء کے علوم ازل سے حاصل ہیں۔ جیسا کہ ”كَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا“ اور ایک سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ بعض علوم حادث ہیں جیسے القاط ”حَتَّى نَقْلَمَ“ وغیرہ مگر جو لوگ فہیدہ ہیں اور نکتہ مذکورہ سے متنبہ ہو گئے ہیں دونوں کو مطابق یک دیکر سمجھتے ہیں۔

محذوبات کی بحث اور علم الہی کے دو دفتر

اب مناسب یوں ہے ”يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُنْبِثُ“ کے معنی بھی بیان کیے جائیں کہ مصنفان علماء شیعہ کو شاید انتظار ہو مخدوم من اول ساری آیت گوش گزار ہے، بعد اس کے اپنا مانی الضمیر بھی معروض خدمت ہوگا۔ ساری آیت یوں ہے: ”وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٍ يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُنْبِثُ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ“ حاصل اس کا یہ ہے کہ ”کسی رسول سے یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی معجزہ جو اس کی نبوت کی نشانی ہو خدا کی بے اجازت لے آئے اللہ کے یہاں ہر مدت کی ایک جدا کتاب ہے اس میں سے جو چاہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور اس کے پاس ایک اور بڑی کتاب ہے جو سب کی اصل ہے۔“ یہ تو اس آیت کا حاصل ہوا۔ اب الہی فہم سے یہ امید ہے کہ بعد ملاحظہ ان دونوں لفظوں کے ایک تو ”لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٍ“ اور دوسرا ”وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ“ اور نیز بعد لحاظ اس امر کے کہ جملہ ”يَمْحُو اللَّهُ الْخ“ اول کے بعد واقع ہے بے حبیہ کے آپ سمجھ جائیں گے کہ خداوند کریم

کے یہاں دو دفتر ہیں ایک بڑا جس کی طرف اُم الکتاب کا لفظ اشارہ کرتا ہے۔ دوسرا چھوٹا دفتر جس کی طرف جملہ لکھل اجل کتاب ہدایت کرتا ہے اور محو اور اثبات یعنی مٹانہ نہ مٹانا یہ چھوٹے دفتر میں ہوتا ہے، بڑے میں نہیں ہوتا۔ سو عینہ یہی الہی سنت کا مذہب ہے، وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ بڑا دفتر جو علم خداوندی کے موافق ہے یا خود علم خداوندی ہے اس میں گھٹا بڑھاؤ نہیں ہوتا۔

عقیدہ بد اقرا آن سے اس طرح ثابت ہے

جیسے ”لَا تَقْرُبُوا الصَّلَاةَ“ سے نماز کی ممانعت

پھر شیعہ کس خوبی پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ بد اکلام اللہ سے ثابت ہوتا ہے، اگر اسی آیت کے بھروسہ کو دتے ہیں تو یہ عینہ ایسا ہی استدلال ہے جیسا کسی بالوانے کہا تھا کہ کلام اللہ میں خدا نے نماز سے منع فرمایا ہے اس لیے ہم نہیں پڑھتے۔ کسی نے پوچھا کہ صاحب ہمیں بھی بتلاؤ ہم نے تو آج تک یہ بات نہیں سنی اگر یہ حکم ہے تو کلام اللہ کے قربان جائے بڑے آرام کی بات کل آئی، بالوانے کہا صاحب سورہ نساء میں نہیں؟ کہ ”لَا تَقْرُبُوا الصَّلَاةَ“ یعنی نماز کے پاس نہ پہنچو اس نے کہا، صاحب اس کے بعد ”وَأَلْتَمِسُ مُخَارَاجًا“ بھی تو ہے یعنی نشے کی حالت میں نماز مت پڑھو۔ ساری آیت کے معنی پر عمل کرنا چاہیے، بالوانے کہا بابا سارے کلام پر کس سے عمل ہوا ہے؟ یہ بھی غنیمت ہے جو اتنا بھی عمل ہو جائے تو شاید علماء شیعہ نے بھی اسی قاعدہ پر عمل کیا ہے۔

اور میرے نزدیک ایک اور عذر شیعوں کے لیے اس موقع میں سخت اُتارنے کے لیے بہت عمدہ ہے وہ یہ ہے کہ سارے کلام اللہ کے یاد نہ ہونے میں تو شیعہ معذور ہی ہیں۔ اتفاق سے ”لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ يَمْحُوهُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُنَبِّئُ“ تک فقط ان کو یاد ہو گیا تھا بسبب کمال عبودیت اور سراپا بندہ ہونے کے اسی پر اعتقاد جما بیٹھے۔ سو یہ بات تو قابل تعریف ہے اگر ”وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ“ بھی ان کو معلوم ہوتا اور پھر سنیوں کے موافق ان کا اعتقاد نہ ہوتا۔ تب البتہ جائے گرفت تھی۔ سبحان اللہ اس تفسیر دانی اور کلام اللہ کے محفوظ ہونے پر سنیوں سے مقابلے کا دعویٰ مگر ”موشے بخواب اندر بیرون ز شہر شد“ جناب من شیعوں کے اکثر استدلال تو بالوانہ کور کے سے استدلال ہیں اور کلام اللہ کی یادداشت ایسی ہے جیسے مرزا نوشہ شاعر متقاضے تاشیر مذہب اپنی سرگزشت لکھتے ہیں:

لَا تَقْرُبُوا الصَّلَاةَ زَكَمْ بِخَاطِرِ اسْتِ وَزَامِرِ يَادَ مَانِدَ كَلُوا وَاشْرَبُوا امِرا

علم الہی قدیم غیر متغیر محیط ہے

حق یوں ہے کہ علم الہی میں کچھ تغیر نہیں آتا اور کیونکر تغیر ہو سکے۔ خداوند کریم جا بجا ایسے ہی توہمات کے دفعیہ کے لیے فرماتا ہے:

كَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا كَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ غَالِمِينَ،
إِنَّ اللَّهَ قَدْ أَخَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلَمًا كَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّجِيبًا

”حاصل سب کا یہ ہے کہ خداوند کریم ازل سے ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز کی حقیقت پہچانتا ہے اور ہر چیز ازل سے اس کے احاطہ علمی اور احاطہ وجود میں ہے۔“

چنانچہ تصویر اس مضمون کی کچھ مذکور بھی ہوئی، پھر جب ازل سے ہر چیز کو محیط ہے تو بعد اس کے غلطی کا باعث اگر ہو سکے ہے تو یہ ہو سکے ہے کہ کوئی چیز بیچ میں خدا کے اور خدا کے معلومات کے حائل ہو جائے۔ سو اگر یہ احتمال ہے تو اس کا جواب تو کلام اللہ ہی میں بہت جگہ موجود ہے۔ ”نحن اقرب“ یعنی ہم سب سے زیادہ نزدیک ہیں یا شیعہ یوں تجویز فرمائیں کہ (نعوذ باللہ) خداوند کریم کے حواس میں فتور ہے سو اتنی جرأت شیعوں ہی کو ہے۔ مع هذا ”لَا يَخْفَى عَلَى اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ“ یعنی اللہ پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہتی زمین میں نہ آسمان میں، یہ بھی کلام اللہ ہی میں ہے کسی پنڈت کی پوچھی کی آیت نہیں۔

عقیدہ بد اخدا کیلئے جہل مرکب تجویز کرتا ہے

اس پر طرفہ یہ ہے کہ اکثر علماء شیعہ معقولات میں دخل در معقولات رکھتے ہیں مگر اس پر اتنا نہیں سمجھتے کہ علم غلط حقیقت میں علم نہیں وہ اقسام جہل میں سے ہے، اسی واسطے اس کو جہل مرکب کہتے ہیں۔ اس اصطلاح کو منطق کے چھوٹے رسالہ پڑھنے والے تو دور کناران پڑھے بھی سمجھتے ہیں بلکہ زبان زد عام و خاص ہے کہ جہل مرکب سے تو جہل بسیط ہی بھلا، بایں ہمہ جو یہ حضرات ذات والاصفات جناب کبریائی کو جہل مرکب کا بدلہ لگاتے ہیں تو اذل تو ان آیات مرقومہ پر خطِ کھینچنا پڑا۔ سبحان اللہ! خدا کے کلام کو بندے نسخ کریں اور وہ بھی اعتقادات میں کہ باتفاق شیعہ و سنی بلکہ باتفاق عالم قائل نسخ ہی نہیں دوسرے خدا کا جہل مرکب کجا نعوذ باللہ من هذا الخرافات۔

عقیدہ بد اتمام موجودات کو ایک طرح خدا پر فضیلت دیتا ہے

تیسرے جمادات وغیرہ جن کو بالکل علم نہیں بلکہ تمام موجودات ایک وجہ سے خدا سے افضل

ٹھہرے کیونکہ کوئی ہوسوائے خدا کے سب میں کچھ نہ کچھ جہل بسیط ہے اور خدا میں جہل بسیط نہیں کیونکہ کلام اللہ کی آیات سے خود واضح ہو چکا کہ خدا کو سب چیز کی خبر ہے۔ سو وہ خبر اور وہ علم اگر غلط ہو دے تو جہل مرکب ہوگا اور جہل مرکب سے جہل بسیط آخر افضل ہی ہے تو سب مخلوقات ایک وجہ سے خدا سے افضل نکل۔ واہ سبحان اللہ کیا خدا کی قدر شناسی ہے۔

تمام عالم علم الہی کے محو و اثبات کا دفتر ہے

باقی کوئی ہم سے یوں پوچھے کہ وہ دفتر کون سا ہے جس میں محو و اثبات ہوتا ہے تو گو ہمیں بعد اس کے کہ یہ معلوم ہو گیا کہ وہ دفتر علم الہی کے علاوہ ہے کچھ اس کے جواب کی حاجت نہیں لیکن تسکین خاطر کر دینی بھی اچھی ہوتی ہے، اس لیے معروض خدمت ہے کہ ان امور کی حقیقت تو خدا ہی جانے، یا جن کو وہ اطلاع کر دے مگر بطور امکان و احتمال اس مقام میں ہمیں بیان کرنا لازم پڑا، اس کم فہم کے فہم نارسا میں جو بمعنوت تقاریر بعض بزرگان آتا ہے تو یہ ہے کہ تمام عالم دفتر خداوندی ہے مگر اس میں سے بعض اشیاء کو بمنزلہ اوراق کے اور بعض کو بمنزلہ نقوش اور حروف کے سمجھئے۔

محو و اثبات کی ایک تفہیمی تمثیل

تفہیم کے لیے اوّل ایک مثال گوش گزار ہے موم یا گارے یا کسی اور نرم چیز کو ہم کئی کئی شکل میں لاسکتے ہیں چاہیں اس کو گول بنالیں چاہیں چپٹا مگر اس موم پر ان اشکال میں سے ایک وقت میں ایک ہی شکل آ سکتی ہے دو مجتمع نہیں ہو سکتیں۔ جب دوسری شکل آئے گی پہلی مٹ جائے گی لیکن چونکہ اشکال تو ایک قسم کے نقش و نگار ہیں تو ان کو تو بمنزلہ حروف اور نقوش سمجھئے اور اس موم کو بمنزلہ اوراق سمجھئے۔ جب یہ مثال ذہن نشین ہو چکی تو اب سنئے کہ تمام اجسام میں تبدل اشکال اور کیفیات نظر آتا ہے، زمین سے جو کھیتی نکلتی ہے تو وہی اجزائے خاکی ہوتے ہیں، پر خدا کی نیرنگی سے ان کی شکل اوّل بدل جاتی ہے، پھر اس کھیتی کی شکل کیا سے کیا ہو جاتی ہے، آخر رفتہ رفتہ وہی غذا جو حقیقت میں اجزاء خاکی ہیں، شکل بدل کر غذا بن گئے ہیں۔ معدہ میں جا کر کچھ اور ہی ہو جاتے ہیں اور پھر نطفہ بن کے کچھ اور رنگ روپ پیدا کر لیتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اور اجسام میں دیکھ لیجئے گرمی سردی وغیرہ جتنے تغیرات ہیں وہ سب اسی قسم کے ہیں۔

ایسے ہی ادواح میں طرح طرح کی کیفیات کا تبدل رہتا ہے رنج خوشی خوف و امن وغیرہ سو جو چیزیں کہ ہلتی رہتی ہیں، ان کو تو اس دفتر خداوندی کے حروف اور نقوش سمجھئے اور اجسام

اور ارواح وغیرہ کو جو ان سب احوال میں بمنزلہ موم بجائے خود موجود رہے ہیں اس دفتر کے اوراق سمجھئے، بعد اس کے یہ ذہن نشین کر لیجئے کہ جو جو اشکال معدوم ہو گئے وہ تو محو ہو گئے اور جو ان کی جگہ قائم کیے گئے وہ اثبات اور مثبت ہو گئے۔ چنانچہ محاورہ دان فارسی اور عربی جانتے ہیں کہ اثبات اور مثبت لکھنے کے موقع میں بولا کرتے ہیں۔

”لِکَلِّ اَجَلٍ کِتَاب“ کی عجیب تفسیر

مگر چونکہ ہر شکل کے لیے کچھ نہ کچھ زمانہ چاہیے اور اس کی بقاء کے لیے زمانہ میں سے کچھ مقدار معین ہوتی ہے تو خداوند کریم نے ارشاد فرمایا ”لِکَلِّ اَجَلٍ کِتَاب“ یعنی ہر زمانہ کے لیے جدا جدا نقوش ہیں جب ایک زمانہ ہو لیتا ہے اور دوسرے نقوش اور نگہائے اشکال اور کیفیات کی بہار آتی ہے اور ان کے زمانہ کی آمد ہوتی ہے تب پہلے نقوش کو مٹا دیتے ہیں اور دوسرے زمانے کے مناسب نقوش ان اوراق میں لکھے جاتے ہیں مگر یہ وہ اوراق نہیں کہ پہلے نقوش کے مٹانے سے بگڑ جائیں یا آلودہ ہو جائیں بلکہ جیسے دفتر میں یا سلیٹ کی تختی یا لکڑی کی تختی پر جو چاہا لکھ دیا۔ پھر جب چاہا مٹا دیا اور اس کی جگہ اور لکھ دیا، ایسے ہی ان اوراق میں بھی جو چاہا لکھ دیا اور جب چاہا مٹا دیا۔

اُم الکتاب کی توضیحی مثال

لیکن پہلے پچھلے سب نقوش کی نقل بلکہ اصل ایک بڑے دفتر اور بڑی کتاب میں ہے جیسے تحریر پڑھنے والے جس شکل کو پڑھتے جاتے ہیں سلیٹ پر کھینچ کھینچتے جاتے ہیں اور جب سمجھ لیتے ہیں اور دوسری شکل کے سمجھنے کی نوبت آتی ہے، پہلی کو مٹا دیتے ہیں اور دوسری کھینچ لیتے ہیں اور بایں ہمہ ان سب کی نقل بلکہ اصل تحریر اقلیدس میں موجود ہے۔ باقی رہا اس آیت کا اپنے ماقبل سے اس صورت میں یہ ہوگا کہ کسی نبی سے کیونکر ہو سکے کہ اپنے آپ کوئی آیت لے آئے، ہمارے یہاں تو ہر زمانہ کے لیے نقوش مقرر ہیں گنے چنے ہوئے رکھے ہیں، اس میں کمی بیشی کب ہو سکتی ہے جو کوئی اپنی طرف سے اس میں اپنی خواہش کے موافق اس آیت کا نقش بھی رلا دے؟

محو و اثبات علم الہی میں نہیں لہذا ابد کی گنجائش بھی نہیں

اب اس تقریر کو اہل انصاف غور فرمائیں کہ کیسی برکت ہے اور پھر بایں ہمہ اس میں کہیں اس کی گنجائش نہیں کہ قائلین بد انگشت رکھ سکیں یا تمسک کر سکیں، پھر کوئی کیونکر کہہ دے کہ آیت میں محو اثبات کا ذکر ہے تو علم الہی میں محو اثبات ہونا ہوگا مگر جو بات اپنے ذہن میں جمی ہوئی ہوتی ہے اسی

کی طرف ذہن دوڑا کرتا ہے، بھوکے کے نزدیک دو اور دو چار روٹیاں ہی ہوتی ہیں اور اگر اس تقریر کو سن کر کسی کے یوں کان کھڑے ہوں کہ مشہور تو یوں سنا تھا کہ ”لِکْطَلِ اَجَلِ کِتَاب“ سے جو لکھنا نکلتا ہے تو یہی لکھنا ہے جسے عرف میں لکھنا کہتے ہیں۔ سو وہ تو کسی کلام اور الفاظ کے مقابلہ میں جو حرف اور نقوش ہوتے ہیں ان کے لیے ہوتا ہے تو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ حق بات چاہے مشہور ہو کہ نہ ہو ہاں اگر یہ متنی چسپاں نہ ہوں تو جب ہی کہو۔

اُم الکتاب اور محو و اثبات کی ایک اور مثال

مع ہذا جیسے اور صاحبوں کی مرضی ہم بھی اسی راہ چلتے ہیں، دُکانداروں کے یہاں اکثروں نے دیکھا ہوگا کہ روزمرہ کی برداشت کو تختی پر لکھتے جاتے ہیں، بعد ازاں یہی میں نقل کر کے تختی کو دھوپیتے ہیں پھر دوسرے دن کی برداشت اسی تختی پر لکھنی شروع کر دیتے ہیں، سو روز یہ لکھنا اور مٹانا رہتا ہے اور اس پر ایک بمی وہ لکھی ہے کہ اس میں تمام ایام کی برداشت کی تفصیل تاریخ وار درج ہے کہ اس میں بحر لکھنے کے مٹانے کا اتفاق نہیں ہوتا، سو ایسا ہی جناب باری تعالیٰ کے کارخانہ قدرت میں سمجھ لیجئے جیسے یہاں روزمرہ کی برداشت تختی پر لکھتے ہیں وہاں قرن وار کسی لوح پر ایک تحریر ہوتی ہو اور پھر اس کو اس لوح سے مٹا کر بڑی کتاب میں کہ اس کو اُم الکتاب کہتے ہوں درج کر دیتے ہوں۔ بعد ازاں پھر دوسرے قرن کا حساب کتاب لکھنا شروع کر دیتے ہوں۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرن کا حساب کتاب ایک لوح پر لکھ کر اس کو کسی بڑی لوح میں نقل کر دیا ہو، پھر اس لوح سے اس تحریر کو مٹا کر صحابہ کے قرن کا حساب کتاب لکھ کر اسی طرح لوح کلاں میں درج کر دیا ہو، اسی طرح یہ محو اثبات ہمیشہ ہوتا ہو مگر سب جانتے ہیں کہ یہ محو اثبات بوجہ غلطی تحریر نہیں کہ جس سے بدا ثبات ہو جائے۔

محو و اثبات بالفرض احکام میں بھی ہو تو حذاقت ہے بدائیں

اور سلیمان کہ یہ بھی نہ سہی بلکہ حکم احکام کے تبدیل و تغیر کے باعث یہ محو اثبات ہوتا ہو تب بھی تو مقتدایان شیعہ کا دعویٰ ثابت نہیں ہو سکتا، تصویر اگر مطلوب ہے تو اس کی یہ صورت ہے کہ بیمار اگر طبیب کے پاس جاتا ہے تو وہ اس کے لیے موافق قواعد طب کے مثلاً منہج تجویز کرتا ہے۔ جب اس کی میعاد پوری ہوتی ہے و انہی دواؤں میں سے بعض دواؤں کو کاٹ دیتا ہے اور سنا وغیرہ بڑھاتا ہے اور بعد اس کے تمہید کا نسخہ لکھتا ہے اور پھر مقویات تجویز کرتا ہے تو اس صورت میں جو کچھ طبیب تجویز کرتا ہے وہ سب کتب طب کے موافق ہوتا ہے اور منہج اور مسہل اور تمہید اور مقویات کی جو

تہدیلی کرتا ہے تو وہ تہدیلی اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ پہلی تجویز میں کچھ غلطی ہوئی تھی بلکہ عین فہم و خوبی طہات بھی ہے کہ اپنے اپنے وقت پر منفع اور مسہل اور تہمد کا استعمال ہوا کرے۔

سو جیسے یہ قصہ ہے ایسا ہی کارخانہ قدرت کا کارخانہ سمجھئے۔ جناب باری تعالیٰ کو جو حکیم مطلق ہے بجائے طیب حاذق خیال فرمائیے اور اُم الکتاب کو بجائے کتب طب قرار دیجئے اور اس کتاب کو جو ”کَلْبُ الْاَنْجَلِ بِکِتَاب“ میں ہے یعنی ہر ہر مدت کی جدا جدا کتاب کو بمنزلہ نسخہ منفع اور مسہل رکھئے اور فرشتوں کو حمار دار اور مجموعہ عالم کو جو اصطلاح محققین میں مسی بہ فہم اکبر ہے بیمار فرض کیجئے اور محمود اثبات کو ایسا سمجھئے جیسا منفع کی جگہ مسہل بدلتے ہیں اور مسہل کی جگہ تہمد ہو۔ اس تہدیلی کو بدائع مصلحہ سمجھنا کمال خوش فہمی پر دلالت کرتا ہے۔ ہاں اگر یہ تہدیلی اس قسم کی ہوتی جیسے شخص کی غلطی سے اول کچھ تجویز کیا تھا، پھر کچھ سمجھ میں اور آیا، البتہ ایک موقع تھا لیکن ”کَلْبُ الْاَنْجَلِ بِکِتَاب“ اس بات کو چاہتا ہے کہ مدت دار جدا جدا تحریریں ہوتی ہیں اور وہ تہدیلی بوجہ تبدیلی مدت ہے بوجہ غلطی تجویز نہیں۔

القصہ یہ تینوں تقریریں جو مذکور ہوئیں ایک سے ایک چڑھتی ہوئی ہے اور بعد ملاحظہ ان تقریرات کے مدعیان بذا کا حوصلہ معلوم نہیں ہوتا کہ پھر اس آیت کی طرف منہ کر کے بھی سوویں یا اس آیت سے تمسک کا نام بھی لیں مگر جس کے دل میں انصاف نہ ہو اس کے آگے حق بات کا بیان کرنا بھی لا حاصل خیر کوئی سمجھے یا نہ سمجھے جو اس پر بھی نہ سمجھے اسے خدا سمجھے۔

عقیدۂ بداء پر تیسرا استدلال

اور بعض علماء شیعہ کو بداء کی حقیقت پر ایک اور نئی دلیل سوجھی ہے۔ آیت ”وَوَعَدْنَا مُوسٰی فَلْيُفِنَ لَيْلَةً وَاتَّخَذْنَا هٰذَا بِعَشْرِ الْخ“ سے بداء کی حقیقت پر استدلال لاتے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی سنئے، ہم سناتے ہیں۔ حاصل اس آیت کریمہ کا اول معروض ہے، وہ یہ ہے کہ ”وعدہ ٹھہرایا ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا اور پورا کیا ہم نے اس مدت کو ایک عشرہ اور بڑھا کر، سو پورا ہو گیا وقت اس کے رب کا چالیس راتیں اتھنی“

اب تقریر استدلال سنئے اول تو جناب باری نے تیس شب کی محنت پر تورات کا وعدہ کیا، پھر تیس رات کے مجاہدہ پر تورات عطا نہ ہوئی بلکہ فرماتے ہیں کہ تیس رات کے بعد دس روز اور بڑھا دیئے۔ سبب اس زیادتی کا بجز اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تیس رات کی خلوت پر تورات کا عطا ہونا خلاف مصلحت معلوم ہوا یہ کثیر اجرت اس قلیل مدت پر ناز یا نظر آئی، تعظیم اجرت کے لیے مدت اور بڑھائی۔ سو اگر خدا ہی کو یہ بات پہلے سے سوجھی نہ تھی تب تو بداء کا ثبوت موافق

اصطلاح حقد میں ظاہر ہے ورنہ اس سے تو کم بھی نہیں کہ خداوند عظیم تو جانتا تھا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسرائیل کو کچھ کا کچھ بتا دیا۔ سو اس بات میں اور اس بات میں گوزمین و آسمان کا تفاوت ہے ہمارے حق میں جیسا بد حسب اصطلاح حقد میں دیا ہی تو یہ رب العالمین، نہ اس صورت میں خدا کے کلام پر اعتماد نہ اس صورت میں کلام ربانی قابل استناد، پھر اگر فضائل صحابہ وغیرہ معتقدات اہل سنت پر کلام ربانی شاہد بھی ہو تو کیا ہوا، ایک زبانی بات ہے قابل التفات نہیں۔

جواب: مگر کوئی سمجھ دار ہو تو ہم بھی اپنے حق میں اس کا جواب لیے بیٹھے ہیں۔ غلطی یا غلط گوئی محکم اور ہے اور غلط فہمی کا طب اور، حضرات شیعہ اپنی غلط فہمی سے اپنی غلط فہمی کو غلطی یا غلط گوئی خداوندی سمجھتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ غلط فہمی اپنی سمجھ کا قصور ہے، خداوند عظیم کا اس میں کیا قصور؟ یہ سب جانتے ہیں کہ جناب باری نے اس قصہ کو مختصر بیان فرمایا ہے، روزوں کا اس میں ذکر نہیں، مسواک کا اس جگہ ذکر نہیں، سو جیسا روزوں کا ذکر نہیں فرمایا حالانکہ حدیث و تفسیر سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ فقط تیس دن رات مقصود نہ تھے بلکہ اتنے دنوں صائم رہنا مطلوب تھا۔ ایسے ہی ہو سکتا ہے کہ بعض اور شرائط بھی ہوں کہ ان کا ذکر نہیں فرمایا۔ من جملہ ان کے مسواک کا کرنا بھی ہو اور اگر فرض کیجئے روایات سے ثابت ہو جائے کہ تورات کی اجرت میں فقط تیس دن کے روزے ہی تھے اور سو اس کے اور کوئی بات مشروط نہ ہوئی تھی تو قطع نظر اس کے کہ اس امر کا ثبوت غیر ممکن معلوم ہوتا ہے۔ فقط عدم ثبوت نکلے تو نکلے ثبوت عدم محال نظر آتا ہے۔

جواب کی ایک توضیحی مثال

ہم کہتے ہیں کہ بہت سے ایسے شرائط ہوتے ہیں کہ وقت تقرر اجرت ان کا ذکر نہیں آتا، ان کا معروف ہونا کافی ہو جاتا ہے۔ کچھری یا فوج کے ملازموں کو دیکھئے کہ لباس خاص اور اکرام حکام اور تقدیم تسلیم کا وقت تقرر ان سے کوئی ذکر نہیں کرتا۔ بایں ہمہ ان امور کے ترک پر ان سے مواخذہ کیا جاتا ہے، جرمانہ لیا جاتا ہے، تاوان لیتے ہیں، سزا دیتے ہیں اور اگر ملازمان بادشاہی کی بات بایں وجہ قابل قیاس نہ ہو کہ ان سے تو اصل کار اور اجرت کی مقدار کا بھی ذکر نہیں آتا۔ ایک بات معین ہوتی ہے جس سے ہر عام و خاص جانتا ہے۔ علی ہذا القیاس اور امور بالائی مثل لباس وغیرہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ سو اس حساب سے ان کا حال مثل اصل امر رہا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات تو ہمارے اندر بھی مفید مطلب ہے کیوں کہ جب شہرت کے سامنے تمام امور کے ذکر کی حاجت نہیں تو بعض امور کے ذکر ہونے کی تو بشرط شہرت لاجرم حاجت نہ ہوگی۔

دوسری توضیحی مثال

مع ہذا یہ مثال ناپسند ہے تو اور مثال لیجئے، گھوڑے کو کہیں جانے کے لیے کرایہ کرتے ہیں تو چار جامہ پوری لگام رکاب وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ ہاں ہمہ اگر گھوڑے والا گھوڑے کے ساتھ یہ چیزیں حوالہ نہیں کرتا تو کرایہ لے جانے والا کیسا کچھ لڑتا جھگڑتا ہے اور بن پڑتا ہے تو کرایہ میں سے بھی کچھ نہ کچھ کتر لیتا ہے۔ ایسے ہی اگر مابین بندگان خاص خداوندی خصوصاً انبیاء اور جناب ہاری کچھ قوانین ادب مقرر ہوں اور بندگان خاص کے نزدیک مشہور معروف ہوں اور اس کے ترک پر اگرچہ ذکر نہ آئے مواخذہ ہو تو عین حق اور عین صواب ہے مگر اس کو بد انہیں کہہ سکتے۔ بد کہنا جب مناسب ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو ہرگز اس کی اطلاع نہ ہو اور در صورت یہ کہ اس کی اطلاع ہو اور فقط بمقتضای بشریت ان سے خطاء ہو جائے تو پھر بد انہیں۔

دوسرا جواب

اور یہ بھی نہ سہی کلام اللہ سے فقط اتنا اثبات ہوتا ہے کہ تیس دن کے مجاہدہ پر توبہ کا عطا ہونا ٹھہرا تھا اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک ماہ کا کسی کا کچھ مشاہرہ مقرر کر دیں۔ سو جیسے ایک ماہ کی تنخواہ کے یہ معنی ہیں کہ ایک مہینے کی یہ مزدوری ہوئی۔ خواہ تیسویں دن ملے، خواہ دس دن بعد ایسے ہی تیس رات دن کے مجاہدہ پر توبہ کے عطا ہونے کے یہ معنی ہیں کہ تیس دن کے مجاہدہ کا یہ ثمرہ اور یہ پھل ہے خواہ تیسویں دن ملی ہو یا دس دن بعد، باقی رعی دس روز زیادہ کی محنت کی وجہ، اس کا بیان ہمارے مذمہ ضرور نہیں۔

دفع تو ہم

اور اگر کوئی نادان لفظ التعمنا سے دس رات کا بہ نسبت تیس رات کے تہہ ہونا سمجھ کر الجھنے کو تیار ہو تو اس کا جواب بھی لیجئے سنن و نوافل کا بہ نسبت فرائض کے متم ہونا اور علی ہذا القیاس صدقۃ الفطر کا بہ نسبت صیام رمضان کے متم ہونا احادیث صحیحہ سے ظاہر و باہر ہے مگر کسی کے نزدیک اس کے یہ معنی نہیں کہ فرائض پنجگانہ کی مقدار بہ نسبت زمانہ سابق کے زیادہ کی گئی بلکہ یہ معنی ہیں کہ بمقتضای بشریت ہر عمل میں کچھ نہ کچھ قصور رہی جاتا ہے، کتنا ہی اہتمام کیوں نہ کرو، اس صورت میں مقدار اصلی خدا کے نزدیک بھی اور بندوں کے علم میں بھی وہی رعی اور یہ سب اوپر کا بکھیرا از قبیل قضاء ما فات اور جبر نقصان اور مکافات تقصیرات ہے سو ایسے ہی ان دس دن کو سمجھئے بلکہ لفظ "التعمنا" ہی خود اس بات پر شاہد ہے کہ یہ دس دن کی محنت از قبیل جبر نقصان ہے ورنہ میعاد اصلی وہی تیس دن

تھے اُن راتیں رات کا مجاہدہ ہر وجہ قابل پسند ہوتا اور بمسکھائے بشریت جس سے سب بچا رہتے تھے۔ چنانچہ واقف کار واقف ہیں کوئی قصور تو ر عارض حال موسوی نہ ہوتا تو جناب باری تعالیٰ کی طرف سے اور دس دن کا مطالبہ نہ ہوتا۔

لفظ میقات کی تفسیر

باقی رہا لفظ میقات وہ مکاں اس بات پر دلالت کرتا کہ میعاد اصلی چالیس راتیں تھیں، سو اس کا جواب یہ ہے کہ باز خداوندی میں ہر عمل کی ایک اجرت ہے اور ہر اجرت کے لیے ایک محنت مہین ہے کہ ہم نے حدیث اس کے گولہ ہیں فضائل عظیمہ مثل حصول توبہ وغیرہ کا نرخ چالیس رات کی محنت اصل سے مقرر ہو کر مکمل جو اور عموم رحمت کے باعث حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے دس دن یعنی تہائی محنت کی تخفیف کی گئی ہو جسے اس امت کے عوام کے لیے نو حصے محنت کی تخفیف کی گئی ہے ہا ورنہ حدیث اس آیت کو دیکھئے مَنْ جَاءَ بِالْخَسْبَةِ فَلَهُ عَشْرُ امْتِنَانٍ یعنی جو ایک تنگی لائے گا دس گنا ثواب پائے گا۔ سو دس گنا توبہ ہی کہہ سکتے ہیں کہ ایک تنگی کے عوض دس نیکیوں کا ثواب ملے، پھر جب ایک ہی تنگی پر دس نیکیوں کا ثواب ملا تو نو حصے محنت کی تخفیف آپ نکل آئی، آیات اور احادیث میں اس مضمون کے اور بھی بہت شہید ہیں، پھر بعض آیات و احادیث تو ایسی ہیں جن سے اس سے زیادتی تخفیف بھی بعض بعض افراد کے لیے ثابت ہوتی ہے۔ باندیدہ تطویل تفصیل سے معذور ہوں۔

فرض یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے حکم نہایت قدیمانہ دس دن کی تخفیف ہوئی ہو پر بمسکھائے بشریت حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ عمل ایسا کامل نہ بن پڑا جیسا توبہ کے صلہ کے لیے بکار تھا بلکہ کچھ نقصان نکلا جس کی مکافات اور ستانی دس دن کی خلوت و مجاہدہ سے ہو سکی، اس لیے بنظر رحمت خاصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تیس دن کی محنت کو رد تو نہ کیا۔ اگر چہ رد کرنے کا موقع تھا، ہاں دس دن کی اور ہدایت فرمائی تاکہ کامیاب جائیں اور غیروں کے سامنے نہامت نہ اٹھائیں۔ جب اس طریقہ سے وہی چالیس دن آ پڑے تو جناب باری نے بھی یہ ارشاد فرمایا: فَتَمَّ بِمَقَاتٍ رَبُّهُ أَنْ يَنْبَغِيَ لَكَ "یعنی پس تمام ہو گئی وہی چالیس راتیں جو اس کے رب کا میقات تھا۔ یعنی دولت جمائی کہنتوں کے لیے اس نے مقرر کر رکھا تھا، سو انجام کار وہی پورا ہوا۔

تیسرا جواب

یادیں کہئے کہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بذات خود قابل اہتمام اور شایان تاکید ملک علام

پہن ہوتیں، پر کسی بندہ خاص سے جو ایک وقت خاص اور ساعت اخلاص میں بھرورت کسی امر ہادسی کے ظاہر ہوتی ہیں تو جناب باری برائے کمال بندہ پروری اور غلام نوازی اس عمل کو ایسا قبول کرتا ہے کہ اس کو داخل عبادات خاصہ کر دیتا ہے اور پھر ہر خاص و عام سے اس کے کرنے نہ کرنے کا حساب لیتا ہے تاکہ خدا کی قدر شناسی اور اس بندہ کی رخصت و قدر معلوم ہو جائے۔ مثال اس کی اگر مطلوب ہے تو حضرت ہاجرہ کا صفا مروہ کے بیچ دوڑنا اور اس سبب سے اس سہمی کا داخل سنن یا واجبات مع ہو جانا حالانکہ مثل سلیم کو اس فعل میں کوئی مضمون تعبد کا نظر نہیں آتا سب کا سنا ہوا قصہ ہے۔

علیٰ ہذا القیاس اگر چالیس رات کی مقدار اوّل سے خداوند عظیم کے نزدیک قابل اہتمام نہ ہو بلکہ اس وقت تک وہی تیس رات کی مقدار مہتمم بالشان ہو مگر چونکہ بندہ خاص سراپا اختصاص حضرت موسیٰ علیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک وقت خاص میں جس کا ذکر ہے چالیس رات کا مجاہدہ بضرورت معلوم ظہور میں آیا تو بیجہ کمال اخلاص حضرت موسیٰ علیہ السلام جناب باری نے اس عمل کو ایسا قبول فرمایا کہ آئندہ سے فضائل جلیلہ کی تحصیل کے لیے عدد اربعین ہی مقرر ہو گیا اور جب اس وجہ سے یہ عدد مہتمم بالشان ٹھہرا تو جناب باری عزاسمہ کے اس قول کے ”لستم میقات ربہ اربعین لیلۃ“ یہ معنی ہوئے کہ ہر چند ایسی نعمتوں کے لیے اصل میں وہی تیس راتیں تھیں لیکن چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بضرورت معلوم حالت اخلاص میں چالیس رات کا مجاہدہ ظہور میں آیا تو خداوند کریم نے اس عمل کو ان کے اخلاص کے باعث ایسا قبول فرمایا کہ اب سے تقرب بارگاہ خداوندی کے لیے پوری چالیس شب و روز کی خلوت مقرر ہو گئی چونکہ پہلی تقریر اور اس تقریر میں فرق ظاہر ہے ان دونوں کے بیان فرق سے معذور ہوں۔

بدائیئے کذب لازم ہے

ہاں نتیجہ اس طول بیانی کا عرض کرنا پڑا، اس لیے سامع خراش اہل انصاف ہوں کہ بدایا کا ثبوت اس آیت سے جب ہو سکتا ہے کہ یا تو جناب علام الغیوب ہی نے پہلے سے یہ ارادہ کر رکھا تھا کہ بعد مرد تیس شب کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت عطا کریں گے اور جب تک ہرگز چالیس رات کی تاخیر کا دھیان نہ تھا، اتفاق سے کسی مصلحت تازہ کے باعث ارادہ سابق سے پلٹ گئے اور تیس رات کے بدلے چالیس رات کے بعد عطا فرمائی یا جناب باری عالم الغیب والہ شہادۃ کے علم و ارادہ میں تو یہی تھا کہ بعد انقضاء مدت چہل شب عطا توریت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام مشرف ہوں مگر عموماً حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تیس شب کے بعد توریت کے عطا ہونے کی خبر دی۔ حضرت

موسیٰ علیہ السلام باعتراف صدق خبر خداوندی یہی سمجھتے رہے کہ لا جرم بعد مرور تیس شب کے تو ریت عطا ہوگی مگر چونکہ مد نظر خداوندی کچھ اور تھا تو ریت کی بات چالیس رات پر جا پڑی۔

اس صورت میں گو صفت علم خداوندی اور صفت ارادہ عیب و نقصان سے منزہ رہے، پر کلام خداوندی میں دروغ کو بے لگا، یہ اس واسطے جکایا کہ بعض محققان شیعہ پیاس عصمت صفت علم و ارادہ بدا کی تقریر کچھ ایسی ہی کرتے ہیں جس سے نقصان و عیب جو کچھ ہو، اخبار تک رہے، علم و ارادہ تک نہ پہنچے، پر جو لوگ خدا کی عظمت و جلال کو کسی قدر سمجھتے ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں کہ خداوند عظیم الشان کی کوئی صفت کیوں نہ ہو، عیب و نقصان سے مبرا ہے۔ محقق مذکور نے بزعم خود اچھی روش اختیار کی تھی اور صفت علم و ارادہ کو نقصان سے بچا کر یوں خوش تھے کہ اہل سنت سے دامن چھڑا لیا، پر یہ نہ سمجھے کہ یہ صفتیں اگر منزہ ہیں تو کیا ہوا ایک اور صفت میں نقصان لازم آیا۔ آری دروغ کو را حافضہ نباشد

مخاطب کی غلط فہمی سے علم خداوندی میں بدا ثابت نہیں ہو سکتا

بہر حال یہ دو صورتیں بدا کے ثبوت کی تھیں اور در صورت یہ کہ یہ دونوں صورتیں نہ ہوں بلکہ فعل متحد اجراء اور تعلق شرط و جزاء ہو تو اگر بیحد عدم وقوع شرط جزاء ظہور میں نہ آئی اور بہ سبب ناپسندی عمل اجرت نہ ملے تو اس میں خدا کی جانب کون سا قصور عائد ہوتا ہے جو بدا کے ثبوت کی گنجائش ملے، ہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام غلطی فہم کے باعث جس سے انبیاء معصومین بھی معصوم نہیں، اگر کچھ کا کچھ سمجھ جائیں تو ہم تو نہیں کہہ سکتے یہ ان کا قصور ہے مگر اس کو بدا سے کیا علاقہ، ایسے بدا کے تو خود اہل سنت جو بدا کے بعایت منکر ہیں بکثرت قائل ہیں، اختلاف آئمہ جو لا جرم ایک نہ ایک کی غلط فہمی کو مستلزم ہے ان کے نزدیک رحمت غلطی ہے۔ بالملکہ بدا کی حقیقت یہ ہے کہ حکم یعنی جناب باری خود غلط سمجھے جیسے حدیث من شیعہ کی رائے معلوم ہوتی ہے یا عمداً غلط کہہ دی جیسے بعض محققین زمانہ تاویل کرتے ہیں، نہ یہ کہ مخاطب یعنی انبیاء یا علماء و غیر ہم اپنے قصور فہم سے کچھ کا کچھ سمجھ جائیں، اس کو غلطی اجتہاد و غلط فہمی اور قصور فہم کہتے ہیں، بدا کو اس سے کچھ علاقہ نہیں، ہاں کوئی قاصر الفہم اگر اس کو بدا سمجھ جائے تو تمام ذمہ و صوح حق کو نہ معذور ہے۔ گواہی ہاتوں میں طرز جہل مقبول نہیں اور بعد ذمہ و صوح حق اور اتمام حجت پھر یہ قصور مطلقاً دیکھا قصور ہے "نعوذ باللہ من سوء الفہم"

مگر تاثرین تقریر ہذا کو اس قدر یاد رہے کہ غلطی اجتہاد کی گنجائش اگر ہے تو ما سوا محکم اور عبارت اہل حق میں ہے، عبارت اہل حق اور محکم میں اہل فہم نہیں ہو سکتے جو اس میں بھی خطا کرے وہ

جاہل ہے عالم نہیں سوتاوت کرنے والے کلام اللہ کے خود جانتے ہیں کہ آیات فہائل صحابہ در باب فضیلت صحابہ محکم اور عبارت النص ہیں کہ نہیں؟

آیہ میقات کی دو دیگر تفسیریں اور بدا کا استیصال

اگر کوئی اب بھی نہ سمجھے تو اس کو خدا سمجھے، پر نقل مشہور ہے جیسے کو تیسرا، ایسے نادانوں کا یہ علاج ہے کہ یوں کہا جائے ثلاثین لیلۃ یا مفعول بہ ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے یا مفعول فیہ، اگر مفعول بہ ہے تو قدر موعود تو وہی تیس راتیں تھیں اور مطلب یہ تھا کہ تم طور پر آنا، اپنا ایک خاص کام یعنی تیس رات کی عبادت جو اہل عقل کے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں تم سے لیں گے، سو اس وعدہ کو پورا فرمایا اور پھر بمختصائے کرم خداوندی دس دن کا اور اضافہ فرمایا۔ سو یہ از قبیل ”لَدُنْہَا مَرْبُودٌ“ ہے اور اس نعمت اول کی اس کو روکن سمجھنا چاہیے۔ جب عوام امت محمدی کو نوٹو گنی اصل سے روکن ملتی ہو، اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک تہائی روکن مل گئی تو شیعوں کو اتنا برا کیوں معلوم ہوتا ہے اس صورت میں تو ریت کو اس وعدہ سے کچھ علاقہ نہیں، یا تو وہ از قسم وعدہ وعید ہی نہ ہو بلکہ از قبیل ”لَدُنْہَا مَرْبُودٌ“ ہو یا موعود تو ہو پر بالاستقلال موعود ہو تیس رات کی محنت کا بطور تطبیق و شرط موعود نہ ہو۔

بالجملہ آیت سے اس صورت میں اگر ثابت ہوگا تو تیس رات کی عبادت کا موعود ہونا ثابت ہوگا تو رات کا موعود ہونا جس پر مدار کارا ثبات بداتھا، ہرگز ثابت نہ ہوگا اور اگر مفعول فیہ ہے تو یہ معنی ہوں گے کہ تیس راتوں تک وعدہ ہوتا رہا۔ باقی رہا موعود کیا ہے اس کے بیان سے یہ آیت ساکت ہے، اگر امر موعود عطاء تو ریت تھا تب کچھ نقصان نہیں اور اگر امر دیگر تھا تب کچھ خلجان نہیں، اول تیس رات تک یہ بشارت آتی رہی، جب بایں لحاظ کہ ایک مہینے کی مقدار عرف بنی آدم میں ایک مقدار کثیر ہے اسی سبب اکثر معاملات اجرت اس پر منعقد ہوتے ہیں۔ اس قدر بشارت سے تسلی ہو گئی تب مزید اطمینان کے لیے چلہ پورا کیا اور اسی واسطے ایک بار ہی ”وواعدنا موسیٰ اربعین لیلۃ“ کہہ کر خاتمہ نہ کر دیا بلکہ ”ثلاثین لیلۃ“ کہہ کر ”واعمناھا بعشر“ فرمایا۔ بہر حال مطلب یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں یہ نہیں کہ کسی امر کے لیے اول کچھ ایک مدت مقرر فرمائی۔ پھر وقت پر اور مدت کام میں آئی جو بدا کے لیے دست آویز اور مذہب حق سے جائے گریز ہو۔ چنانچہ ظاہر ہے مگر دیکھنے والوں کو یہ معلوم رہے کہ یہ تقریر اخیر موافق مثل مشہور جواب ترکی بہ ترکی اہل جدل کے مقابلہ میں بطور مجادلہ لکھی گئی ہے ورنہ طالبان حق کے لیے یہی حق و باطل خود ظاہر ہے۔

خاتمہ مباحث بدا

اب اس قدر ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ شیعہ بدا کے وقوع کے مدعی تھے اور یہ آیت بزم خود انہوں نے دلیل دعویٰ سمجھ رکھی تھی اور یہ سب اہل فہم جانتے ہیں کہ مدعی کے لیے دلیل الہی چاہیے جس میں خلاف دعویٰ اور کوئی احتمال نہ ہو اور جو کوئی احتمال خلاف دعویٰ اُس دلیل سے سمجھ میں آتا ہو اور پھر وہ احتمال بھی ایسا کہ بہ نسبت دعویٰ مدعی کے زیادہ چسپاں بلکہ عین مفہوم مطابقی ہو اور بایں ہمہ اور دلائل اس کے مثبت ہوں اور دعویٰ مدعی کو رد کرتے ہوں تو اہل عقل پھر ہرگز اُس دعوے کو قبول نہ کریں گے اور حق نہ سمجھیں گے بلکہ حق اس دوسرے ہی احتمال کو سمجھیں گے، سو یہاں جتنی سببیں ہیں۔ چنانچہ اہل فہم پر پوشیدہ نہ رہے گی۔

جب بدا کے ابطال سے بفضلہ تعالیٰ فراغت پائی تو ہم اپنی طرف سے اُن لوگوں کے عذر کا جواب دے چکے جو خلفاء عظماء اور بانی مہاجرین اور انصار کی بزرگی کے باوجود یہ کہ کلام اللہ میں ان کی بزرگیاں مذکور ہیں اور ان کے لیے بڑے بڑے وعدہ کیے ہیں اس عذر سے قائل نہیں ہوتے تھے کہ شاید خدا کو بداد واقع ہوا ہو اور یہ سارے وعدے اور سب ان کی تعریفیں غلطی سے اوّل ظہور میں آئی ہوں اور پھر بعد میں حقیقت الامر صحابہ کی جناب باری تعالیٰ کو معلوم ہو گئی ہو اور بروئے انصاف اب ہمارے یہ یہ واجب نہیں کہ آئمہ کے اقوال سے ان کو تسلی کر دیں۔

بدا کے ضمن میں آئمہ کے علم غیب پر بحث

اور اگر ہم اس پر بھی خاک ڈالیں تو یہ بات کیونکر سنی جائے کہ آئمہ کو ”ما کان وما یکون“ کا علم تھا اس لیے اگر ان کے اقوال سے خلفاء یا اصحاب کی بزرگی ثابت ہو جائے تو پھر کوئی شبہ باقی نہ رہے گا۔ سبحان اللہ! خدا کے کہے سے تو تسلی نہ ہو اور اماموں کے فرمانے پر قرار آ جائے۔ اوّل تو صد ہا آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ سواہ جناب باری تعالیٰ کسی کو علم غیب نہیں برائے تسکین دو تین آیتیں لکھنی ضرور پڑیں۔ ”مَا تَلْبِسُ نَفْسٌ مَّا ذَا تَكْسِبُ هَذَا“ یعنی نہیں جانتا کوئی کہ کل کو کیا کرے گا اس آیت میں کسی کا استثناء نہیں سب کو امام ہو یا غیر امام برابر فرماتے ہیں کہ کل کی خبر نہیں رکھتے۔ ”فَلَا يَخْلُمُ مِنْ لِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبِ إِلَّا اللَّهُ“ کہہ دے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ نہیں جانتے زمین و آسمان والے غیب کو مگر اللہ جانتا ہے۔

”ما کان ویکون“ تسلیم کرنے میں مساوات لازم ہے

دوسرے اس صورت میں خدا کے علم میں اور آئمہ کے علم میں مساوات لازم آئے گی حالانکہ

جناب باری تعالیٰ سورۃ یوسف میں یوں ارشاد فرماتے ہیں: "وَلَوْ فِی كُلِّ ذِی عِلْمٍ عَلَیْمٌ" یعنی ہر علم والے سے اوپر ایک علم والا ہے اور اگر کوئی یوں کہے کہ اگر اس آیت سے استدلال کرتے ہو تو اس آیت سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ خدا سے بھی زیادہ کوئی علم والا ہے کیوں کہ اس آیت میں کلیہ فرما دیا ہے کہ خدا اور غیر خدا کی تخصیص نہیں کی تو یہ بات اول تو اہل فہم کے نزدیک قابل جواب نہیں اور جواب کے قابل بھی ہے تو اس جواب کے کہ یوں کہا جائے: ع برین فہم ودانش بیاہر گریست

کون نہیں جانتا کہ ایسے مقامات میں جناب باری تعالیٰ ہا شتاء عقلی مشکی ہوا کرتا ہے۔ "إِنَّ اللَّهَ عَلَیْ كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" سے کسی نادان کو بھی آج تک یہ شبہ نہیں پڑا کہ جب اللہ ہر چیز پر قادر ہوا تو اپنے معدوم کر دینے یا اپنے شریک کے پیدا کر دینے پر بھی قادر ہوگا۔ اتنا ہر کوئی سمجھ لیتا ہے کہ انبیاء اور اماموں کے پیدا کرنے اور معدوم کر دینے پر دونوں پر قادر ہے۔ ایسے ہی "فَوْقُ كُلِّ ذِی عِلْمٍ عَلَیْمٌ" سے جاہل سا جاہل بھی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ خدا سے بھی زیادہ کوئی عالم ہوگا۔ پھر اگر کوئی اس قسم کی گفتگو کرے تو بجز تعصب اور ہٹ دھرمی کے اور کچھ نہیں کہا جاتا۔

ایک عجیب تفسیری لطیفہ

مع ہذا ذی علم کے لفظ میں ایک اشارہ لطیف اس بات کے جواب کی طرف بھی ہے جیسے "إِنَّ اللَّهَ عَلَیْ كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" میں جو لفظ شے ہے اس میں ایک اشارہ لطیف خدا شے مذکور کے جواب کی طرف ہے، بیان اس کا یہ ہے کہ ذی علم اور علیم ہر چند بظاہر دونوں لفظ ہم معنی ہیں لیکن ذی علم میں ایک گونہ اتنی بات نکلتی ہے کہ غیر ذات ہے کیونکہ اضافت بالاتفاق تغایر پر دلالت کرتی ہے بخلاف علیم کے کہ اُس میں یہ بات نہیں۔ سو چونکہ خدا کا علم غیر ذات نہیں بالاجماع خصوصاً شیعہ کے نزدیک تو اس کو ذی علم کہنا مناسب نہیں بلکہ علیم کہنا چاہیے جیسے کہ شے اسے کہنا چاہیے جو مشیت کے تلے داخل ہو اور ذات خداوندی مشیت کے تلے داخل نہیں بلکہ معاملہ بالعکس ہے۔ القصہ جیسے خداوند کریم مشیت کے تلے داخل ہی نہیں جو اشیاء میں محدود ہو اور قدرت کے تصرفات اس پر چل سکیں، ایسے ہی خداوند کریم ذی علم میں داخل ہی نہیں جو اُس سے اوپر کوئی علیم ہوگا۔

الحاصل علم میں کوئی خدا کے ہم پلہ نہیں جیسے وہ ذات میں یکتا ہے ویسے ہی صفات میں یکتا ہے، نہ انبیاء اس کے علم میں برابر ہیں نہ امام نہ ملک نہ جن نہ خواص نہ عوام، اس عقیدہ میں شیعوں کا بھی نہ ایسا غلو ہے جیسا نصاریٰ کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بزرگی میں قدم حد سے بڑھ گیا ہے اور وہ تشبیہ

جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دی ہے اور یوں فرمایا ہے کہ تیری مثال ایسی ہے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال کہ ایک فرقہ ان کی محبت میں ہلاک ہوا اور ایک ان کے بغض میں۔ وہ تشبیہ اور تمثیل سب بجا اور درست نکل کہ خوارج نے جو بغض لیا تو روافض نے وہ محبت لی کہ جس سے حضرت امیر کو انبیاء سے تو بڑھایا ہی تھا خدا تک پہنچا دیا بلکہ انہوں نے ”لَذَيْنَا مَزِيد“ کا کام کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو فقط حضرت امیر ہی کی نسبت یہ فرمایا تھا۔ حضرات شیعہ نے آپ کے فرمانے کی ایسی تصدیق کی کہ کچھ اس سے بھی بڑھ کر دکھلادیا، خوارج سے تصدیق نبوی میں وہ کارگزاری نہیں بن پڑی تھی جو شیعہ سے بن پڑی۔ القصد خوارج سے حضرات آئمہ کے باب میں وہ تفریط نہ ہوئی جو شیعوں سے افراط ہوئی اور کسی نے سچ کہا ہے دشمن دانا بہتر از نادان دوست۔

بالفرض اگر علوم غیب آئمہ کیلئے ثابت بھی ہوں تو بد کا خدشہ دور نہیں ہوا
 اور اگر ”سلمنا“ آئمہ کو علم ماکان اور علم مایکون تھا بھی، تب جو خدشہ کہ بوجہ بد خدا کے فرمودہ میں تھا وہ بجائے خود رہے گا کیونکہ حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو افضل الائمہ اور اعلم الائمہ ہیں وہ یوں فرماتے ہیں ”فی حدیث الکافی وَأَمَّا إِلَى الصُّلُوقِ عَنْ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ لَوْلَا آيَةُ فِي كِتَابِ اللَّهِ لَاخْبَرْتُكُمْ بِمَا يَكُونُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ يُرِيدُ بِالْآيَةِ قَوْلَهُ يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُنْشِئُ“ حاصل اس روایت کا یہ ہے کہ کافی جو کلینی کی تصنیف ہے اور امالی جو شیخ صدوق کی کتاب ہے ان دونوں میں حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے جس کا یہ نکلوا ہے۔ آپ نے فرمایا اگر ایک آیت یعنی ”يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ“ نہ ہوتی تو میں تمہیں جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے سب کی خبر دے دیتا۔ یہاں تک حاصل روایت ہوا اب غور فرمائیے کہ جو دلیل ان کے عالم مایکون اور عالم ماکان ہونے کی تھی وہی دلیل اس بات کی بھی ہے کہ ان کا علم خدا کے علم سے بڑھ کر نہیں، پھر بایں ہمہ جس وجہ سے خدا کا علم قابل اعتماد نہ تھا۔ اُسی وجہ سے آئمہ کے علوم بھی قابل اطمینان نہیں، خدا کے ہدائے وہ بھی تنگ تھے اور اپنے کسی علم پر بھروسہ نہ کرتے تھے۔ اس خیال سے شاید شیعوں کو تو یہ رنج ہو کہ ہمارا دین ہی ہاتھ سے چلا، جب آئمہ کو اپنے علم پر اعتماد نہ ہو تو یہ دین جو انہیں کے علوم کا پر تو ہے کیا قابل اعتماد رہا؟

پر ہمیں یہ خوشی ہے کہ اصحاب ثلاثہ اور سوائے ان کے اور مہاجرین و انصار کی برائیاں جو شیعہ حضرات آئمہ سے روایت کرتے تھے قطع نظر اس کے کہ ان روایات کے راوی کذاب اور مفتری

تھے۔ (چنانچہ کچھ کچھ اس کا بیان ہو چکا) یونہی قابل اطمینان نہ رہے اور ماسوا اس کے اور جو کچھ ان کی کتابوں میں خلاف مذہب اہل سنت حضرات آئمہ سے مروی ہے سب ساقط الاعتبار ہو گیا۔
باقی رہی یہ بات کہ بد اگر ہوا بھی ہوگا تو کہیں قدر لکھل ہوا ہوگا تو جواب اس کا یہ ہے کہ اعتبار کے اٹھ جانے کو اتنا بھی بہت ہے، انجیل اور توریت کون سی ساری کی ساری اوّل سے آخر تک بدل گئی تھیں؟ دس پانچ جگہ کی تحریف نے سب کا اعتبار کھو دیا۔

مناقب خلفاء و صحابہ بزرگان امیر رضی اللہ عنہ و دیگر آئمہ

اور اگر کوئی یہ فرق نکالے کہ کلام اللہ میں جو کچھ اصحاب کے فضائل نازل ہوئے ہیں یا خلفاء ثلاثہ کی بزرگیوں کی طرف اشارہ ہے وہ سب قبل وفات اکثر اصحاب نازل ہو لیا تھا اور وفات سے پہلے پہلے آدمی کا کچھ اعتبار نہیں، ہاں خاتمہ کا اعتبار ہے۔ سو خدا کی تشیص میں غلطی کا احتمال ہے پر امیر المؤمنین یا اور آئمہ نے جو کچھ فرمایا ہوگا وہ سب بعد وفات کا قصہ ہے اس میں غلطی کا احتمال نہیں، اگر ان کے کلام سے ان کی بزرگی خاص کر اصحاب ثلاثہ میں سے کسی کی ثابت ہو جائے تو پھر گنجائش انکار نہیں، اس لیے آئمہ کی روایات پیش نظر کرتا ہوں، نہج البلاغہ تصنیف علامہ رضی میں جس کی مرویات شیعوں کے نزدیک متواترات میں سے ہیں، یوں منقول ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو لوگوں نے ان اصحاب کا حال پوچھا جن کا انتقال ہو چکا تھا تو آپ نے ان کے وہ اوصاف فرمائے جو بجز اولیاء کے ہو ہی نہیں سکتے۔ وہ عبارت بلاغت آمیز بحینہ منقول ہے ”كَانُوا إِذَا ذَكَرُوا اللَّهَ هَمَلَتْ أَعْيُنُهُمْ حَتَّى تَبْلُ جِبَاهُهُمْ مَا دُوا كَمَا يَمِينُ الشَّجَرُ يَوْمَ الرِّيحِ الْعَاصِفِ خَوْفًا مِنَ الْعِقَابِ وَرَجَاءً لِلثَّوَابِ“ اور پھر دوسری دفعہ ان کے حق میں فرمایا: ”كَانَ أَحَبَّ إِلَيْهِمْ لِقَاءُ اللَّهِ وَأَنَّهُمْ يَتَقَلَّبُونَ عَلَى مِثْلِ الْجَمْرِ مِنْ ذِكْرِ مَعَادِهِمْ“ ”حاصل ان دونوں عبارتوں کا یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا حال یہ تھا کہ جب خدا کا ذکر کرتے تھے ”ہنہ“ نکلتی تھیں ان کی آنکھیں یہاں تک کہ ان کے چہرے تر ہو جاتے تھے اور خدا کے ڈر اور اُمید ثواب میں ایسے لرزتے اور جھومتے تھے جیسے درخت تیز ہوا سے اور سب میں زیادہ محبت ان کو خدا کے ملنے کی تھی اور آخرت کو یاد کر کے ایسے بے چین ہو کر کروٹیں لیا کرتے تھے، جانوا انگاروں پر لوٹتے ہیں۔“ اور حضرت امام سجاد سے صحیفہ کاملہ میں بڑی طول طویل دُعا جس میں اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور ان کے لیے دُعا خیر ندرج ہے منقول ہے۔ سوساری دُعا کی نقل کی گنجائش نہیں۔ فقط دو چار لفظ لکھے دیتا ہوں۔ اس

”اللَّهُمَّ وَأَصْحَابُ مُحَمَّدٍ خَاصَّةً الْبَهَنَ خَسَنُوا الصَّحَابَةَ“ کہہ کے آ کے کچے
 ہیں تھک لیا، الا زواج والا اولاد لی اظہار کلمتہ و لائقوا الایاء والا کثناء لی تفتن
 مومہ“ اس کے بعد میں فرماتے ہیں: ”لَا تَنْسَى لَهُمُ اللَّهُمَّ مَا تَرَكُوا لَكَ وَلِہِکَ
 وَتَرْجِعُهُمْ مِنْ رِضْوَانِکَ الْیَع“ پھر اس کے بعد تابعین تک نبوت کا بیجائی اور ان کے حق میں
 بھی اسی قسم کی ذمائی فرمائیں۔ حاصل ان الفاظ کا یہ ہے ”یا اللہ اور جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم کے اصحاب ہیں جنہوں نے خوب باری کا حق ادا کیا، پیوں اور اولاد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم کے بول بالا کرنے کے لیے چھوڑ دیا اور ہاپوں اور بیٹوں سے ان کی نبوت کے جمانے کے
 لیے تھے، سوت بھولیو ان کے حق میں یا اللہ جو انہوں نے تیرے لیے اور تیرے سب سے
 چھوڑ دیا اور راضی کر دے ان کو تو اپنی رضامندی سے“ یہاں تک الفاظ مذکورہ کا مضمون ہے ان
 روایات سے تو مطلقاً صحابہ کی تعریف اور بزرگی ثابت ہوتی ہے۔

مناقب صدیق رضی اللہ عنہ

اب وہ بھی سنئے کہ جس سے خاص ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت ثابت ہو دے۔
 رضی کی نیک ابلاغت میرا جو شیعوں کے نزدیک مثل وحی آسانی ہے، روایت کیا ہے
 ”عَنْ نَجْرِ الْمُؤْمِنِينَ إِنَّ لَالِ اللَّهِ بِلَاذِ أَبِي بَكْرٍ فَلَقَدْ قَوْمٌ الْأَوْكَودَاوَى الْعَمَدِ
 وَفَقَمَ السُّنَّةَ وَخَلَفَ الْبِلَادَةَ نَقَى الْقُوبَ لَيْلِيلُ الْعَيْبِ صَاخَبَ خَيْرَهَا وَسَبَقَ
 خَيْرَهَا أَدَى إِلَى اللَّهِ طَائِفَةً وَاتَّقَاهُ بِحَقِّهِ رَحَلَ وَتَرَكَهُمْ فِي طَرَفِي مُنْشَعِبَةٍ لَا يَهْتَدِي
 فِيهَا الْعَالُ وَلَا يَسْتَعِينُ الْمُتَهْتِدِي“

حاصل اس کا یہ ہے کہ ”حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں خدا ہی کے
 واسطے ہیں شہر (یعنی جو کنگا ہو کر کے شہر خدا ہی کے تھے تو خدا ہی کے رُجے کا ظہور ہوا اور ظاہر ہے کہ
 جس کا خدا حرقی ہو وہ شخص لاجرم بڑا ہی صاحب کمال ہوگا) ابو بکر کے یعنی ابو بکر میں خدا داد خوبیاں
 ہیں۔ پس قسم ہے کہ انہوں نے سدا کر دیا کچی کو اور اصلاح کر دیا ستون کو اور قائم کر دیا سست کو پس
 پشت اٹھا انہوں نے ہمت کو، دُلیا سے پاک دامن بے عیب گئے، خوبی خلافت کی ان کو نصیب
 ہوئی، لوہے کے چل دیے خلافت کے لہجوں سے، ادا کی انہوں نے خداوند کریم کی طاعت،
 پرہیزگار رہے، حق پرہیزگاری کا چل دیے اور لوگ مختلف رستوں میں حیران ہیں کہ نہ گمراہوں کو ماہ
 لی ہے اور نہ ہدایت والوں کو اپنی ہدایت کا یقین ہے۔“ یہاں تک حاصل معنی خطبہ مرقومہ ہوا۔

علامہ رضی کی خیانت جو مفید مطلب نہ ہو سکی

اب گوش گزار ناظرین رسالہ یہ ہے کہ علامہ رضی نے ہمارے دارائی مذہب ابو بکر کے لفظ کی جگہ لفظ لالاں بدل دیا ہے تاکہ سنیوں کو گنجائش استدلال نہ رہے اور ان علامہ رضی کی کچھ عادت ہی یہ ہے مگر اتنا نہ سمجھے کہ نام کے چمکانے سے کیا فائدہ؟ حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پہلے کل تین خلیفہ تھے سو جس کی تعریف ہوگی سنیوں کا مطلب کہیں نہیں گیا۔ لہذا وہ اوصاف ایسے ہیں کہ خود ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ پکڑا دیں، خاص کر پہلا وصف اور دوسرا وصف کہ یہ دو وصف سواء ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کوئی ملائے تو اور کس پر منطبق ہوتے ہیں؟ اور کس کی خلافت میں دین میں کئی آگلی تھی؟ اور کس رکن یعنی ستون میں ارکان اسلام میں سے نقصان آگیا تھا کہ اس نے اس کی درستی کی؟

ہاں ان کی خلافت میں البتہ بسبب وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چار طرف سے شور ارتداد اٹھا، بہت لوگ ادائے زکوٰۃ سے جو رکن اسلام ہے مانع آئے، سونا ابو بکر صدیق ہوں نہ یہ فتنے دہیں، ان کی برکات اور حسن انتظام اور خوبی خلافت کے باعث جو حضرت امیر کے آنکھوں میں کبے ہوئے تھے اور شیعہ بھی جی میں تو مانتے ہی ہوں گے زبان سے کہیں یا نہ کہیں، حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے زمانے کے فساد اور فتنوں کو دیکھ دیکھ انہیں یاد کرتے ہیں اور تاسف کرتے ہیں کہ ایسے زمانے میں ایسا شخص ہونا چاہیے تھا۔

صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شجاعت اور استقامت

اور کیوں نہ ہو ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ تھے کہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جب چار طرف مرتدین کا زور ہوا تو اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم گھبرا گئے، یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے جری اور ذی ہوش اور صاحب رائے کے ہوش بھی لھکانے نہ دے، یہاں تک کہ ہمت بندھانے کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا تھا "أَجْبَازُ بَنِي الْخِزَابِ" یعنی اے عمر! کیا کفر کے زمانے میں یہ شورا شوری تھی اور اسلام میں یوں بول گئے۔ القصہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ رائے تھی کہ اپنے میں اگر لشکر آسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ بھیجا جائے تو مناسب معلوم ہوتا ہے مہارامہ بن زید منورہ لشکر مجاہدین سے خالی ہو جائے اور دشمن تاحمت کر نہیں لیکن آفرین ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شجاعت اور استقامت پر کہ

باوجود ان ہنگاموں کے ہرگز نہ گھبرائے اور یہ فرمایا کہ جس لشکر کی تیاری خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کر گئے ہوں یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کو روانہ نہ کروں اور ایسے ہی مرتدین کے قتال میں جو لشکر کے بھیجنے کا ارادہ فرمایا اور اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے اس باب میں ان کی رائے کے مخالف ہوئی تو ایسا کچھ فرمایا کہ اگر کوئی نہ جائے گا تو میں تنہا جا کر لڑوں گا اور اسی طرح زکوٰۃ سے انکار کرنے والوں کے قتال کے باب میں جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ شبہ کیا کہ وہ کلہ کر ہیں تو یہ ارشاد فرمایا کہ جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا نماز کو فرض کہے گا اور اسے فرض نہ سمجھے گا میں اس سے بے تامل لڑوں گا، واللہ! اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک بکری کا بچہ لوگ زکوٰۃ میں دیتے ہوں گے اور اب نہ دیں گے تو میں ان سے جہاد میں درلغ نہ کروں گا۔ الحاصل یہ انہیں کی شجاعت اور فہم و فراست تھی جو یہ رائے صائب و سوجھی اور دین کو تھا اور نہ دین میں وہ فتور پڑے تھے کہ خدایا حافظ تھا۔

سو جناب امیر المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے زمانے کے فسادوں اور بدعتوں کو جو لوگوں نے برپا کر رکھے تھے دیکھ دیکھ کر ان کو یاد کرتے تھے۔ چنانچہ الفاظ خطبہ مذکورہ خود گواہی دیتے ہیں اسی واسطے اکثر شارحین کج البلاغہ کی بھی رائے ہے اور کیونکر ممکن ہو کہ اور کسی پر ان اوصاف کو منطبق کر دیں، بہت کرتے تو یہ کرتے کہ کسی ایسے شخص کا احتمال پیدا کرتے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مر گیا ہوتا۔ جیسے بعضے ناانصافوں نے کیا ہے۔ سو شارحین کے ذمہ معنی کا درست کرنا بھی تو ہوتا ہے، ان اوصاف کو اس پر کیونکر منطبق کر دیتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو کچھ خوبی ظہور میں آئی وہ سب آپ کا طفیل تھا اور کسی کا اس میں کیا اجارہ؟ اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک زبان پر اس لیے نہیں لاسکتے کہ سنیوں سے اس کا کیا عذر کریں گے کہ حضرت امیر نے "ما حسنی" لفظ فلاں کہا۔ کس قدر گستاخی کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کس طرح سے ذکر کیا۔

مقام تعریف مقام تصریح ہوتا ہے نہ کہ مقام اخفاء

اور پھر کیا باعث ہوا کہ محل تعریف میں جو مقام تصریح و اعلام ہوتا ہے یہ اخفاء اور ابہام، بلکہ اسی نظر سے کہ یہ محل تعریف ہے یوں خیال میں آتا ہے کہ یہ تعریف ابو بکر ہی کی تعریف ہے اور یہ کنایہ لاجرم اصحاب کی تحریف ہے ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں تو کچھ اندیشہ ہی نہ تھا جو کسی نے یوں چھپایا اور نام نہ بتایا۔ ہاں ابو بکر کی ضد میں بایں غرض کہ یہ مدح ابو بکر صدیق رضی

اللہ عنہ کی مدح نہ ہو جائے، گو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی کی تہمت بھی اپنے ذمہ لازم آئے، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت (گو بہ جبر) باعث اخفاء نام ہو سکے، گوارا کریں اور اس طرح سے اس مدح کو مدح نبوی قرار دیں تو ممکن ہے مگر اوصاف مذکورہ اس توجیہ کو کرنے بھی دیں، آپ کے زمانے میں اول تو اقامت سنت اور تحلیف بدعت کے کیا معنی؟ جس سے چاہو پوچھ دیکھو اقامت سنت کے لفظ سے کیا متبادر ہوتا ہے؟ ہر کوئی اتنا جانتا ہے کہ اقامت کے لیے سنت کا وجود اور اس کی پستی ہونی چاہیے، نہیں تو پھر اقامت کس کی ہوگی، سو جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احکام فرماتے تھے یا خود کوئی عمل کرتے تھے تو وہ اقامت سنت نہ ہوتی تھی بلکہ اس کو خود سنت سمجھنا چاہیے۔ مع ہذا بعد مقرر ہونے احکام سنت کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کون سا ان میں فتور پڑ گیا؟ اور پڑ بھی کیا تھا تو آپ نے اس کی کیا اصلاح فرمائی؟

بہر حال کچھ کیجئے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کی طرف یہ اوصاف ڈھلتے ہیں، سو یہ کرامت حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے کہ ہر چند علامہ رضی نے ان کے کلام کو خراب کرنا چاہا مگر معنی وہی رہے اور بدنامی اپنے ذمہ لگائی، بھلا اتنا بھی خیال نہ کیا کہ تعریف کے محل میں ایسے کنایات سے کون باتیں کیا کرتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے اور بعضے شارحین کی رائے یہ ہے کہ اس خطبہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعریف ہے۔ سو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہمیں کون سے برے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر جو وہ اس تعریف کو منطبق کرتے ہیں تو اس وجہ سے کہ وہ یوں لکھتے ہیں کہ مجھے مصنف کے ہاتھ کا یعنی علامہ رضی کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ البلاء کا نسخہ مل گیا تھا۔ سو اس میں لفظ فلانے کے نیچے عمر کا نام لکھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ مجھ سے فخر بن معد مولوی ادیب شاعر نے ایسا ہی بیان کیا اور میں نے ابو جعفر یحییٰ بن زید علوی سے جو پوچھا کہ اس لفظ سے کون مراد ہے تو انہوں نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مراد ہیں، میں نے کہا کیا امیر المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس قدر ان کی تعریف کی، انہوں نے کہا ہاں۔

الغرض اس وجہ سے اور نیز اس وجہ سے کہ بعضے خطبوں میں جو حضرت عمر کے نام سے تعریف ہے تو اس کے الفاظ ان الفاظ سے بہت ملتے ہیں۔ بعضے شارحین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف ڈھلتے ہیں، پر اظہر یہی ہے کہ مراد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی ہیں لیکن جب شیعوں نے دیکھا کہ آخر یہ تعریف ہے تو کسی کی اصحاب ثلاثہ میں سے ہے تو انہوں نے کہا کہ آؤ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کی بتلاؤ، حضرت عمر آخر حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے داماد تو ہیں۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے تو بہر حال کچھ ان کا پاس لحاظ زیادہ ہی چاہیے لیکن ہمارا ادھر

بھی لکھا ہے اسی واسطے جو روایت کہ خاص ان کی تعریف میں ہے اس کو بھی ذیب رقم کرتا ہوں۔

مناقب عمر رضی اللہ عنہ بزبان امیر رضی اللہ عنہ

لاسان کتاب المواقف میں زفر بن حکیم سے روایت کرتا ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہوا تو میں نے کہا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس چلنا چاہیے اور ان کی سبب سے وہ کیا کہتے ہیں، سو میں جوان کی محفل میں آیا تو بہت لوگ ان کے منتظر بیٹھے تھے سو کچھ یونہی دیر ہوئی ہوگی جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے۔ اول تو سر مبارک جھکایا، پھر اوپر اٹھا کر یہ فرمایا:

لِلّٰهِ ذُرُّ بَاكِیَةِ عُمَرَ وَاعْمَرَاهُ قَوْمٌ اَلَا وَاذُوَا اَیْمَةِ الْعَمَمَاتِ نَقِی الثُّوبِ قَلِیْلُ الْعِیْبِ وَاعْمَرَاهُ ذُعَبٌ بِالسُّنَّةِ وَاتَّقِی الْفِتْنَةَ اَصَابَ وَاللّٰهُ اِنَّهُ الْخَطَابُ خَیْرَهَا وَنَجَی مِنْ شَرِّهَا وَلَقَدْ نَظَرَ لَهُ صَاحِبُهُ فَصَارَ عَلٰی الطَّرِیْقَةِ مَا اسْتَقَامَتْ ثُمَّ قَالَ فَقَالَ رَجُلٌ الْمَرْكَبُ فَتَشَعَّبَهُمُ الطَّرِیْقُ لَا یَلْدِی الضَّالَّ وَلَا یَسْتَقِیْنُ الْمُهْتَدِی.

اس عبارت کے معنی بھی قریب قریب پہلی ہی روایت کے ہیں اس لیے بعض شراح جن کا ذکر ہو چکا، روایت مقدم کو بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی پر محمول کرتے ہیں لیکن اوصاف کو دیکھئے تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی پر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مرقوم ہو چکا باقی اس روایت کے الفاظ اور اس روایت کے الفاظ کے تطابق سے کچھ یہ لازم نہیں آتا کہ دونوں ایک ہی آدمی کی تعریف میں ہوں۔ اگر دونوں روایتوں کو جدا جدا شخص کے لیے سمجھئے تب بھی تو کچھ محال نہیں۔ آخر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت بھی تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کی خلافت کا تتمہ تھا۔ بنیاد ساری باتوں کی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی باندھ گئے تھے، ملک شام اور ایران پر جو جہاد ہوا تو پرداز اس کا خلیفہ اول ہی ڈال گئے تھے اور جو جو لوازم خلافت تھے سب کی جزوی درست کر گئے تھے۔ چنانچہ ماہران تواریخ پر پوشیدہ نہیں، وہ موجد قوانین انتظام تھے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس کے برتنے والے۔ غرض حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک رستہ ڈال گئے ہیں کہ حضرت عمر اسی رستہ چلتے گئے اگر اس وجہ سے کہ ابو بکر صدیق کے کاموں کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پورا کیا، ان کو بھی موصوف ہا و صاف مندرجہ روایات اول سمجھیں تو چنداں بعید نہیں۔

باب عقیدہ تقیہ

عقیدہ تقیہ اور اس کے عقلی و نقلی مباحث

بہر حال اگر شیعوں کو یہی مرکز خاطر ہو کہ ہم بجز اماموں کے فرمانے کے اصحاب مٹا دیے اور اصحاب کے قیامت تک معتقد نہ ہوں گے تو یہ عذر بھی ہم نے ان کا باقی نہ رکھا۔ اس سے زیادہ کیا ہو گا جو مرقوم ہوا مگر ہم جانتے ہیں کہ ”خوئے بدرابہا نہا بسیار“ شیعہ اپنی نا انصافی سے باز نہ آئیں اور بسبب عداوت صحابہ کے جو اہل بیت کی محبت سے پہلے ان کی رگ و پے میں رچ گئی ہے عجب نہیں کہ خلاف اُمید یوں بھی کہہ اُنھیں کہ حضرات آئمہ کی بات کا بھی کیا اعتبار؟ ساری عمر انہوں نے تقیہ میں گزاری اور حق کو ناحق اور ناحق کو حق کہتے کہتے چل دیئے۔ جب امام الائمہ حضرت امیر المؤمنین بایں ہمہ شہرہ شجاعت اور ظہور کرامت کہ شیر خدا اور علی ولی اللہ ان کا لقب ہے، خلفائے مٹا دیے سے اتنا کچھ ڈرتے تھے کہ ان کے زمانے میں تو کیا اپنے زمانے میں بھی اظہار مذہب حق نہ کر سکے ہوں تو اوروں کا تو کیا ذکر؟ ہم جب تک ہرگز نہ مانیں کہ یا تو تقیہ کو کوئی باطل کر دکھلائے یا کسی ایسے کی سند بتلائے کہ وہ تقیہ نہ کرتے ہوں۔

اس لیے ناچار تقیہ کی اصل حقیقت بھی کھول کر کچھ کچھ دکھلانی پڑی، نا انصافوں سے پہلے پڑا ہے، دیکھئے کتنی چک پھیریاں کھائیں اور ہم ان کی دم کے ساتھ لگے ہوئے کہاں کہاں تک جائیں۔ مخدوم من آفرین ہے ان لوگوں کی ہوشیاری پر کہ جن کا یہ دین ساختہ پرداختہ ہے۔ ایسی نا معقول باتوں کا بجز بد اور تقیہ کے رواج ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر سینوں نے کلام اللہ کا حوالہ دیا تو بد کا عذر کیا، اماموں کا قول پیش کیا تو تقیہ سے الزام دیا اب عمارے سنی اپنا سامنہ لے کر رہ نہ جائیں تو اور کیا کریں؟ غرض جس نے اس مذہب کو تراشاد افقی نہایت ہوشیار تھا، پر کم فہم بھی ہوں تو اتنے ہوں جتنے حضرات شیعہ کہ دام و دانہ کہ ان کو کچھ تمیز نہیں، ہائے افسوس کیسے لوگ اس دام میں پھنس گئے یہ نہ سمجھا کہ دین خداوندی کو ایسی باتوں سے کیا علاقہ، یہ فقط یاروں کی گھڑی ہوئی باتیں

ہیں، نہ عبد اللہ بن سبا یہودی منافق اور اس کے شاگرد پیشہ ہوتے نہ یہ قواعد تشیع تصنیف ہوئے۔
خبر بہر حال اس جیلہ اخیر کا جواب بھی دے لیجئے، شاید خداوند کریم کسی کو ہدایت نصیب فرمائے۔

تقیہ شیعہ کی اپنی روایات کے آئینے میں

مخدوم من اول تو یہ عذر روایات مذکورہ میں بنظر غور پیش نہیں جاتا، خاص کر پہلی دو روایات
میں حضرت امام سجاد زین العباد رضی اللہ عنہ ”وعن آبائہ الکرام“ نے جو کچھ اصحاب کرام کی
تعریف فرمائی تو عین مناجات خداوندی اور دُعا کے وقت فرمائی ہے خدا سے کیا تقیہ پڑا تھا؟ اگر کسی
بنی آدم سے کلام گفتگو ہوتی تو یہ بھی احتمال ہوتا کہ شاید طرفدار ان صحابہ میں سے ہو اور اگر خدا پر بھی
صحابہ کی طرف داری کی تہمت تھی تو سنیوں کے زہے نصیب کہ ان پیشواؤں کی خدا بھی طرف داری
کرتا تھا لیکن شیعوں کو اپنا فکر چاہیے۔ مع ہذا حق مذہب سوا اس کے اور کسے کہتے ہیں کہ خدا ان کی
پشتی پر ہو سارا کلام اللہ ”إِنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ“ اور اسی قسم کی آیات سے بھرا ہوا ہے، باقی خدا کی
طرف یہ احتمال تو ہو ہی نہیں سکتا کہ خدا بھی اصحاب ثلاثہ سے ڈرے تھا۔ (نعوذ باللہ منہا)
ہاں اگر شیعہ کہہ دیں تو کچھ نہیں کیوں کہ ان کے عقائد کے موافق تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ
عنہ کا تقیہ بھی کچھ اس سے کم نہیں، شیر خدا جدا تھے۔

موت پر اختیار، غیب کا علم، بے انتہا شجاعت، پھر تقیہ کیوں؟

بائیں ہم اپنی موت اپنے اختیار میں، چنانچہ کلینی نے اس بات کو ثابت ہی کیا ہے کہ اماموں کی
موت ان کے اختیار میں ہے اور کلینی کیا سارے امامیہ اس پر متفق ہیں کہ علم ”ما کان ما یکون“
جدا تھا اتنا یقیناً جانتے تھے کہ فلاں وقت فلاں کے ہاتھ سے شہید ہوں گا، اس سے پہلے نہ اس
سے پیچھے اور تمام عمر میں اس طرح بآسائش گزاروں گا کہ باوجود کثرت انبوء دشمنان میرا کوئی
محرّم حال یا درپے جان و مال نہ ہوگا اور اگر ہوگا بھی تو میرا کچھ نقصان نہ ہوگا، پھر ان سب
اختیارات اور علوم کے بعد شجاعت تو ایسی کہ ہزار رستم بھی ہوں تو مان جائیں، ابو بکر و عمر تو کس گنتی
میں ہیں اور کرامت اس قدر کہ دیکھ کر کواٹھا کر پھینک دیں۔ خانا ابو بکر و عمر کی کیا حقیقت۔

پھر بائیں ہم ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے ڈرے، کوئی انصاف کر کے بتلائے کہ یہ تقیہ خدا کے تقیہ
سے کس بات میں کم ہے؟ علاوہ بریں وقت تعریف مذکور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا بجز نام و کام نام و نشان
باقی نہ ہا تھا اور ظاہر ہے کہ مرے ہوئے سے تو گیڈر بھی نہیں ڈرتے۔ شیر خدا علی مرتضیٰ پھر روہاہ مری

ہوئی سے دے تو قیامت آگئی، خیر کہاں تک کہنے مطلب اتنا ہے کہ دُعا کے وقت کہ جو وقت مناجات عالم السرا والخصیات ہے۔ اس وقت تقیہ کا ہونا ایسا ہی ہے جیسے کہ منافقین کا نماز پڑھنا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر، منافق بندوں کو دھوکا دیتے تھے اور در صورت تقیہ (نعوذ باللہ) حضرت امام سجاد خدا کو کیونکہ یہ تو ہم یقیناً جانتے ہیں اور شیعہ بھی کتنے ہی نادان کیوں نہ ہوں اس کے خلاف نہ کہیں گے کہ حضرت امام کی عبادت رومی دریا تھی، سو کسی سنی یا معتقد خلفاء کے استرضاء کا تو ان کی عبادت میں احتمال ہی نہیں۔ بجز اس کے کہ بخیاں جانب داری خلفاء جو خدا سے ظہور میں آئی یہ خیال دل میں ہو کہ ایسا نہ ہو کہ خداوند کریم بہ سبب خلفاء اور بے اعتقادی صحابہ سے اگر چہ حق ہی ہونا راض نہ ہو جائے۔ ”نعوذ باللہ من هذه الخرافات“ جناب من ایسی محفل میں تقیہ کا احتمال کرنا جس پہلو سے پلٹ کر دیکھو دین کو برہم درہم کیے دیتا ہے یا خداوند کریم کی طرف برائی عائد ہوگی۔ ”تَعَالَى اللَّهُ عَنْ ذَالِكْ عَلُوا كَبِيرًا ط“ یا آئمہ کی طرف..... ”نعوذ باللہ منہ کثیرا“ بہر حال تقیہ کے پردہ میں یہ دشمنانِ اہلبیت آئمہ کو کیا کیا کچھ نہیں کہہ لیتے واقعی بہت خوبصورتی سے جھو کرتے ہیں۔

حضرت امیر نے بعد وفات صدیق کے

مناقب حلفاً بیان کیے اس وقت خوف بھی نہ تھا

بھلا امام سجاد تو ستم دیدہ اور ظلم کشیدہ دشمنانِ سفاک تھے۔ اس پر نہ وہ شجاعت تھی جو حضرت امیر میں تھی نہ وہ کرامت تھی جو حضرت امیر میں تھی۔ اگر ان کے حق میں کوئی تقیہ کا دعویٰ کرے تو شاید کوئی بیوقوف فی الجملہ مان بھی جائے لیکن ستم تو یہ ہے کہ حضرت امیر کی نسبت بایں ہمہ زور و شجاعت و باوجود یکتائے علم و کرامت و استمرارِ صحت و سلامت کہ زمانِ خلفاء ثلاثہ سے لے کر اپنی خلافت تک بے اندیشہ گزاری اپنی نیند سوئے اپنی بھوک کھایا یہ احتمال کیا جائے کہ انہوں نے ایسے دس جھوٹ پر قسم کھائی کہ ان کی بدولت آسمان گر جائے تو عجب نہیں اور زمین پھٹ جائے تو دور نہیں، کجایہ اوصاف جلیلہ اور محامد علیہ کہ لگ بھگ انبیاء کے اوصاف اور لوازم کے ہیں کجا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ بزمِ شیعہ اہلبیت سے بڑھ کر کہ اس کا برا کہنا مستحب بھی نہ ہو اور ان کا حبرِ افرض بلکہ اس سے بڑھ کر کہا جائے تو عجب نہیں کیونکہ موافق ”مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَفْعَالِهَا“ کے ایسے ویسے لوگوں کے فرضوں کا ثواب دس گنا ہو تو اس لیے کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو ایک نیکی لے کر آئے گا تو اس کو وہ چند ثواب ملے گا۔

اور لعن شیخین اس قدر مقبول ہے کہ ان کی کتابوں میں یہ بات مرقوم ہے کہ ابو بکر صدیق اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر برص لعنت کرنی ستر نیکوں کے برابر ہے اور پھر طرفہ یہ ہے کہ ابلیس اور نمرود اور شداد اور فرعون اور ابو جہل اور اُمیہ بن خلف اور ابولہب وغیرہم دشمنانِ خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لعن اور تمرا ماشہ بھرنکی کے برابر نہیں، کسی نے ایسوں ہی کی تعریف میں کہا ہے۔ ”بریں عقل و دانش بہاید گریست“ بالجلد ایسے لوگوں کی تعریف جو ابلیس اور نمرود اور فرعون اور ابو جہل وغیرہم سے بھی بڑھ کر ہوں اور پھر تعریف بھی اس قدر کہ دس بڑے بڑے کمالات بقسم بیان کیے جائیں، ایسے کاٹلوں سے جن کا نام حضرت علی شیر خدا جن کے اوصاف اوپر مذکور ہو چکے جب ہی ہو سکتی ہے کہ کافر ہونے کے یہ متقی ہوں کہ خدا کا بڑا ہی مطیع و فرمانبردار ہو، سوا اگر کفر کے یہی معنی ہیں تو کون مردود برامانا ہے، ایسی گالیاں تو جتنی چاہیں شیعہ دے لیں، بجز تسلیم اس طرف سے ان شاء اللہ جواب ہی نہ ہوگا۔

بیت: بدم گفتی و خور ستم عفاک اللہ کو گفتی جواب تلخ می نہد لب لعل شکر خارا
سبحان اللہ! کس کس بیچ سے حضراتِ ائمہ کی معصومیت بلکہ بزرگی کو بیٹہ لگاتے ہیں۔ خوارج سے شیعہ (ہم جانیں) کچھ دوا بگشت زیادہ ہی ہوں گے پراتنا ہی کہ شیعہ سنوار کر چھان چکھوڑ کر عیب لگاتے ہیں اور خوارج اناذیوں کی طرح بے سوچے سمجھے گنوار کا سالٹھ مار بیٹھتے ہیں۔

حکایاتِ تقیہ کی روایات کتبِ شیعہ، پر زور تکذیب کرتی ہیں

القصد یہ عذر پوچھ عاقلوں کے سامنے کہ آئمہ معصومین اصحابِ ثلاثہ یا اور مہاجرین اور انصار کی تعریف بعدِ تقیہ کیا کرتے تھے قطع نظر اس کے کہ عقل کے نزدیک یہ عذر لا طائل گزشتہ کے نرخ بکتا ہے، یوں بھی تو قابلِ تمسک نہیں کہ جن بزرگوں کی طرف تقیہ کی تہمت کرتے ہیں ان ہی بزرگوں کے افسانے جو ان کی محبر کتابوں میں منقول ہیں بآواز بلند تقیہ کی تکذیب کرتی ہیں۔ ہر چند سب کا اس رسالہ میں صحت کرنا ممکن نہیں لیکن ”مثنیٰ نمونہ خردارے“ دو تین روایتیں جو امامِ ائمہ حضرت امیر کے اظہارِ حق بعدِ صدقِ حال پر دلالت کریں درج کی جاتی ہیں تاکہ بحکم متابعت بزرگانِ اوروں کی بزرگی اور خوبی بھی کذبِ لہو دیا سے پاک و صاف ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ جب شمسِ ائمہ کا حال یہ ہے کہ تقیہ میں جو قولِ شیعان پر منجملہ فرائض ہی تھا اس قدر تفسیر وار تھے اور احکام تو کیا ذکر؟ تو اور آئسکا کیا حال ہوگا؟

امیر کا حکم کہ سچائی اختیار کرو خواہ کچھ بھی ہو

نہج البلاغت میں جو شیعوں کے نزدیک اصح الکتاب اور متواتر ہے۔ حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ

عنه کا یہ قول تقیہ کے ابطال میں دلیل قوی اور برہان کامل ہے "عَلَامَةُ الْإِيمَانِ إِفْشَارُكَ
الْبَصْدَقِ حَيْثُ يَنْصُرُكَ عَلَى الْكُذْبِ حَيْثُ يَنْفَعُكَ" یعنی ایمان کی نشانی یہ ہے کہ
جہاں سچ بولنا ضرر کرتا ہو ایسی جگہ سچ بولنے کو پسند رکھے۔ جھوٹ بولنے پر جو نفع دیتا ہو، اس روایت
سے صاف لگتا ہے کہ جو تقیہ کرے اس میں ایمان نہیں کیونکہ علامت ایمان کی یہ ہے کہ جان و مال
کا ضرر کو ہو جائے پر جھوٹی بات زبان پر نہ لائے۔

امام کی شجاعت اور اشتیاق جنت

دوسری روایت بھی نہج البلاغت ہی کی ہے: قَالَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ إِنِّي وَاللَّهِ لَوْ لَقِيتُهُمْ
وَاحِدًا وَهُمْ طِلَاعُ الْأَرْضِ كُلِّهَا مَا بَالَيْتُ وَلَا اسْتَوْحَشْتُ وَإِنِّي مِنْ خَلَائِبِهِمُ الَّتِي
هُمْ فِيهَا وَالْهَدَى الْإِلَهِي أَنَا عَلَيْهِ لَعَلِّي بَصِيرَةٌ مِنْ نَفْسِي وَيَقِينٌ مِنْ رَبِّي وَإِنِّي إِلَى
لِقَاءِ اللَّهِ وَلِلْحُسْنِ نَوَاقِبٍ لَمُنْتَظَرٍ رَاجٍ.

مطلب یہ ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں بیشک قسم
اللہ کی اگر ان سے تنہا مقابل ہوں اور وہ تمام زمین کو گھیرے ہوئے ہوں تو میں ہرگز کچھ پروا نہ
کروں اور نہ گھبراؤں اور مجھے ان کی گمراہی اور اپنی ہدایت کا حال عیاں ہے اور اس بات کا خدا داد
یقین ہے اور میں خدا کے ملنے یعنی مرنے اور اس کے ثواب کے انتظار اور امید میں ہوں۔ اب غور
فرمائیے جو شخص تنہا اتنے دشمنوں سے بھی نہ ڈرے جو تمام روئے زمین کو ڈھک لیں اور ڈرنا تو
درکنار پروا اور گھبراہٹ تک نہ ہو بلکہ مرنے اور جنت کا مشاق ہو، ایسے لوگوں سے تقیہ کے ہونے
کے کیا معنی؟ ایسے لوگ بھی اگر ڈرنے لگے تو قیامت آگئی۔ مع ہذا تقیہ بغیر خوف کے تو ہوتا ہی نہیں
اگر مرجانے کا خوف ہے تو وہ اماموں کو ہوتا ہی نہیں کیونکہ اول تو ان کی موت ان کے اختیار میں
ہے۔ چنانچہ کلینی نے اس مسئلہ کو ثابت کیا ہے اور تمام امامیہ کا اس پر اتفاق ہے پھر وہ کسی سے کیا
ڈریں اور کیوں ڈریں؟ دوسرے علم وقائع گزشتہ اور نیز وقائع آئندہ سب ان کو متحضر، خود اپنے
مرنے کا حال اور کیفیت تفصیل و تشریح معلوم ہوتی ہے، اس وقت سے پہلے ڈر ہو ہی نہیں سکتا۔

انبیاء اور آئمہ کا منصب صبر و تحمل اور حق گوئی ہے

اور اگر خوف مال یا آبرو یا بدگوئی خلافت کا اندیشہ یا کسی قسم کی تکلیف کا خوف ہے تو انبیاء اور
آئمہ کا کام یہی ہے کہ تکلیفیں اٹھایا کریں اور تحمل کیا کریں اور دشمنوں کی قوت و شوکت اور اپنی بے

کسی اور بے زری کا لحاظ نہ کریں اور یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود سے نہ چپے اور آگ میں گرنا قبول کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون سے نہ ڈرے اور آخر نوبت جلا وطن ہونے کی پہنچی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے نو سو برس تک کیا کیا، مصیبتیں اٹھائیں، شیعوں نے بھی سنی ہوں گی۔ حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا علیہم السلام کا مقتول ہونا شہرہ آفاق ہے۔ حضرات شیعہ ہی انصاف کر کے فرمائیں کہ ان کے مقتول ہونے کا باعث سوا کلمۃ الحق اور حق گوئی کے اور کیا تھا۔ عزت چھوڑ یہاں تو جان پر کھیل گئے۔ حضرت امیر جو انبیاء سے افضل نہیں تو مساوات میں تو شیعوں کے نزدیک کلام ہی نہیں آبرو تک کا خدا سے دریغ کریں۔

تقیہ اگر فرض تھا تو امام حسین کی شہادت معصیت ہوگی

اور خود خلف رشید حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سید الشہداء شہید کربلا رضی اللہ تعالیٰ عنہ جان نازنین کو نثارِ راہِ خدا کر گئے۔ اگر تقیہ سنت حضرت علی رضی اللہ عنہ بلکہ فرض خداوندی تھا تو اس سے زیادہ اور کونسا موقع تقیہ کا ہوگا کہ تیس ہزار فوج جرار برسرِ کار زار، زن و فرزند ہمراہ، تنگ و ناموس کا اندیشہ، نہ کھانا نہ دانا، نہ پانی کا سامان نہ آڑ کے لیے کوئی مکان اور اس طرف سے فقط اتنی طلبگاری کہ بیعت یزید قبول کر لو پھر جہاں جی چاہے چل دو، بڑے حیف کی بات ہے جان و مال سب برباد محض، زن و فرزند پر جو کچھ گزری سب جانتے ہیں، پھر تسہ خاتمہ ہوا تو یوں ہوا کہ فرض مفترض معمول بہ الہی بیت پر عمل نہ کیا، بے گناہوں کو مفت کے مظلمہ میں گرفتار کیا، ان کا وبال (نعوذ باللہ) اپنی گردن پر لیا (نعوذ باللہ) اگر یہی تقیہ ہے تو ہم جانتے ہیں کہ یہ دوست بدتر از ہزار دشمن، بہ نسبت حضرت امام الشہداء نعوذ باللہ عقیدہ ”خسر الدنیا والآخرة“ رکھتے ہیں، واللہ کہ ان الفاظ کے کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے مگر خداوند عالم الغیب والمشاہدہ خوب جانتا ہے میں تقیہ سے نہیں کہتا کہ یہ سب رد و کد بدولت حضرات مدعیان دروغ فرقہ سکی بھیعہ کے ہے ورنہ یہ خاکپائے غلامان الہی بیت ان حضرات کو اکابر اولیاء اللہ اور عمدہ صدیقین اور افسر مخلصین اور خلاصہ محسنین اور زبدہ متقین اور سرِ حلقہ محبوبین سمجھتا ہے، حاشا دکلا جو بطور شیعہ دعویٰ دروغ ہو۔

امام کا اپنی کرامت سے حضرت عمر کو مرعوب کر دینا

تیسری روایت راوندی کی کہ مقتداء شیعہ اور شارح نفع البلاغت ہے۔ کتاب جرائح الجوائح میں سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتا ہے۔

إِنَّ عَلِيًّا بَلَغَهُ عَنْ عُمَرَ أَنَّهُ ذَكَرَ شَيْعَتَهُ فَاسْتَقْبَلَهُ لِيُبْعِضَ طُرُقَاتِ الْبَنَاتَيْنِ
الْمَدِينَةِ وَفِي يَدِ عَلِيٍّ قَوْسٌ فَقَالَ يَا عُمَرُ بَلِّغْنِي عَنْكَ ذِكْرَكَ لِشَيْعَتِي فَقَالَ إِرْبَعُ
عَلَى صَلَافِكَ فَقَالَ عَلِيٌّ إِنَّكَ لَهْنَانَا ثُمَّ رَمَى بِالْقَوْسِ عَلَى الْأَرْضِ فَإِذَا هِيَ
لُعْبَانٌ كَالْبَعِيرِ فَأَعْرَأَ فَاهُ وَقَدْ أَقْبَلَ نَحْوُ عُمَرَ لِنُبْلَعَهُ فَقَالَ عُمَرُ اللَّهُ اللَّهُ يَا أَبَا
الْحَسَنِ لَا تُعْذِثْ بَعْلَهَا فِي شَيْءٍ وَجَعَلَ يَتَضَرَّعُ إِلَيْهِ لَضَرْبِ يَدِهِ إِلَى الثُّغْبَانِ
فَعَادَتِ الْقَوْمُ كَمَا كَانَتْ فَمَضَى عُمَرُ إِلَى بَيْتِهِ. الخ

یہ روایت بہت بڑی ہے کہاں تک نقل کروں اتنے الفاظ بھی بہت ہیں، پر حاصل معنی۔ اس کا
بیان کیے دیتا ہوں۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ”حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ
عنہ کو یوں خبر پہنچی تھی کہ عمر کچھ شیعہ علی کو برا کہتے ہیں، سو اتفاقات سے بعض مدینہ کے باغوں کی راہ
میں ان کے سامنے آ گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے عمر! مجھے یوں خبر پہنچی ہے کہ تو
میرے شیعہ کو برا کہتا ہے۔ عمر نے کہا اے میاں اپنی خیر مناؤ۔ حضرت علی نے فرمایا تم اتنے ہو گئے،
پھر کمان کو جو زمین پر ڈالا تو ایک اڑدھا تھا اونٹ کے برابر نہ کھولے ہوئے حضرت عمر کی طرف
نگلنے کے ارادہ سے دوڑا۔ عمر نے کہا خدا کے واسطے خدا کے واسطے، اے ابوالحسن پھر اس کے بعد
ایسی بات کہی نہ کہوں گا، اور گلے گڑ گڑانے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس اڑدھا کی طرف
جو ہاتھ لپکایا، پھر وہی کمان کی کمان ہو گئی، خیر عمر اپنے گھر چلے گئے۔“ اس روایت کو دیکھئے تو تقیہ کی
تو گردن ہی توڑ دی۔ خلیفوں اور اصحاب میں بڑی دھوم دھام حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تھی
اور سنی بھی انہیں کی شوکت اور دبدبہ کو بہت زبان پر لایا کرتے ہیں، سو جب ان کا یہ حال ہو کہ ایک
کرشمے سے ان کو ڈرا دیا اور بچارے تو فقط اشارہ کے تھے۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضرت امیر کا سکوت جو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ
عنہما کے افعال اور حرکات پر تھا۔ یہاں تک کہ غصب فدک دیکھا کئے، اپنی بیٹی کا نکاح ان سے
کر دیا اور ان سے بیعت کر لی اور ان کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے، یہ سب بوجہ حقانیت تھا، نہ بوجہ
تقیہ ورنہ اس زور اور قدرت اور اس کرامت کا آدمی اور کون تھا جو ان سے اندیشہ یا ہراس رکھتا اور
اگر بالفرض یہ زور اور بل اور یہ قدرت خدا داد کسی میں ہوتی بھی تب غصب دختر طاہرہ مطہرہ تو ہرگز
گوارا نہ ہوتا۔ اہل ہند جو تمام دلائیوں کے لوگوں کے نامردہ پن میں امام ہیں ان میں بھگلی اور
ہمار بھی اس سہولت سے بیٹی نہیں دیتا جس طرح حضرت امیر نے اپنی دختر مطہرہ کو حضرت عمر کے

حوالے کر دیا۔ آپ بھی دیکھتے رہے اور صاحبزادی بھی، پھر صاحبزادوں میں بھی ایک وہ ہے کہ جنہوں نے تیس ہزار فوج جرار کا مقابلہ کیا حالانکہ وہ زمانہ ضعیفی اور قہل کا تھا اور بہن کے کلام کے وقت عین شباب تھا اور تسپر تماشا یہ ہے کہ ہنگامہ کر بلا میں جو دشمنان سفاک نے حرم محترم اور دہان اہلیت کی طرف جانے کا ارادہ کیا تو کیا کچھ غضب اور جوش آیا، شیعوں کو تو شہادت نامہ کر بلا اور ہی ہوگا۔ لکھنے کی کیا حاجت۔

تقیہ از روئے عقل و نقل و عرف

بالجملہ روایات شیعہ خود تقیہ کی جڑ اکھاڑتی ہیں، فقط سنیوں ہی کا قصور نہیں اور اب آگے اور لکھا ہمیں ضرور نہیں کہ بحمد اللہ عاقلان منصف کے لیے یہ بھی بہت ہے مگر بنظر اتمام حجت اور حریدہ فوج یوں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عقل اور نقل اور عرف سے بھی اس بات میں استثناء کیجئے تاکہ فیض کی آنکھیں تو کھلیں کہ ہم کس خواب خرگوش میں مدہوش ہیں۔ جناب من عقل کی رو سے دیکھئے پیغمبروں اور اماموں کا تقیہ ایسا ہے جیسے کسی معلم کو لڑکوں کے پڑھانے اور تادیب کے لیے نوکر رکھا جائے اور وہ معلم تعلیم اور تادیب تو درکنار لڑکوں کے ہم رنگ ہو کر گیند بلا یا گلی ڈھرا کھیلنے لگے پیغمبروں اور اماموں کے لیے خدا کی طرف سے تقیہ کا فرض ہونا ایسا ہی ہے جیسے معلم اور مودب کو اہل کتب یہ حکم دے کہ پڑھائیے، پرچائیے تمہارے اور لڑکوں کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلے۔ خبردار! ایسا نہ کرنا اور ان کی تادیب میں نصیر نہ ہو لیکن جس طرح سے لڑکے چاہیں سرمواس میں تفاوت نہ ہونے ان کو ڈرائیو، نہ ماریو نہ اپنی طرف سے کچھ کہو بلکہ وہ کھیلیں تو ان کے ساتھ تم بھی کھیلنے لگیو۔

اب اہل انصاف انصاف فرمائیں کہ یہ بات کچھ عقل کی ہے اور اس میں اور پیغمبروں اور اماموں کے تقیہ میں کیا فرق ہے؟ اور پھر تقیہ بھی اتنا کچھ کہ دین برباد ہو گیا تمام امت محمدی گمراہ ہو گئی، تسپر اپنا ننگ و ناموس جاتا رہا، پرچائیے زبان سے کلمہ الحق نکلے، اس کی نوبت نہ آئی۔ کھل کھیلنا تو کہا اور پھر ہاں ہم حضرات شیعہ معتقد اس بات کے کہ دین شیعہ عین مطابق عقل ہے اور کیونکر نہ کہیں خداوند کریم تو ان کے اعتقاد کے موافق ہاں ہم خداوندی اور احکم الحاکمین ہونے کے محکوم عقل ہے اور عقل کی اطاعت اس کے ذمہ فرض ہے۔ وہ سبحان اللہ کیا خدا کی قدر دانی ہے۔ جب خدا کے ساتھ یہ معاملہ ہے تو کسی کو کیا شکایت، اوّل تو خدا کو محکوم بتایا اور اس کے احکم الحاکمین ہونے سے جو کلام اللہ میں معینہ انہیں الفاظ سے مذکور ہے ہاتھ اٹھایا، دوسرے ایسا خلاف عقل حکم اس کے نام لگا یا کہ جس سے بزم خود (لعود باللہ) خدا کو تنہا اور تارک فرض ٹھہرایا۔ ”تعالی اللہ عن ہلہ العیوب علوا کبیرا“

تقیہ از روئے کلام اللہ

اور از روئے نقلِ تقیہ کا حال پوچھئے تو سینکڑوں آیتیں ایسے تقیہ کی ہدائی پر (جیسے حضراتِ شیعہ آپ کرتے ہیں اور اماموں کے ذمہ لگاتے ہیں) دلالت کرتی ہیں بلکہ اُلٹے تقیہ نہ کرنے کی خوبیاں کلام اللہ سے جتنی چاہو نکال لو۔ یہاں تک کہ جان کے جانے کے وقت بھی تقیہ کے نہ کرنے ہی کی بہبودِ کلام اللہ سے ثابت ہوتی ہے۔ کلام اللہ کوئی مفادِ چیز نہیں جو نہ ملے۔ اگر شیعوں کو یہ وجہ یاد نہ ہونے کلام اللہ کے میری طرف جملِ احتمال ہو تو مطابق کر دیکھیں کہ کلام اللہ میں سورہ بقرہ میں دوسرے سپارہ میں نصف سے کچھ بعد یہ آیت ہے کہ نہیں؟

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الْبَاقِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ط مَسْنُومُ
الْبَاقِیَّ وَالْعَصْرَاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالْبَاقِیْنَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصَرَ اللَّهُ
ط أَلَا إِنَّ نَصَرَ اللَّهِ قَرِیْبٌ ۝

”یعنی کیا تم کو اے مسلمانو! یہ گمان ہوگا کہ تم جنت میں یونہی چلے جاؤ اور تم پر وہ حالت نہ گزری ہو جو پہلوں پر گزری کہ ان کو شدت کا خوف اور تکلیفیں پیش آئیں اور جہزِ جزائے گئے یہاں تک کہ رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان دار تھے، گھبرا کر یوں کہنے لگے کہ خدا کی مدد کب ہوگی، سو خبردار رہو اللہ کی مدد قریب ہی لگی ہوئی ہے۔“

اور اس آیت کو بھی دیکھ لیں۔ سورہ آل عمران میں چوتھے سپارہ میں مابین رُلج اور نصف کے یہ آیت ہے: وَكَانَ مِنْ نَبِيِّ قَعْلٍ مَعَهُ رِبِیُّونَ كَثِیْرٌ لَمَّا وَفَّوْا لِمَا أَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ
اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَغْنَوْا ط وَاللَّهُ یُحِبُّ الضَّعِیْفِیْنَ ۝

”یعنی بہت سے نبی ہوئے ہیں جس کے ساتھ میں ہو کر بہت سے اللہ والے دشمنوں سے لڑے ہیں، سو جہادوں میں جو تکلیفیں ان کو پیش آئیں تو ان تکلیفوں کے سبب وہ کچھ ڈھیلے ہوئے نہ ست ہوئے نہ کفار سے کچھ دُوب لگے اور اللہ صابروں سے محبت رکھے ہے۔“

تقیہ جنت سے محرومی کا سبب ہے

ان دونوں آیتوں کو خدا را بنظرِ غرور اور چشمِ انصاف دیکھئے اور بے روی دریا فرمائیے کہ مرضی جنابِ ہاری کس طرف ہے۔ در صورت یہ کہ عوام مؤمنین کے حق میں یوں کہتا ہے تو امام اور خطیب تو امام اور خطیب ہیں وہ تو دین کی باتوں میں عوام سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ پہلی آیت کی رو سے تو

تقیہ کی صورت میں جنت سے اُمید ہی منقطع ہے۔ پھر اس سے زیادہ اور تقیہ کو کیوں وضع کریں گے باقی سینوں کی بے بسی اور بے کسی کا عذر ہو تو جناب ہاری تعالیٰ نے پہلے اس کا دفعیہ فرما دیا ہے ”اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيبٌ“ یعنی گھبراؤ مت ہماری مدد پاس ہی لگی ہوئی ہے۔

خوف کفار سے ست ہونا ممنوع ہوا تقیہ تو دور کی بات ہے

اور دوسری آیت میں تقیہ تو تقیہ کفار کے خوف سے ست ہو جانے اور ضعیف ہو جانے پر مجبور کرتے ہیں کیونکہ تقیہ کی برائی کی طرف تو اشارہ ”وَمَا اسْتَعَاذُوا“ میں آگیا تھا اس لیے کہ اس کے معنی یہی ہیں کہ اُن لوگوں نے کفار کے آگے باوجود تکلیفات کے پھر ظاہر کی چال چلوسی نہ کی اور یہی تقیہ ہے اور کیا تقیہ کے سرسنگ ہیں، پھر جو دو باتیں اور فرمائیں کہ نہ ست ہوئے نہ ضعیف ہوئے تقیہ سے دو نمبر اور اُدھر کو کھینچا ہے تاکہ اس سے دور رہیں اور اس میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ سبحان اللہ خدا بھی کیا منتظم اور مدبر ہے، یہ وہی قصہ ہے ”برکش گیر تابہ چ راضی شود“ لیکن آفرین ہے شیعوں کی بھی ہٹ دھرمی پر کہ تپ پر بھی راضی نہیں ہوتے۔ موت تو درکنار اور کیوں راضی ہوں جہاد کو کیوں سر دھریں اور جہاد تو جب ہوگا جب ہوگا۔ سینوں کے گمروں کے پلاؤ اور قورے کیوں ہاتھ سے کھوئے اور کیوں ان کے تیر ملامت کا نشانہ ہو کر اپنے نصیبوں کو روئے جنت گئی بلائے گئی۔

نقد رانیہ گذاشتن کار خرد منداں نیست

اور میں نے جو یہ عرض کیا کہ اس آیت میں تقیہ وغیرہ سے روکتے ہیں۔ ہر چند اہل فہم کے نزدیک محتاج بیان نہیں لیکن باندیشہ خوش فہمی شیعہ گزارش ہی لازم ہے۔ اس آیت کے سیاق و سباق سے واضح ہے جسے تامل ہو دیکھ لو کہ جناب ہاری تعالیٰ اس اُمت کے لوگوں کو خاص کر صحابہ کو پہلی اُمتوں کے حال سنا کر ست ہونے اور ضعیف ہونے اور تقیہ کرنے سے روکتے ہیں، اب اہل انصاف سے التماس ہے کہ باوجود ان تنبیہات کے اگر کوئی نہ مانے اس کو کیا کہئے وہ ناکارہ لوگوں میں سے ہوگا یا عمدہ اور عمدہ بھی اس قدر کہ مستحق ثواب ہو، جیسا اہل تقیہ فرماتے ہیں۔

تقیہ سبب عتاب ہے نہ کہ موجب ثواب

حق تو یوں ہے کہ تقیہ والے مورد عتاب ہیں۔ چنانچہ ان آیات سے ظاہر و باہر ہے ثواب کجا اور تقیہ کر کے منصب پیغمبری اور مرجہ امامت پر مامور رہنا تو درکنار ویسے بھی خیر نہیں، خاص کر ایسے تقیہ کے ساتھ کہ مذہم شیعہ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ائمہ کرتے تھے۔ صحابہ معلومین

کے ساتھ کہ جو ان کے عقیدے کے موافق (نعوذ باللہ) ابلیس سے بھی بڑھ کر تھے۔ چنانچہ اس کی طرف اشارہ ہو چکا، ہمیشہ ہم نوالہ اور ہم پیالہ رہے اور ہمیشہ ان کی رضا جوئی میں عمر عزیز کو بسر کیا، خداوند کریم تو ارشاد فرمائے ”وَلْيَنْتَبِهُ أَهْوَاءَ هُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ“ یعنی ”اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اگر تو بعد حق و ناحق کے معلوم کرنے کے ان کی خواہشوں کے موافق کچھ بھی کرے گا تو تیرا کہیں ٹھکانا نہیں، نہ تیرا کوئی دوست تجھے چھڑا سکے گا نہ کوئی تیری مدد کرنے والا ہے جو خدا سے بچالے گا۔“ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہاں ہمہ ممانعت و تہدید پھر بھی ان کی دلجوئی سے باز نہ آئے۔ خدا کی خواہش پر ان کی خواہش کو مقدم رکھا۔

انبیاء خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے

القسمہ خداوند کریم تو عوام تک کو تقیہ کے کرنے سے روکے اور شیعہ خواص کو بھی تقیہ کرنے والا اور وہ بھی دائم التقیہ سمجھیں حالانکہ خاص امانت رسالت کے پہنچانے والوں کو (جو شیعوں کے نزدیک بھی پیغمبر اور امام ہیں) جناب باری علامت ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی سے ڈرتے اور اللہ کے پیام کے پہنچانے میں دریغ نہیں کرتے۔ سورہ احزاب کے پانچویں رکوع میں یہ آیت موجود ہے انبیاء کے حق میں فرماتے ہیں: ”الَّذِينَ يَتْلُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ“ یعنی انبیاء کے اوصاف یہ ہیں پہنچاتے ہیں اللہ کے پیام اور اسی سے ڈرتے ہیں اور سوا اللہ کے اور کسی سے نہیں ڈرتے اس آیت کو دیکھئے کہ فقط انبیاء کا نہ ڈرنا ہی اس میں نہیں جو کوئی شیعہ یوں کہنے لگے کہ تقیہ دین کے چھپانے کو کہتے ہیں کیا ضرور ہے کہ ڈر ہی کے سبب چھپاتے ہوں بلکہ کچھ اور مصلحت ہو۔ سو یہ احتمال اول تو ان کا جی جانتا ہے کہ کیسا نامعقول ہے پھر بایں ہمہ شاید کوئی اس بات میں کچھ زبان زوری بھی کرتا لیکن جناب باری تعالیٰ تو علام الغیوب ہے، شیعوں کی ہٹ دھرمی تو پہلے ہی سے جانتا تھا، اسی لیے پہلے ہی یہ پتھر لگا دی۔ ”الَّذِينَ يَتْلُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ“

خاتم الانبیاء کو تبلیغ کا تاکید امر

پھر انبیاء میں سے بھی خاص کر جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو زرا خاص کر حکم جدا گانہ سنایا تاکہ مزید تاکید ہو اور کوئی کسی قسم کی سستی اور مدہدست ظہور میں نہ آجائے۔ چنانچہ سورہ حجر میں فرماتے ہیں ”فَاذْهَبْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاعْبُدْهُ وَاعْبُدْ غَيْرَ الْمُشْرِكِينَ“ یعنی ”سنادے کھول کر دین کی بات اور مشرکین کا کچھ دھیان نہ کر“ اور پھر اس کے آگے برابر تاکید پر تاکید اسی بات کی چلی جاتی

ہے کہ کہنے میں قصور نہ کر جسے شک ہو دیکھ لے اور پھر ہاں ہمہ سورۃ احزاب ہی میں یوں فرماتے ہیں: "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ
الْآخِرَ" حاصل یہ ہے "تمہارے حق میں رسول اللہ ہی کا اقتداء انہیں کی چال ڈھال اور راہ روش پر
رہنا اچھا ہے جسے اللہ کی اور پچھلے دن کی امید ہے۔" اس آیت نے ساری امت کے ذمہ یہ بات
واجب کر دی جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق بات کے کہنے اور اظہار دین میں دریغ نہیں کرتے
تھے تم بھی نہ کرو، پھر خاص کر آئمہ تو آئمہ ہیں وہ تو تبلیغ دین اور اظہار حق ہی کے لیے بھیجے گئے ہیں
بلکہ شیعوں کے نزدیک رسولوں سے زیادہ نہیں تو برادری میں تو حرف ہی نہیں اور برادری نہ تھا جب
ایک کام پر مامور ہوئے تو اس میں اوروں سے تو زیادہ ہی کنج و کاؤ چاہیے۔

انبیاء اور ان کے نائب، سب کا مقصد انذار و تبشیر ہے

مع ہذا خداوند کریم فرماتے ہیں "وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ" یعنی
"ہم نہیں بھیجتے مرسلین کو مگر فقط بشارت دینے اور ڈرانے کے لیے" اور مرسلین کلام اللہ کی اصطلاح
کے موافق فقط پیغمبر ہی کو نہیں کہتے بلکہ جو خدا کے احکام پہنچائے پیغمبر ہو یا نائب پیغمبر، چنانچہ صمد
لینین میں جو "إِنَّا إِلَيْكُمْ مُّرْسَلُونَ" ہے اس لیے نائبان حضرت عیسیٰ مراد ہیں حالانکہ وہ نبی نہ
تھے نائب نبی تھے اور امام کے تو خود بھی معنی ہیں۔ شیعوں کے نزدیک کہ نائب نبی ہو، باقی کوئی
یوں کہے کہ حضرت کے یاروں کو جو رسول کہا تو ہاں معنی کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھیجے
ہوئے تھے اور آیت "وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ" میں وہ مراد ہیں جو خدا کے بھیجے ہوئے ہوں تو
اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نائبوں کے بھیجے کو بھی خداوند کریم نے اپنی طرف
نسبت کیا اور یوں فرمایا ہے "إِذْ أَوْسَلْنَا إِلَيْهِمُ النَّبِيَّ" یعنی ہم نے بھیجا اور یوں نہیں فرمایا کہ عیسیٰ
علیہ السلام نے بھیجا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نائبوں کو خداوند کریم اپنا بھیجا ہوا مرسل کہے
ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب تو اس کے بھیجے ہوئے کیوں نہ ہوں گے؟ اور جب اس کے
بھیجے ہوئے اور مرسل ہوئے تو موافق آیت مذکورہ "وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ" ان کا کام بھی یہی
ہے بشارت اور ڈرانا۔ پھر اب فرمائیے کہ تقیہ کہاں سے آ گیا؟ ہم سے تو نہیں ہو سکتا کہ منہ الال کر
جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور آئمہ اطہار کی نسبت یوں گمان بھی کریں کہ وہ فرمودہ الہی
میں سر مو بھی تقاوت کرتے ہوں، ہم تن اظہار دین میں مشغول تھے اور کیوں نہ ہوں اول تو آیت
مذکورہ سے خود مترشح ہے کہ پیغمبر تبلیغ رسالت میں قصور نہیں کرتے، پھر نائب کیوکر افغان کریں گے،
نہیں تو پھر نائب ہی کیا ہوئے اور مخالف ہوئے (جیسے لکھے کے مٹانے والے)۔

[illegible]

تبلغ دین انہما جلا جارا۔ ہر شخص

اس وقت بھی آپ کا مزاج ہے، یہاں تک کہ وہ اس کے ساتھ ساتھ

عی ہوتا ہے، اگر وہ اظہار حق نہ کرے اور بالکل چپکا بیٹھ رہے تو فرض تبلیغ احکام اس کے ذمہ رہ جائے اور فرض تبلیغ احکام کی انبیاء اور درویشوں اور علماء کے ذمہ سب کے نزدیک مسلم ہے اور کسی اور پر نہ ہو، ہمارے خیر آخراں میں صلی اللہ علیہ وسلم پر تبلیغ احکام کی فرضیت اس آیت سے واضح کاف ہے۔

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ لَمََّا يَلُغْتَ رِسَالَتَهُ
 ”یعنی اے رسول پہنچادے جو کچھ تیری طرف نازل کیا گیا ہے تیرے رب کی طرف سے اور اگر یہ نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہنچایا اس کا پیغام“ اسی طرح اور لوگوں کو فرماتے ہیں:

وَلَتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
 ”یعنی اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک جماعت، بلائی نیک کام کی طرف اور حکم کرتی اچھی بات کا اور منع کرتی ناپسند کو۔“

سویہ حکم ظاہر ہے کہ معروف اور منکر کے جاننے والوں کو ہے۔ سوا سی کا نام عالم اور درویش ہے جتنا کوئی زیادہ جانے اتنی ہی اس کے ذمہ فرضیت زیادہ ہوگی۔ سوا ماموں سے زیادہ اس باب میں اور کون ہوگا؟ بالجملة اگر انبیاء مہر سکوت منہ پر لگا کر بیٹھ رہیں اور سرے سے منہ کھولیں عی نہیں تب تو انبیاء کا گنہگار ہونا لازم آئے گا اور اگر احکام الہی پہنچائیں تو ظاہر ہے کہ احکام الہی تو نفس کے خلاف ہی ہوں گے۔ اسی واسطے مطیع و فرمانبردار کوئی کوئی ہوتا ہے ورنہ پھر بد بخت کوئی کوئی ہوتا اور جب نفس کے خلاف کوئی بات کہتا ہے تو لاکھ میں سے ایک تو مثل ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بے کھٹکے ماننا ہے ورنہ سو سو جہنمیں نکالتے ہیں بلکہ اُلٹے دشمن ہو جاتے ہیں۔

پھر اس وقت اگر آدمی لوگوں کی بدگوئی اور ایذا رسانی سے ہٹ رہے تو اس میں اور دنیا داروں میں کیا فرق رہا؟ ہر کوئی اُس کو مطلب کا یا سمجھ کر دینی تکذیب پر کمر باندھے گا اور جو ساتھ ہو گئے تھے وہ ہٹ رہیں گے، سودین کی خیریت ہوئی اور نبوت بھی ختم ہوئی اور اگر ایسے وقت میں پکار رہا اور لوگوں کی بدگوئی اور نقصان جان و مال سے نہ ڈرا تو آگے پھر آسانی کا وقت ہے، اللہ کا وعدہ ہے کہ بعد شدت اور کلفت کے نصرت بھیجتا ہے۔ چنانچہ آیت ”أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ الْخَالِدَةَ“ کے آخر میں جو ”إِلَّا إِنْ نَصَرَ اللَّهُ قَرْبًا“ ہے اپنے ماقبل سے مل کر یہی کہتا ہے اور جب آسانی ہوئی اور خدا کی مدد آ پہنچی تو پھر تہیہ کس مرض کی دوا ہے؟ الغرض انبیاء کے حق میں کوئی صورت تہیہ کے رد اہونے کی معلوم نہیں ہوتی اور چونکہ آئمہ ہدیٰ بھی ماتبان پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور نائب کا وہی کام ہوتا ہے جس کام کے لیے مہیب ہوا کرتا ہے تو بیشک تبلیغ احکام ان کے

ذمہ میں فرض ہوگئی اور ان کی کیا تخصیص ہے سب ہی پر فرض ہے۔ چنانچہ ابھی مرقوم ہوا لیکن یہ خاص اسی کام کے لیے ہوتے ہیں اور پھر آئمہ ہدیٰ معصوم بھی ہیں صدور گناہ کا احتمال نہیں تو ان سے بھی تقیہ کا ہونا ممکن نہیں جیسے کہ انبیاء سے ممکن نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکی زندگی تقیہ کا استیصال ہے

سو بفضلہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء کے احوال کے مطابق کرنے سے یونہی معلوم ہوتا ہے کہ حق گوئی میں انہوں نے ذرہ برابر دروغ نہیں کیا بلکہ اس سبب سے جان و مال، عزت و آبرو سب کو برباد کیا ہے اور اپنی بات سے نہیں ہٹے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال تو ظاہر ہے سب اہل اسلام نے سنا ہوگا، آپ کی ایذاؤں کی نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ سالہا سال تک کفار نے ذات برادری سے نکالے رکھا مکہ سے باہر پڑے رہے یہ عہد کر لیا تھا کہ ان سے نہ کوئی بیع و شرا کرے نہ ان کا کوئی کام مزدوری غیر مزدوری سے کر دے اور زبانی طعن و تشنیع اور دشنام اور دست درازیاں تو جدار ہیں۔

آخر یہ ہوا کہ قتل کا ارادہ ہوا اور آپ چھپ کر مدینہ منورہ کو تشریف لے گئے۔ اگر تقیہ فرض کیا درست بھی ہوتا تو آپ کیوں اتنے مصائب اٹھاتے؟ اور کیوں بیت اللہ جیسی اشرف چیز کو چھوڑ کر آتے؟ ابولہب اور ابو جہل کیوں دشمن ہوتے؟ برائے خدا کوئی بتلائے تو سہی کہ ان طغویوں کو سوائے حق گوئی کے آپ نے اور کیا ستایا تھا زمین ملک ان کے نہیں دبا لیے تھے، ملک و دولت ان کے نہیں چھین لیے تھے، علیٰ ہذا القیاس حضرت ابراہیم علیہ السلام جو آگ میں ڈالے گئے اور ہجرت کر کے وطن سے چلے آئے تو آپ نے سوا حق گوئی اور اظہار حق کے اور کیا گناہ کیا تھا؟ بالجملہ مثل آفتاب روشن ہو گیا کہ انبیاء نے نہ تقیہ کیا اور نہ ان سے تقیہ ہو سکے۔

علیٰ ہذا القیاس جو ان کے نائب ہیں نہ انہوں نے تقیہ کیا نہ ان سے ہو سکے۔ چنانچہ حضرت امام حسین سید الشہداء کی جان نازنین پر جو کچھ گزرا وہ سب جانتے ہیں باعث اس کا فقط حق گوئی تھا اور نہ بزید کا کلمہ کہہ دیتے تو جان کی جان بچتی اور اُلٹی مال و دولت اور اعزاز و اکرام ہوتا اور حضرت امام المائتہ حضرت امیر کا امیر معاویہ سے لڑنا سب پر روشن ہے سوائے ان کے اور اماموں کا حال بھی سنا ہوگا کہ سلاطین سفاک کے ہاتھ سے کیا کیا ایذائیں ان کے نصیب ہوئیں قید خانوں میں محبوس رہے، اگر تقیہ کر لیتے تو کیوں یہ ذلت اور خواری اور کیوں یہ محنت و دشواری اٹھاتے؟ ہاں عوام مؤمنین کی نسبت اگر کوئی کہے تو فرضیت تو درکنار؟ البتہ جواز معلوم ہوتا ہے اگر عذر قرار واقعی ہو، مثلاً لڑکے اور عورتیں اور اندھے اور لنگڑے اور پاچ اور قیدی اور سوا اس کے جو کوئی ایسا ہی ناچار ہو تو اس کو بقدر ضرورت کفار

سے موافقت جائز ہے، بشرطیکہ جان کا یا کسی عضو کا اندیشہ ہو (اپنی یا اپنی اولاد، یا ماں باپ وغیرہ کا) اور اگر کچھ یونہی تکلیف کا اندیشہ ہو جسے تحمل کر سکے تو پھر کفار سے موافقت کرنی ہرگز جائز نہیں۔

صبر کے فضائل اور ترغیب جس سے تقیہ کی حقیقت کھلتی ہے

اور بایں ہمہ پھر ثواب اس میں ہے کہ تقیہ نہ کرے کیونکہ صبر کی جو جا بجا تعریفیں کتاب اللہ میں آئی ہیں تو ایسوں ہی کے واسطے ہیں، نہیں تو تقیہ میں کیا ایذا تھی جو صبر کی ضرورت ہوتی؟ اس میں تو اور پلاؤ اور تنجین میرا آتے ہیں اور حضرت اور قبلہ بن جاتے ہیں، اسی لیے کلام اللہ میں جتنی صبر کی تاکید ہے اتنی کسی اور چیز کی نہیں۔

وَالْعَصْرِ ۝ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

”یعنی سب انسان ٹوٹے میں ہیں مگر جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے اور آپس میں ایک دوسرے کو حق گوئی اور حق پر قائم رہنے اور صبر کی نصیحت کی۔“

شیعوں کے مذہب میں حق گوئی تو کہاں، حق کے دبالینے کی تاکید ہے، ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تو ایک فدک کے دبالینے میں اس قدر برا کہتے ہیں یہ جو تمام حق خدا وعدی یعنی دین حق کے دبالینے کی فرضیت کے قائل ہیں ان پر کتنے ہزار لعنت چاہیے؟ اور سوا اس کے ”إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ وَاصْبِرُوا“ وغیرہ آیات صبر سے کلام اللہ بھرا ہوا ہے، اگر تقیہ فرض ہوتا صبر کوڑی کے کام کا بھی نہ تھا۔ مع ہذا کہیں ایک جگہ گو اس کا حکم آیا یا بالجلہ اگر تقیہ کہیں ہے بھی؟ تو حوام کے واسطے ہے اور ان میں بھی معذوروں کے لیے نہ ہر کسی کے لیے اور ان کے واسطے بھی جان کے خوف میں اور وہ بھی جائز ہے واجب نہیں بلکہ ثواب کی بات یہی ہے کہ نہ کرے اور کرے بھی تو واجب ہے کہ بقدر ضرورت کرے۔

جہاں اظہار حق نہ ہو سکے ہجرت واجب ہے

اور عین حالت تقیہ ہجرت کی فکر میں رہے اور جب قدرت پائے آنکھ بچا کر کہیں ایسی جگہ بھاگ جائے جہاں اظہار حق سے کوئی مانع نہ ہو کیونکہ کلام اللہ میں ہجرت کی برابر تاکیدیں بھری ہوئی ہیں۔ ”إِنْ أَرْضِي وَأَبْعَةً لِّأَهَائِي لَأُعْبَدُون“ یعنی ”میری زمین واسعہ ہے گھر کی کیا تخصیص ہے جہاں بن پڑے وہاں ہی چلے جاؤ اور میری ہی عبادت کرو۔“ دوسرے

إِنَّ الدِّينَ تَوَلَّيْتُمْ الْمَلَائِكَةَ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا لَيْمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ لِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَ ثَمَرٌ مَصِيرًا

”یعنی جو لوگ ملائکہ ان کی جانیں قبض کرتے ہیں اور وہ ہجرت کے مقدمہ میں تقصیر وار تھے تو فرشتے ان سے کہتے ہیں تم کس کام میں تھے؟ اور کہتے ہیں کہ ہم ضعیف تھے بے بس ایک زمین میں پڑے تھے، فرشتے کہتے ہیں کیا اللہ کی زمین واسع نہ تھی جو تم ہجرت کر لیتے سو ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے انجام کی۔“

اور سو ان آیات کے اور بہت آیات میں ہجرت کا حکم ہے سو ہجرت کا حکم اسی اندیشہ سے ہوتا ہے کہ احکام دینی ظاہر نہیں ہو سکا کرتے، بالجملة عوام کو یہ بشرائط مذکورہ جائز ہے واجب نہیں، ورنہ ایسے ہی بٹے کٹوں کو جو زمین میں لات ماریں تو پانی نکل آئے ہر گز انھا حق جائز نہیں، ان کو یہ لازم ہے کہ اگر وطن میں یا جہاں کہیں وہ ہوں اظہار حق نہ کر سکیں تو وطن چھوڑ کر چلے جائیں۔

اکراہ میں بھی اظہار حق افضل ہے

چنانچہ آیت: ”لَا يَتَخَذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ وَاللَّهُ الْمَصِيرُ ط“ فقط اتنی ہی اجازت پر دلالت کرتی ہے کہ اپنا بچاؤ کرلو، پر کفار سے موافقت اور دوستی مت کرو، سو بچاؤ تو یوں بھی ہو سکتا ہے کہ آدمی اس جگہ سے چل دے، تسکین خاطر کے لیے، معنی ساری آیت کے لکھے دیتا ہوں حاصل یہ ہے ”کہ مومن کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور ان سے موافقت اور صلح نہ رکھیں، مومنوں کو سوائے خدا کے اور کسی کی موافقت اور دوستی نہیں چاہیے اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ کے حساب سے کسی شمار میں نہیں مگر ہاں یہ تمہیں اختیار ہے کہ کچھ اپنا بچاؤ کر لو اور پھر یہ ہے کہ اللہ اپنے آپ سے ڈرائے ہے اور پھر اللہ کی طرف سب کا ٹھکانا ہے۔“

یعنی مجھ سے ڈرنا چاہیے کہ میری طرف آنا ہے کافروں سے کیا ڈرتے ہو، ان سے موافقت تو جب کرتے جب ان کی طرف تمہیں جانا ہوتا۔ فقط ہاں اگر آدمی ان کے بنجوں میں پھنس جائے، محبوس ہو یا مثل محبوسوں کے جیسے اندھے، اپانچ، بنگڑے، لو لے، لڑکے، بچے، عورتیں، بیمار اور پھر اس پر کفار زبردستی بھی کریں اور وہ زبردستی بھی ایسی ہو کہ عادت کے موافق اس کو اٹھانہیں سکتا جیسے قید و قتل، تو خیر اختیار ہے اگرچہ ثواب اس میں ہے کہ کل کھیلے کیونکہ ”إِلَّا مَنْ أَكْبَرَهُ وَقَلْبُهُ

مُطَمِّنٌ بِالْأَيْمَانِ“ سے فقط اجازت ہی معلوم ہوتی ہے کہ اگر اہ کی صورت میں فقط بظاہر موائقت کر لے۔ سو اگر اہ اسے ہی کہتے ہیں جو مذکور ہوا لیکن ان آیات سے جو خدا کی راہ میں مارے جانے کے فضائل ان میں بیان ہیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ ثواب اظہار ہی میں ہے۔

سیدنا ابراہیم کے کسی واقعہ سے اخفاء دین ثابت نہیں

باقی حضرت ابراہیم کا جھوٹ بولنا کوئی زبان پر لائے تو کمال بے حیائی کی بات ہے، انہوں نے بظاہر جھوٹ بولا، حقیقت میں جھوٹ نہیں بولا، قصہ ان کا معروض ہے، معلوم ہو جائے گا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو سمجھانا شروع کیا اور بت پرستی سے منع کیا اور بتوں کی ہجو کرنی شروع کر دی تو حضرت کے باپ ہی اول تو مخالف ہو گئے اور ان کا کہنا ماننا تو درکنار، ان کو دھمکانا شروع کیا، یہ اس فکر میں تھے کہ کسی طرح ان کے بتوں کو توڑ دیں، اتفاقاً کفار کی عید کا دن آ گیا، لوگ ان کے پاس بھی آئے کہ چلو، انہوں نے ستاروں کی طرف دیکھ کر یا کتاب (نجوم کی) دیکھ کے یوں فرمایا کہ میں بیمار ہونے والا ہوں، کفار نے سمجھا کہ جیسے ہم نجوم کا اعتبار کرتے ہیں یہ بھی نجوم کو مانتے ہیں سو انہیں نجوم کی راہ سے کچھ یوں معلوم ہوا ہے کہ میں جاؤں گا تو بیمار ہو جاؤں گا اور یہاں حقیقت میں ستاروں کو یا کتاب کو برائے نام ہی دیکھا تھا اور یہ جو کہا تھا کہ میں بیمار ہو جاؤں گا تو کچھ آثار بیماری کے ہوں گے یا آدمی بیمار ہوا ہی کرتے ہیں اور یہ ان سے کہا ہی نہ تھا کہ مجھے ستاروں کے حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ میں بیمار ہو جاؤں گا جو جھوٹ ہوتا؟ ہاں وہ یہ ہی سمجھ گئے کہ انہیں نجوم سے یہ بات معلوم ہوئی جب وہ اپنی عید میں چلے گئے تو انہوں نے ان کے سب بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، پر ایک بڑے بت کو کچھ نہ کہا۔

آخر جب کفار ہٹ کر آئے تو انہیں خبر ہوئی، انہیں ہی اپنے بتوں کا دشمن سمجھتے تھے، سو انہیں ہی پکڑا ان سے جو پوچھا تو انہوں نے استہزاء کے طور پر کہا کہ صاحب اس بڑے بت نے یہ کام کیا ہے سو یہ دوسرا جھوٹ ہے کہ جسے کوئی دیوانہ بھی یوں نہ کہے کہ یہ ایسا جھوٹ ہے جسے ہم جھوٹ سمجھتے ہیں بلکہ ایسی بات ہمارے عقائد میں بڑا سچ گنا جاتا ہے، ان دونوں قصوں کو غور کیجئے اور پھر فرمائیے کہ یہ اخفاء حق ہے یا اظہار حق ہے اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ اسی کام کی بدولت آگ میں ڈالے گئے۔ خاص کر یوں کہنا کہ بڑے نے کیا ہے یہ جھوٹ کیا، سچ سے بھی زیادہ اصلی مطلب پر دلالت کرتا ہے سب جانتے ہیں کہ یہ جواب کیا تھا، ایک چڑا تھا، ایسے میں تو ان کو غصہ نہ آتا تب آتا اور حقیقت میں چمپاتے تو دین کو اس وقت چمپاتے، سو چمپانا تو درکنار حضرت نے اول تو ان کو

چڑایا اور پھر کیا کیا سوال جواب کیے کہ رستم کا حوصلہ نہیں جو ایسے وقت میں ایسی بات کہے اور اوّل دفعہ جوان کو نجوم کی طرف دیکھ کر دھوکا دیا تو کچھ جان کا بچاؤ، آپ کو مد نظر نہ تھا، مال کا بچاؤ آپ کو مد نظر نہ تھا، آبرو کا پاس آپ کو نہ تھا بلکہ اپنی جان کے کھونے کا شوق لگا تھا، فقط مطلب اتنا تھا کہ یہ جائیں تو تنہائی میں ان کے بت نکلڑے کیے جائیں۔ سو یہ کام کرنا جان پر کھیلنا تھا ہاں اس کے ساتھ یہ بھی ہو کہ رسوم کفار اور ان کی عبادت اور اشعار سے بھی یکسور ہیں۔ بہر حال یہ جان بازی کا سامان تھا اور جان بازی کو تقیہ کہنا ایسوں ہی کا کام ہے کہ جن کو دُم کی اور ناک کی تمیز نہ ہو۔

اخفائے علاقہ زوجیت اخفائے دین نہیں ہے

بارے رہا تیسرا جھوٹ، وہ یہ ہے کہ حضرت اپنی بیوی سارہ کو لیے ہوئے ہجرت کیے ہوئے جاتے تھے، ایک بستی میں جا کر پہنچے جہاں کا حاکم بڑا ظالم اور نہایت زانی تھا، اس کے شیطانی لشکر میں سے کسی نے حضرت سارہ کے حسن و جمال کی خبر کر دی، اس مردود نے ان کو بلوا بھیجا، تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بایں خیال کہ اگر اس مردود کو حضرت سارہ کا کچھ زیادہ خیال ہو تو یوں سمجھ کر کہ خاوند کو سب سے زیادہ غیرت ہوتی ہے ایسا نہ ہو، چچھا کریں مجھ کو مروانہ ڈالے۔ جب حضرت سارہ کے لے جانے کو اس کے پیادہ آگئے تو یوں فرمایا کہ اے سارہ! اگر وہ ظالم تجھ سے پوچھے تو یوں کہنا کہ میں ابراہیم کی بہن ہوں کیوں کہ میں تو دونوں دینی بہن بھائی ہیں۔ مع ہذا حضرت سارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا کی بیٹی بھی تھیں تو یہ بھی حقیقت میں جھوٹ نہ تھا اور اگر بالفرض والتقدیر یہ کہنا جھوٹ ہی تھا، تب دین کا اخفاء تو نہ تھا اگر اخفاء تھا تو علاقہ زوجیت کا اخفاء تھا اور وہ بھی بایں غرض کہ یہ جان جو حق گوئی میں جانے کے لائق ہے ایسا نہ ہو کہ ایسے قصہ میں جائے اور خدا کی راہ میں جاں نثاری کا ارمان دل کا دل میں رہ جائے۔ غرض اس جگہ جان کا بچانا بھی اسی لیے تھا کہ کل کو اظہار حق کروں اور خدا کے کام میں جان دوں، ایسے قصے میں نہ مروں۔ بالجملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معاملات سے تقیہ کا ثابت کرنا کمال دانش مندی اور خوش فہمی پر دلالت کرتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ہجرت کر جانا اور عار ثور میں چھپنا یہ سب کا سب اظہار حق کے باعث تھا ورنہ ابو جہل اور کفار مکہ کی موافقت میں تو کچھ زیان ہی نہ تھا۔ اس کو تقیہ کہنا اس سے بھی بڑھ کر ہے ایسا تقیہ یہ بھی ہے کہ آدمی دشمن کے وار کو ڈھال سے روکتا ہے، اگر بچاؤ کر لینے کے معنی تقیہ ہے تو یہ تو عین اظہار حق ہے کیونکہ بچاؤ کی تو جب ہی ضرورت پڑتی ہے کہ دوسرا کوئی درپے ایذا ہو۔

بچاؤ اور تقیہ میں فرق عظیم ہے

اس مقام پر ہر کسی نے غالباً تقیہ شیعہ اور بچاؤ میں فرق سمجھ لیا ہوگا پر مزید توضیح کے لیے میں بھی کچھ عرض کیے دیتا ہوں، تقیہ معطل شیعہ میں دشمن کے دل سے خیال ایذا ہی نکل جائے ہے کیونکہ تقیہ اپنے مذہب کا فقط بدل لینا اور اپنے آپ کو ہم مذہب دشمن بنالینا ہوتا ہے۔ سو چونکہ اختلاف مذہب میں دشمنی دینی کے باعث تقیہ کی ضرورت ہوتی ہے تو در صورت تبدیل مذہب دشمنی ہی نہ رہے گی بلکہ برعکس دوستی بن جائے گی اور بچاؤ کی صورت میں دشمنی اور بڑھ جاتی ہے اور خیال ایذا اور سانی دہالا ہو جاتا ہے کیونکہ آدمی کا قاعدہ ہے کہ جب تک دشمن اپنے قابو میں رہتا ہے اور ایسا موقع ہوتا ہے کہ اس کو ایذا دے سکیں تو اس کا اوّل تو کچھ چنداں رشک نہیں ہوتا، دوسرے یوں بے فکری ہوتی ہے کہ جب چاہیں گے اسے ذلیل و خوار کر دیں گے، تیسرے جب وہ کچھ اپنا بچاؤ کر لیتا ہے تو پھر اپنا بھی اندیشہ ہوتا ہے کہ مبادا اب یہ ہم پر وار نہ کرے تو ان وجوہ سے اعداء کو خیال ایذا اور سانی تا مقدور زیادہ ہوتا ہے ایسے میں جو کچھ ان سے بن پڑا کرتا ہے دروغ نہیں کیا کرتے تو اس صورت میں مقربان الہی کو سخت مصیبت پیش آیا کرتی ہے۔ بالکل یہ فرق لطیف یاد رکھنا چاہیے کہ بہت کا رآمد ہے۔

حضرت امیر (بزعم شیعہ) سنت احمدی و ابراہیمی و موسوی پر عمل پیرا نہ ہو سکے جب یہ بات مقرر ہو چکی تو اب اہل انصاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال کو جو ہنگام قیام مکہ معظمہ اور اثنائے ہجرت میں پیش آئے۔ حضرت امیر کے احوال سے جو بعد وقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیش آئے ملا کر دیکھیں، اگر اصحاب کرام مرتد ہو گئے تھے تو بیشک حضرت امیر بھی بحکم متابعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ ویسے ہی پیش آتے جیسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ابو جہل اور اُمیہ بن خلف وغیرہم سے پیش آئے اور آپ پر بھی وہ سانچے گزرتے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گزرے۔ آخر کو ایک نہ ایک دن تو نوبت ہجرت پہنچتی اور سنت احمدی اور سنت ابراہیمی اور سنت موسوی کی تکمیل ہو جاتی۔

لیکن شکایت تو یہ ہے کہ حضرت امیر نے کبھی منہ کھول کر ایک دفعہ بھی یوں نہ فرمایا کہ میں دین حق پر ہوں اور تم دین باطل پر، اور اگر آپ نے اظہار حق کیا تو دو حال سے خالی نہیں کہ یا اصحاب نے انکار فرما کر تسلیم کر لیا تب تو تقیہ کی کیا ضرورت اور ان پر کیا اعتراض ہے؟ بلکہ جو کچھ انہوں نے کیا وہ عین موافق مرضی مرتضوی ہوا، اور نہ مانا تو کیا سبب کہ ایسے دشمن کو کسی قسم کی ایذا نہ دی؟ اور

اگر یوں کہئے کہ بسبب شجاعت مرتضوی یا امداد خداوندی کے وہ کچھ ایذا نہ پہنچا سکے تو اول تو یہ خلاف معقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون سے حضرت امیر سے کم تھے جو آپ پر یہ آفتیں آئیں، حاشا دکلا جو حضرت امیر نے کبھی تقیہ کیا ہو، اگر تقیہ کرتے تو مکہ معظمہ ہی میں کرتے اور کبھی کیا ہوتا تو امیر معاویہ کے ساتھ ضرور کر لیتے، بہت ہوتا تو یہ ہوتا کہ قاتلان عثمان مارے جاتے وہ کون سے آپ کو ایسے عزیز تھے کہ جن کے پاس ولحاظ میں اتنے کچھ شرف و فساد کے دین میں روادار ہوئے۔

حضرت سید الشہداء نے تو بے گناہوں اور وہ بے گناہ بھی کیسے کہ اپنے قوت بازو اور اپنے لخت جگر کو اس دین ہی کی بابت قتل کروایا اور اپنے آپ بھی جاں بحق ہوئے اور زن و فرزند ننگ و ناموس کا بھی کچھ لحاظ نہ فرمایا حالانکہ یہ سب کشت و خون بظاہر لا حاصل تھا، تیس ہزار آدمیوں کے مقابلہ میں اتنے آدمیوں اور اس بے سروسامانی پر کیا اُمید کامیابی تھی بخلاف حضرت امیر کے کہ وہ اگر قاتلان عثمان غنی کو امیر معاویہ کے حوالے کر دیتے تو خلافت کی خلافت بنی رہتی، ایک باغی جو مفسد دین تھا اپنا مطیع و منقاد ہو جاتا دین کی ترقی ہوتی اور پھر بایں ہمہ کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ آخر قاتلان حضرت عثمان ظالم تھے مظلوم نہ تھے اور نہ سبھی ہمراہیاں امام الشہداء کے برابر تو بے گناہ بھی نہ تھے۔ حق یوں ہے کہ یہ سب تہمت اخفاء حق اور عیب نامردہ بن ان حضرات شیعہ کا لگایا ہوا ہے۔ ”سبحانک ہللا بہتان عظیم“

دورانِ خلافت میں بھی امیر پر تقیہ واجب تھا

اور طرفہ تر شیعوں کا گوزشتہ اور سنئے سید مرتضیٰ جو بڑے محقق مذہب شیعہ ہیں وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ حضرت امیر پر اپنی خلافت اور حکومت کے زمانے میں بھی تقیہ باقی تھا، الہی یہ تقیہ نہ ہوا ایک جان کا وبال ہوا، کسی راہ حضرت امیر کا پیچھا چھوٹا ہی نہیں مگر کوئی ان سے پوچھے کہ اگر اس وقت بھی تقیہ ان پر واجب تھا تو امیر معاویہ کو کیوں معزول کیا۔ حضرت تو پہلے سے ان سے ڈریں تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اس شخص کا مکر بہت بڑا ہے حالانکہ مغیرہ بن شعبہ اور عبد اللہ بن عباس کی صلاح بھی یہی تھی کہ ابھی معزول نہ فرمائیے بعد استقامت معزول فرمائیے گا، مگر آپ نے نہ مانا اور یہ نہ مانا آخر کو موجب کیا کیا خرابیوں کا ہوا، یہ سب شیعوں ہی کی کتابوں میں ہے۔

سید مرتضیٰ صاحب کی دلیل سنئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ خلافت مرتضوی برائے نام تھی، امیر معاویہ ہمیشہ ان سے لڑتے رہے، مع ہذا آپ کی فوج اور آپ کے ساتھی اکثر اولاد صحابہ تھے جو آپ کے دشمن جان گزرے ہیں اور ان کے دل میں خلیفہ اول اور ثانی کا عدل اور فضل جما ہوا تھا، اگر حضرت امیر اس وقت ”کما ینہی“ ۳ ظہار حق کرتے تو بہت دشواری ہو جاتی۔ گمان غالب تھا

کہ فوج بھی پھر جاتی، اس سبب سے عالم خلافت میں بھی ان پر تقیہ واجب تھا اور اظہار حق حرام۔ اس اعتقاد میں ہر چند سید مرتضیٰ نے تمام امامیوں کا خلاف کیا ہے کیونکہ وہ سب اس بات کے قائل ہیں کہ قبل خلافت آپ پر تقیہ واجب تھا اور بعد خلافت آپ پر بھی حرام تھا لیکن بزم خود بڑی دور اندیشی اور کمال چالاکی کری تھی پر خدا نے چلنے نہ دی۔

خلافت امیر میں تقیہ کے بہتان کا پس منظر

انہوں نے اپنے عندیہ میں اس کا بچاؤ کیا تھا کہ مبادا کوئی سنی، حضرت کے ایام خلافت کے خطبوں اور ملفوظات کو جن میں اصحاب کرام خصوصاً خلیفہ اول اور خلیفہ ثانی کی تعریف ہے دیکھ کر ناک میں دم کر دے، یا یہ گرفت کر بیٹھے کہ دین شیعہ حق ہے تو حضرت امیر کی خلافت تو سب میں ا خیر تھی، آپ نے کیوں نہ اس کو شائع ذائع کیا، اگر آپ دین شیعہ کو رواج دیتے اور اسے مشہور کرتے تو روئے زمین میں یہی دین ہوتا اور سنیوں کا دین نیست و نابود ہو جاتا۔ جیسے ابو بکر اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو تمہارے گمان کے موافق نیست و نابود کر دیا اور اپنا ساختہ پرداختہ مروج کر دیا اور آپ کے بعد کسی نے دین کے باب میں چنداں کج کاؤ نہیں کی۔ سو آپ ہی کا دین باقی رہنا چاہیے تھا اور القصد حضرت امیر آخر میں خلیفہ ہوئے تھے، یہ بات دین کی ترقی کے لیے ایسی مفید ہوئی تھی کہ در صورت برعکس ترتیب کے ہرگز متصور نہیں، پھر کیا سبب کہ دین اہل سنت و جماعت ہی مشہور رہا، اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بھی دین اہل سنت ہی پسند تھا۔ الغرض اس اندیشہ سے سید مرتضیٰ صاحب نے یہ چکر کھایا اور یہ پلٹے لیے تھے۔

حضرت امیر و مسائل رکھتے ہوئے بھی اظہار دین نہ کر سکے

لیکن یہ نہ سوچیں کہ خلافت اور ولایت اسے کہتے ہیں کہ ملک میں تصرف ہو، حکم احکام چلتے ہوں محصول اور خراج رعیت سے وصول کر سکے، چور قزاق کو سزا دے سکے۔ سو یہ بات سوائے شام کے اور کون سے ملک میں حاصل نہ تھی۔ خصوصاً حجاز اور عمان اور حرین اور عراقین اور آذربائیجان اور فارس اور خراسان میں بے شک آپ کی حکومت تھی، پھر یہ تھوڑی سلطنت تھی؟ امیر معاویہ کے پاس تو اتنا ملک تھا بھی نہیں وہ اپنے ملک میں جو حکم چاہتے تھے جاری کرتے تھے۔ ادھر ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقط ملک عرب میں حکومت چھوڑ کر اس عالم سے تشریف لے گئے تھے اور پھر اس پر چار طرف معاندین زور پڑتے۔ مسیلہ کذاب اور بنو حنیفہ ملک

یامہ میں ایک طرف اور سجاح متنبیہ بنی قسیم میں کہ ان سے بڑھ کر عرب میں کوئی قبیلہ ہی نہ تھا، جدایہ برسر پر خاش، منکرین زکوٰۃ اپنی ہی طرف کو کھینچ رہے تھے۔ بنو عسفان جامہ سے باہر جدا لٹکے جاتے تھے۔ ادھر گرد و لوح مدینہ کے مرتدین کا جواز و رشور تھا، آپ کے ساتھی گئے چے مکہ مدینہ والے ہی تھے اور پھر بایں ہمہ کسی بات میں کسی سے نہ بے اور کسی حکم میں مدعت نہ کی، اگر زکوٰۃ نہ دینے والوں کو ان کے طور پر راضی کر دیتے اور اووروں کو ان کے طور پر تو کچھ مشقت نہ ہوتی۔

صدیق نے بے سرو سامانی میں اظہار حق کیا

ابو بکر صدیق باوجود اس قلت سامان اور عدم شجاعت کے اسنے دشمنوں سے بھی نہ گھبرائے حالانکہ اکثر ان کے دشمن لڑائی کے مشتاق تھے اور بعضے بعضے تو چھوٹے سے بادشاہ تھے اور حضرت علی بایں ہمہ شجاعت و کرامت اور زور و قدرت اور شوکت اور سلطنت اور امامت و ولایت کہ ابو بکر کو ایک بھی ان اوصاف جزیا میں سے نصیب نہ تھا اظہار حق میں (اور بھی کسی امر میں نہیں) اتنی سستی فرمائیں؟ اگر ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ اوصاف کہیں سے مل جاتے، پھر کافر نام کوئی پھونس کا آدمی بھی دنیا میں رہتا تو ہمارا ذمہ تھا، باقی یہ کہنا کہ آپ کی فوج انکھڑا دلاد صحابہ تھی، اگر کوئی سنی کہتا تو زیب بھی دیتا، سید مرتضیٰ صاحب کس منہ سے کہتے ہیں قاضی نور اللہ صاحب کی نہیں سنتے وہ کیا فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ قریش میں سے کل پانچ ہی آدمی تھے، باقی تیرہ قبیلہ معاویہ کے ساتھ۔ اس لیے آپ کو فتح میسر نہ ہوئی۔ بالجملہ شیعوں کے اقرار سے آپ کے ہمراہی کو فیان جاں نثار تھے جو مقتدایان شیعہ ہیں اور اگر وہ نہ ہوتے اور صحابہ کی اولاد ہی ہوتی تو جیسے ان کو عدل اور فضل بخین کا (دیکھئے بھالے) اعتقاد تھا اور اس کے باعث ان کی راہ روش پسندیدہ تھی ایسے ہی اپنے ماں باپ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ بھی سنے سنائے یاد تھا۔

مع ہذا اگر پھر جاتے تو کیا تھا، آخر دین مرتضوی میں وہ وہ آسائشیں اور سہولتیں ہیں کہ منکر بھی معتقد ہو جائے۔ متعہ کا آوازہ سن کر امیر معاویہ کے ہمراہی بھی ہمراہ ہو جاتے بلکہ جس المل مذہب کے کان میں یہ بشارت پہنچتی کہ جیتے جی یہ مزے ہیں اور مر کر یہ مرتبے، کیسے ہی دین کے کچے کیوں نہ ہوتے حضرت امیر کی ہر کابی اختیار کرتے، علاوہ بریں غسل رجلین کی تحفیف، تراویح سے بے کھٹکے، ایسا دین اور ایسا ایمان تو قسمت ہی سے ملتا ہے۔ اگر اظہار دین خود کرتے تو تمام ملک عرب اور طوائف عجم محمد و معاون ہوتے۔ سبحان اللہ! سنیوں سے مقابلہ اور پھر یہ سامان، اتنا ہی سوچا ہوتا کہ ابتداء سے لے کر آخر تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محمد و معاون وہی لوگ تھے

جو آپ کے دشمنان جانی کے بھائی برادر یا اولاد تھے، خالد بن الولید، عکرمہ بن ابی جہل بلکہ خور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ ابو جہل کے بھانجے اور ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابو قحافہ کے بیٹے، حضرت عثمان ابوسفیان کے قرائی، علی ہذا القیاس اور لوگ ایسے ہی تھے۔

مقربان الہی کا طریقہ اظہار حق کرنا اور جفا کیں اٹھانا ہے

اب بس کیجئے اور ایک دو آیت لکھ دیجئے جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ مقربان الہی کا کام میٹھ سے تم کئی امداد دین رہا ہے اور مدام اچھے لوگوں نے ان کے ہاتھ سے ایذا کیں اٹھائی ہیں۔ اور خدا وعدہ کریم کو دین کے مقدمہ میں سختی اور پختل پسندیدہ ہے نہ کہ سستی اور مدہسعت ”إِنَّ الدِّينَ يَكْفُرُونَ بِلَيْعَتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيَّ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الدِّينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ“..... ”یعنی جو لوگ انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کو جو حق بات کہتے ہیں ان کو سخت عذاب کی بشارت سنا دے۔“ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء اور اچھے لوگ تقیہ نہیں کیا کرتے بلکہ حق کوئی میں درلج نہیں کرتے اور اسی سبب سے ان کو قتل کر دیتے تھے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهَ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَلُفُونَ لَوْمَةً لَّآئِمَةً ط ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ط

”یعنی اے ایمان والو جو تم میں سے مرتد ہو جائے گا تو بلا سے، اللہ اور ایسے لوگوں کو لے آئے گا، جن سے خدا کو محبت ہوگی اور خدا سے ان کو محبت ہوگی، مومنوں کے سامنے تو ذلیل نظر آئیں گے اور کافروں کے سامنے بڑے سخت ہوں گے خدا کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی کے بھلا برا کہنے سے نہ ڈریں گے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ خدا کے محب و محبوب وہی لوگ ہیں جو کافروں کے سامنے دب کر نہ رہیں اور ان کی خوشامد نہ کریں بلکہ ان سے کچھ ہی رہیں اور کسی کی ملامت سے نہ ڈریں، اب فرمائیے کہ تقیہ میں سوا کفار کی خوشامد اور ان کی موافقت اور اندیشہ ملامت کے اور کیا ہوتا ہے؟ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تقیہ محبوبوں اور محبوں کا کام نہیں بلکہ دشمنان خدا و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ہے۔

تقیہ عرف اور دستور کی کسوٹی پر

اب الحمد للہ کہ مافلان منصف کے لیے خوبی تقیہ عقل و نقل سے خوب واضح ہو گئی، مناسب

وقت یوں ہے کہ عرف اور دستور خلافت پر بھی اس کو منطبق کر کے کچھ اس کی بزرگی تلاء دیجئے۔ جملہ آفاق میں پسندیدہ خلائق پختگی اور استقامت ہے اور تلون کو سب لوگ ناپسند کرتے ہیں، خاص کر دین کے مقدمات میں اور وہ بھی پھر اتنا کہ ایک دفعہ شور اشوری اور پھر بالکل بے نمکی، سو پختہبران دین اور آئمہ ہدیٰ اگر ایک دفعہ احکام دین سنا کر پھر خوف جان یا خوف آبرو سے ہم کاسے کفار ہو جائیں تو سب کے نزدیک یہ ذہن نشین ہو جائے کہ یہ لوگ خام طمع دنیا طلب ہیں۔ پھر وہ معجزات کا عطا ہونا جو محض حسن اعتقاد خلائق کے لیے ہے سب رائیگاں ہو جائے اور جو لوگ کہ آمادہ ہدایت ہوں، وہ منحرف ہو جائیں اور جوراہ پر آئے ہوں وہ اس حب جاہ کو دیکھ کر بے اعتقاد ہو کر پلٹ جائیں بلکہ ایسے لوگوں کو سخت دنیا دار سمجھیں۔ مع ہذا ظاہر ہے کہ نصیحت کی تاثیر کے لیے خود عمل کرنا رکن اعظم ہے۔ جب تقیہ ہوا تو عمل کجا؟ تو لا جرم اس صورت میں ہدایت کی کوئی صورت نہیں۔ بالجملہ تقیہ کے بطلان پر عقل اور نقل اور عرف تینوں متفق ہیں، پر جس کی چشم انصاف کو رہا اس کو کیا نظر آئے؟ اور نقل مشہور ہے بلکہ حدیث شریف ہے ”حُبُّكَ الشَّيْءُ يُغَيِّبُ وَنُصَيْمٌ“ یعنی تجھے اگر کسی چیز سے محبت ہو جائے تو اس کے عیوب اور نقصانات کے دیکھنے سننے میں وہ محبت تجھ کو اندھا بنا دیتی ہے، اگر محبت مذہب دل سے ایک طرف کر کے ان تقریروں اور اثبات تقیہ کی تقریروں کو موازنہ کریں تو ان شاء اللہ مولوی عمار علی صاحب بھی توبہ کر اٹھیں، میرنا در علی کو تو شیعہ کیا بتائیں؟ اور اب ہم کو اس کی ضرورت نہیں رہی کہ بعد اس کے بھی کچھ بیان کریں لیکن اتمام حجت کے لیے اتنا اور معروض خدمت علماء شیعہ ہے کہ اگر بالفرض و التقدیر فرض محال تقیہ ثابت بھی ہو جائے تو موافق جمہور شیعہ حضرت امیر پرہنگام خلافت تقیہ حرام تھا، پھر تعریف صحابہ کو تقیہ پر کیوں محمول کیا جائے؟

حضرت ابو بکر صدیق کو، صدیق نہ کہنے والے کیلئے حضرت جعفر کی بددعاء اور سلما کہ ہنگام خلافت بھی ان پر تقیہ فرض تھا، تو قطع نظر اس کے کہ یہ تعصب ہی تعصب ہے اور اس قول کے قائل نے عقل کی بھی ناک کتر لی ہے، اس میں کیا عذر کریں گے کہ حضرت امام باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعریف کرتے ہیں حالانکہ موافق مذہب شیعہ وہ خدا کی طرف سے تقیہ کرنے سے ممنوع تھے اور تقیہ ان پر حرام تھا۔ علی بن عیسیٰ اردبیلی امامی اثنا عشری اپنی کتاب کشف الغمہ عن معرفۃ الائمہ میں نقل کرتے ہیں۔

سئل الامام ابو جعفر عن جلیۃ السیف هل یجوز لقال نعم قد حلی ابو بکر الصلیق سیفہ لقال الراوی اتقول ہکذا فوالی الامام عن مکالہ لقال نعم الصلیق نعم

الصَّبِيْقُ نَعَمْ الصَّبِيْقُ فَمَنْ لَمْ يَقُلْ لَهُ الصَّبِيْقُ فَلَا صَدَقَ اللَّهُ قَوْلُهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ
 ”یعنی حضرت امام ابو جعفر یعنی امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آہاء الکرام سے کسی نے پوچھا
 کہ تلواریں کے قبضہ پر چاندی سونے کا کچھ نقش و نگار یا بوٹے وغیرہ بھی درست ہیں یا نہیں؟ آپ نے
 فرمایا ہاں درست ہے اس لیے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی تلوار پر چاندی کا جھول
 کرایا تھا۔ راوی نے کہا کیا آپ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، آپ غصہ میں اپنی
 جگہ سے اُچک بیٹھے اور فرمانے لگے ہاں صدیق، ہاں صدیق، ہاں صدیق، جو انہیں صدیق نہ کہے
 اللہ اس کی بات کو دُور آخرت میں سچی مت کیجیو۔ فقط“

اب گوش گزار اہل انصاف یہ ہے کہ سب امامیہ اس بات پر متفق ہیں کہ علی بن عیسیٰ اردبیلی علم و
 فضل میں یکساں اور نقل اور روایت میں بڑے معتمد علیہ ہیں ان کی روایت پر کوئی سقم نہیں پکڑ سکتا۔

امام جعفر پر رقیہ حرام تھا

باقی رہی یہ بات کہ حضرت امام محمد باقر پر رقیہ کے حرام ہونے کی کیا دلیل ہے؟ سو یہ وجہ معقول
 ، اس کا جواب بھی ہم سے معقول ہی سنئے۔ کلینی میں روایت ہے:

عن معاذ بن کثیر عن ابی عبد اللہ قال ان اللہ عزوجل انزل علی نبیہ کتابا
 فقال یا محمد هذه وصیتک الی النجباء فقال ومن النجباء یا جبریل فقال علی
 بن ابی طالب وولده کان علی الكتاب خواتیم من ذهب فدفعه رسول اللہ صلی
 اللہ علیہ وسلم الی علی وامرہ ان یفک خاتما منه فیعمل بما فیہ ثم دفعه الی
 الحسن لفک عنه خاتما لعل بما فیہ ثم دفعه الی الحسین لفک خاتما فوجد
 فیہ اخرج بقوم الی الشهادة فلا شهادة لهم الا معک واشتر نفسك للہ ففعل
 ثم دفعه الی علی بن الحسین لفک خاتما فوجد فیہ ان اطرق واصمت والنزم
 منزلک واعبد ربک حتی یتیک الیقین ففعل ثم دفعه الی ابنہ محمد بن علی
 ابن الحسین علیہ السلام لفک خاتما فوجد فیہ حدیث الناس وافتهم والنشر
 علوم اهل بیتک وصدیق اہاءک الصالحین ولا تخافن احدا الا اللہ فانہ لا سبیل
 لاحد علیک ثم دفعه الی جعفر الصادق لفک خاتما فوجد فیہ حدیث الناس
 وافتهم ولا تخافن احدا الا اللہ والنشر علوم اهل بیتک وصدیق اہاءک
 الصالحین فانک فی جرر وامن ففعل ثم دفعه الی ابنہ موسیٰ علیہ السلام وهكذا

الی لایام المہدی ورواہ من طریق آخر عن معاذ بن کثیر ایضا عن ابی عبد اللہ ولہ فی الخاتم الخامس وقل الحق فی الامن والخوف ولا نخش الا اللہ انتہی۔

”حاصل روایت کا یہ ہے کہ کلینی میں معاذ بن کثیر سے روایت ہے وہ حضرت امام محمد باقر سے

روایت کرتے ہیں کہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے نازل کی اپنے نبی پر ایک کتاب اور فرمایا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ تیری وصیت ہے نبیاء کو، آپ نے فرمایا جبریل نبیاء کون ہیں؟ جبریل نے کہا علی بن ابی طالب اور ان کی اولاد، اور اس کتاب پر سونے کی مہریں لگی ہوئی تھیں (یعنی جیسے خطوں پر لاکھ لگا کر مہر لگا دیتے ہیں، ایسے ہی اس خط پر لاکھ کی جگہ سونے کی مہریں لگی ہوئی تھیں) سو حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وصیت نامہ کو حضرت علی کو دیا اور یہ فرمایا کہ ایک مہر کو توڑیں اور جو اس کے نیچے سے نکلے اس پر عمل کریں، پھر انہوں نے حضرت امام حسن کو دیا، انہوں نے بھی ایک مہر توڑ کر اس کے نیچے جو کچھ نکلا اس پر عمل کیا، پھر انہوں نے حضرت سید الشہداء امام حسین رضی اللہ عنہ کو دیا انہوں نے مہر توڑی تو اس کے نیچے سے یہ نکلا کہ ایک قوم کو شہادت کی طرف لے جا اس لیے کہ ان کی شہادت تیرے ہی ساتھ ہے اور اپنی جان کو اللہ کے واسطے خرید لے، سو انہوں نے ویسا ہی کیا، بعد اس کے انہوں نے حضرت امام زین العابدین کو وہ وصیت نامہ دیا، انہوں نے مہر کو توڑا تو اس میں نکلا کہ سر جھکا کر بیٹھ رہ اور اپنے گھر ہی میں رہ اور اپنے رب کی عبادت کیے جا، یہاں تک کہ موت آ جائے، سو انہوں نے ویسا ہی کیا، پھر انہوں نے وہ وصیت نامہ اپنے بیٹے امام محمد باقر کو دیا، انہوں نے جو مہر کو توڑا اس میں یہ پایا کہ لوگوں سے حدیثیں بیان کر اور فتوے دے اور اپنے اہل بیت کے علوم کو پھیلا اور اپنے آباء و اجداد صلحا کو سچا کر اور سوا خدا کے کسی سے مت ڈر، اس لیے کہ کوئی تجھ پر قادر نہ ہو سکے گا، پھر انہوں نے اپنے بیٹے امام جعفر صادق علیہ السلام کو وہ وصیت حوالہ کی، انہوں نے جو مہر توڑی تو اس میں بھی یہ پایا کہ حدیثیں بیان کر لوگوں سے اور فتوے دے اور کسی سے سوائے خدا کے مت ڈر اور اپنے اہل بیت کے علوم کو پھیلا اور اپنے آباء و اجداد صالحین کی تصدیق کر، اس لیے کہ تو خدا کے حفظ و امان میں ہے۔ سو انہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ پھر انہوں نے اپنے بیٹے امام موسیٰ علیہ السلام کو وہ وصیت دی اور اسی طرح حضرت امام مہدی تک ہوتا چلا گیا۔

اور دوسری سند سے کلینی ہی معاذ بن کثیر مذکور کے واسطے سے امام محمد باقر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے اور اس روایت میں پانچویں مہر میں یعنی حضرت امام باقر کی نوبت میں اتنا اور بھی ہے اور کہتا رہ حق بات امن میں اور خوف میں اور سوا خدا کے کسی سے مت ڈر۔ فقط“

اس روایت میں خود فرمائیے کہ حضرت امام محمد باقر کو کس تاکید سے تئیک کی ممانعت ہے پھر بھی حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ جن کو یہ وصیت تھی کہ حق کے سوا کبھی کچھ اور مت کہو، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اتنی کچھ تعریف فرماتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی مرتبہ بجز نبوت کے نہیں ماس لیے کہ یہ انبیاء کے کلام اللہ میں صدیقین ہی کو ذکر فرماتے ہیں اور پھر تعریف بھی اس تاکید سے کہ بدو عا فرماتے ہیں ان لوگوں کے حق میں جو انہیں صدیق نہ کہیں اور برا کہنے کا تو کچھ لکھا ہی نہیں۔

امام جعفر کی بدو عا سے حقانیت اہل سنت اور بطلان مذہب شیعہ ظاہر ہو گیا ہمیں اس روایت سے قطعاً یہی فائدہ نہیں ہوا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا صدیق ہونا بے غل و غش ثابت ہو گیا اور کسی کو تئیک کے احتمال کی گنجائش نہ رہی بلکہ شیعوں کے مذہب کا بطلان اور سینوں کے مذہب کی حقانیت بھی یہ تحقیق معلوم ہو گئی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حضرات شیعہ قاطبہ خواہ امامیہ خواہ غیر امامیہ خواہ اثنا عشریہ خواہ غیر اثنا عشریہ اس بدو عا کے اندر داخل ہیں جو حضرت امام معصوم مستجاب الدعوات امام محمد باقر کی زبان مبارک سے صادر ہوئی، ہم کو تو ہم شیعوں کو بھی اس کے قبول ہونے میں تامل نہیں، سو اس سبب سے ہم کو بالیقین معلوم ہو گیا کہ ان کے دعوے محبت اہل بیت اور دعوے اسلام اور دعوے ایمان سب خداوند کریم کے نزدیک جھوٹا ہے اور آخرت میں بھی خداوند کریم ان کی تکذیب فرمائے گا۔ سو اس سے زیادہ اور کونسا مرتبہ باطل ہونے کا ہو گا۔ دوسرے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو کیا سب حسب فرمان الہی اور موافق وصیت پیغمبری تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر اور حضرت عثمان رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے جو بیعت کی، علیٰ ہذا القیاس حضرت امام حسن نے جو خلافت امیر معاویہ کے حوالے فرمائی، سب حسب ایماء خداوندی اور ارشاد پیغمبری تھا بوجہ تئیک نہ تھا اور جب ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعت موافق ارشاد خداوندی کی تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ قائل اسی کے تھے، علیٰ ہذا القیاس، دختر مطہرہ حضرت ام کلثوم کا نکاح جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوا تو وہ نکاح بھی خدا کے حکم کے موافق ہونے میں حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے نکاح سے کچھ کم نہیں، جیسے ان کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موافق ارشاد خداوندی ہوا تھا، ویسے ہی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حسب فرمان الہی تھا۔ وہو الرائد الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ سب حیلہ و حجت امام کا جواب دندان شکن بن پڑا، یہی خداوند نعمت کا کرم ہے حق کو حق کر دکھایا اور باطل کو باطل۔

امام جعفر پر ایک اعتراض جو خود کشی کی نوعیت رکھتا ہے

مگر ہاں اتنا کھٹکاتا ہے کہ شاید فرقہ امامیہ اہل سنت کی ضد میں اگر یہ حجت کریں کہ واقعی کلام اللہ اور اقوالِ عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنیوں کے برحق ہونے اور شیعوں کے باطل پر ہونے کے دو گواہ عادل ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے: "إِنِّي قَارِكٌ بَيْنَكُمْ الْقَلْبَيْنِ مَا إِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِي أَخْلَعُ مَا أَغْظَمُ مِنَ الْأَخْبَرِ كِتَابُ اللَّهِ وَحُجَّتِي أَهْلُ بَيْتِي"..... "یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں تم میں دو چیزیں بھاری چھوڑے جاتا ہوں جب تک تم ان دونوں کو پکڑے رہو گے گمراہ نہ ہو گے، ایک ان میں دوسرے سے بڑا ہے وہ دونوں کیا ہے ایک تو کلام اللہ دوسرے میرے اہل بیت۔ فقط" اور اس حدیث کو سنی شیعہ دونوں فریق باتفاق برسرِ چشم رکھتے ہیں اور اس کی حدیث ہونے کے قائل ہیں۔

القصد شیعہ اب اگر تین پانچ کریں تو یوں کریں کہ موافق حدیثِ مطہورہ کلام اللہ اور عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنیوں کے برحق ہونے اور شیعوں کے باطل پر ہونے کے دو گواہ عادل بہت ہیں لیکن اس بات کو کیا کیجئے کہ اقوالِ عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہم تک پہنچے ہیں تو وہ سب کے سب امام معصوم متجانب الدعوات اعمیٰ امام محمد باقر علیہ السلام کی بددعا میں جس کا ابھی مذکور ہوا داخل ہیں کیونکہ ہمارے سارے پیشوا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے صدیق ہونے کے منکر ہیں، ان سب کا قول ہر چہ با دابا قابلِ تسلیم نہ رہا کیوں کہ بددعا تو یہی ہے کہ خدا ان لوگوں کی بات سنی نہ کرے، پھر جب ان کی بات ہی سنی نہ ہوئی تو ان کی روایات کیا اعتبار؟

مع ہذا اکثر پیشوایان مذہب شیعہ اور راویان اخبار صحیحہ مذہب مذکور کافر مطلق اور بے دین محض تھے کہ فتویٰ شیعہ بھی ان کے حق میں بجز تکفیر اور نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بعض بعض کا احوال کچھ اوپر آیت محمد رسول اللہ ﷺ کے ترجمہ اور متعلقات میں گزر چکا اور اوروں کا حال کچھ نہ پوچھئے کہ پردہ ہی میں بہتر ہے، زرارة بن اعین کے باب میں تو امام جعفر صادق نے اس بات کی گواہی دی کہ وہ اہل نار سے ہے۔ چنانچہ کتب معتبرہ میں ابنِ سنان سے موجود ہے اور قاضی نور اللہ صاحب رقم فرماتے ہیں کہ زرارة بن اعین کے چار بھائی حمران، عبدالملک، بکیر، عبدالرحمن اور زرارة کے دو بیٹے حسن حسین اور بیٹے یعنی چاروں بھائیوں کے بیٹے حمزہ محمد خلیل، عبداللہ جہم، عبدالجید، عبدالاعلیٰ عمر سب کے سب زرارة بن اعین کا سا عقیدہ رکھتے تھے یعنی مثل زرارة، سب اس بات کے قائل تھے کہ خداوند کریم ازل میں جاہل تھا (نعوذ باللہ منها) تو اس صورت میں "كُنَّا بِكُلِّ خَسِيءٍ

غَالِبِیْن" کے مضمون کے منکر تھے اور آپ جانتے ہی ہیں کہ کلام اللہ کا منکر کون ہوتا ہے۔

علیٰ بن القیاس اوروں کو سمجھتے یہ تو بڑے مقتداؤں اور بڑے حاملان اخبار کا ذکر ہے اور طحاوی اور مجاہل کا کچھ حساب ہی نہیں، پھر ہم اپنی روایات کا کس طرح اعتبار کریں۔ اس صورت میں ایک گواہ کی گواہی تو ہمارے نزدیک مسلم، یعنی کلام اللہ کا فرمانا تو خیر جبراً کرنا برسرِ کیونکہ ہر قرن میں بتواتر منقول ہوتا رہا ہے، پر دوسرے گواہ کی گواہی یعنی اہلبیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی جب قابل اعتبار ہو کہ وہ بھی ایسی ہی طرح منقول ہو اور یہ بھی نہیں تو سند ایسی تو ہو کہ اس کے راوی دیندار مؤمن ہوں کافر تو نہ ہوں، سو چونکہ ہماری روایات کے ایسے راوی نہیں اور سنہوں کا ہمیں پہلے سے اعتبار نہیں تو فقط ایک گواہ باقی رہ گیا اور شریعت میں ایک گواہ کا اعتبار نہیں، اس لیے ہم صحابہ کے معتقد نہیں ہو سکتے گو اس میں ہمارے مذہب کی ہی بیخ و بنیاد اُکھڑ جائے اور سب کو یہ معلوم ہو جائے کہ شیعوں کے دین اور روایات کا یہ حال ہے:

شادم کہ از رقیباں دامن کشان گذشتی گوشت خاک ما ہم بردار رفتہ باشد
سواس کا جواب ہمارے پاس ہر چند بوجہ عقل بہت کچھ ہے لیکن اب بھی بہتر ہے کہ یوں کہا جائے
کہ اگر تم ہماری ضد میں اپنے مذہب سے بھی دست بردار ہوئے تو صاحب ہم ہمارے تم جیتے۔ خیر اب
بفضلہ تعالیٰ یہ بات ثابت ہو گئی کہ بشہادت عقلین اُنی کلام اللہ اور عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
مذہب شیعہ غلط ہے اور یہی فقط مقصود تھا تو اب مناسب یوں ہے کہ بقدر مناسب اور باعزازہ فرصت
مولوی عمار علی صاحب کے خط کی بھی خبر لیجئے مگر مناسب یوں ہے کہ اوّل اس خط کو لفظاً لفظاً نقل کیجئے
تا کہ تاخرین جواب کو لذت کامل نصیب ہو اس لیے اوّل وہ خط ہی پیش نظر کرتا ہوں، وہ خط یہ ہے:

نقل خط مولوی عمار علی

میر صاحب مظہر عنایت و کرم مجمع محمد شیم زاد فضلہ و کرمہ بعد سلام کے واضح خدمت عالی ہووے
کہ عنایت نامہ تمہارا پہنچا، جو کچھ آپ نے لکھا تھا معلوم ہوا آپ نے لکھا تھا کہ مجھے صحت علماء شیعہ
سے فدک کے غصب ہونے میں نہیں ہوتی۔ صورت اس کی یہ ہے کہ آپ کی ملاقات کسی عالم واقف
اور خبردار سے آج تک حاصل نہیں ہوئی، اگر مجھ سے آپ کی ملاقات ہووے اور میری زبانی آپ
سنیں تو آپ پر واضح ہو جاوے کہ اہل سنت بالکل غلطی پر ہیں اور ہٹ دھرمی کرتے ہیں اور بھس پر لپٹا
لیپتے ہیں اور تین سوال جو آپ نے عبدالحق کی طرف سے لکھے تھے ان کا جواب مختصر یہ ہے کہ سوال
اوّل میں آپ نے لکھا تھا کہ رسول خدا کی بیٹیوں کا نکاح کس سے ہوا، یہ سوال بے محل ہے، اس واسطے

کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے نطفہ سے ایک بیٹی تھی فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا، سو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب تھی اور دو بیٹیاں جو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلسنت مشہور کرتے ہیں وہ دونوں حضرت کے نطفہ سے نہ تھیں بلکہ وہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پہلے شوہر کے نطفہ سے تھیں، ہمراہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے آئی تھیں اور نام ان دونوں صاحبزادیوں کا رقیہ اور ام کلثوم رضی اللہ عنہن تھا۔ ابن حجر محدث المل سنت نے کتاب اصاہہ میں لکھا ہے کہ ایک کا نکاح تو ان میں سے عتبہ بن ابی لہب سے ہوا تھا اور دوسری کا نکاح ابوالعاص بن الربیع سے اور یہ دونوں کافر تھے لہجے، بعد اس کے نکاح ان دونوں کا عثمان سے ہوا جس وقت کہ باوجود قوت اسلام کے کافروں کے نکاح میں رہی ہیں اور پیغمبر خدا نے ان سے علیحدہ نہ کیا۔ اگر عثمان کے نکاح میں آئیں تو کیا قباحت ہے۔ عثمان تو خود مسلمان تھا، حضرت کے دو برو اور ان کافروں سے بدبچہ بہتر تھا۔

البتہ بعد وفات جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسی بدعتیں عثمان نے کیں کہ عائشہ رضی اللہ عنہا اس کے حق میں کہتی تھی ”اقتلوا نعلنا لعن اللہ نعلنا اقتلوا حراق المصاحف“ یعنی قتل کرو اس ریش دراز کو لعنت کرو اس ریش دراز پر، قتل کرو اس قرآن کے جلانے والے کو، چنانچہ استیعاب میں لکھا ہے یہاں تک بدعتیں کیں کہ صحابہ رسول نے تنگ ہو کر اسے قتل کیا، یہ سب ماجرا مل سنت کی کتابوں میں مذکور ہے، اگر سند اس کی مطلوب ہوگی تو روانہ کر دی جائے گی اور اگر یہ دونوں صاحبزادیاں بھی رسول خدا کے نطفہ سے ہوتیں تو ان کے فضائل کچھ مذکور ہوتے جیسے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے فضائل سنی، شیعہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ سیدۃ النساء العالمین سیدۃ النساء الملیٰ الجبرۃ، العالمۃ ضد منیٰ اور سو اس کے فضائل فاطمہ رضی اللہ عنہا کے صدہا کتابوں میں مذکور ہیں اور ان دونوں کے فضائل ایسے مذکور نہیں ہیں، اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نطفہ سے ہوتیں تو البتہ مذکور ہوتے۔

سوال دوسرا، علی رضی اللہ عنہ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے بہتر جنگیں کیں، اگر باغ فدک اصحاب ملاحہ نے غصب کیا تھا تو علی نے ان پر جہاد کیوں نہ کیا، جواب اس کا یہ ہے کہ یہ سوال بھی غلط ہے اس واسطے کہ علی نے عائشہ سے بہتر جنگیں نہیں کیں بلکہ ایک جنگ کی تھی سو عائشہ رضی اللہ عنہا کو شکست ہوئی۔ چنانچہ اہلسنت کی کتابوں میں لکھا ہے اور فدک کے غصب کرنے سے جہاد لازم نہ ہوا تھا، اس واسطے کہ جہاد مال دنیا کے غصب کرنے سے واجب نہیں ہے بلکہ پیغمبر اور امام واسطے ترقی دین کے جہاد کرتے ہیں نہ واسطے مال دنیا کے اور علی کے پاس جہاد کرنے کو انصار کب تھے کہ وہ جہاد کرتے، جہاد کرنے کا حکم تنہا کے واسطے نہیں ہے بلکہ جس وقت انصار و مددگار بہم

پہنچیں اس وقت جہاد کرنا چاہیے، جیسے کہ رسول خدا جب تک مکہ میں رہے بسبب نہ ہونے انصار کے حکم جہاد کا نہ ہوا، جب مدینہ گئے کافروں کے خوف سے ہجرت کر کے: انصار بہم پہنچے تو جہاد کفار پر کیا اور جب تک مکہ میں رہے کچھ نہ ہوسکا بلکہ کچھ مددگار بھی وہاں موجود تھے۔ ان مددگاروں میں ایک علی بھی تھے ان سے بھی کچھ نہ ہوسکا، آخر کفار کے خوف سے سب نے اپنا وطن اصلی چھوڑ دیا مگر ایسے ہی حال علی کا بعد رسول خدا کے تھا کہ خلفاء ثلاثہ کے زمانہ میں ان کو انصار و مددگار بہم نہ پہنچے تو جہاد نہ کیا اور جب بہم پہنچے تو عائشہ پر بھی جہاد کیا اور معاویہ پر بھی۔

اور سوال تیسرا یہ کہ علی کی بیٹیوں کا نکاح کس سے ہوا تھا، جواب اس کا یہ ہے کہ فاطمہ کے پیٹ سے علی کی دو بیٹیاں تھیں، بڑی بیٹی زینب کہ جس کا نکاح عبداللہ بن جعفر طیار سے ہوا تھا اور دوسری بیٹی کلثوم تھی کہ جس کا نکاح محمد بن جعفر طیار سے ہوا تھا، فقط یہی سوال تھا جس کا جواب ہوا اگر کچھ زیادہ لکھتے تو زیادہ لکھا جاتا اور فدک کا غصب ہونا جو آپ نے دریافت کیا تھا اس کو ایک دفتر چاہیے لیکن کچھ مختصر تھوڑا سا آپ کی خدمت میں تحریر کرتا ہوں، اگر آپ کی طبیعت میں انصاف ہے تو اسی قدر کفایت کرتا ہے اور جو کچھ لکھتا ہوں یہ سب اہل سنت کی معتبر کتابوں سے ہے جس شخص کو کچھ تردد ہو مطابق کر لے اور بعد اس کے انصاف کرے کہ یہ ظلم ہے یا نہیں؟ جلال الدین سیوطی نے تفسیر درمنثور میں اور شیخ علی متقی نے کنز العمال میں اور ابوعلی موصلی نے اپنی مسند میں اور صاحب معارج النبوة نے معارج النبوة میں اور سوا اس کے اور علماء اہل سنت نے روایت کی ہے کہ جس وقت نازل ہوئی آیت "وات ذا القربنی حقہ" یعنی دے تو اے محمد قریبوں کو حق ان کا، تو اس وقت پیغمبر خدا نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا کہ قریب میرے کون ہیں اور حق ان کا کیا ہے جبریل علیہ السلام نے عرض کی کہ قریب تمہارے فاطمہ ہے اور حق اس کا فدک ہے، فدک اس کو دیدو اس وقت رسول خدا نے فدک فاطمہ کو دے دیا، پس تحریر سے ان علماء کی ثابت ہوا کہ رسول خدا نے فاطمہ کو فدک دیا اور فاطمہ مالک فدک کی تھی۔

جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے رحلت فرمائی اور ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو فدک کو فاطمہ سے چھین لیا اور ان کا قبضہ اٹھا دیا، اب فرمائیے؟ کہ یہ غصب نہیں تو کیا ہے؟ اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ تاریخ آل عباس کہ کتب معتبرہ اہل سنت سے ہے اس میں لکھا ہے کہ جس وقت اولاد حسین نے مامون رشید خلیفہ عباسی سے دعویٰ فدک کا کیا تو اس نے دو صد علماء اہل سنت جمع کر کے کہا کہ حال فدک کا راست راست بیان کرو، انہوں نے بروایت واقدی اور بشیر بن ولید

بیان کیا کہ بعد فتح خیبر آیت "وآت ذال القربیٰ حقہ" نازل ہوئی تو رسول خدا نے جبریل سے پوچھا کہ ذوالقربیٰ میرے کون ہیں اور حق ان کا کیا ہے؟ جبریل علیہ السلام نے عرض کی کہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا تمہاری قریب ہے اور حق اس کا فدک ہے، اس وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک دے دیا، جب ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک سے منع کیا تو فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ فدک مجھ کو میرے باپ نے دیا ہے، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قبول کیا اور چاہا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کاغذ معافی کا لکھ دے اور فدک فاطمہ رضی اللہ عنہا کو پھیر دے، اس وقت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے گواہ طلب کر کہ پیغمبر خدا نے اس کو کب دیا ہے؟ اس وقت فاطمہ زہرا، حضرت علی اور ام ایمن کا ایک بی بی تھیں اور حسنین علیہ السلام کو گواہ اپنا لائی اور انہوں نے گواہی دی کہ پیغمبر خدا نے فاطمہ کو فدک دیا ہے تو اس وقت ابو بکر نے فاطمہ کو کاغذ فدک کا لکھ دیا کہ اپنے حق پر قابض ہو دے، عمر نے وہ کاغذ ابو بکر سے لے کر پھاڑ ڈالا اور کہا کہ فاطمہ ایک عورت ہے اور علی اس کا شوہر ہے اپنے نفع کے لیے کہتا ہے، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی قبول کیا اور یہ دعویٰ کرنا فاطمہ کا ابو بکر سے بہت فدک کا اور گواہی دینا علی اور حسنین کا اور ام ایمن کا اور رد کرنا اور نا منظور کرنا ابو بکر کا ان کی گواہی کو اہلسنت کی بہت کتابوں میں لکھا ہے، مثل صواعق محرقہ اور فصل الخطاب اور معجم البلدان اور ریاض المعرہ اور کنز العمال اور تاریخ حاکم اور جمع الجوامع اور شرح مواقف اور نہایت المعقول اور سوا اس کے بہت کتابوں میں ہے لیکن ابو بکر نے فاطمہ کو اور اس کے گواہوں کو اس دعوے میں جھوٹا جانا اور سوائے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے جس کسی نے ابو بکر سے دعویٰ کیا اس کو ابو بکر نے سچا جانا اور گواہ اس سے طلب نہ کیے جو کچھ اس نے مانگا دے دیا۔

چنانچہ صحیح بخاری میں جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتا ہے کہ میں ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا اور میں نے کہا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مال بحرین کا آدے گا تو میں تجھ کو اس میں سے اس قدر مال دوں گا اور مال بحرین کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نہ آیا لیکن اب تمہارے پاس آیا ہے تم اس میں سے مجھ کو دو کہ حضرت نے مجھ سے وعدہ کیا تھا، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ بات سن کر اسی وقت تین مٹھی مال کی مجھے بھر کر دی اور گواہ مجھ سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدہ کرنے کے طلب نہ کیے اور فتح الباری شرح صحیح بخاری میں وجہ اس کی اس طرح لکھی ہے کہ ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو جابر سے گواہ طلب نہ کیے اور دعویٰ کرتے ہی مال اس کو دے دیا، سبب اس کا یہ ہے کہ جابر صاحبی معاذ اللہ

پیغمبر خدا پر جھوٹا دعویٰ کرے کہ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر جابر سچا نہ ہو تو پھر کون سچا ہو سکتا ہے؟ اس واسطے ابو بکر نے اس سے گواہ طلب نہ کئے اور بدون گواہی اس کو مال دے دیا، اب کہتا ہوں میں کہ وائے بردینداری اہل سنت کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جو کہ پارہ جگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہے جابر کے برابر بھی نہ جانا کہ ادنیٰ صحابی تھا اور ان کے نزدیک فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مرتبہ جابر کے برابر بھی نہ ہوا کہ جابر کو تو بدون گواہوں کے مال دے دیا اور اس کو جھوٹ سے بچایا اور کہا کہ جابر سچا نہ ہوگا تو اور کون سچا ہوگا؟ اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جھوٹا سمجھ کر اس سے گواہ طلب کیے جب گواہوں نے اس کی گواہی دی تو ان کی گواہی کو رد کیا، علی رضی اللہ عنہ کو تو کہا کہ یہ شوہر اس کا ہے اپنے نفع کے لیے کہتا ہے۔ علی کو بھی جھوٹا جانا ہر چند علی بھی صحابی تھے لیکن جابر رضی اللہ عنہ کے برابر سچے نہ تھے اور حسین کو کہا یہ فرزند اس کے ہیں اور لڑکے ہیں اور ام ایمن جو باقی رہی وہ ایک عورت ہے اس کی گواہی کیسے درست ہو دے۔

اب فرمائیے کہ یہ غصب نہیں تو اور کیا ہے۔ سو اس کے اور غصب کس کو کہتے ہیں؟ اور یہ عداوت ہے یا دوستی؟ اور مروت اور رعایت حق رسول؟ اور حق اور سچ تو یہ ہے کہ اہل بیت کی دشمنی میں حق رسول کی بھی رعایت نہ کی۔ آپ نے لکھا تھا کہ مجھے غصب فدک کی کسی سے صحت نہیں ہوتی، اب آپ کو چاہیے کہ میری صحت علماء سنت سے کرائیے اور میری باتوں کا جواب لکھوا کر بھجوائیے کہ کیا سبب ہے کہ جابر کو سچا جانا اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جھوٹا سمجھا اور اس مظلومہ کے گواہوں کو بھی رد کیا اور یہ بھی سننا چاہیے کہ جب فاطمہ نے جانا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مجھے بہہ فدک میں جھوٹا سمجھا تو اس معصومہ نے دعویٰ وراثت کا کیا اور ابو بکر سے کہا کہ میں پیغمبر خدا کی بیٹی ہوں، مجھے ان حضرت کا مال وراثت میں پہنچتا ہے اور فدک میرے باپ کا مال ہے مجھے دے دے، اس وقت ابو بکر نے ایک جھوٹی روایت قرآن کے خلاف بنا کر کہا کہ میں نے پیغمبر خدا سے سنا ہے کہ وہ حضرت فرماتے تھے کہ انبیاء کا مال سب صدقہ ہے کسی کو ان کے وارثوں میں سے نہیں پہنچتا۔ اول تو یہ روایت خلاف قرآن کے ہے، دوسرے یہ کہ پیغمبر خدا نے اپنے وارثوں میں سے نہ بیٹی سے نہ اپنی بیٹیوں سے کسی سے نہ کہا کہ میرا مال صدقہ ہے تم کو نہیں پہنچتا، تم دعوے نہ کرنا اور حکم خدا کا جو کچھ ان کے واسطے تھا، اس کو ان سے چھپا کر رکھا اور ایک اجنبی شخص سے کہ اس کو کسی طرح کا دخل پیغمبر خدا کی وراثت میں نہ تھا اس کے کان میں کہہ دیا اور کسی دوسرے صحابی سے بھی نہ کہا۔

لیکن باوجود اس کے پھر ایک مرتبہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس گئی اور اس

وقت ابو بکر رضی اللہ عنہ منبر پر تھے، کہا کہ اے ابو بکر! تیری بیٹی تو تیرا ترکہ پاؤں اور میں اپنے باپ کا ترکہ نہ پاؤں، اس وقت ابو بکر رضی اللہ عنہ منبر سے نیچے اتر اور کہا کہ لے میں تجھ کو فدک دیتا ہوں یہ کہہ کر فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کاغذ لکھ دیا، اتنے میں عمر رضی اللہ عنہ آئے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ یہ کیسا کاغذ ہے کہا کہ میں نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک لکھ دیا ہے، عمر رضی اللہ عنہ نے وہ کاغذ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے لے کر پھاڑ ڈالا اور کہا کہ لوگوں کو کیا دے گا؟ عربوں سے لڑائی ہو رہی ہے۔

چنانچہ یہ روایت سبط ابن جوزی نے اپنی سیرت میں تحریر کی ہے اور واقعی محدث اہل سنت اور برہان الدین حلبي شافعی نے اپنی سیر میں لکھا ہے فاطمہ نے ابو بکر سے دعویٰ فدک کا کیا کہ فدک میرا ہے میرے باپ نے مجھ کو دیا تھا، اس وقت ابو بکر نے فاطمہ کو فدک کا کاغذ لکھ دیا، جب فاطمہ رضی اللہ عنہا وہ کاغذ لے کر وہاں سے پھری تو رستہ میں عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی، عمر نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ یہ کیسا کاغذ ہے؟ فاطمہ نے کہا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مجھ کو فدک لکھ دیا ہے، عمر رضی اللہ عنہ نے وہ کاغذ ہاتھ فاطمہ سے چھین کر پھاڑ ڈالا، اگر کوئی کہے کہ ابو بکر اس میں کیا قصور ہے، اس نے تو لکھ دیا تھا، جواب اس کا یہ ہے کہ ابو بکر حاکم تھا اس کو اس امر میں تابعداری عمر کی نہ چاہیے تھی، عمر رضی اللہ عنہ کو اس شر سے باز رکھتا اور اس کے کہے پر عمل نہ کرتا لیکن وہ تو اس کا ہر امر میں شریک تھا اس کے مشورہ بدو نہ کچھ نہیں کر سکتا تھا اور میں کہتا ہوں کہ اگر صحابہ ابو بکر کو اس امر میں سچا جانتے تھے اور علی بھی ابو بکر کو سچا جانتے تھے کہ ابو بکر سچ کہتا ہے پیغمبر خدا کا سب ترکہ صدقہ ہے کسی کو نہیں پہنچتا تو پھر علی اور عباس رضی اللہ عنہم نے عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں عمر رضی اللہ عنہ سے جا کر کیوں دعویٰ کیا؟ پیغمبر کے ترکہ کا اس وقت عمر نے علی اور عباس کو کہا کہ تم ابو بکر رضی اللہ عنہ کو کاذب اور خائن اور غدار اور آثم جانتے تھے اور مجھے بھی تم دونوں کاذب اور خائن اور غدار اور آثم جانتے ہو اور میں وہی کروں گا جو کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کرتا تھا یہ روایت صحیح مسلم میں لکھی ہے۔

اور مسند احمد بن حنبل میں لکھا ہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں عثمان سے بھی پھر دعویٰ کیا تھا، پس اگر ابو بکر سچا ہوتا تو ان کے زمانہ میں دعویٰ ہرگز نہ کرتے، معلوم ہوا کہ ابو بکر اس روایت میں بالکل جھوٹا تھا، ازراہ عداوت کے روایت بنا کر فاطمہ کا حق غصب کیا اور عمر خود علی اور عباس سے اقرار کرتا ہے کہ تم ابو بکر کو کاذب اور خائن جانتے تھے اور مجھے بھی تم کاذب اور خائن جانتے ہو۔ پس جس وقت علی نے ان کو کاذب اور خائن جانا تو بیشک ہم بھی ان کو کاذب اور خائن جانیں گے اور یہی مطلب غصب سے ہے اور صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ جس وقت

ابوبکر نے مذک کے دینے سے انکار کیا تو فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اس پر غضب ناک ہوئی اور تمام عمر پھر کبھی اس سے کلام نہ کیا اور صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ فاطمہ نے وقت مرنے کے وصیت کی کہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما میرے جنازہ پر نہ آنے پائیں۔ فقط

جواب خط

یہاں تک خط مذکور کی عبارت تھی بلکہ بلا کم و کاست لفظاً لفظاً نقل کر دیا ہے لیکن اب ہماری بات سننے کے لیے بھی تیار ہو جائیے تاکہ مولوی صاحب کی اس طمطراق کی حقیقت اور مولوی صاحب کی قابلیت اور علماء شیعہ کی فہم و فراست بخوبی معلوم ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ یہ خط ہر چند عبارت میں تو زیادہ لیکن مثل غذا لکلیل الکیموس کہ باوجود قلت کیموس کے سنی الکیموس بھی ہو خلاصہ نکالے۔ تو کل دو چار ہی باتیں ہیں پھر وہ بھی غلط اگر اعتبار نہ آئے تو دیکھئے۔

اول مولوی صاحب یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نطفہ سے فقط ایک ہی بیٹی تھی جن کا نام حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا تھا اور اہل سنت جو دو بیٹیاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور مشہور کرتے ہیں وہ آپ کے نطفہ سے نہ تھیں بلکہ حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے پہلے خاوند کے نطفہ سے تھیں، خیر غنیمت ہے کہ جناب مولوی عمار علی صاحب نے اتنا تو لحاظ رکھا کہ حضرت خدیجہ الکبریٰ کی اولاد ہونے سے تو ان کو خارج نہیں کیا۔ ہم ایسی نا انصافی پر اس کے بھی شکر گزار ہیں ورنہ جہاں مولوی صاحب نے جرأت کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا نسب منقطع کیا تھا اگر حضرت خدیجہ الکبریٰ سے بھی ان کا نسب منقطع کر دیتے جیسے بعض ایسے ہی دشمنان پہناتی اہل بیت نے کیا ہے تو کون مانع تھا۔ بات یہ ہے کہ اس جگہ تو مولوی صاحب نے غیرت کی ناک ہی کتر لی ہے اور موافق مثل مشہور: ”دروغ گویم بروئے تو“ یہ ستم کیسے ہیں کہ سنیوں کی ضد میں اہل بیت پر جفا کر کے (سوکھی) اپنے ایمان پر بھی تو قلم پھیر گئے، نہ کلام اللہ کی سنی نہ اپنی معتبر کتابوں کا لحاظ کیا، آفرین ہے کیوں نہوں مولوی عمار علی..... ع..... ”ایں کا باز تو آید و مرداں چنیں کنند“

بنات طیبات از روئے کلام اللہ شریف

برائے خدا اہل انصاف بے روی و رویا ہو کر میری گزارش کو سنیں اگر بیجا ہو جب ہی کہیں، کلام اللہ موجود ہے اگر مولوی عمار علی صاحب کو یہ طرز ہو کہ شیعوں کو کلام اللہ یاد نہیں ہوتا، ہم کلام اللہ کے حوالوں کی کیونکر تصدیق کریں تو میں پتے دار تلاتا ہوں۔ سورۃ احزاب میں ہائیسویں پارہ میں

قریب ریل کے آخر کے رکوع سے پہلے رکوع کے شروع ہی میں یوں ارشاد فرماتے ہیں:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُلْبَسْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ خَلَائِفِهِنَّ

”یعنی کہہ دے اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی بیبیوں اور بیٹیوں کو اور مومنوں کی عورتوں کو کہ اپنے اوپر اپنی چادریں ڈال لیا کریں۔“ فقط

اب گزارش یہ ہے کہ اتنی بات تو مولوی عمار علی صاحب بھی سمجھتے ہوں گے کہ سات جمع ہے اور جمع کم سے کم تین پر بولی جاتی ہے اور اگر کبھی توسع کر کے دو پر بھی اطلاق کر دیں تب بھی ایک سے تو زیادہ ہی ہوگا۔ بہر حال یہ کہنا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سوا اور کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیٹی ہی نہ تھی تب بھی غلط ہوگا۔ فسوس مولوی صاحب کو اتنی شرم بھی تو نہ آئی کہ کوئی سنے گا تو کیا ہوگا مگر مولوی صاحب نے ہم جانے یہ سن رکھا ہے۔ ”الحیاء یمنع الرزق“ یعنی حیاء رزق روک دیتی ہے اس لیے شاید اس پر بھی دھیان نہ فرمایا، الحیاء شعبۂ من الایمان کیونکہ ایمان کا ثمرہ بالقرض کچھ ہوا بھی تو آخرت میں ہوگا، رزق تو آج ہاتھ سے جائے ہے اور پہلے لوگ فرما گئے ہیں۔

”نقد رہنسیہ گذشتن کار خرد منداں نیست“

بالجملہ یا تو مولوی صاحب یہ تسلیم فرمائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی بیٹیاں تھیں، پھر یہ آپ تسلیم کریں گے کہ وہ حضرت رقیہ وغیرہا تھیں کیونکہ سوال ان کے اور کسی کی نسبت تو کسی نے یہ دعویٰ کیا ہی نہیں ورنہ آیات ربانی کے منکرین کے لیے یہ تازیانہ موجود ہے۔ ”وَمَا يَجُوزُ بِأَيَاتِنَا إِلَّا الْكَافِرُونَ“..... ”یعنی نہیں انکار کرتے ہماری آیات سے مگر کافر“ اور اگر کافر بن جانا گوارا کریں اور اس بات کو نہ مانیں کہ سوا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور بھی کوئی بیٹی تھی تو ناچار پھر ہمیں شیعوں ہی کی کتابوں کی سند دینی لازم ہوگی انہیں تو جھوٹا نہیں بتائیں گے اور اگر ہماری ضد میں ان سے بھی دست بردار ہوں تو سبحان اللہ ”چشم مارو شن دل ماشا“

بنات طیبات کی تعداد از روئے کتب شیعہ

بہر حال اس اُمید پر اس باب میں روایات کتب معتبرہ شیعہ ہی نقل کرتے ہیں۔ نفع البلاغت میں جو شیعوں کے نزدیک مثل صحیفہ آسمانی اور آیات قرآنی کے ہے اور اس کے مردیات کو سب اثنا عشریہ متواتر سمجھتے ہیں۔ علامہ رضی جو اس کے جامع ہیں حضرت امیر کا قول حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خطاب میں یوں نقل فرماتے ہیں: ”قَدْ بَلَغْتُ مِنْ جَهَنَّمَ صَلَی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم مَا لَمْ يَنَالْهُ“ یعنی انہیں حاصل اس کا یہ ہوا کہ حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عثمان ذی النورین کو کسی

مقام میں یوں فرماتے ہیں کہ تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دامادی کا وہ شرف میسر آیا ہے کہ ابوہریرہ صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بھی میسر نہیں آیا اور شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی تہذیب میں جو صحاح اربعہ شیعہ میں سے ہے اور ہم سنگ کافی کلینی ہے۔ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے یوں روایت کرتے ہیں: ”كَانَ يَقُولُ لِي دُعَايِهِ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی رُقِيَّةَ بِنْتِ لَبِيْكَ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی اُمِّ كُلثُوْمٍ بِنْتِ نَبِيِّكَ“..... ”یعنی حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ دعائیں یوں کہا کرتے تھے کہ یا اللہ! رحمت بھیج حضرت رقیہ پر جو تیرے نبی کی بیٹی ہیں، یا اللہ رحمت بھیج حضرت اُم کلثوم پر جو تیرے نبی کی بیٹی ہیں۔“ اور اس پر بھی تسکین خاطر نہ ہوا اور جناب مولوی صاحب قبلہ اپنی دعویٰ مرفیٰ کی ایک ہانگ گائے جائیں اور اس کی یوں تاویل کرنے لگیں کہ عرف کی رو سے انہیں بیٹیاں کہہ دیا ہوں، لے پالک کو سارا جہاں بیٹا بیٹی کہا کرتے ہیں ورنہ حقیقت میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی بیٹی تھیں اور میں بھی ان شام اللہ مولوی صاحب سے تسلیم ہی کرا کر چھوڑ دوں گا۔ کلینی میں روایت موجود ہے:

تَزَوَّجَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ خَدِيجَةَ وَهُوَ ابْنُ بَضْعَ وَعِشْرِينَ سَنَةً فَوُلِدَ لَهُ مِنْهَا قَبْلَ بَيْعِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ الْقَاسِمُ وَرُقِيَّةٌ وَزَيْنَبُ وَأُمُّ كُلثُوْمٍ وَوُلِدَ لَهُ بَعْدَ الْمُبْعَثِ الطَّبِيُّ وَالطَّاهِرُ وَالْوَاطِئَةُ.

”حاصل اس روایت کا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے جب نکاح کیا تو اس وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر شریف کچھ اوپر بیس برس کی تھی، سو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ کے نطفہ سے پہلے نبوت کے تو حضرت قاسم اور حضرت رقیہ اور حضرت زینب اور حضرت اُم کلثوم پیدا ہوئے اور بعد نبوت کے حضرت طیب اور حضرت طاہر اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہم اجمعین پیدا ہوئے۔“

اس روایت میں شیعوں کو کچھ تین پانچ کرنے کی گنجائش نہیں، لے پالک ہونے کے احتمال کو بھی پیش نہیں کر سکتے اور اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چار صاحبزادیاں تھیں، ایک تو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور تین اور۔ حضرت زینب، حضرت رقیہ، حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہن اور یہی سنیوں کا دعویٰ ہے۔

پر مولوی صاحب نے کمال تورع کے باعث تین کے عدد کو منہ پر لانا بھی گوارا نہ کیا اور اہل سنت کی طرف دعویٰ صاحبزادہوں کا سوائے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دعویٰ کرنا بیان کیا۔ مع ہذا انہوں نے سمجھا حریف کی بات کو مٹا گھٹایا جائے مناسب ہے، سبحان اللہ! اس پر تاجر، اہل سنت کی بیسیوں کتابوں

کے نام گنا تے چلے جاتے ہیں کوئی جانے مولوی صاحب کی نظر میں سب گزری ہوئی ہیں، حضور کو اس بات کی تو خبر ہی نہیں جو زبان زد عام و خاص اہل سنت ہے، اہل سنت کی کتابوں کو دیکھنا تو کہاں نصیب؟ میں جانوں کسی سنی طالب علم سے کتابوں کے نام سن بھاگے ہیں ورنہ بعضی بعضی کتابیں جو حضور نے رقیہ کریمہ میں ان کے حوالہ سے غصب فدک بیان فرماتے ہیں شاید خواب میں بھی نہ دیکھیں ہوں۔ خصوصاً جمع الجوامع اور مسند احمد بن حنبل، علیٰ ہذا القیاس اور کتابیں بھی ایسی ہی ہیں۔ ہر چند بعد اس تحریر کے مجھ کو کچھ ضرورت تحریر نہیں، اہل فہم اور اہل انصاف کے نزدیک دھوکہ بات ہوگی۔

مذکور نہ ہونا معدوم ہونے کی دلیل نہیں ہے

لیکن مولوی صاحب کی خوش فہمی کی تعریف بھی ہمارے ذمہ واجب ہے، جناب مولوی صاحب اس دعوے کی دلیل کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے سوا حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی صاحبزادی نہ تھی، یوں رقم فرماتے ہیں ”کہ اگر حضرت رقیہ اور حضرت اُم کلثوم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں ہوتیں تو ان کے فضائل بھی مذکور ہوتے۔ جیسے حضرت زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے فضائل طرفین کی کتابوں میں موجود ہیں، کیا دلیل ہے؟ کسی نے ایسوں ہی کی تعریف میں کہا ہے کہ..... ع.....“ بریں فہم و دانش بیاید گریست“ اگر مولوی صاحب کو قواعد استدلال کی خبر نہ تھی تو کسی سے پوچھ لیتا تھا۔ آخر اتنا بھی اوروں ہی کی تے جشی کے بھروسے پر ہے، جب ہی تو یوں بے تحقیق جو چاہا لکھ دیا، جناب مولوی صاحب معقولات کے طور پر تو اتنا ہی جواب بہت ہے کہ عدم الاطلاع یا عدم الذکر عدم لثے پر دلالت نہیں کرتا لیکن آپ کے سامنے تو بے نقل کام نہیں چلتا کیونکہ کمال تورع سے معقولات کے ذکر کو آپ حرام ہی جانتے ہوں گے۔ جناب ہاری تعالیٰ سورہ نساء کے آخر میں ارشاد فرماتا ہے: ”وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَمْ نَقُصُّهُمْ عَلَيْكَ“.....“ یعنی بہت رسول تو ایسے ہیں کہ ان کا قصہ ہم نے تجھ سے پہلے ہی کہلایا ہے، اور بہت سے رسول ایسے ہیں کہ ان کا قصہ اور احوال ہم نے تجھ سے بیان ہی نہیں کیا۔“ غرض اگر کسی کا ذکر نہ کرنا اس کے عدم کی دلیل ہوا کرے تو لازم آئے کہ سوا ان رسولوں کے جن کا کلام اللہ میں مذکور ہے (نعوذ باللہ منہ) کوئی اور رسول پیدا ہی نہ ہوا ہو۔ مع ہذا یہ کچھ لازم ہے کہ کسی بزرگ کی اولاد سب کی سب برابر ہوا کرے اور اگر اس بات کو مانیں تو مولوی صاحب سنبھل کر مانیں۔ پھر حضرت امام محمد باقر اور زید شہید کو جو ان کے بھائی تھے برابر کہنا پڑے گا یہ تو مولوی صاحب نے فرمایا ہوتا کہ اہل سنت حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور

حضرت اُم کلثوم کو برابر سمجھتے ہوں۔ حاشا وکلا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جو شرف ہے، وہ اور کے لیے نہیں۔ ”ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَّشَاءُ“

عمار علی کی تاریخ دانی

باقی یہ جو مولوی صاحب رقم فرماتے ہیں کہ حضرت زُقیہ اور حضرت اُم کلثوم میں سے ایک کا نکاح ابوالعاص سے ہوا تھا۔ یہ مولوی صاحب کی قوت حافظہ کی دلیل ہے۔ ”آرے دروغ گور حافظہ نباشد“ جناب من ابوالعاص سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح ہوا تھا اور وہ دونوں صاحبزادیاں جن کا نام آپ نے لکھا ہے ابولہب کے دو بیٹوں سے منسوب ہوئی تھیں اور حافظہ ابن حجر کا نام کیوں بدنام کرتے ہو۔ خطا تو اپنی ہے اور لگاتے ہیں اوروں کے ذمہ، اور یہ جو مولوی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ باوجود قوت اسلام کے وہ کافروں کے نکاح میں رہیں۔ یہ مولوی صاحب ہی کی جرأت ہے۔ سبحان اللہ! وہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں نہ تھیں تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بیٹیاں تو تھیں۔

اور ہم جانیں کہ شیعہ بھی اُم الاطہار حضرت خدیجہ الکبریٰ کی اتنی تو پاسداری ضرور کرتے ہوں گے کہ ان کی بیٹیوں کو مسلمان تو سمجھتے ہوں گے اور خیر کوئی سمجھے یا نہ سمجھے، مولوی صاحب تو ان کو مسلمان ہی سمجھتے ہیں کیونکہ اگر وہ دونوں کافر ہوتیں تو اس کے کہنے کی کیا حاجت تھی ”جس وقت کہ باوجود قوت اسلام کے کافروں کے نکاح میں رہیں اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے علیحدہ نہ کیا اگر عثمان کے نکاح میں آئیں تو کیا قباحت ہے، عثمان رضی اللہ عنہ تو خود مسلمان تھا، حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو اور ان کافروں سے بدرجہا بہتر تھا اتنی“ پھر کسی مسلمان کے خیال میں آسکے ہے کہ باوجود قوت اسلام اور شوکت اہل اسلام کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادنیٰ مسلمان عورت کو بھی (چہ جائیکہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بیٹیاں) کفار کی قید میں رہنے دیتے۔

مسلمان عورت کو قید کفار سے رہائی دلانے کا قرآنی حکم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خداوند کریم تو ہر خاص و عام کو اس کی تاکید فرماتا ہے کہ مسلمان عورتوں کو کفار کی قید سے چمڑاؤ۔ یقین نہ ہو تو سورہ نساء کی یہ آیت موجود ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ لِيُ سَهِّلَ اللَّهُ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْبُلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا

بِنِ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۖ اِجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝

”یعنی خداوند کریم مسلمانوں کو یوں ارشاد فرماتا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے جو تم خدا کی راہ میں قتال نہیں کرتے اور ضعیفوں کے چھڑانے کے لیے نہیں لڑتے، یعنی واسطے تاوانوں کے مردوں سے اور عورتوں سے اور بچوں سے جو یوں کہہ رہے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی خبر گیراں اور مددگار بنادے۔“

مع ہذا شیعوں کو بھی معلوم ہوگا کہ ان آیات کا نزول قبل فتح مکہ ہے اور فتح مکہ سے پہلے ایسی شوکت اسلام نہ تھی کہ آپ ملک عرب میں جو چاہیں سو کر لیں، سواگر مولوی صاحب کا یہ مطلب ہے کہ اس آیت کے نزول تک وہ مکہ معظمہ ہی میں تھے تب تو قطع نظر جموٹ کے ان کا کفار کے پنجہ میں رہنے کا قائل ہونا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس پردہ میں طعن کرنا ہے اور اگر اس آیت کے نزول سے پہلے ہی وہ تشریف لے آئی تھیں۔ سو شوکت ہی آپ کو کون سی تھی جو باوجود اس کے آپ نے ان کا کافروں کے نکاح میں رہنا گوارا کیا اور اگر ہم سے پوچھئے تو حق یوں ہے کہ قبل بعث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں صاحبزادیوں کا نکاح ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عتبہ سے ہوا تھا، بعد بعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جب ابولہب برسر پر خاش حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہوا تو عداوت کے باعث اپنے بیٹوں سے کہہ کر آپ کی صاحبزادیوں کو طلاق دلوا دی۔ سو وہ دونوں اقل سال ہجرت ہی میں مدینہ منورہ آ گئی تھیں۔ یہاں تک کہ غزوہ بدر میں جو پہلے ہی سال ہجرت میں واقع ہوا ہے، ایک صاحبزادی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں اور انہیں کی بیماری کے باعث حضرت عثمان کو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں رہنے کی اجازت دی تھی مگر تاریخ دانی اور راست بیانی مولوی صاحب پر ختم ہے جو چاہیں فرمادیں۔

ذوالنورین کے فضائل اور واقعہ شہادت کی تفصیل

باقی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے باب میں جو کچھ مولوی صاحب نے لکھ کر اپنی عاقبت خراب کی ہے اس کا جواب ہم سے نہیں ہو سکتا، ہم کس کو کہیں؟ ہمیں حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما دونوں بمنزلہ دو آنکھوں کے ہیں۔ بجز اس کے کہ یوں کہیں کہ مولوی صاحب کو خدا سمجھے اور کیا کہیں؟ اور یہ جو ارشاد ہے کہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عثمان رضی اللہ عنہ نے بدعتیں کیں۔ اس کا جواب تو جب لکھا جاتا جب ان کو لکھتے مع ہذا آیت ”وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا“ اور اس کے مابعد کی آیات کے ترجموں میں بزرگی اصحاب ملاحہ بالخصوص اور باقی اصحاب بالعموم مذکور ہوئی ہے اس لیے

اس گزشتہ پرکتہ گیری مناسب نہیں اور باقی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نسبت ”اَقْلُوْا نَفْلًا بِالْفَنِّ اللّٰهُ نَفْلًا يَّا اَقْلُوْا خِرَاقَ الْمَصَاحِفِ“ کہنا یہ سب لکن تحبیہ اور این اہم کوئی سساملی کی گمڑی ہوئی باتیں ہیں اور یہ جماعت کی جماعت کذاب مشہور ہیں اور شیعہ عالی ہیں ان کے کہنے کو سنیوں کی طرف منسوب کرنا اسی مثل مشہور کا مصداق بننا ہے۔ ”پاؤں آپ لگا دے اوروں کو“ مولوی صاحب کو شرم نہیں آتی کہ ان افسانہ ہائے ددوغ کو سنیوں کی کتابوں کی طرف منسوب کر کے ایک دوسرا جھوٹ اپنی گردن پر رکھتے ہیں۔

عمار علی کی فنون عربیہ میں مہارت

خیر جو صاحب کسان کتب پر عبور رکھتے ہیں وہ تو حقیقت الامر کو آپ جانتے ہیں اور جوتیں جانتے ان کے اطمینان کے لیے اتنی بات بہت ہے کہ ”اَقْلُوْا بِمُوجِبِ“ ہے اس کے ترجمہ میں تو قتل کر جو واحد کا ترجمہ ہے، رقم فرماتے ہیں چنانچہ ملاحظہ نقل خط مولوی صاحب سے معلوم ہو جائے گا، اس میں تو خیر یہ بھی احتمال ہے کہ کرو کی واؤ بہانہ، سو مولوی صاحب کے قلم سے رہ گئی ہو مگر اس میں تو سہ کی بھی گنجائش نہیں کہ ”لَقْنِ اللّٰهُ“ کا ترجمہ لعنت کرو، زیب رقم ہے کجا ماضی کجا معنی امر؟ بایں ہمہ لفظ اللہ کے ترجمہ میں ضمیر واحد عائشہ کے معنی واحد حاضر کے کیے، نہ معلوم یہ کون سے محاورہ کے موافق مولوی صاحب نے ترجمہ کیا ہے؟ ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم جانتا ہے کہ کسی طفل میزان خوان کو مصدر کے معنی بتا دیجئے تو اگر اس میں پایہ فہم ہوگا تو وہ صحیح صحیح ”اَقْلُوْا“ اور ”لَقْنِ“ کے معنی بتا سکتا ہے مگر جناب مولوی صاحب اس تحریر پر کہ مقتداء شیعہ اور امام امامیہ اسی سبب سے ہو گئے ہیں، ہنوز جمع اور واحد اور ماضی اور امر کے فرق کو نہیں سمجھتے۔ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہا جاتا کہ یا تو حضور کو میزان تک کا سلیقہ نہیں اور یہ عمامہ بندی اور کرتہ پوشی اور دعوائے علم و امامت فقط اتنی بات پر ہے کہ دو چار باتیں کہیں سے سن بھاگے ہیں اور بیجہ جلسازی عوام کی نظر بندی کر کے روٹیاں مروڑتے پھرتے ہیں یا قدر قلیل مایہ علم تو ہے پر خداوند کریم نے موافق وحدہ ”وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ“ مولوی صاحب کو بیجہ شامت بداعتقادی اور بدگوئی مقررمان الہی صحابہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین اظہار بطلان مذہب مولوی صاحب کے لیے اتنی بھی تہدایت نہیں کرتا کہ ترجمہ ہی ٹھیک کر لیں۔

بہر حال اس سلیقہ اور اس استعداد پر ایسے ایسے مضامین عالی میں گفتگو کرنے کو تیار ہیں اور اہل ملت سے کہ ان کا طریقہ ہو بہو ملت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور اس میں ہرگز گنجائش حرف گیری نہیں اُلجھنے کو موجود ہیں اور ہاں ہمہ ایسی ایسی کتب کا حوالہ دیتے ہیں کہ بجز ادیب کامل ان کا

مطلب صحیح نہیں سمجھ سکتا۔ اس استعداد کو دیکھ کر تو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ اگر بالفرض کچھ قریب نہیں تب بھی غلطی فہم سے تو مولوی صاحب کی باتیں خالی نہ ہوں گی مگر ایک توجیہ ہو سکتی ہے۔ یعنی یوں کہتے کہ مولوی صاحب بھی سچ فرماتے ہیں، بیشک اہل سنت کی محبر کتابوں میں ان روایات کو لکھ کر یوں لکھ دیا ہے کہ یہ روایات موضوع اور افترا ہیں۔ شیعوں کی گھڑی ہوئی ہیں وہاں کچھ اور مطلب تھا، مولوی صاحب کمال فطانت سے اپنا مطلب سمجھ گئے۔

سو اس قاعدہ پر اگر مولوی صاحب جبر ہیں تو ہمیں یقین ہے کہ رفتہ رفتہ ترقی کر کے کتاب اللہ سے مال کے نہ دینے کے مضمون نکال کر مال داندوں سے بہت سا کچھ کالیں گے کیونکہ کلام اللہ میں "لَا يَخْسَبَنَّ الَّذِينَ يَتَّخِلُونَ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ" کے بعد "هُوَ خَيْرٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْتَسِبُونَ" کو مولوی صاحب فرمانے لگیں گے، زکوٰۃ کا نہ دینا بہتر ہے اور فرعون کے حق میں "زَبْتَكُمْ أَلَا غُلٰی" مذکور ہے تو فرعون کو رب اعلیٰ بتائیں گے۔ علیٰ ہذا القیاس مولوی صاحب کا یوں رقم فرمانا کہ استیجاب میں لکھا ہے یہاں تک بدعتیں کہیں کہ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج ہو کر اسے قتل کیا سراسر دودغ اور بہتان صاف ہے، اتنی بات تو عوام اور نادان بھی جانتے ہیں کہ اہل سنت میں سے کوئی شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نسبت حرف گیر نہیں، دل و جان سے ہر کوئی اُن کا معتقد خالص ہے اور مبتدع اور اہل بدعت کو اہل سنت سراسر گمراہ سمجھتے ہیں اور کلی مخالفت ان سے رکھتے ہیں اور کیونکر مخالفت نہ رکھیں بدعت تو خلاف سنت ہی کو کہتے ہیں، سوا اگر ایسی محبر کتابوں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نسبت مبتدع ہونا نہ کور ہوتا تو اہل سنت میں سے ان کا کوئی نام بھی نہ لیتا چہ جائیکہ یہ اعتقاد۔

یہ سب مولوی عمار علی صاحب کی جعل سازی ہے مگر موافق نقل مشہور "حق بر زبان جاہلی شو" مولوی صاحب بلکہ پیشوایان مولوی صاحب اس جھوٹ میں بھی بے ساختہ حق کہہ گزرے، اتنا تو معلوم ہوا کہ اہل بدعت قاتل قتل ہیں، سو اہل سنت کو سمجھنا چاہیے کہ وہ کس وجہ کو مقبول ہوں گے اور جب اہل سنت مقبول ہوئے تو لا جرم شیعی مردود اور داخل زمرۃ اہل بدعت اور قاتل قتل ہوں گے اتنا اگر آئی لمبیہ ہو اور مولوی صاحب کی ان فریب بازیوں کو دیکھے تو بلا تاہل و جاہل نہیں تو کو چک لبدل دجاہل سمجھے، اللہ اللہ ایسے فریب باز ہم نے بھی نہ دیکھے تھے نہ سنے تھے، اپنی کتابوں کی روایات کو جو حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم کے بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہونے پر دلالت کرتی ہیں، چھپا کر اگر جھوٹ بول دیا تو بظاہر یہ احتمال تھا کہ اہل سنت کو شیعوں کی روایات کی کیا خبر ہوگی، پر اس بے حیالی کو دیکھنا کہ اہل سنت کے سامنے اہل سنت ہی کی کتابوں کے حوالے سے جھوٹ بولتے ہیں۔ "مدرغ گویم ہمدے تو"

ذی النورین کے بچاؤ کیلئے صحابہ اور اہل بیت کی جانکاہی

خیر مولوی صاحب کو تو اس شرمانے سے کب شرم آتی ہے، حیات و حیا والوں ہی کو آتی ہے اس لیے لازم یوں ہے کہ صحابہ کا اور اہل بیت کا بدل و جان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بچانے کی تدبیروں میں مصروف رہتا اور متمنی اجازت حضرت عثمان در باب قتال اہل ہوا ہونا روایات صحیحہ اور تواریخ طرفین سے ثابت کیجئے تاکہ مسلمانان سادہ لوح مولوی عمار علی صاحب کی ان ابلہ فریبوں سے فریب میں نہ آجائیں اور شاید مولوی صاحب کی بھی اس خواب غفلت سے آنکھ کھل جائے اور اس نوعِ ظلمات سے چونک اٹھیں۔ بغور سنئے کہ جو کچھ مولوی صاحب نے رقم فرمایا ہے محض افترا اور سراسر بہتان ہے، لڑکے اور دیوانے بھی ہوں تو سمجھ جائیں کہ یہ فقط مولوی صاحب کی شرارت ہے اس لیے کہ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر اور حضرت عائشہ اور امیر معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص جو حضرت امیر سے لڑتے تھے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص ہی کے لیے لڑتے تھے چونکہ قاتلان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حضرت امیر کے ساتھ ہو لیے تھے اور حضرت بنا چاری انہیں کچھ نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ وہ بسبب کثرت اور شورہ پشتی کے کسی سے دبتے نہ تھے اور بجائے خود یوں سمجھتے تھے کہ جب ہم نے بنی یثرب کی خلافت کو درہم برہم کر دیا تو اوروں کی کیا ہستی ہے؟ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر وغیرہم کو تو اس قسم کے توہمات تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دربارہ قصاص مدہنت کرتے ہیں اور امیر معاویہ اور ان کے ذیل کے لوگ یوں سمجھتے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اشاروں سے قتل ہوئے ہیں۔

خیر تواریخ طرفین شیعہ و سنی (کی) حاضر ہیں، صحابہ نے بلوا قتل عثمان رضی اللہ عنہ کے دبانے میں اپنی طرف سے کچھ قصور نہیں کیا، پر مقتدر یوں ہی تھا تا مقدور کلمہ کلام سے بلوائیوں کو سمجھایا جب کچھ ان کی سمجھ میں نہ آئی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے قتل قتال کی اجازت چاہی پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی قتل قتال اور جنگ و جدال کے روادار نہ ہوئے بلکہ کمال تاکید سے مانع آئے لاچار ہو کے صحابہ خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔ بایں ہمہ پانی کے پہنچانے اور بلوائیوں کے ہٹانے میں آخر تک تدبیروں میں مشغول رہے۔ حضرت زید بن ثابت انصاری تمام انصاریوں کو لے کر آئے اور جوانان انصاری نے کہا اگر فرماؤ تو دوبارہ انصار خدا نہیں؟

عبداللہ بن عمر تمام مہاجرین کے ساتھ آئے اور یہ کہا جنہوں نے تم پر بلوا کر رکھا ہے وہی لوگ ہیں جو ہماری ہی تلواروں سے مسلمان ہوئے ہیں اور اب تک ان صدموں کے ڈر سے پاجامہ میں گئے

دیتے ہیں۔ یہ ساری بڑھ بڑھ کر باتیں کرنی ان کی اس سبب سے ہیں کہ کلمہ گو ہیں اور تم کلمہ گوئی کا لحاظ کرتے ہو، اگر فرماؤ تو انہیں ان کی حقیقت دکھلا دیں اور وہ بھولے دن پھر انہیں یاد دلادیں؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا، یہی بات مت کہو، ایک میری جان کے لیے اتنا ہنگامہ اسلام میں برپا مت کرو مگر بایں ہمہ حضرات حسنین، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، ابو ہریرہ، عبداللہ بن عامر بن ربیعہ اور سوا ان کے اور صحابہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے ساتھ ان کے گھر میں تھے اور جب بلوائی ہجوم کرتے تھے تو یہ سب صاحب پتھر لاشی مار مار ہٹاتے تھے اور دروازہ بند کر دیتے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے غلام جو ایک فوج کی فوج تھے، یہاں تک کہ اگر آپ ان کو حکم دے دیتے تو اہل بلوا کو حقیقت معلوم ہو جاتی، ہتھیار اور لڑائی کا سامان لے کر حاضر ہوئے اور کمال زاری اور بے قراری سے کہا کہ ہم وہ لوگ ہیں کہ خراسان سے افریقہ تک کوئی ہماری تلوار کے سامنے نہیں ٹھہرا، اگر حکم ہو تو ان لوگوں کا گھمنڈ نکال دیں اور تماشا دکھلا دیں کیونکہ سمجھانے سے تو ان کی اصلاح نہیں ہوتی، انہوں نے دیکھا کہ کلمہ گوئی کے باعث ہمیں کوئی چھیڑ نہیں سکتا، اس لیے رو براہ نہیں ہوتے اور تمہارے اور سوا تمہارے اور بڑے بڑے صحابہ کی بات نہیں سنتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی فرمائے جاتے تھے کہ اگر میری خوشی منظور ہے اور میرا حق نمک ادا کرنا چاہتے ہو تو ہتھیار الگ کر کے اپنے گھروں میں بیٹھ رہو اور جو ہتھیار الگ کر دے گا اسے میں نے آزاد کیا، واللہ خوزیری خلافت سے پہلے اگر میں مقتول ہو جاؤں تو یہ مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے، اس بات سے کہ خوزیری کے بعد مارا جاؤں، یعنی میری شہادت تو لکھی ہوئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرما دیا تھا تم لڑو یا نہ لڑو میں مقتول ہوں گا۔ سو کیا فائدہ کہ لوگ بھی مارے جائیں اور مطلب بھی حاصل نہ ہو۔

اور تواریخ فریقین میں موجود ہے کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادوں اور حضرت جعفر کی اولاد کو اور اپنے چیلے قنبر کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دروازہ پر متعین کر رکھا تھا اور حضرت طلحہ اور حضرت زبیر نے بھی اپنے بیٹوں کو دروازہ پر بٹھا دیا تھا تاکہ بلوائیوں کو دھکے دیتے رہیں۔ سو جب اہل بلوا ہجوم کر کے آتے تھے یہ سب صاحب لاشی لکڑی سے جوتا تھ میں آ جاتا تھا، لڑتے تھے یہاں تک کہ حضرت سبط اکبر امام ہمام امام حسن رضی اللہ عنہ خون آلودہ ہو گئے۔ محمد بن طلحہ اور قنبر کے سر پر زخم لگا، جب دروازہ کی راہ سے اہل بلوا کو آنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی اور اندر گھسنے کی کوئی تدبیر نہ بنی تو پیچھے سے بعض انصاریوں کے گھر میں نقب دے کر اندر گھس گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔

ذوالنورین کے لیے امام کی مدافعت

نسخ البلاغت جوامع الکلب شیعہ ہے اس بات کی گواہ ہے۔ حضرت امیر سے اس میں روایت ہے کہ انہوں نے یہ فرمایا ”وَلِلّٰهِ لَقَدْ ذَفَعْتُ عَنْهُ“ یعنی حضرت علی قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ واللہ میں نے تو حضرت عثمان سے اس بلا اور اس بلوا کو بہت ہی ہٹایا، اس کی شرح میں تمام شرح نسخ البلاغت نے روایت کیا ہے کہ حضرت امیر بلوا کے دنوں میں جب حضرت عثمان کے گھر میں آتے تھے تو بلوائیوں کو چابک مار مار دھک کرتے تھے اور برا بھلا کہتے تھے اور لعنت کرتے تھے۔ ابن عثم کوئی یعنی شیعوں کا مورخ جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وغیرہ اصحاب کرام کا دشمن جان ہے وہی اپنی فتوح میں قتل کرتا ہے کہ حضرت امیر نے فرزند ارجمند سبط اکبر امام حسن رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ اور کہو میرے والد کا دل تمہاری ہی طرف لگا ہوا ہے۔ فرماتے ہیں میں سنتا ہوں کہ یہ لوگ تمہارے مقدمہ میں کچھ بہت شور و غل کر رہے ہیں اور کسی کی نصیحت نہیں سنتے اور تمہارے قتل کا مہم ارادہ کیے بیٹھے ہیں اس لیے تمہاری طرف سے مجھے بہت اندیشہ ہو رہا ہے اگر فرماؤ تو میں بھی آ کر تمہارا مددگار رہوں اور ان لوگوں سے لڑوں اور جس طرح بن پڑے ان لوگوں کو تمہارے دروازہ سے ہٹاؤں۔ حضرت امام حسن حسب ارشاد والد ماجد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور یہ پیام پہنچایا، انہوں نے فرمایا مجھے یہ منظور نہیں کہ آپ تکلیف اٹھائیں اور ان لوگوں سے لڑیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے، یوں فرماتے ہیں اگر ان لوگوں سے لڑو تو لڑو فتح ہوگی اور نہ لڑو تو روزہ ہمارے پاس کھلیو۔ سواب بھی تمنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا کر روزہ کھولے۔ حضرت حسن چپ ہو کر چلے آئے۔

حضرت امام کا کوئی معاملہ ظاہر داری نہ تھا

اب سنئے اہل ایمان کا تو یہ کام نہیں کہ حضرت امیر کے تمام معاملات کو نفاق اور ظاہر داری پر محمول کریں۔ شیعہ اگر تکلم ”الْخُرُءُ یَقْبِضُ عَلٰی نَفْسِهِ“ حضرت امیر اور صاحبزادوں کے ان معاملات اور ان تمام گتگتوں کو منافقانہ سمجھیں تو انہیں اہل ایمان ہی کون سمجھتا ہے۔ معاذ اللہ حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور نفاق ”چور کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی“ اور اگر بالفرض محال نفاق ہی تھا تو اسی وقت ہوگا، اپنی خلافت میں کوفہ میں جب خطبہ میں اس بات پر قسم کھائی کہ میں نے قاتلان عثمان کو بہت ہٹایا تو اس وقت کیا دہاؤ تھا جب تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی شہید

ہو لیے تھے اور قطع نظر شجاعت کے کار فرمائے۔ خلافت بھی آپ ہی تھے، مرے ہوئے سے تو نامرد بھی نہیں ڈرتے اور بے سروسامان کو ہراس نہیں ہوتا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس شجاعت اور اس شوکت پر کیا ہوا کہ اب تک بھی عثمان کا خوف نہ گیا، اگر بزم شیعہ اس میں کچھ نفاق ہوتا تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد ہاؤاز بلند یوں کیوں فرماتے؟

دفاع عثمان کے لیے دیگر صحابہ کا رویہ

ادھر حضرت عبداللہ بن سلام ہر صبح کو بلوائیوں کے پاس جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ ”حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل مت کرو ورنہ ان کے قتل کے بعد بہت سے خفے فساد اٹھیں گے۔“ اور حضرت حذیفہ بن الیمان جن کو منافقین کا علم تھا اور حضرت امیر نے بھی ان کے حق میں اس علم کی گواہی دی۔ چنانچہ شیعوں کی کتابوں میں موجود ہے بلوائیوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل سے بتا کید منع کرتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ ان کا مارا جانا بہت فتنوں کا باعث ہو جائے گا، اب کوئی مولوی صاحب سے پوچھتے کہ یہ لوگ جن کا مذکور ہوا صحابہ نہیں تو اور کون ہیں؟ پھر ان میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تو وہ ہیں کہ وہ اکیلے لاکھوں کے برابر ہیں۔ خصوصاً شیعوں کے نزدیک، سو اگر بالفرض والتقدیر صحابہ ہی نے ان کو قتل کیا ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ تو مانع ہی تھے، پھر مولوی صاحب نے کس خوبی پر بھوکے موقع میں کہہ دیا کہ صحابہ رسول نے تنگ ہو کر اُسے قتل کیا مگر میں ہی چوکا مولوی عمار علی صاحب بلکہ تمام شیعہ حضرت امیر اور بزرگان مسطور الاسم کو صحابہ نہیں سمجھتے، یہ تو ادب باش کو ذہ اور بد معاشان مصر اور منافقان اُمت کو صحابہ سمجھتے ہیں۔ سو یہی لوگ ہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے لیے اکٹھے ہو کر آئے تھے۔ سو مولوی صاحب نے اپنے عندیہ کے موافق بیج ہی کہا ہے، زوف ہے اس عقل مانہ بچار پر کہ اپنے مذہب کے پابند بھی تو نہیں، بہر حال یہ جو مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ صحابہ نے تنگ ہو کر قتل کیا سراسر بہتان اور دروغ صریح ہے، پر جسے نہ خدا کا ڈر ہو نہ خلق کی شرم وہ جو چاہے سو کرے مگر ہم تو اس بے حیائی اور اس جرأت پر غش ہیں کہ کس دلاوری سے فرماتے ہیں، اگر سند مطلوب ہو تو روانہ کر دی جاوے۔

ع..... چہ دلا درست وز دے کہ بکف چہ اراغ دارد

حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بزدلی کا بہتان

اور یہ جو کچھ جناب مولوی صاحب حضرت عائشہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی جنگ کے باب

میں رقم فرماتے ہیں کہ ان کی باہم بہتر جنگ نہیں ہوئی ہیں اور جہاد مال دُنیا کے واسطے نہیں ہوتا یہ بجا درست، مگر تعجب ہے کہ اس بات میں مولوی صاحب نے کچھ جھوٹ کیوں نہیں بولا، ہم جانیں یہ مثل سچی ہے ”الْكُذُوبُ قَدْ يَصْدُقُ“..... ”یعنی جھوٹا کبھی سچ بھی بول دے ہے“ لیکن تاہم بھی حق سے چشم پوشی کر ہی گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صحابہ ثلاثہ سے جہاد نہ کرنے کو اس وجہ پر محمول کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس انصار اور مددگار کب تھے، کوئی مولوی صاحب سے پوچھے کہ انصار اور مددگار کی ضرورت جہاد میں فقط اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ تن تنہا آدمی مجمع کثیر کے مقابلہ میں کیا کرے گا؟ سو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اگر بوجہ نہ ہونے انصار کے قبل مدینہ منورہ کو آنے کے جہاد نہ کیا تو بجائے خود تھا کہ آپ میں تن تنہا تاب مقابلہ کفار نہ تھی۔ حضرت امیر کو کیا عذر تھا جو انہوں نے تن تنہا جہاد نہ کیا دیکھو تو وہ خود اپنے حال میں کیا فرماتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام دُنیا پر بھاری تھے

سُج البلاغت میں جوامع الکتاب شیعہ ہے علامہ رضی نقل کرتے ہیں:

قَالَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ إِنِّي وَاللَّهِ لَوْ لَقَيْتُهُمْ وَجِدًا وَهُمْ جِلَاعُ الْأَرْضِ كُلُّهَا مَابَا لَيْتُ وَلَا أَسْتَوْحِشْتُ وَإِنِّي مِنْ ضَلَالَتِهِمُ النَّبِيُّ لِيْنَهَا وَالْهَدَى الْإِلَهِيُّ أَنَا عَلَيْهِ لَعَلِّي بَصِيرَةٌ مِنْ نَفْسِي وَيَقِينُ مِنْ رَبِّي وَإِنِّي إِلَى لِقَاءِ اللَّهِ وَلِحُسْنِ قَوَائِمِهِ لَمُنْتَظَرٌ وَرَاجٍ۔
یعنی فرمایا حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے کہ تحقیق قسم اللہ کی اگر میں ان سے تن تنہا ملوں اور وہ اس کثرت سے ہوں کہ تمام روئے زمین کو ڈھکے ہوئے ہوں تو میں کچھ پروا نہ کروں اور نہ گھبراؤں اور مجھے ان کی گمراہی اور اپنی ہدایت (جانو) آنکھوں سے نظر آ رہی ہے اور خدا کی طرف سے اس کا یقین ہو گیا ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے ملنے اور اس کے اچھے ثواب کا منتظر اور امیدوار ہوں۔ فقط“

جو شخص کہ تمام روئے زمین کے آدمیوں بلکہ اتنے آدمیوں سے بھی جو زمین کو ڈھک لیں تن تنہا نہ ڈرے اس کو انصار اور مددگار کی کیا حاجت؟ ہاں اماموں کی موت اپنے اختیار میں نہ ہوتی تو یوں بھی کہہ سکتے کہ نہ گھبرانے اور نہ پروا کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ آدمی مارا بھی نہ جائے۔ شاید اس سبب سے جہاد نہ کیا ہو، آپ نے سمجھا میں تن تنہا لڑوں گا تو فتح تو معلوم مارا ہی جاؤں گا پھر کیا حاصل؟ جہاد اعلاء دین کے لیے ہے جب وہ تو حاصل نہ ہو اور فقط جان ہی جاتی رہے پھر جہاد کا ہے کے لیے کیجئے؟ کچھ خدا کو فقط جان گوانا تو مطلوب نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ شجاعت میں بے مثل

اور اپنی موت پر قابو یافتہ تھے (بزعم شیعہ)

اور در صورت یہ کہ امام کا انتقال اس کے اختیار میں ہو۔ چنانچہ کلینی نے اس کو ثابت کیا اور تمام امامیہ اس پر متفق ہیں تو پھر تنہا جہاد میں وہ ترقی دین ہوتی کہ مجمع کی صورت میں ہرگز ممکن نہیں، مددگاروں کی وجہ سے اگر آدمی نہ مارا جائے تو کرشمے کی بات نہیں، ہاں تنہا ہو کر پھر تمام جہان جس کو نہ مار سکے اس سے زیادہ اور کیا معجزہ ہوگا۔ ہندو جو عجائب پرست ہیں اگر ایسا معجزہ کسی سے دیکھ لیں تو بیشک پکار اٹھیں ”لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ“ ایک دودفعہ بھی اگر ایسی لڑائی لڑ لیتے تو بہت سے بہت تکلیف ہوتی تو اتنی ہی ہوتی کہ آپ زخمی ہی ہو جاتے یا بیہوش ہو جاتے لیکن عموماً یہ اعتقاد لوگوں کے دل میں بیٹھ جاتا کہ چیرتے تو لکھا اور موافق مخالف سب حلقہ بگوش حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہو جاتے اور دین کی ایسی ترقی ہوتی کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کرات مرآت کثیر کثیر انبوءہ سے جہاد کرنے میں وہ ترقی نہ ہوئی تھی کیونکہ کفار غلبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بوجہ جمعیت سمجھ کر معتقد نہ ہوئے تھے اسی واسطے اپنے غلبہ کی بھی اُمید رکھتے تھے اور لڑنے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ اگر حضرت امیر تنہا لڑتے تو جو مطلب کہ حضرت امام ہمام امام مہدی کے آنے پر موقوف تھا وہ ابھی حاصل ہو جاتا اور اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کچھ گزرا وہ ظہور میں نہ آتا لیکن افسوس تو یہ ہے کہ لڑنا تو شے دیگر، حضرت امیر تو اصحاب ثلاثہ کے سامنے کبھی اتنا بھی نہ بولے جتنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو جہل اور اُمیہ بن خلف اور ابولہب اور ولید بن عتبہ وغیرہم کے سامنے بول لیے تھے، طرفہ تماشا ہے کہ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اس زور اور بل اور قوت اور شجاعت کے باب میں کوئی روایت نہ ہو اور وہ تو حق گوئی کی بدولت کفار مگنوار کے ہاتھ سے عالم تنہائی میں کیا کیا جھانسیں اٹھائیں، یہاں تک کہ علاوہ دشنام ہائے نافر جام اور دست درازی ہائے بے اندازہ کی نوبت یہ پہنچی کہ گمراہ ہر سب کو الوداع کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوری زندگی خوف و ذلت سے گزاری (بزعم شیعہ)

حضرت امیر کو ایک دفعہ بھی یہ نوبت نہ آئی کہ علی الاعلان حق گوئی اختیار کریں اور جھانسیں اٹھائیں یا مدینہ منورہ سے ہجرت کر کے شرف ہجرت کو اضعاف مضاعف فرماتے بلکہ ہم پیالہ اور ہم نوالہ انہیں کے پیچھے نمازیں پڑھتے، عید جمعہ میں انہیں کے خطبہ سنتے، انہیں سے رشتہ پیوند

قربان پیدا کرتے، تمام عمر یوں ہی گزاری اور بھی کچھ نہیں ہو سکے تھا تو جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقیہ نہ کیا تھا آپ بھی نہ کرتے۔ القصہ حضرت امیر کے جہاد نہ کرنے کو اس بات پر محمول کرنا کہ آپ کے ساتھ انصار اور مددگار نہ تھے کمال سفاہت ہے بلکہ درپردہ حضرت امیر کی تکذیب کرنی ہے تو حضرت امیر تو یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے مقابلہ میں سارا جہان بھی آجائے تو کچھ اندیشہ نہیں اور پھر بوجہ موت کے اختیار کی ہونے کے تنہائی کی صورت میں اور اُمید بہودی تھی اور مولوی صاحب یوں ارشاد فرمائیں کہ حضرت امیر انصار کے محتاج تھے، مع ہذا اور کتابوں کو تو پلٹ کر دیکھیں، انصار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بزم شیعہ سب انصار و مددگار حضرت امیر تھے، اولاد انصار آپ کی مددگار رہی، آپ کے ایام خلافت میں اکثر اولاد انصار آپ کے ساتھ تھی، پھر کیا وجہ کہ آپ نے اصحاب ثلاثہ کے زمانہ میں جہاد نہ کیا؟ انصاف یوں ہے کہ حضرت امیر یہ دل معین و مددگار خلفائے ثلاثہ رہے، خصوصاً شیخین کہ آپ نے ان کی تعریفیں اپنی خلافت میں بھی کی ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ زمانہ تقیہ کا نہ تھا، باعتبار جمہور امامیہ اس زمانہ میں آپ پر تقیہ حرام تھا۔ چنانچہ پہلے مرقوم ہو چکا، اور نیز اس زمانہ میں ان کا انتقال ہو چکا تھا مرے ہوئے سے تو نامردوں کو بھی خوف نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ حضرت علی؟ پھر ان سب وقائع کے ملاحظہ کے بعد اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور کمالات اور قوت ایمانی کو خیال کر کے اہل فہم کو تو بجز اس کے خیال میں نہیں آ سکتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سکوت فقط اسی وجہ سے تھا کہ ان کو خلیفہ برحق سمجھتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ باوجود بے مثل شجاعت کے جگر گوشہ رسول کو فدک نہ دلا سکے باقی جناب مولوی صاحب کا یہ ارشاد کہ ”جہاد مال دُنیا کے لیے ہوتا ہے۔“ ہر چند درست ہے لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ مظلوم کی نصرت دین میں سے ہے یا دُنیا میں سے؟ اور مظلوم بھی کون جگر گوشہ جناب سید الاولین و آخرین، اگر ایسے مظلوموں کی نصرت داخل دین ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے باوجود اتنی استطاعت کے کہ اکیلے سارے جہان کا مقابلہ کر سکتے تھے اور اپنی جان کا کچھ زیاں بھی نہ تھا، مع ہذا انصار ان کے انصار تھے کیوں حضرت زہرا کی مدد نہ کی؟ اگر حضرت زہرا معاف کر دیتی جب بھی ایک بات تھی حسب الارشاد مولوی صاحب موصوف ”تادم واپس ابو بکر صدیق کا ظلم ان کے پیش نظر تھا“ اور اگر یوں کہتے کہ نصرت مظلوم کا ردِ دنیاوی ہے تو دُنیا کی خوبی اور بزرگی تو سب ہی جانتے ہیں۔ اس صورت میں نصرت مظلوم اگر ممنوع بھی نہ ہوگی تو موجب ثواب بھی نہ ہوگی، واجب تو درکنار پھر ہاں ہم ترک نصرت حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جو سنی ہائے شیعہ لبریز شکایت

صحابہ اور اولاد صحابہ ہے محض بیجا ہوا۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ مولوی صاحب نصرت مظلوم کو مجملہ دین بلکہ واجب ہی قرار دیں گے کیوں اڈل تو کلام اللہ اور احادیث طرفین اس مضمون سے مشغول ہیں، دوسرے صحابہ کے مطاعن کی کوئی بات چاہیے۔ مولوی صاحب تو اس پر غش ہیں بلا سے حضرت امیر پر بھی حرف آجائے مگر ہمیں خدا کی ذات سے یقین ہے کہ ہم نے جو کچھ تقیہ کے باب میں لو پر لکھا ہے اگر مولوی صاحب بغور دیکھیں تو زبان سے بھی نہ کہیں گے تو دل سے تو بیشک اس بات کے معتقد ہو جائیں گے کہ حضرت امیر کا اصحاب ثلاثہ سے بیعت کرنا اور فدک کے نہ دینے پر سکوت کرنا سب بیحد حقانیت اصحاب ثلاثہ تھا نہ بیحد تقیہ اور آگے جو کچھ آتا ہے ان شاء اللہ و تقریر ماسبق کی اور تاکید کرے گا۔ اس مجموعہ کو دیکھ کر سب کو معلوم ہو جائے گا کہ حضرت امیر کی وہ لوگ زیادہ قدر کرتے ہیں جو یوں کہتے ہیں کہ آپ کسی سے ہارے ہوئے نہ تھے، اور بسبب ضعف اور ناتوانی کے خلفاء کے ساتھ موافقت نہ رکھتے تھے بلکہ محض خدا واسطے یا وہ لوگ جو یوں کہتے ہیں کہ آپ ذلیل و خوار بے سر سامان ناتوان ناچاری کے باعث اطاعت کرتے تھے اور آپ کے دل میں کچھ تھا اور زبان پر کچھ تھا، تمام عمر اخفاء حق اور کتمان دین میں مصروف رہے اور باوجود یہ کہ آیہ ”وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَانْتُمْ تَعْلَمُونَ“ (جس کا یہ مضمون ہے کہ غلط ملتصق کر دو حق کو باطل کے ساتھ اور مت چھپاؤ حق کو جان بوجھ کر) آپ کو یاد تھی، پھر بھی حضرت اصحاب کے ساتھ ایسے ہم بیالہ اور ہم نوالہ ہوئے کہ بظاہر حق و باطل کی تمیز و شمار ہو گئی۔ چنانچہ گروہ اعظم اہل سنت اسی دھوکے میں اصحاب ثلاثہ کی حد سے زیادہ توقیر کرنے لگے اور معاملہ سب برعکس ہو گیا، دین اصلی بہت ضعیف اور مخفی رہ گیا۔

حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کے نکاح کی بحث

تیسرا مطلب حضور کے رقیبہ میں یہ ہے ”کہ حضرت اُم کلثوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صلب اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے شکم سے تھیں، ان کا نکاح حضرت محمد بن جعفر طیار سے ہوا تھا۔“ ہر چند یہ جواب سوال سائل پر بظاہر منطبق ہے لیکن حقیقت میں دیکھئے کہ یہ جواب سوال سائل سے ایسی ہی نسبت رکھتا ہے جیسے کہ کسی گاہک کے اس سوال کے ساتھ کہ لالہ تیل بھی ہے لالہ کا یہ جواب ہاں میاں آلو بھی ہے، اتنا تو مولوی صاحب بھی سمجھتے ہوں گے کہ سائل کی غرض اس بات کے پوچھنے سے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیٹیوں کا نکاح کس کس سے ہوا ہے؟ یہی ہے کہ یہ جو مشہور ہے کہ حضرت اُم کلثوم دختر مطہرہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوا یہ صحیح ہے یا غلط ہے؟ اور یہ بھی احتمال ہے کہ

مولوی صاحب نہ سمجھے ہوں اس لیے کہ بات بھی تو بہت مشکل ہے۔ بہر حال جناب مولوی صاحب نے اس جواب میں طرفہ چالاکی کی ہے کہ جواب کا جواب دے دیا اور بات کی بات رکھ لی، مگر نامعلوم اس جواب میں پہلی چال کیوں بھول گئے یا اور کوئی عمدہ مصلحت نظر آئی یہ تو حضرت ام کلثوم کی مولوی صاحب کی طرف شکایت ہی رہ گئی کہ ان کی خالواؤں کو تو مولوی صاحب نے جفاء قطع نسب سے مستحق اجر عظیم کیا، انہوں نے کیا قصور کیا تھا جو مولوی صاحب نے اس عنایت سے محروم رکھا؟

کیا وہ اہل بیت میں سے نہ تھی جو اس جفا سے دریغ کیا مگر مولوی صاحب کی طرف سے میں جواب دیئے دیتا ہوں ”الْفَضْلُ لِلْمُتَّقِیْمِ“..... ”یعنی بزرگی پہلوں ہی کے لیے ہے۔“ اس مثل کے خلاف کیونکر کر دیں، شاید ملا زمان مولوی صاحب کو یہ گمان ہوا ہو کہ حضرت ام کلثوم بنت سیدۃ النساء کی تزویج کا قصہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بہ نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں کے نکاح کے جو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوا تھا ایک جدید امر ہے اور تازہ بات، مبادا اس کا کوئی جاننے والا ہو اور قلعی کھل جائے مگر میں ذمہ کش ہوں، اہل سنت ان دونوں قصوں کو یکساں پرانا سمجھتے ہیں اور اس فرق کو فرق نہیں سمجھتے۔ اب کے جناب مولوی صاحب اگر میرا در علی صاحب کو یہ مضمون لکھ کر کہ حضرت ام کلثوم حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی بیٹی ہی نہ تھیں اصلاح تحریر حقدم کر دیں اور اندیشہ بدظنی سنیاں ہو تو عذر بدموجود ہے، آپ کچھ خدا سے تو زیادہ نہیں؟ جب خداوند کریم کو ہائیں ہمہ علم غیب بد واقع ہوتا تو آپ تو آدمی ہی ہیں۔

القصہ مصلحت یوں ہے کہ اسامہ بنت عمیس کی طرف منسوب کر دیجئے اور جھوٹ ہے تو بلا سے ”چو آب از سرگذشت چہ یک نیزہ چہ یک دست“ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں کی نسبت میں تعریف کیا ہے تو اسی کے نسب میں بھی سہمی۔ مع ہذا اور امانائے روزگار فقط دنیا کے لیے سینکڑوں جھوٹ بولتے ہیں آپ نے اگر دو جھوٹ حفظ دین کے لیے بول دیئے تو کیا غضب ہوا؟ بلکہ بنظر پاس ننگ و ناموس دین اور متابعت بزرگان اور آئمہ اطہار امید ثواب عظیم ہے کیوں کہ یہ بھی ایک قسم کا تقیہ ہے۔

عمار علی کی تلبیس

لیکن جناب مولوی صاحب کے لوازم رائے زنی اور مشورہ گوئی میں سے ہے کہ جملہ مراتب نفع و نقصان سے اطلاع کر دیجئے۔ اس لیے معروض ہے کہ ہائیں ہمہ منافع ایک اس میں نقصان بھی ہے کہ جناب ہاری تعالیٰ یوں بھی فرماتا ہے: ”وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ“

وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ“ (یعنی حق باطل کو مت رُلاؤ اور نہ چمپاؤ حق کو جان بوجھ کر) دوسرے یوں بھی فرماتا ہے: ”وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ أَلَّمَ قَلْبَهُ“..... ”یعنی نہ چمپاؤ گواہی اور جو چمپائے گواہی تو اس کا دل گنہگار ہے۔“ ان دونوں آیات پر نظر کر لیجئے مگر مجھ ہی سے غلطی ہوئی آپ نے اب کون سی (حق و باطل کے رُلانے اور شہادت حق کے چمپانے میں) کمی کی ہے جو اس کا اندیشہ ہو، اس سے زیادہ اور کیا رُلانا ہوگا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نکاح کا نام ہی نہ لیا بلکہ اصل رُلانا تو یہی ہے اگر صاف انکار کر دیتے اور کہہ دیتے کہ حضرت زہرا کے یا حضرت علی رضی اللہ عنہما کے کوئی بیٹی ہی نہ تھی تو یہ رُلانا نہ تھا اسے انکار کہتے ہیں اور عربی زبان میں اسے خود کہتے ہیں اور یہ جو اکثر آتا ہے ”وَمَا يَنْجَعُهُ بِأَيِّئِنَّا“ تو اسی مقام میں آتا ہے اور یہ انداز کہ جواب کا جواب ہو جائے اور پھر بات ہاتھ سے نہ جائے جیسے مولوی صاحب نے اس مقام میں کیا ہے تو یہ عین حق و باطل کا رُلادینا ہے۔ مع ہذا حق باطل کے خلط ملط کر دینے میں جو برائی ہے تو فقط اسی سبب سے ہے کہ دوسرا کوئی دھوکا نہ کھائے۔ در صورت یہ کہ اہل سنت جماعت نے شیعوں کی روایات سے یہ ثابت کر دیا ہو کہ حضرت اُم کلثوم کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوا تو کیا اندیشہ؟ وہ دھوکے کی بات ہی نہ رہی جس سے ڈرے اور اگر آپ کو یقین نہ آئے تو یہ دیکھئے آپ کے یہاں کی روایتیں اس باب میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ آپ اپنی عادت سلف دعا و فریب کو نہ چھوڑئے۔

فاروق رضی اللہ عنہ سے اُم کلثوم کا نکاح حضرت عباس نے کیا تھا

قاضی نور اللہ صاحب شہید رابع حضرت عباس عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احوال میں رقم فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے بہت محبت تھی اور ان کے حق میں یوں فرماتے تھے کہ عباس میرے باپ کی جگہ ہے اور سوائے اس کے بہت ہی کچھ ان کے فضائل لکھے، اس کے بعد لکھتے ہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے کے موافق حضرت امیر سے حضرت اُم کلثوم کے نکاح کی خواستگاری کی۔ حضرت امیر نے اول بار انکار فرمایا، دوسری دفعہ سکوت فرمایا، بعد ازاں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود حضرت اُم کلثوم کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نکاح کر دیا۔ حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بوجہ تقيہ منع نہ کر سکے، اس لیے چپکے ہو رہے یہ ہے قاضی صاحب کا بیان۔

بزعم شیعہ حضرت عباس اعراف میں ہوں گے

میں نے اپنے اعتقاد کے موافق حضرت عباس اور حضرت کے نام پر لفظ حضرت لگا دیا ہے

ورنہ قاضی صاحب سے اس تعظیم کی کس امید ہے؟ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو ان کے نزدیک حضرت عمر ہیں وہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے حق میں بھی اسی بیان کے پس و پیش میں یوں لکھتے ہیں بلکہ یہ تقریر بھی بطور دلیل ہی بیان کی ہے اور مطلب اصلی ان کا یہ ہے کہ وہ اعراف میں ہوں گے لیکن حق بات چھپی نہیں رہتی، عاقل خود جانتے ہیں کہ جو ایسے محبوب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں وہ اعراف میں کیوں کر رہیں گے؟ ان کے تو نیاز مند بھی اگر جنت میں چلے جائیں تو کچھ بعید نہیں، حیف صد حیف مہمان حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تو یہ رُجہ ہو کہ ان کے محبوں کو کوئی گناہ ضرر نہ کرے بلکہ گناہ تو گناہ کفر بھی ضرر نہ کرے۔

محبوب رسول اعراف میں اور یہودی و نصرانی جنت میں

چنانچہ رضی الدین لغوی نے زینب بن اطلق نصرانی کے ختی ہونے کا نقطہ چند بیتوں (شعر و نثر نصرانی)

عدی و تیم لا احوال ذکرہم بسوء ولكنی محب لها شم
وما یعتبرنی فی علی و اہلہ اذا ذکروا فی اللہ لومة لائم
یقولون ما بال النصارى لحبہم و اهل النبی من اعراب و اعاجم
فقلت لهم انی لاحسب حبہم سوری فی قلوب الخلق حتی البہتم
کی تصنیف کے باعث جن کے مضمون سے محبت حضرت علی رضی اللہ عنہ ٹپکتی ہے حکم کر دیا ہے
حالانکہ انہیں ایمات سے اس کا نصرانی ہونا ثابت ہے اور ایسے ہی ابن فضلون (لابن فضلون)

ہب لی من المعیشتہ سولی واعف عنی بحق ال الرسول

واسقنی شرۃ بکف علی سید الاولیاء بعل بقول

یہودی کو سب علماء (اس فرقہ کے) بزرگ سمجھتے ہیں اس کا باعث بھی یہی دو تین بیتیں ہیں۔

القمر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تو یہ رُجہ کہ ان کے محب بھی اگرچہ کافر ہی کیوں نہ ہوں جنت میں جائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب بھی جنت میں نہ جانے پائیں، اعراف سے آگے قدم رکھنے کی اجازت نہ ہو اور پھر محبوب بھی کون؟ چچا جان اور وہ بھی مسلمان کیوں کہ اگر کافر ہوتے تو اعراف تک کی نوبت میسر کہاں آتی کیوں کہ کفار کے لیے تو سیر تیار ہے، فرماتے ہیں:

”إِنَّا أَخْلَعْنَا لِلْكَافِرِينَ سَلَابِلَ وَأَغْلَلًا وَسَجِيرًا“..... ”یعنی ہم نے کافروں کے لیے تیار

کر رکھی ہیں زنجیریں اور ذوق اور سیر“..... دوسری آیت ”وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ“

..... ”یعنی جو لوگ کافر ہوئے ان کا ٹھکانہ بجز جہنم کے اور کچھ نہیں۔“

بہر حال قاضی صاحب کی تحقیق کی خوبی دیکھنی چاہیے کہ کس دعویٰ کو کس دلیل سے ثابت کرتے ہیں اس سے واضح ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ان کو بجائے پدریہ زکواری سمجھتے تھے مگر بالقرض اپنا حق نہیں بھی چاہتا تھا اب اس وجہ سے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا فرمانا اس قائل نہیں کہ نہ مانے ان کا فرمانا قبول کر لیا نہ کہ تقیہ کی وجہ سے چپکے ہو رہے مگر حق گمراہ کرتا ہے تو الٹی ہی سمجھ میں آتی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خاموشی رضا مندی کی وجہ سے تھی

بہر حال اتنی بات ثابت ہے کہ حضرت ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بالضرور ہوا ہے، باقی رہا عذر تقیہ، سوال عقل آپ پہنچاتے ہیں کہ یہ خیال خام الی تشیع ہے ورنہ یہ روایت خود ہی اس کی تکذیب کرتی ہے کہ یہ سانحہ بوجہ تقیہ حضرت امیر پر گزرا ہو، کوئی مسلمان سمجھ سکتا ہے کہ اول تو حضرت امیر اور پھر تقیہ؟ یہ ایسی بات ہے کہ جیسے کوئی یوں کہے کہ شیر ہو کر گیدڑوں سے ڈرتا ہے اور پھر حضرت امیر کا تقیہ بھی ایسے قصہ میں کہ کوئی کافر بے دین اور بے غیرت اور بے حکمین بھی گوارا نہ کرے، مع ہذا یہ بھی منجملہ محالات عادی کے ہے کہ محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ ہی کے خاندان کے ساتھ ایسی جفا ظہور میں آئے، اس لیے کہ محبت نبوی تو میزان حق و باطل ہونی چاہیے جس طرف کو آپ کی محبت جھکی وہ حق ہو دوسری جانب باطل، القرض محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا ریب الی حق میں سے ہوں گے پھر الی حق سے کہیں ہو سکتا ہے کہ آپ کی نواسی کو ایک کافر بے دین کے حوالے کر دے؟ مع ہذا ہم نے مانا کہ بوجہ تقیہ ہی حضرت امیر نے یہ نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کر دیا لیکن تاہم یہ عذر تقیہ بدتر از گناہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی کیوں سامنے ہو؟

فاروق اگر کافر ہوں تو امام علی بھی محفوظ نہیں

بالجملہ یہ نکتہ محفوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ مسلمان ہیں اور کامل الایمان ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ضرور باایمان ہیں کہ ان کے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح کر دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اگر (نعوذ باللہ) کافر ہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ (نعوذ باللہ) پہلے ہیں، کافر نہیں، فاجر بھی کہ اپنی بیٹی کا نکاح ان سے کر دیا، اپنے آپ کیا تو کفر میں کچھ شک نہیں اور زبردستی کر دیا تو باوجود اس استطاعت کے اتنی بے عزتی (نعوذ باللہ) کہ ادنیٰ چمار بھی گوارا نہ کرے، حضرت علی رضی اللہ عنہ تو درکنار، الہی تو خوب جانتا ہے کہ میں اس عقیدہ سے بدل و

جان نا خوش ہوں اور حضرت زہرا کی صاحبزادی کا یہ قصہ بنا چاری لکھتا ہوں کہ کسی طرح مولوی عمار علی صاحب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے بدظن نہ رہیں۔

تزوج أم کلثوم کا کتب شیعہ سے ثبوت

اور خمریہ بھی نہ سہی ہم بھی (ہوں گے تو) ان شاء اللہ تعالیٰ قاضی صاحب کو اماموں کے اقوال سے جھوٹا کریں گے، کتب امامیہ میں صحیح صحیح روایتیں اس مضمون کی موجود ہیں کہ حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لائق فائق سمجھ کر اپنی صاحبزادی مطہرہ کا نکاح کیا نہ کہ جبراً کرنا۔

سُئِلَ الْأَمَامُ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيٍّ الْبَاقِرُ عَنْ تَزْوِيجِهَا فَقَالَ لَوْلَا إِنَّهُ رَأَاهُ أَهْلُ لَمَّا كَانَ يُزَوِّجُهَا إِيَّاهُ وَكَانَتْ أَشْرَفَ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ جَلَسًا رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَخَوَاهَا الْحَسَنُ وَالْحُسَيْنَ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ سَيِّدَ الشِّبَابِ أَهْلُ الْجَنَّةِ وَأَبُوهَا عَلِيُّ ذُو الشَّرَفِ وَالْمُنَقِبَةِ لِي الْأِسْلَامِ وَأُمُّهَا فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَلَّتْهَا خَدِيجَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا.

”حاصل اس کا یہ ہے کہ حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ سے حضرت أم کلثوم کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نکاح کی وجہ پوچھی گئی، انہوں نے فرمایا کہ اگر حضرت علی حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو حضرت أم کلثوم کے لائق نہ سمجھتے ہرگز ان کا نکاح ان سے نہ کرتے، وہ سارے جہان کی عورتوں سے زیادہ شرافت والی تھیں، اس لیے کہنا تو ان کے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دو بھائی ان کے حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضوان اللہ تعالیٰ علیہما اجمعین جو جوانانِ جنت کے سردار ہیں، باپ ان کے حضرت علی رضی اللہ عنہ جو اسلام میں شرف اور منقبہ رکھتے ہیں اور اماں ان کی حضرت فاطمہ سیدۃ نساء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی اور ثانی ان کی خدیجہ الکبریٰ خلیلہ کی بیٹی رضی اللہ عنہما فقط“

شیعہ کو اہل بیت سے محبت نہیں، صحابہ سے عداوت ہے

اس روایت کو دیکھئے اور حضرت قاضی صاحب کی بناوٹ کو دیکھئے، زور اس دعویٰ محبت پر کہ اس پردہ میں کیا کہتے ہیں، مشہور تو یوں کرتے ہیں کہ ہم کو اہل بیت سے محبت ہے اور اس لیے صحابہ سے عداوت ہے اور ہماری تشفی میں یوں آتا ہے کہ آپ کو اصل صحابہ سے عداوت ہے اور اس سبب سے اہل بیت کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، سوال بیت کب اس طرح کھینچتے ہیں؟ بلکہ اس طرف سے کھینچتے ہیں اور کیونکر نہ کھینچیں۔ امام محمد باقر رضی اللہ عنہ پر تفسیر حرام تھا چنانچہ بحث تفسیر

میں اس کی سند گزر چکی، ان کے فرمانے کے بعد بھی حضرت علی اور حسین رضی اللہ عنہما کیا ان کے ساتھ بنی ہاشم کو بے غیرت اور بے حیا تلائے جاتے ہیں اور طاہرہ مطہرہ جگر گوشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو "إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَ كُمْ تَطْهِيرًا" کی بشارت تطہیر میں داخل ہے، بدشام وزنا (نعوذ باللہ) پیش آتے ہیں، خدا ان خبیثوں کو سمجھے، پھر اہل بیت کا ان پر غصہ نہ ہو تو اور کیا ہو جس کے دل میں ایمان ہے وہ ایسی داہیات کو سن کر کانپ اٹھتے ہیں، پر خدا جانے ان تیرہ درونوں کو کیا ہوا کہ اپنے اس عیب کج کے ہنر بنانے کے لیے اماموں پر بھی بہتان باندھتے ہیں، یہ بے ایمان کہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ پر بہتان باندھتے ہیں اور اپنا گناہ ان کے سر دھرتے ہیں اور اس نکاح کے عذر میں یہ ناپاک الفاظ نقل کرتے ہیں کہ جن کی نقل سے بھی جی ڈرتا ہے۔ ترجمہ تو درکنار وہ الفاظ یہ ہیں "وَهُوَ أَوَّلُ فَرْجٍ غُصِبَ مِنَّا" اے خداوند عالم الغیب تجھ پر روشن ہے کہ میں بدل و زبان اس خیال ناپاک سے بری ہوں اور یوں سمجھ کر کہ نقل کفر کفر نباشد بایں خیال نقل کرتا ہوں کہ شاید کوئی بے خبر ان دعا بازوں کے وام میں پھنسا ہوا ان کے کہ کفریات سن کر شاید راہ راست پر آ جائے۔

حب حضرت علی رضی اللہ عنہ کفر کے باوجود اگر جنتی بناتی ہے تو قرابت بھی بنائیگی

افسوس ایک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عداوت کے سبب خاندان نبوی کو تو اتلید لگا دیا پر یہ نہ ہو سکا کہ بتصدق اہل بیت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کوشاں رحمت اور مغفرت خداوندی سمجھ لیتے، کیا یہ نسبت تزویج زینب بنت ابی اسحق نصرانی اور ابن فضلون یہودی کے اشعار سے بھی گئی؟ حب علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں یہ تاثر ہے کہ ایمان کی بھی ضرورت نہیں حالانکہ کلام اللہ سے کفار کا ٹھکانہ جہنم ہی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ مرقوم ہو چکا، پھر کیا اتنی بھی تاثیر نہ ہوگی کہ اپنے واسطے داروں کو بخشوالیں، بہر حال علماء شیعہ حضرت ام کلثوم کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نکاح ہونے میں متفق ہیں پر بعض بھولے چو کے حق بات بول جاتے ہیں اور معنی بری طرح ادا کرتے ہیں۔ سو ہمارا تو مذہب یہ ہے کہ "خُلِدَ مَا صَفَا وَذُغَ مَا كَلَسَ" لیکن مولوی عمار علی صاحب سب سے بڑھتے رہے انہوں نے سمجھا حق کو حق کہئے تو مذہب کی خیر نہیں بلکہ مذہب تو مذہب، سنیوں سے ہزار مرتبہ زیادہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا معتقد ہونا پڑے گا کہ وہ اہل بیت میں داخل ہو جائیں گے اور تفسیر کی صورت میں بھی باوجود جھوٹ بولنے کے وہی خرابی کی خرابی برسر، بلکہ اس سے زیادہ کیونکہ بطغیل اہل بیت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ناحق میں اتنی خرابی نہیں جتنا بطغیل عمر اہل بیت کے نہ ماننے میں خرابی ہے۔ خصوصاً حضرت امیر کے اور در صورت

تقیہ ظاہر ہے کہ کمال بے غیرتی اور بزدلی اور بے حیائی اور دین کی سستی اور حدود اور احکام میں مدھنٹ اور مدھنٹ بھی اس قدر لازم آتی ہے، سو مولوی صاحب نے ہمارے نزدیک بہت اچھا سمجھا کیونکہ جب جھوٹ بولنا ہی ٹھہرا تو معقول ہی کیوں نہ بولے گو کچھ زیادہ ہی سہی۔

چو آب از سر گذشت چہ یک نیزہ چہ یک دست
چونکہ مولوی صاحب کے اس جمل سے فی الجملہ ہوشیاری شکتی ہے تو عجب نہیں کہ اگرچہ کئی بات کہی جائے تو ان کے دل میں لگ جائے اور شاید اس سبب سردست نہیں تو رفتہ رفتہ حق کو حق سمجھ جائیں، ہمیں بھی لازم پڑا کہ کوئی اور روایت بھی بیان کریں کہ اس میں ایک تو مولوی صاحب کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر غیظ و غضب کم ہو جائے گا، دوسرے کثرت روایات سے شرما کو شادان و فرحان نہیں تو (لے لے لے) زبان سے شاید مان جائیں وہ روایت یہ ہے:

رَوَى ابْنُ أَبِي الْخَلْدِيدِ شَارِحُ نَهْجِ الْبَلَاغَةِ لِي قِصَّةَ تَزْوِيجِ أُمِّ كَلْثُومٍ لِحَبَابَةِ
عُمَرَ إِلَى مَجْلِسِ الْمُهَاجِرِينَ بِالرُّوَصَةِ وَقَالَ رَفَعُونِي رَفَعُونِي قَالُوا بِمَاذَا يَا أَمِيرَ
الْمُؤْمِنِينَ قَالَ تَزَوَّجْتُ أُمِّ كَلْثُومٍ بِنْتُ عَلِيٍّ بِنِ ابْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ.

”حاصل یہ ہے کہ ابن ابی الہدیہ شارح نہج البلاغۃ حضرت ام کلثوم کے نکاح کے قصہ میں بیان کرتا ہے کہ جس جگہ مہاجرین روضہ میں بیٹھے ہوئے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے اور یہ فرمایا کہ مجھے مبارکباد دو، مجھے مبارکباد دو، انہوں نے کہا یا امیر المؤمنین! کاہے کی مبارکباد؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضرت ام کلثوم علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی بیٹی سے نکاح کیا ہے۔ فقط“
اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس نکاح سے بڑا افتخار تھا، اہل انصاف کے نزدیک تو یہی بات کفایت کرتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے معتقد ہو جائیں کیونکہ بظاہر افتخار اسی وجہ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت حاصل ہو گئی اور کوئی یوں نہ سمجھے، لو ہم کون سے گلے پر چھری رکھے ہوئے ہیں۔

حضرت ام کلثوم سے فاروق کی اولاد

اب مناسب یوں ہے کہ اس بات کا خاتمہ کیجئے پر بطور تنبیہ ایک اور امر معروض خدمت ہے، بعضے امامیوں نے سنیوں کے سامنے شرم اتارنے کے لیے حضرت سارہ زوجہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں سے اخذ کر کے یوں بات بنائی ہے کہ حضرت عمر حضرت ام کلثوم پر قادر نہ ہوئے اور وجہ یہ ہوئی کہ ایک جن بیچ میں حائل ہو جاتا تھا۔ سو ہر چند اس جا جھوٹا ہونا اس روایت

ہا معلول سے بھی لگا ہے کہ جو حضرت امام جعفر صادق کی طرف سے بتایا ہے مگر ہاں ہمہ جواز ثابت ہے کہ حضرت ام کلثوم کے شکم مبارک سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک بیٹا پیدا ہوا، ان کا نام زید رکھا، وہ جوان ہوئے، آخر کو بیس برس کی عمر میں بنی عدی کی باہم کی خانہ جنگی میں شہید ہوئے۔ "إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ" اور ان کی والدہ بھی اسی روز بیماری میں انتقال کر گئی تھیں اور نو جنازوں کو ایک دفعہ نکالا اور حضرت امام حسین اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جنازہ کی نماز پڑھ کر دفن کر دیا اور یہ بھی نہ سہی یہ کیا تھوڑی بات ہے کہ مدت العمر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس رہیں۔ حضرت سارہ کسی ایسے کی نو اسی نہ تھیں، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جب ان کو ایک دم میں چھڑا دیا تو حضرت ام کلثوم کی تو زیادہ ہی قدر کرنی چاہیے۔

باب مباحثہ فدک

الحمد للہ کہ مولوی عمار علی صاحب کی تمام افترا پرداز یوں کے جواب سے فراغت پائی مگر جو کچھ انہوں نے دربارہ فدک زبان درازیاں اور افترا پردازیاں کی ہیں، اس کی مکافات میں حسب محل مشہور جیسے کوتیسا اور جواب ترکی بہ ترکی، مناسب تو یوں تھا کہ ہم بھی کچھ نظم و نثر سے پیش آتے اور مولوی صاحب کی مہملات کے جواب میں مولوی صاحب کو بے نقط سناتے مگر جو نکالسی خرافات کا بکنا پا جیوں کا کام ہے ہم کو کیا زبیا ہے کہ اسکی نازیبا باتوں میں مولوی صاحب کے بمصطیر ہوں اور اپنی زبان کو گندہ کریں اور اہل عقل اور ارباب حیا سے شرمندہ ہوں؟ مع ہذا اصحاب ملشہ کی اہانت کے انتقام میں مولوی عمار علی صاحب سے دست و گریباں ہونا تو ایسا ہی جیسا چاند سورج پر تھوکنے کی سزا میں کتے کے کوئی پتھر لگائے یا آسمان کی طرف تھوکنے کے عوض میں کسی کم محل ناخبار کے منہ میں کوئی پیشاب کی دھار لگائے، ظاہر ہے کہ اول تو چاند، سورج کو ان حرکات ناشائستہ سے کیا نقصان؟ بلکہ عقلاء کے نزدیک اور دلیل رفعت مکان ہے، دوئم کجا شمس و قمر کجا سگ و کم محل سگ نژاد؟ مساوات ہو تو ایک بات بھی ہے ورنہ سگ اور سگ مزاجوں کی اتنے میں کچھ عزت نہیں جاتی ہاں اپنی اوقات البتہ فی الجملہ خراب جاتی ہے۔ سو ایسے ہی اصحاب ملشہ کو اول تو مولوی عمار علی صاحب جیسوں کی اہانت یا برا کہنے سے کیا نقصان؟ بلکہ الٹا باعث رفعت شان ہے۔ چاند، سورج کی طرح وہ روشن ہوئے تو کتے ان پر بھونکے اور اوروں پر کیوں نہ بھونکے؟ دوئم کجا اصحاب ملشہ کجا امثال مولوی عمار علی؟ جو ان کے برا کہنے کے عوض میں ان کو برا کہہ کے جی ٹھنڈا ہوا اور دل کا بخار لگے، یہاں تو یہی نسبت مذکور ہے۔ سو مولوی عمار علی صاحب جیسوں کے برا کہنے میں ان کی تو کچھ

عزت نکس جاتی جو قصاص تمہارا اہانت اصحاب ہو، ہاں اپنی اوقات خرافات میں صرف ہوگی۔ سو ہم کون سے مجتہد زمانی طوسی ثانی مولوی میرن صاحب کے چیلے چانٹوں میں سے ہیں جو محل کی یہ شہادت در بارہ دشنام نہ سنیں ”دشنام ہمد ہے کہ طاعت باشد مذہب معلوم و اہل مذہب معلوم“ اور دشنام کو عبادت نہ سمجھ کر مولوی عمار علی صاحب کو گالیاں دے کر ان کی عزت بڑھائیں اور مولوی عمار علی صاحب یا امثال مولوی عمار علی صاحب کو چھوڑ کر کسی برے کو برا کہیں تو کس کو کہیں۔

حب اہل بیت و حب صحابہ ایمان کے دو پر ہیں

اہل بیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو ہمارے حق میں چشم و چراغ ہیں، ہمارے نزدیک اعتقاد اصحاب اور حب اہل بیت دونوں کے دونوں ایمان کے لیے بمنزلہ دو پر کے ہیں، دونوں ہی سے کام چلے ہے، جیسے ایک پڑ سے طائر بلند پرواز نصف پرواز تو کیا ایک بالشت بھی نہیں اڑ سکتا، ایسے ہی ایمان بھی بے ان دو پڑوں کے سہارے کے موجب فوز مقصود (جس کی طرف ”أُولَئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ يَا فَازٌ فَوْزًا عَظِيمًا“ وغیرہ میں اشارہ ہے) نہیں ہو سکتا بلکہ ایسا ایمان ایسا ہی ایمان ہے جس کا آیت ”لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا“ میں بیان ہے ہاں اگر ہم قدم بقدم حضرات شیعہ ہوتے تو جیسے انہوں نے موافق مثل مشہور غیروں کی بدگفتی کے لیے اپنی ناک کاٹ لی، سنیوں کی ضد میں اصحاب کرام کو برا کہہ کر اپنے ایمان کا زیاں کیا، ہم بھی شیعوں کی ضد میں نعوذ باللہ اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برا کہہ کر مثل خوارج و نواصب اپنے ایمان کو خراب کرتے لیکن ہم کو تو پابندی عقل و نقل سے ناچاری ہے شیعہ تو نہیں کہ مثل شتر بے مہار پر اگندہ رفتار جائیں۔

حب اہل بیت و حب صحابہ ایمان کی دو آنکھیں ہیں

راہ کی بات تو یہ ہے کہ ہم کو دونوں فریق بمنزلہ دو آنکھوں کے ہیں، کس کو پھوڑیں جس کو پھوڑیں اپنا ہی نقصان ہے بلکہ جیسے کوئی حسین متناسب الاعضاء ہو کہ اس کی آنکھ ناک سب کی سب مناسب اور متناسب ہوں اور پھر اس کی ایک آنکھ بیٹھ جائے تو دوسری آنکھ کی زیب بھی جاتی رہے گی اور اس پر اگر بیٹھی ہوئی آنکھ کے حصہ کی فراخی بھی دوسری ہی آنکھ میں آجائے اور اس میں بجائے سپیدی بھی سیاہی ہی چھا جائے، بجائے حسن ایسا قبیح النظر ہو جائے کہ دلدادگان قدیمی اور عاشقان صمیمی بھی اس کی صورت پر لا حول پڑھنے لگیں، خاص کر دوسری آنکھ جو باقی رہی ہے بسبب اس کے کہ اپنے اندازہ سے زیادہ فراخ اور کشادہ اور سپیدی کی جا بھی سیاہی ہی ہو گئی ہے، ایسی بری اور بد شکل ہو جائے گی کہ

کچھ نہ پوچھو بلکہ اگر چشم باقی ماندہ کو شعور اور اختیار ہو تو اپنی اسی حالت اصلی پر آجائے اور دوسری آنکھ کو بھی بدستور قائم کر دکھائے کیونکہ اپنا حسن بھی اصلی کیفیت اور دوسری آنکھ کی معیت میں ہے۔

شیعوں نے اپنے ایمان کی ایک آنکھ پھوڑ ڈالی

سوجینہ بھی قصہ حضرات شیعہ کے ایمان کے ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے، اعتقاد صحابہ اور حب الہ بیت جو بمقتضائے شہادات کلام اللہ اور عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کے لیے بمنزلہ دو آنکھوں کے ہیں۔ چنانچہ رسالہ ہذا کے ملاحظہ کرنے والوں پر پوشیدہ نہ رہے گا، ان دونوں آنکھوں میں سے شیعوں نے ایک آنکھ کو پھوڑ دیا اور اس کے حصہ کی فراخی اور کشادگی بھی بلکہ اس سے بھی زیادہ دوسری آنکھ کو دے کر اس کو خراب کر دیا۔ یعنی اعتقاد صحابہ کو جو بمنزلہ چشم ایمان ہے اپنے ہاتھوں کھو کر دوسری آنکھ یعنی حب الہ بیت کو اس قدر بڑھایا کہ صحابہ کے حصے کی محبت بھی انہیں کے لیے صرف کر دی، پھر جیسے کہ آنکھ میں سفیدی کی جا بھی سیائی آجائے، ان حضرات بزرگوار فرقہ مسیحی بھی نے بھی ایسا ہی کیا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ جیسے آنکھ میں گل اور سیائی اور سفیدی غرض چند قسمیں ہوتی ہیں ایسے ہی عترت میں بھی چند قسمیں تھیں، اولاد اور ازواج اور سوا ان کے اور اقربا کیونکر باتفاق الہ لغت عترت کے معنی خویش اور اقربا کے ہیں۔ سوا ان سب میں سے حضرات شیعہ نے فقط اولاد کو اور اولاد میں سے بھی فقط دس بارہ کو اور سوا اولاد ایک آدھے کسی اور کو تو مخدوم و مکرم سمجھا، باقی سب کے لیے تبرا ہے، پر جن کو اپنا پیشوا اور مقتدا بنایا اور مخدوم و مکرم ٹھہرایا، ان کے حق میں محبت کو کچھ ایسا حد سے بڑھایا کہ گویا صحابہ باقی ماندگان عترت کے حصہ کی محبت بھی انہیں کے ثار کی، سو یہ بھی نہ وہی مثل ہے کہ آنکھ اپنے اندازہ سے زیادہ کشادہ تو ہوئی تھی پر سفیدی کے عوض بھی سیائی ہو گئی، شاید اس اجمال میں تاوانقان شیعہ کو بحکم مثل مشہور ”المرء یقیس علی نقبہ“ کے احتمال جعل و تلبس ہو اس لیے تفصیل اس اجمال کی ضرور کرنی پڑی تاکہ اپنی کتاب اور الہ کتاب کی طرف مراجعت کر کے ہآسانی تحقیق کر کے بعد تطبیق اس ہجرت کی تصدیق کریں۔

شیعوں نے عترت میں سے بعض کی تکریم کی اور اکثر پر تبرا کیا

سو تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حضرات شیعہ حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم دختران مطہرہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سرے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں ہی نہیں سمجھتے،

یہاں تک کہ زبان زد خاص شیعہ یہ بات ہو گئی ہے، عام تو درکنار خاص بھی اسی حساب سے عام ہی ہیں بلکہ عام سے بھی پرے اور تو کیا کہوں حالانکہ انہیں کی کتب معتبرہ سے ان دونوں مطہرات کا بہ نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیاں ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ قریب ہی اس بات کی شرح مرقوم ہو چکی اور حضرت عباس عم بزرگوار سید الارسل اللہ علیہ وسلم اور ان کی اولاد اور ایسے ہی حضرت زبیر بن العوام کو بھی داخل حرمت نہیں سمجھتے اور اس قرابت قریبہ پر بھی لحاظ نہیں کرتے۔ حضرت عباس کی قرابت تو مشہور و معروف ہی ہے پر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بھی بسبب کثرت علاقہ ہائے قرابت گویا بمنزلہ برادر حقیقی کے تھے، اول تو ان کی والدہ حضرت صفیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمہ اور ان کی دادی ہالہ بنت وہب بن عبد مناف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی خالہ تھیں ان کے باپ کی پھوپھی ام حبیب بنت اسد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دادی اور ان کی حقیقی پھوپھی حضرت ام المؤمنین خدیجہ الکبریٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ، پھر ان سب کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم زلف ان کی بیوی حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہا، حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بہن، ماسوا ان سب کے پانچویں پشت یعنی قصی بن کلاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملے ہیں، علماء نسب نے لکھا ہے کہ اتنی کثرت سے قرابت کے علاقے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے اور کسی کو نصیب نہیں ہوئے۔

لیکن آفرین ہے حضرات شیعہ کو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقرباء کے دشمن ہوں تو ایسے ہوں کہ حضرت زبیر جیسے قریب عزیز کو (تو ہا وجود یہ کہ وہ مہاجرین اولین میں اور مجاہدین سابقین میں سے ہیں اور سینکڑوں بشارات فرقانی اور وعدہ ہائے قرآنی ان لوگوں کی بزرگی پر گواہ ہیں)۔ از جملہ کفار گونا گوار اور منافقین بدکردار سمجھتے ہیں۔

اہل بیت سے مراد کون ہیں؟

باقی رہیں ازواج مطہرات جو اہمات مؤمنین یعنی سب مسلمانوں کی مائیں ہیں، ان کی نسبت جو کچھ حضرات شیعہ ثاخوان ہیں سب ہی جانتے ہیں حالانکہ اصل اہل بیت وہی ہیں کیونکہ اول تو اہل بیت کے معنی اہل خانہ ہے، اتنی بات تو (گو نہ جانتے ہوں) مولوی عمار علی صاحب بھی جانتے ہوں گے، دوسرے لفظ اہل بیت جو کلام اللہ میں واقع ہوا ہے تو ازواج مطہرات ہی کی شان میں وارد ہوا ہے۔ گو حضرت علی اور حضرت زہرا اور حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی بوجہ عموم لفظ یا بہ سبب التماس حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل بیت ہونے کی فضیلت میں داخل

ہو گئے ہیں۔ مزید تسکین کے لیے جس آیت میں یہ لفظ واقع ہے مائل اور مابعد سمیت لکھ کر اس کا ترجمہ لکھ دیتا ہوں تاکہ سب شیعہ دینی متنبہ ہو جائیں۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لَسْتَنْ كَاخِذٍ مِّنَ الْبَيِّنَاتِ اِنَّ الْاَقْيِسَ لَآ تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ
الْبَدِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۝ وَقُرْنِ لِّيْ يُّوْنُسَ وَلَا تَبْرُجْنَ تَبَرُّجَ
الْجَاهِلِيَّةِ الْاُولٰٓئِى وَ اَلِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ اَتَيْنَ الزَّكٰوةَ وَ اَطَعْنَ اللّٰهَ وَرَّسُوْلَهٗ. اِنَّمَا يُرِيْدُ
اللّٰهُ لِيُذِلَّ عَنْكُمْ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرا ۝ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى لِيْنَ
يُّوْنُسَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَ الْحِكْمَةِ. اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ۝

”یعنی اے نبی کی عورتو! تم نہیں ہو جیسے ہر کوئی عورتیں، اگر تم ڈر رکھو تو وہ کر نہ کہو بات، پھر
لاحی کرے کوئی جس کے دل میں روگ ہے اور کہو بات معقول اور قرار پکڑو، اپنے گھروں میں اور
دکھائی نہ پھر جیسا دکھانا دستور تھا، پہلے نادانی کے وقت میں اور کھڑی رکھو نماز اور دینی سوز کوۃ اور
اطاعت میں رہو اللہ کی اور اس کے رسول کی، اللہ بھی چاہتا ہے کہ دور کرے تم سے گندی باتیں
اے گمراہو، اور ستمرا کرے تم کو ایک ستمرائی سے اور یاد کرو اے پیغمبر کی بیوی جو پڑھی جاتی ہیں
تمہارے گھروں میں اللہ کی باتیں اور عقل مندی، مقرر اللہ ہے بھید جانا خبردار۔“

یہاں تک ترجمہ تھا۔ اب عرض یہ ہے کہ شیعہ ہی اپنے علماء سے پوچھیں کہ میں نے ترجمہ صحیح کیا
یا غلط۔ بہر حال ان آیات سے اوّل بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اہل بیت ازواج ہی ہیں۔

خاندان امام کو عبا میں لے کر دُعا کرنے کی وجہ

اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی اور حضرت زہرا اور حضرات حسنین رضی اللہ
عنہم اجمعین کو ایک عبا میں لے کر یہ دُعا کی کہ الٰہی یہ میرے اہل بیت ہیں تاکہ وہ بھی اس فضیلت
میں داخل ہو جائیں، یہ ایسی مثال ہے جیسے کوئی بادشاہ قدر شناس چشم پوش اپنے وزیر سے یوں کہے کہ
تمہارے گھر کے سب لوگوں کو ہم جدا جدا جگہ کر دیں گے تو وہ وزیر موافق محاورہ کے یوں سمجھ کر کہ ایسے
موقع میں بی بی اور بیٹا مراد ہوا کرتے ہیں اور بیٹی اور نواسی مراد نکلی ہوتی کیونکہ دوسرے گھر کی ہوتی
ہیں، کچھ اپنے جی میں سوچ کر وقت دیکھ کر بیٹی اور داماد اور نواسوں کو بھی پیش کرے، وہ بادشاہ اگر پوچھ
بیٹھے کہ یہ کون ہیں تو ہائیں لحاظ کہ بیٹی اور نواسی اور داماد بھی قرابت میں کچھ بیٹی اور پوتی اور بی بی سے کم
نہیں، یہ کہے کہ حضور میرے گھر کے لوگ ہیں تو اس بادشاہ کو گو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ داماد اور نواسی اور
بیٹیاں ہیں، اس کے گھر کے لوگ نہیں، پر مستحضائے اپنی چشم پوشی ذاتی کے ان کو بھی جا کر دے گا۔

یا لفظ اہل بیت اصل سے عام ہے ازواج اور حضرت علی اور حضرت زہرا اور حضرات حسین و علی
 اللہ تعالیٰ سب کو شامل ہے۔ گو لفظ ازواج ہی کی شان میں نازل ہوا ہو، جیسے دلی والا ایک لفظ عام ہے
 سب دلی والوں کی نسبت بول سکتے ہیں، اگر کوئی دلی کے رہنے والوں کو یوں کہے کہ یہ دلی والے
 ہیں تو اس سے کوئی کون گوار تک بھی یہ نہیں سمجھتا کہ دلی والے لفظ بھی ہیں ان کے سوا اور کوئی دلی
 والا نہیں، اس تقریر سے سب پر واضح ہو گیا کہ کلام اللہ سے جواز ازواج کا اہل بیت ہونا ثابت ہوتا ہے
 سب صحیح اور درست ہے، اگرچہ شیعوں کی سمجھ میں نہ آتا ہو، بالجلہ ازواج مطہرات کو ہا و حمد یکساں
 اصلی اہل بیت ہیں اور کلام اللہ میں ان کی شان میں یوں آیا ہے "وَآزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ"..... یعنی
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیاں مومنوں کی مائیں ہیں۔ "پھر بھی حضرات شیعہ اپنی زبان نہیں
 سنبھالتے اور لگام نہیں دیتے۔ اگر دوسری آیت کا یوں جواب دیں کہ وہ مومنوں کی مائیں ہیں
 ہماری تو نہیں، تو سلمنا پر آیت اول کا۔ یعنی جس سے ان کا اہل بیت ہونا ثابت ہوتا ہے کیا حجاب
 دیں گے؟ بالجلہ ازواج مطہرات کے اعتقاد اور محبت کا اس مذہب میں یہ حال ہے۔

شیعہ اولاد فاطمہ کی اکثریت کے دشمن ہیں

باقی ربی اولاد سوان کا حال بھی سنئے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی اکثر اولاد کے
 حضرات شیعہ دشمن جانی ہیں اور برا کہتے ہیں۔ من جملہ ان کے حضرت زید شہید فرزند ارجمند
 حضرت امام ہمام زین العابدین رضی اللہ عنہما جو عالم اور متقی اور متورع تھے اور مردانوں کے
 ہاتھ سے شہید ہوئے اور ان کے بیٹے یحییٰ بن زید ہیں جو بزرگ اثنا عشریہ مرتد ہیں اور ایسے ہی
 ابراہیم بن امام موسیٰ کاظم اور جعفر بن امام موسیٰ کاظم جن کا لقب شیعوں نے کذاب رکھ چھوڑا ہے
 حالانکہ وہ کبار اولیاء اللہ میں سے ہیں اور بایزید بسطامی انہیں کے مرید ہیں اور جعفر بن علی برادر
 امام حسن عسکری کہ شیعوں کے عرف میں ان کا بھی لقب کذاب ہے اور حسن بن حسن ثنی اور ان کے
 فرزند عبد اللہ محض اور ان کے فرزند محمد نام جو ملقب بنف زکیہ ہیں کافر اور مرتد سمجھتے ہیں اور ابراہیم
 بن عبد اللہ کو اور زکریا بن محمد باقر کو اور محمد بن عبد اللہ بن الحسین بن الحسن اور محمد بن القاسم بن الحسن
 اور یحییٰ بن عمر کو بھی جو حضرت زید شہید کے پوتوں میں سے تھے، کافر اور مرتد جانتے ہیں اور
 جماعت کی جماعت سادات حبیبہ اور حسینہ کو جو حضرت زید شہید کی امامت اور بزرگی کے قائل ہیں
 گمراہ اور اہل ضلالت میں سے سمجھتے ہیں حالانکہ کتب انساب اور کتب تواریخ سادات اس بات پر
 شاہد ہیں کہ اکثر سادات حنی، یعنی حضرت زید کی امامت اور فضیلت کے معتقد تھے۔

حاصل یہ کہ اکثر اثنا عشریہ ان بزرگواروں کو کافر اور مرتد سمجھتے ہیں اور یہ تم خود ہیں جتنے ہیں کہ یہ سب جگر گوشہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور نعت جگر حضرت تبارک و تعالیٰ ہیں۔ ابدلاً بادک جہنم میں رہیں گے اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کیونکہ ان کے نزدیک دوازده امام میں سے کسی امام کی امامت کا منکر ایسا ہی کافر ہے جیسا کسی نبی کی نبوت کا منکر اور سب جانتے ہیں کہ کافر ابدلاً بادک جہنم میں رہیں گے۔ الغرض قول اکثر اثنا عشریہ کا یہی ہے اور یہی ان کے عقائد پر مبنی ہے کہ یہ بزرگواران مذکور کافر ہیں اور ان کے لیے کبھی نجات نہ ہوگی، اگرچہ بعض بات کے قائل ہیں کہ یہ گروہ مثل حضرت عباس عم بزرگوار سیدالابرار صلی اللہ علیہ وسلم اعراف میں رہیں گے اور بعض کہتے ہیں کہ بعد عذاب شدید کے اپنے آباؤ اجداد کی شفاعت سے نجات پائیں گے لیکن ظاہر ہے کہ یہ دونوں قول پوچھ ہیں کیونکہ جب منکر امامت کافر ہوا تو شفاعت کے ہونے اور اعراف میں رہنے کے کیا معنی، شفاعت بالاجماع کافروں کے حق میں نہ کوئی کر سکے اور نہ مقبول ہو اور اعراف میں کافروں کا جانا خلاف قرآن ہے۔

إِنَّ الدِّينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝ خَلِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْقَرُونَ ۝

”یعنی مقرر جو لوگ کہ کافر ہوئے اور کفر پر ہی مرے ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی لعنہ لوگوں کی سب کی لعنت ہے، ہمیشہ اس میں رہیں گے ننان سے عذاب کم کیا جائے گا نہ ننان کو مہلت ملے گی۔“
الحاصل حضرات شیعہ کو دعوائے محبت تو اس قدر اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد اور اقرباء اور ازواج رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اماموں کی اولاد اور ان کے بھائیوں کے ساتھ یہ سلوک، خاک پڑے اس محبت پر، ان میں اور ماصیوں میں دس بارہ ہی نمبر کافریہ ہے فقط اعادہ تو ہے کہ شیعہ دوازده امام اور ان کے بعض اقرباء کی بزرگی کے معتقد ہیں بلور ماضی حقیقت نہیں، سو اس اعتقاد سے تو ان کی بے اعتقادی ہی بھلی کیونکہ اول تو یہ فرقہ محبت کے پردہ میں حضرات ائمہ کے ذمہ صدمہ عیب لگاتے ہیں اور پھر ان کفریات کو ہر کس و نا کس اپنے بیگانے کے سامنے لگاتے ہیں، چنانچہ کچھ کچھ تو اس رسالہ کے دیکھنے والوں کو بھی معلوم ہو گیا ہوگا۔

اہل شیعہ کی حضرت علی سے محبت جو دشمنی سے بدتر ہے

یہاں ہر چند اس بات کے مفصل لکھنے کا موقع ہے لیکن اس رسالہ مختصر کے مناسب نہیں، اس لیے بطور نمونہ اشارہ کیے جاتا ہوں۔ حضرت امام الائمہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حوالہ کچھ ایسے

تراش رکھے ہیں کہ جس سے ہر کوئی سمجھ یہ جائے کہ (نعوذ باللہ) وہ بڑے بے غیرت نامرد جموں
کذاب تھے کہ اپنی بیٹی کافروں کے حوالے کر دی اور بہ خوف جان نہ اس مقدمہ میں کچھ چون دھا
کی، نہ کسی اور بات میں دم مارا، کافروں کے پیچھے ساری عمر نمازیں پڑھیں اور ہمیشہ ان سے ہم
حیالہ اور ہم نوالہ رہے اور ان کی تعریفیں ہار ہا ایسی کریں کہ مومنان با اخلاص کی اس کے عشر مشیر بھی
ایک دفعہ بھی نہ کی جب ان کا یہ حال ہے تو اوروں کا تو کیا ذکر۔

ع:..... قیاس کن زگستان من بہار مرا

خارجی اور نامحی ہر چند حضرت علی کو برا سمجھتے ہیں، پراتنا نہیں سمجھتے۔

انبیاء آئمہ سے بلکہ تمام مخلوق سے افضل ہیں

دوسرے پھر اس محبت نامعقول کو اتنا حد سے بڑھایا کہ انبیاء اور مرسلین علیہم السلام کو بھی
اماموں سے گھٹایا، چنانچہ مذہب امامیہ بہ نسبت تمام آئمہ ہدی کے کہتا ہے کہ وہ سب تمام انبیاء سے
افضل ہیں حالانکہ کلام اللہ اور خود ان کی کتابیں اس بات پر شاہد ہیں کہ انبیاء سب سے افضل ہیں،
کلام اللہ میں برابر انبیاء کی نسبت اصطلافاً اور اجباً جو بمعنی چھانٹ لینے کے ہے، مستعمل ہے اور ظاہر
ہے کہ چھانٹی ہوئی چیز باقی سے افضل ہوتی ہے، مع ہذا اکل چار فرقوں کی خداوند کریم تعریف فرماتا
ہے، انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین، سو ہر جگہ انبیاء ہی کو مقدم کیا ہے، تو اس سے معلوم ہوا
کہ نبی باقی تین فرقوں سے افضل اور رتبہ میں مقدم ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے آئمہ ہدی نبی تو تھے ہی
نہیں پھر ان تینوں فرقوں میں سے جوئے کو شیعہ پسند کریں اختیار ہے، بہت سے بہت اماموں کو
صدیق کہیں گے اور ہمارا عقیدہ بھی یہی ہے۔ تب بھی انبیاء سے بعد ہی میں رہے۔

افضلیت انبیاء کتب شیعہ سے

لیکن ہم جانتے ہیں کہ شیعہ کلام اللہ کی کاہ کو شیخ کے؟ اس لیے مناسب ہے کہ انہیں کی
کتابوں سے ان کو جھوٹا سمجھئے اور جنادیجئے کہ یہ جو مثل مشہور ہے کہ ”دروغ گورا حافظہ ہاشد“ اور
ایسے ہی مثل کہ ”حق بر زبان جاری شو“ دونوں سچی ہیں، پیشوایان شیعہ نے ہر چند ان روایات
کے تراشنے میں جہد بلیغ کیا جس سے اماموں کا انبیاء سے افضل ہونا ثابت ہو جائے لیکن
بمٹھائے مثل اول چوک کر بمٹھاء مفہوم مثل ثانی حق بات کہی گئی۔

روی الکلبی عن هشام الاحول عن زید بن علی ان الانبياء

الْعَصْلُ مِنَ الْإِثْمَةِ وَإِنْ مَنْ قَالَ غَيْرَ ذَلِكَ فَهُوَ ضَالٌّ

”یعنی کلینی بواسطہ ہشام احوال کے زید بن علی سے روایت کرتا ہے کہ مقرر انبیاء اماموں سے الخلل ہیں اور بیشک جو اس کے سوا کہے وہ گمراہ ہے۔ فقط“

ابوہریرہؓ کا یہ کتاب الامالی میں بروایت صحیح ایک حدیث طویل کے ضمن میں جس میں حضرت ذہیر رضی اللہ عنہما حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کے نکاح کا قصہ مندرج ہے اس طرح طاعت فرماتے ہیں:

عَنِ الصَّادِقِ عَنْ آبَائِهِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى قَالَ لِسُكَّانِ الْجَنَّةِ مِنَ الْمَلَائِكَةِ وَأَرْوَاحِ الرُّسُلِ وَمَنْ لَيْسَ فِيهَا إِلَّا إِنِّي زُوجْتُ أَحَبَّ النِّسَاءِ إِلَيَّ مِنْ أَحَبِّ الرِّجَالِ إِلَيَّ بَعْدَ النَّبِيِّينَ.

”یعنی حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ اپنے باپ دادوں سے روایت کرتے ہیں کہ مقرر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے جنت کے رہنے والوں سے، یعنی فرشتوں سے اور رسولوں کی ارواح سے اور جو سوا ان کے جنت میں تھے، ان سے خداوند کریم نے فرمایا کہ خیر دار رہو کہ میں نے اس عورت کا نکاح جو سب عورتوں سے زیادہ مجھے محبوب ہے اس مرد سے کر دیا ہے کہ جو سب مردوں سے زیادہ مجھے محبوب ہے، انبیاء کے بعد“

خود فرمانے کی جا ہے یہ روایتیں ہا واز بلند ہی کہتی ہیں کہ حضرت امیر کا رتبہ بعد انبیاء کے ہے مگر تم یہ ہے کہ باوجود ان روایات کے پھر آئمہ کو انبیاء سے افضل ہی بتلائے جاتے ہیں، ظاہر اس کا سبب یہی ہے کہ صحابہ کے حصہ کی محبت اور نیز اکثر اہل بیت کے حصہ کا اعتقاد فقط انہیں چند اشخاص محدود کے حق میں صرف کرتے ہیں، سو بہ سبب ادعام اور اجتماع محبت ہائے کثیرہ کے محبت دوازده امام اپنی حد سے باہر نکل گئی۔

اور فی الخلل شیعوں کے وہی مثل ہو گئی جو نصرانیوں کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اس قدر محبت کو بڑھایا کہ ان کو عبودیت سے نکال کر معبودیت تک پہنچایا، چونکہ یہ قصہ بھینہ آنکھ کی مثال کا سا ہے، یعنی جیسے کسی حسین متناسب الاعضاء متناسق الاطراف کی ایک آنکھ بالکل پٹ ہو جائے اور اس کے حصہ کی فراخی بھی دوسری ہی آنکھ میں آجائے اور اس ایک ہی کی مساحت دونوں کی مساحت کے برابر ہو جائے اور پھر اس آنکھ میں بھی بجائے سفیدی سیاہی ہی چھا جائے، ایسے ہی حضرات شیعہ نے حب اہل بیت اور حب اصحاب میں سے ایک کو رکھا اور ایک کو کھودیا اور جس کو رکھا اس کو ایسا بڑھایا کہ دونوں کے برابر اس ایک ہی کو کر دیا اور جیسے آنکھ میں سفیدی کی جا

بھی سیای ہی چھا جائے تو انہوں نے بھی تمام اہل بیت میں سے چند اشخاص معدود کو بزرگ سمجھا اور ہاتی کو مردود اور مرتد قرار دیا اور ہایں وجہ کہ جن کے ساتھ شیعہ محبت کرتے ہیں ان کی محبت سے بڑھی ہوئی ہے۔ یوں سمجھ میں آتا ہے کہ ہاقیوں کے حصہ کی محبت بھی انہیں چند اشخاص معلوم کے لیے ہے تو اس صورت میں جیسے آنکھ نہ کور خود نازیبا معلوم ہوگی اور تمام چہرے کو بے زیب کر دے گی، ایسے ہی حب اہل بیت اور حب اصحاب جو بمنزلہ ایمان کی دو آنکھوں کے ہیں ان میں سے اگر ایک جاتی رہے اور دوسری بڑھ جائے تو دوسری بھی نازیبا ہو جائے گی اور ایمان کے حسن کو بھی بے زیب کر دے گی، اس لیے بالیقین یوں سمجھ میں آتا ہے کہ دو ازادہ امام بھی اس محبت سے خوش نہ ہوں بلکہ متنفر ہوں اور اس بات کے خواستگار ہوں کہ ان کی محبت اپنے اندازہ پر آ جائے تاکہ بری نہ معلوم ہو اور اس کے ساتھ اصحاب سے بھی محبت اور اعتقاد دل میں جمایا جائے تاکہ جیسے ایک آنکھ سے دوسری کی زیب و زینت ہونے ہی سے چہرہ پر حسن آتا ہے، ایسے ہی حب اصحاب سے حب اہل بیت کو زینت ہو اور دونوں ہی سے ایمان اور اسلام کی خوبصورتی ظاہر ہو۔

شیعوں نے صدیق کے بارے میں خدا کی

گواہی اور آئمہ کی شہادت بھی رد کر دی

سوچو کہ اہل سنت رضا اہل بیت میں اپنی سعادت سمجھتے ہیں تو یہ خاکپائے غلامان اہل بیت کی طرف سے نپایہ تمام شیعوں کے عموماً اور مولوی عمار علی صاحب کے خصوصاً کان کھوتا ہے کہ اے مدعیان محبت اہل بیت یہ محبت نامعقول جب تک مقبول نہ ہوگی جب تک کہ حب اصحاب اس کے برابر نہ ہو ورنہ ان کے برا کہنے میں تمہارا ہی برا ہوگا۔ خصوصاً رفیق غار جان ثار سیدالابرار صلی اللہ علیہ وسلم یعنی حضرت ابوبکر صدیق جن کے صحابی ہونے کا خدا خود گواہ ہے۔ چنانچہ مرقوم ہو چکا اور جن کے صدیق ہونے کی اماموں نے شہادت دی ہے اور بمبالغہ ان کی تعریف کی ہے چنانچہ معلوم ہو چکا ان کا برا کہنا خدا اور آئمہ کو جھٹلاتا ہے، ایسی صورت میں تو ہزار عیب بھی اگر آنکھوں سے نظر آئیں تو یوں سمجھو کہ وہ نہ ہمارے نظر اور فہم کا قصور ہے، خدا کا فرمایا اور آئمہ ہدیٰ کا کہا فلان نہیں ہو سکتا جن کو ہم عیب سمجھتے ہیں وہ ہنری ہوں گے ہماری سمجھ میں نہیں آتا تو مت آؤ، ہم تو ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہا جو اس جلالت قدر اور کمال علم و فضل اور لور نبوت اور وفور عقل کے حضرت خضر کی کشتی کے توڑنے اور لڑکے کے قتل کرنے کو کہ وہ ظلم ہرگز نہ تھا، عین مطابق مرضی خدا

وہی تھا، ظلم عظیم سمجھا حالانکہ خداوند کریم کی ہدایت کے موافق گئے تھے اور جناب باری تعالیٰ نے پہلے ہی حضرت خضر کے علم اور بزرگی کی اطلاع کر دی تھی۔ چنانچہ یہ تمام قصہ سورہ کہف میں رکوع "وَاِذْ قَالَ مُوسٰی لِفَتّٰہُ" سے لے کر رکوع "وَيَسْأَلُوْنَكَ عَنْ ذٰی الْقُرْنَيْنِ" تک مذکور ہے پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے رسول جو مرسلین اولوالعزم میں سے بھی اکثروں سے زیادہ ہیں، آدھے قرآن کے قریب انہیں کے ذکر سے پُر ہوگا۔ حضرت خضر کے افعال کی حقیقت کو نہ سمجھیں حالانکہ حضرت خضر متعقین کے نزدیک ولی ہیں نبی نہیں اور اگر نبی بھی ہیں تو بالاتفاق اس رتبہ کے ہرگز نہیں جو رتبہ کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نصیب ہوا تو حضرات شیعوں نے نبی ہیں نہ ولی نہ محفل و دانش سے ان کو کچھ بہرہ۔ چنانچہ اسی لیے یہ مثل ہی ہو گئی ہے کہ "اَلْبَشِيْعَةُ يَسُوْنُ اَهْلِيْهِ الْاُمَمَةُ"..... "یعنی شیعہ اس امت کی عورتیں ہیں۔"

ایسے نادان اگر امت مصطفوی کے سید الاولیاء کے کسی فعل کی حقیقت نہ سمجھیں تو کیا بعید ہے بلکہ میں معتضنائے قیاس ہے کیوں کہ یہ امت اور امتوں سے افضل، اس امت کے اولیاء پہلی امتوں کے اولیاء سے افضل اور بھی نہیں تو جو اس امت میں ایسا ہو کہ خدا اور آئمہ ہدئی دونوں اس کی تعریف کریں وہ تو بیشک پہلی امتوں کے اولیاء سے افضل ہوگا، ایسے شخص کے افعال کی حقیقت تو اگر آئمہ ہدئی بھی نہ سمجھیں اور ظلم و ستم کا گمان کریں تب بھی اہل محفل کے نزدیک کچھ حرج نہیں، بہت ہو تو شیعوں کو یہ خطبان ہو کہ آئمہ ہدئی ہمارے عقیدہ کے موافق افضل الخلائق ہیں، ابوبکر اگر بزرگ بھی ہوں تب بھی ان سے افضل یا ان کے برابر نہیں ہو سکتے تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے تم خداوند کریم اور آئمہ ہدئی کی گواہی ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بزرگی کے باب میں قبول کر لو، پھر اس کا جواب ہم سے سنو۔ اگر بالفرض واقعہ یہ آئمہ ہدئی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل ہی ہوں اور خدا کا مہاجرین کو علیٰ اہم باقی امت سے صراحتہً افضل بتلانا پھر ان میں سے ابوبکر صدیق کو اشارہً سب سے افضل کہنا۔ چنانچہ اول مفصل مرقوم ہو چکا، تمہارے عقیدہ غلط کے موافق غلط ہو تب بھی تو کچھ شواہد نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی تو حضرت خضر علیہ السلام سے افضل تھے پھر ان کے افعال کی حقیقت نہ سمجھے اور احسان کو نقصان اور عدل کو ظلم سمجھ کر ایسے مغلوب الغضب ہوئے کہ اپنے سب مہدیوں کو بھول گئے۔

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہم السلام کا واقعہ کج فہمیوں کیلئے عبرت ہے

القصہ معتضنائے ایمان خدا اور ادب آئمہ ہدئی تو یوں تھا کہ اگر بالفرض واقعہ یہ حضرت ابوبکر صدیق بظاہر ملحد و زندقہ ہی شیعوں کو نظر آئے تو خدا کی گواہی اور آئمہ کی شہادت کے بعد جو ان کی

بزرگی کی نسبت اول میں اور اوسط میں اس رسالہ کے مرقوم ہو چکی ہے اپنی بھی نہ سنتے اور اپنی عقل
تار سا کی ٹکڑی بکرتے اور حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہم السلام کے قصہ کو پیش نظر کر کے تسکین
خاطر پریشان اور تسلی طمع کج کر لیتے کیونکہ جناب باری تعالیٰ نے اس قصہ کو ایسے ہی کو دونوں کے واسطے
بیان فرمایا ہے۔ حضرات شیعہ جیسے عقل کے دشمن اپنی کج فہمی کے باعث خدا کے مقربوں اور دوستوں
سے بدگمان ہو کر خدا کو اپنا دشمن بتالیں۔ قربان جائیے خدا عظیم کے، کتنی دور کی سوچتی ہے مگر آفرین ہے
شیعوں کی عقل پر بھی کہ اس پر بھی نہ سمجھے، خیر خدا انہیں سمجھے القصد مقتضائے ایمان و ادب تو یہ تھا۔

بالفرض اگر صدیق سے گناہ ہوا تو وہ نیکی بن چکا

ورنہ آئمہ ان کی تعریف نہ کرتے

اور اگر بحکم ”چشم بداندیش کہ بر کندہ باد..... عیب نماید هنرش در نظر“..... یہ بات ان کو دشواری
تھی تو یہ تو شیعہ بھی خواہ مخواہ مانیں ہی گے کہ قیامت کو بعض گنہگاروں کے اعمال بد کو حسنہ بتادیں گے
کیونکہ کلام اللہ موجود ہے۔ دیکھو کیا فرماتے ہیں: ”إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا
فَأُولَٰئِكَ يَجْزِلُ اللَّهُ سَبَابَهُمْ حَسَنَاتٍ“..... ”یعنی مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے
عمل کیے تو ان کے گناہوں کو بھی خدا نیکیاں بنا دے گا۔ فقط“ اور اگر خوردہ پیمان مذہب شیعہ کو یہ
خلجان ہو کہ اس آیت میں جن گناہوں کی نیکیاں بنانے کی طرف اشارہ ہے ظاہر میں وہی گناہ معلوم
ہوتے ہیں جن کا سیاق میں ذکر ہے اور وہ ظاہر ایام کفر کے گناہ ہیں، سو اگر ابو بکر صدیق کا کوئی گناہ
نیکی بنے گا بھی تو وہی بنے گا جو ایام جاہلیت کے گناہوں میں سے ہوگا۔ ہمیں تو ایسی بہت سی باتوں
میں کلام ہے جو بعد زمانہ ایمان ان سے صادر ہوئیں۔ مثلاً غصب فدک کہ وہ بعد وفات سرور
کائنات علیہ علی آلہ الصلوٰۃ والتسلیمات ان سے ظہور میں آیا تو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ ایسا
شیعہ انہیں لوگوں کا ہے کہ جن کا دل شبہ میں پڑا ہوا ہے اور اب تک درجہ یقین اور ایمان تک نہیں
پہنچا۔ اگر ماضی میں گناہان زمانہ کفر ہی کا ذکر ہو اور انہیں کی نسبت تبدیل کا یعنی نیکی بنا دینے کا
اشارہ ہو تب بھی اتنی بات ثابت ہوگئی کہ خدا کو گناہوں کا نیکی بنا دینا آتا ہے پھر جب کفر کے زمانہ
کے گناہوں کو (کہ وہ نسبت گناہان ایام ایمان کے گناہوں سے زیادہ ہی ہوتے ہیں) خدا کو نیکی بنا
دینا آتا ہو تو ایام ایمان کے گناہوں کا نیکی بنا دینا تو سہل ہی ہوگا۔ پھر جس کی خدا اور آئمہ ہدیٰ
تعریف فرمائیں، اس کے ایمان اور بزرگی میں اسے ہی شک ہو سکتا ہے جس کو خدا اور آئمہ ہدیٰ کی

بات میں شک ہو۔ غرض جب ایمان اور صلاحیت اعمال ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بشہادت خداوندی اور گواہی آئمہ ہدیٰ ثابت ہوگئی تو اس بات میں کیوں تامل ہے کہ ان کے گناہ نیکیاں ہو جائیں۔

گناہ سے توبہ پر جنت میں داخلہ سب کو مسلم ہے

اور اگر یوں کہئے کہ گناہوں کا نیکیاں بن جانا توبہ کے ساتھ معلق ہے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے سے معلوم ہو کہ توبہ کر کے مرے ہیں تو اس کا جواب اوّل تو یہ ہے کہ اگر معلق ہو بھی تو گناہوں کے نیکیاں بنادینے کا وعدہ معلق ہوگا کچھ امکان تو معلق نہیں، پھر جب خداوند کریم اور آئمہ دین ان کی تعریف فرمائیں تو اگر ان سے یہ خطا ہوئی بھی تھی، تب بجز اس کے ان کی تعریف کی اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ ان کی خطا کو بھی جناب باری تعالیٰ نے نیکی بنادیا ہو گو انہوں نے توبہ نہ کی ہو۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر توبہ ہی پر تبدیل سیئات بحسنات مقوف ہے تو خداوند متین اور آئمہ دین کی تعریف خود اس بات کی گواہ ہے کہ وہ توبہ کر کے اس عالم سے تشریف لے گئے نہیں تو وہ قابل تعریف تو کجا البتہ لائق ہجو اور مستوجب سزا تھے۔ ہاں اگر شیعہ یہ گرفت کریں کہ خداوند عظیم نے تو تعریف پہلے کی تھی یہ خطا ان سے بعد میں سرزد ہوئی تو اس کا جواب ہمارے پاس بجز اس کے کچھ نہیں کہ البتہ شیعوں کا خدا ایسا ہی ہوگا جسے چار دن کے بعد کی بھی خبر نہ ہو ہمارا خدا عالم الغیب ہے، ازل سے ابد تک سب اس کے پیش نظر ہے، اگر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حسب گمان بد شیعہ برے ہی ہوتے تو خداوند کریم ہرگز تعریف نہ فرماتا، اس کو کیا ضرورت تھی کہ ایک غلط بات کہہ کے آج شیعوں سے شر مانتا۔ اگر خدا کی نہیں مانتے تو نعوذ باللہ آئمہ ہدیٰ تو بزم شیعہ خدا سے بھی بڑھ کر ہیں، خدا کو توبہ بھی واقع ہوا، آئمہ کو توبہ بھی نہیں ہوتا، پھر اس پر علم ”ہما کان ۳ اور علم ”ہما یکون ۳ ان کو حاصل، ان کی تعریف کا تو بجز اس کے کچھ جواب ہی نہیں کہ حضرت صدیق اکبر کے گناہ بھی نیکیاں ہی بن گئے ہوں۔

توبہ کا ثبوت بروایت شیعہ

اور یہ بھی نہ سہی ہم اور جواب رکھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ روایات شیعہ اس بات کی شاہد ہیں کہ ابو بکر صدیق گناہ غصب فدک سے تائب ہو کر مرے ہیں۔ چنانچہ ان شاء اللہ تعالیٰ قریب ہی بحوالہ روایات کتب شیعہ یہ مضمون مرقوم ہوگا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے گو فدک غصب کر لیا تھا لیکن پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی کے حوالے کر دیا اور نیز یہ بھی مرقوم ہوگا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ان سے راضی ہو گئیں۔ اب فرمائیے توبہ اور کسے کہتے ہیں اسی کا نام توبہ ہے۔

نیکیاں زیادہ ہونے پر جنت میں داخلہ متفق علیہ ہے

اور اگر اس پر بھی شیعوں کے دل کا کفر نہ جائے تو اس کی اور بھی تدبیر ہے۔ آخر شیعوں کے نزدیک بھی اتنی بات مسلم تھی کہ قیامت کو حساب کتاب کے بعد جس کے اچھے عمل زیادہ نکلیں گے وہ جنت میں جائے گا جس کے برے عمل زیادہ ہوں گے وہ دوزخ میں اور اگر بنظر دور اندیشی اس وقت اس عقیدہ میں کچھ شک بھی آجائے تو لیجئے یہ کلام اللہ کی آیت موجود ہے اور کلام اللہ میں سے عم عی کے سپارہ کی، اس میں سے بھی اول عی کی سورتوں میں کی جو شیعوں کے یاد بھی نہیں مثل یار تو ضرور عی ہوں گی وہ آیت یہ ہے:

فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ۖ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ ۖ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ۖ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ۖ وَمَا أَجْرُكَ مَا هِيَةٌ ۖ نَارُ حَامِيَةٍ ۖ

”یعنی جن کے عمل تول میں بھاری ہوں گے تو وہ اچھے اور جن کے عمل ہلکے نکلیں گے ان کا ٹھکانہ ہادیہ ہے اور تجھ کو کیا معلوم وہ کیا ہے؟ وہ ایک آگ ہے گرم دہکتی۔ فقط“
اب تو کچھ تکرار کی بات باقی نہیں۔ سو اس صورت میں خداوند عظیم اور آئمہ تعلیم جس کی تعریف فرمائیں وہ اگر خطاوار بھی تھا، تب معلوم ہوا کہ اس کے اچھے عمل زیادہ تھے، پھر ان خطاؤں کے باعث ان سے رنجیدہ رہتا ویسا ہی ہے جیسا کسی نے کہا ہے ”مدعی ست گواہ چست“ یا عربی کی مثل ہے ”رَجِيَّ الْخُضْرَانِ وَمَا رَجِيَّ الْقَاضِي“ یعنی مدعی مدعا علیہ تو راضی ہو گئے، پر قاضی جی راضی نہ ہوئے، خداوند کریم اور آئمہ دین تو راضی ہو جائیں پر شیعی راضی نہ ہوں۔

مہاجرین اولین سے جنت عدن، مغفرت، رضا

کا وعدہ ہو چکا اور خدا وعدہ خلائی نہیں کرتا

اور اس پر بھی خاک ڈالو، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اچھے عملوں کا زیادہ ہونا بھی شیعوں کو ناگوار ہو تو اس میں تو کچھ دھوکا ہی نہیں کہ وہ مہاجرین اولین اور مصاحبان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے تھے۔ سو مہاجرین اولین اور مہمراہیان رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا حال آیت ”وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ“ اور آیت ”مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ“ کی شرح کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے کہ خدا ان سے راضی ہے اور وہ خدا سے راضی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جنات عدن تیار کر رکھی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ مغفرت گناہان

اور وعدہ اجر عظیم کا کر لیا ہے۔ سو اگر بالفرض واقعہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گناہ ہی زیادہ تھے یا فرض کر دو کہ وہ سراپا گناہ اور ہمتن ظلم و جفا ہی تھے۔ تب اس صورت میں جائے طعن باقی نہ رہی کیونکہ خداوند کریم اپنے وعدہ کا سچا اور بات کا پکا ہے۔ مثل حضرات شیعہ نہیں جن کے دین کی باتوں میں بھی جہل ہے، دنیا کا تو کیا ذکر؟ سو ہم کو یقین ہے کہ خدا ان سے راضی ہے، گو شیعہ ناراض ہوں، وہ ناراض ہوں گے، خدا کو ناراض اور اہل بیت کو رنجیدہ کریں گے کیونکہ اہل بیت تو ایسے نہیں کہ گوشہ عنایت خداوندی کسی طرف کو دیکھیں، پھر اس طرف کو نہ جھکیں بلکہ ان کی سعادت ازلی اور ہدایت لم یزلی سے یوں یقین کامل ہے کہ اگر بغرض محال حسب مقالہ شیعہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کچھ ان پر ظلم اور تعدی بھی کی ہو، تب اپنے حقوق سے درگزر کریں اور لحاظ رضا خداوندی حسب مثل مشہور ”ہر عیب کہ سلطان بہ پسند و ہنراست“ اپنے اوپر جفا کو دقا سمجھیں، نقل مشہور ہے جدھر رب اُدھر سب، اور اہل بیت اپنے حقوق سے آپ کیا درگزر کریں گے اور کیا راضی ہوں گے؟ خداوند کریم جب راضی ہو گا سب کو راضی کر دے گا۔ آخر کلام اللہ میں موجود ہے: ”وَنَزَعْنَا مَا فِي صُلُوبِهِمْ مِنْ عِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ط“ یعنی خداوند کریم بعضے جنتیوں کے حق میں فرماتے ہیں ”اور نکال ڈالے ہم نے جو کچھ ان کے دلوں میں رنج تھے، بھائی ہو گئے تھیں پر بیٹھے ہوئے۔ فقط“ اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ بعضے جنتی ایسے بھی ہوں گے کہ ان کے باہم دنیا میں رنج وعداؤں میں تھیں، پر جب خداوند کریم ان کو جنت میں داخل کرے گا ان رنجوں کو ان کے دلوں سے نکال ڈالے گا۔ سو اسی طرح یہاں بھی تصور فرمایا جاسیے۔ آخر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جنتی ہونا شہادت کلام خدا اور کلام آئمہ ہدیٰ شیعوں کو جبراً کرنا تسلیم کرنا تو پڑا ہے اور اہل بیت کے جنتی ہونے کا پہلے ہی سنیوں، شیعوں کو اتفاق یقین ہے اور اگر شیعہ سنیوں کی ضد میں ان کے جنتی ہونے میں کلام کرنے لگیں تو ان کی ہمت دھری سے کچھ بعید بھی نہیں۔ غرض جب دونوں فریق جنتی ہوئے تو ان کے کہنے اور عداوتیں خداوند کریم آپ نکال دے گا۔

حضرت کلیم کا پچھڑے کو جلا نا مبنی بر حکمت تھا

اور اگر ہاں ہمہ فہمائش بلیغ معبجان عبد اللہ بن سبا کو کچھ اثر نہ ہو اور جیسے سامری کے ایک کرشمے پر بنی اسرائیل بہک گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہزار معجزوں پر بھی ڈھیٹ راہ پر نہ آئے، اس دعا ہار کے خن بے سرو پا پر ایسے جیس کہ میرے ان دلائل محکم اور مستحکم سے بھی اکٹڑ جائیں تو جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دستاویز ضلالت آمیز سامری کو باطل کر دیا۔ یعنی اس

سونے کے ٹھکڑے کو جو برکت خاکپائے حضرت جبریل علیہ السلام بولنے لگا تھا اور بنی اسرائیل اسے پوجنے لگے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جلا کر دریا میں ریزہ ریزہ کر کے بکھیر دیا تاکہ ہر کس و تاکس سمجھ جائے کہ اگر یہ معبود بحق اور خدائے برحق ہوتا تو بندوں کے ہاتھوں سے یوں کیوں ذلیل ہوتا۔ اسی طرح میں بھی جیلہ ہائے حجت نمائے مولوی عمار علی صاحب کو (کہ ہو بہو طرز و انداز میں عبد اللہ بن سبا ثانی اور دعا ہائے تازہ کے بانی مبنی ہیں بلکہ ان کی جگہیں اسی سرگروہ شقاوت پروردہ کی تراشی ہوئی باتیں ہیں اور اسی کی پرانی خرافاتیں ہیں۔ سوان دلائل قاطعہ سے قطع نظر کر کے مولوی صاحب کے ہاتھ) کاٹے دیتا ہوں تاکہ ہر کوئی جان جائے کہ سخاں پریشان مولوی صاحب اگر قاتل پذیرائی اہل انصاف ہوتے تو یوں مثل گوز شتر ہوا کے سہارے نہ اڑ جاتے۔

غصب فدک پر آیت ذالقرنیٰ سے استدلال

سو گوش گزاران مولوی صاحب کو یہ بات یاد رہے کہ دربارہ غصب فدک جو کچھ مولوی صاحب نے مکاری کر کے زیب رقم فرمایا ہے، بزم خود بہت ہی چالاکی کی تھی لیکن جن کا خدا حافظ ہو، ان کو ایسے دھوکوں سے کیا اندیشہ۔

چہ باک از موج بحر آں را کہ باشد فوج کشیمان
ہاں ایسے عقل کے اندھے جیسے (گستاخی معاف) ملازمان مولوی صاحب ہیں۔ البتہ اس جہل میں پھنس جاتے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے، مولوی صاحب اپنے نامہ موصومہ میر نادر علی صاحب میں کہ مثل نامہ سیاہ مولوی صاحب کے خوبی کا اس میں نام و نشان نہیں، یوں رقم فرماتے ہیں کہ جلال الدین سیوطی نے تفسیر درمنثور میں اور شیخ علی متقی نے کنز العمال میں اور ابو یعلیٰ موصلی نے اپنی مسند میں اور صاحب معارج النبوت نے اور سوا اس کے اور علمائے اہل سنت نے روایت کی ہے کہ جس وقت نازل ہوئی آیت ”وَآتِ ذَٰلَ الْقُرْبٰی حَقَّہُ“ یعنی ”دے تو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم قریبوں کو حق ان کا“ تو اس وقت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا کہ قریب میرے کون ہیں؟ اور حق ان کا کیا ہے؟ جبریل نے عرض کی کہ قریب تمہارے فاطمہ ہے اور حق اس کا فدک ہے، فدک اس کو دے دو، اس وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ کو فدک دے دیا۔ پس تحریر سے ان کی ثابت ہوا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ کو فدک دیا اور فاطمہ مالک فدک کی تھی۔ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے رحلت فرمائی اور ابو بکر خلیفہ ہوئے تو فدک کو فاطمہ سے چھین لیا اور ان کا قبضہ اٹھا دیا۔ اب فرمائیے کہ یہ غصب نہیں تو کیا ہے۔ اچھی۔ یہاں تک مولوی صاحب کی عہارت تھی۔

غصب فدک کے بہتان کا تاریخی جائزہ

اب ہماری سنئے کہ یہ اعتراض غصب فدک ایک پرانی بات ہے کچھ ملازمان مولوی صاحب ی کو نہیں سوجھی، سارے شیعہ اسے ہی گاتے رہے ہیں، القہہ مولوی صاحب وہی پرانی تے چانتے ہیں جو اگلے اگلے چلے آئے ہیں، پرفانسوس یہ ہے کہ ابتداء میں کسی نے یہ دروغ بے فروغ اگر زبان سے نکالا تھا تو جب تک علماء اہل سنت کو اس کی خبر بھی نہ تھی، نکالا تھا۔ لیکن جس وقت علماء اہل سنت نے جوابات دندان شکن سے شیعوں کے دانت توڑ دیئے تب تو غیرت کی بات یہ تھی کہ اس بات کو منہ پر بھی نہ لاتے، اگر صواعق اور صواعق کیا اب تھے تو بفضلہ تعالیٰ تھنا مشر یہ تصنیف شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہ اور مفتی الکلام وغیرہ مصنفات مناظر بے بدل مولوی حیدر علی سلمہ رہ کہ علماء لکھنؤ بھی ان کے سامنے بول گئے تھے کثرت سے موجود ہیں ان میں اس دروغ عطر دغ کے جو کچھ جواب لکھے ہیں پہلے ان کو رد کرنا تھا جب کہیں اس بات کو زبان پر لانا تھا، اگر خدا سے شرم نہ تھی کیا غیرت دنیاوی کو بھی طاق میں اٹھا دھرا، کیسا ہی کوئی نامعقول کیوں نہ ہو، پر اپنی بات کا جواب معقول سن کر ایک دفعہ تو چپ ہی ہو رہا کرتا ہے۔

ہاں نامرد بے حیا کا یہ کام ہے کہ اگر دلاور ان شجاعت نژاد کی نامز کی سزا میں کچھ سرزنش کرتے ہیں اور ہاتھ پاؤں سے معقول کرتے ہیں تو وہ چونکہ ہاتھ پائی سے مارا ہوا ہوتا ہے، اپنی زبان چلانے سے باز نہیں آتا اور اپنی وہی مرغی کی ایک ٹانگ گائے جایا کرتا ہے۔ مثل مشہور ہے مرد کے ہاتھ چلیں نامرد کی زبان، سو یہی وطیرہ حضرات شیعہ کا ہے کہ اہل سنت کے جوابات دندان شکن سن کر بھی منہ بند نہیں کرتے اور وہی کہے جاتے ہیں۔ اس موقع میں مناسب تو یوں تھا کہ ہم بھی جوابات سابقہ پر استغفا کرتے لیکن چونکہ مولوی عمار علی صاحب نے اپنے عندیہ میں میدان خالی دیکھ کر یہ ہاتھ پاؤں ہلائے ہیں تو ہم کو بھی لازم ہے کہ ان کو ان کی حقیقت دکھلا دیجئے۔

یہ آیت مکیہ ہے مکہ میں فدک کہاں تھا؟

سو عرض یہ ہے کہ ملازمان مولوی صاحب کو تو کلام اللہ نہ یاد ہے نہ یاد ہو، اگر یقین نہ ہو تو کوئی صاحب بھی پوچھ دیکھیں کہ یہ آیت کون سے سپارہ میں ہے؟ بالجملہ اگر مولوی صاحب اور ہم مذہبان مولوی صاحب کو کلام اللہ یاد ہوتا تو اس آیت کو فدک کے باب میں زبان پر بھی نہ لاتے بلکہ اگر ہم بھی کہتے جب بھی نہ مانتے، وجہ اس سخن کی یہ ہے کہ یہ آیت کل دو جگہ کلام اللہ

میں آئی ہے، ایک سورہ بنی اسرائیل میں، دوسری سورہ روم میں، سو دونوں کی دونوں خمر سے کہ میں نازل ہوئی تھیں۔ علماء تو اس بات کو جانتے ہی ہیں پر عوام کی تفہیم اور تسکین کے لیے اتنا اشارہ بہت ہے کہ دنیا میں ہزاروں کلام اللہ موجود ہیں، کھول کر دیکھ لیں ان دونوں سورتوں کے ازل میں یکہ لکھا ہوا ہوگا، اور اگر کوئی الٹی کا کجمن ہار مصاحف کا ہایں وجہ اعتبار نہ کرے کہ کلام اللہ تو سنیوں ہی کی سی کہے گا تو بیچے شیعوں ہی کی گواہی موجود ہے۔

طبری نے تفسیر مجمع البیان میں لکھا ہے "سورة الروم مكية الا قوله سبحان الله الخ" یعنی علامہ طبری جس کے حوالہ سے یہ مذکور ہوگا کہ جب آیت "فات ذا القربىٰ" نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فذک حضرت فاطمہ کو عطا فرمایا وہی تفسیر مجمع البیان میں رقم فرماتے ہیں کہ سورہ روم سوائے آیت "سبحان الله الخ" سب کی ہے اب کوئی مولوی صاحب سے پوچھے کہ مکہ میں فذک کہاں تھا؟ فذک تو ہجرت سے چھٹے ساتویں سال بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں آیا تھا۔ اس صورت میں تو سنیوں کی معتبر کتابوں میں بھی اگر بتدریج یوں لکھ دیتے کہ یہ آیت بعد خیر کی فتح کے نازل ہوئی ہے تب بھی اعتبار نہ کرنا تھا۔

کسی آیت کے مکی یا مدنی ہونے سے کیا مراد ہے؟

بالجملہ پیشوایان مذہب شیعہ نے بات تو بتائی تھی لیکن کیا کریں کلیہ ہے۔ "دروغ گورا حافظہ نہ باشد" تقدیر سے چوک گئے، ہاتی کسی کو یہ شبہ ہو کہ مکی اسے بھی کہتے ہیں کہ مکہ معظمہ یا نواح مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہو، خواہ قبل ہجرت ہو یا بعد ہجرت، سو ہو سکتا ہے کہ غزوہ فتح میں۔ مثلاً یہ سورتیں نازل ہوئی ہوں اور اس سبب ان کو مکی کہتے ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو سورہ بنی اسرائیل کی اس آیت "وَلَا تَجْهَرُوا بِصَلَاتِكُمْ الْخ" اور سورہ روم کی پہلی آیت کی شان نزول خود اس بات پر شاہد ہے کہ ان کا نزول ہجرت سے پیشتر ہے۔

علاوہ بریں مولوی دلداری صاحب رسالہ ضغیہ میں سنیوں کے اس استدلال پر کہ آیت "إِلَّا عَلَىٰ أَرْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ" حرمت تعدد پر دلالت کرتی ہے جو اعتراض کرتے ہیں تو یہ کرتے ہیں کہ یہ آیت مکی ہے۔ سو یہ اعتراض جب ہی وارد ہو سکتا ہے کہ مکی مدنی سے یہی مشہور اصطلاح مراد ہو یعنی مکی وہ ہے جو قبل ہجرت نازل ہوئی ہو اور مدنی وہ جو بعد ہجرت نازل ہوئی اور مولوی دلداری صاحب اس باب میں ہمارے موافق ہوں مگر ظاہر ہے کہ اس صورت میں آیت "وَأَتِذَا الْقُرْهَىٰ" کی یہ تفسیر جو مولوی دلداری صاحب اور سوالان کے اور شیعہ کرتے ہیں سراسر غلط ہوگی۔

ذالقرنیٰ سے سیدہ اور حقہ سے فدک مراد ہوتو

کئی محذور لازم آئیں گے، پہلا محذور خویش پروری

ما سو اس کے اہل فہم و دانش سے یہ التماس ہے کہ خدا مامیری و رعایت نہ کریں پہانصاف کرنا بھی تو کچھ اہل بیت پر ظلم کے برابر نہیں جو اتنا پرہیز ہے کیا ”ذالقرنیٰ“ کے یہی معنی ہیں اور ”حقہ“ کا یہی ترجمہ ہے جو اس روایت میں مذکور ہے، بھلا سنیوں کو اول تو پاس ایمان، دوسرے یہ خبر بھی ہے کہ یہ روایت ساختہ و پرداختہ حضرات شیعہ ہے۔ پر جیسے یہودی، نصرانی، ہندو، عربی خوان کہ نہ ان کو یہ خبر ہے کہ یہ خبر سراسر غلط ہے اور نہ کچھ پاس عزت و عظمت رسول اکرم نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم، اگر اس آیت کو دیکھیں گے تو کیا کہیں گے، سو بدولت حیات حضرات شیعہ بجز اس کے اور کیا ہوگا کہ دشمنان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہتہ دنیا طلبی اور حیلہ پر دازی بہتسم کر کے ہوں کہیں گے کہ یہ جبریل کا حوالہ فقط اس لیے گھڑ لیا تھا کہ اپنی بیٹی کے دینے میں کوئی تکرار نہ کرے ورنہ کلام اللہ کے الفاظ سے اس تفسیر کو کچھ ماس نہیں، ”ذالقرنیٰ“ ایک لفظ کلی ہے بہت سی قریب، فقط، حضرت فاطمہ میں کیوں کر منحصر ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرائع کچھ ایک دو نہ تھے ہزاروں تھے خاص کر حضرت زینب، حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم جو بہ شہادت قرآن اور اصح الکتاب شیعہ کافی کلینی قرابت میں حضرت فاطمہ عی کے برابر تھیں، کچھ کم نہ تھیں۔ چنانچہ سند اس کی اوپر مرقوم ہو چکی اور اگر ہوں کہتے کہ یہ دونوں صاحبزادیاں اس آیت کے نزول سے پہلے وفات پا چکی تھیں تو یہ تو غلط کیونکہ یہ سبکی ہے اور ان دونوں کا انتقال مدینہ میں ہوا۔

دوسرا بلاغت کی مخالفت تیسرا البقیہ اقربا پر ظلم

اور سلیمان حضرت علی اور حضرت عباس اور حضرات حسنین اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہم وغیرہ تو فدک کے قبضہ میں آنے کے وقت موجود تھے اور یہ سب با اتفاق عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرائع ہیں تو اس صورت میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو حق کیا دیا اور سب قرائعوں کا حق تلف کر دیا اور اگر ہمارا یقین نہ ہو تو ان معنوں کی تصدیق کے لیے ہم مولوی عمار علی صاحب کو ہی شاہد لاتے ہیں، دیکھ لیجئے وہ خود اس آیت کے معنی یہی لکھتے ہیں کہ ”دے تو اے محمد قریبوں کو حق ان کا“ دوسرے حقہ کی تفسیر میں فدک کا کہنا جہنہ ایسا ہی مہمل جواب ہے جیسا کہ کسی نے اپنا نام جہوں سے بتلایا تھا۔ ع ف ز بر عف غ ف ز بر عف، میرا نام محمد یوسف، بھلا الکی پوچھا تم اللہ

اور اللہ کے رسول کی طرف نسبت کرنے میں انہیں اتنا بھی خیال نہیں آتا کہ ہمیں کسی نے کچھ کہہ لیا تو کہہ لیا، پر خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی کیا کہے گا، شاید ان افتراء پر دازیوں سے یہ غرض ہو کہ ہم سے اگر خدا اور رسول کے موافق نہیں ہوا جاتا، آؤ جتنا ہو سکے خدا اور رسول ہی کو اپنے موافق کر لیں۔ سبحان اللہ! ان تیرہ دروہوں سے یہ تو نہ ہوا کہ اعجاز کلام اللہ اور شرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آب و تاب دیں اور ظاہر کر دکھلائیں، پر ایسی باتیں کر کے دونوں کو چھپا لیا بلکہ ایسی باتیں تراشیں کہ جن کو سن کر ناواقفوں کے تو ایک دفعہ کان کھڑے ہو جائیں اور جی میں متردد ہوں کہ یہ بلاغت اور فصاحت کلام اللہ کا شہرہ اسی خوبی پر ہے تو بلاغت اور فصاحت معلوم، اس چیتان لائل بولنے سے کیا حاصل تھا۔ اگر "وآب لاطمہ لہک" فرمادیتے تو لفظ مختصر اور معنی واضح ہو جاتے۔

چوتھا آنحضرت کی طرف ادائیگی حقوق میں کوتاہی کی نسبت

ہاں اگر اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے بیع یا ہبہ وغیرہ سے حضرت فاطمہؑ ہرارضی اللہ عنہا کی ملکیت فدک میں ثابت ہو جاتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے دینے میں کسی وجہ سے نعوذ باللہ کچھ تقصیر ہوئی ہوتی تو البتہ اس صورت فدک کی جگہ حق کہنے کا موقع بھی تھا کیوں کہ اگر کوئی کسی کی کوئی چیز دے دیا لیتا ہے تو اس کو کہا کرتے ہیں کہ فلا نے کا حق دے دو۔ قصہ جہاں مخاطب کے پاس کوئی کسی کی خاص چیز دبی ہوتی ہے یا کسی کے ذمہ کوئی حق معلوم ہوتا ہے تو وہاں البتہ اس چیز کا یا اس حق کا لفظ حق سے تعبیر کرنا بجائے خون ہوتا ہے۔ چنانچہ اہل فہم پر پوشیدہ نہیں، کم فہم نہ سمجھیں تو بلا سے نہ سمجھیں۔

سواگر مولوی صاحب کا کہنا صحیح بھی ہو اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ احتمال محال ہو بھی سکے تب بھی کام نہیں چلتا کیونکہ اس صورت میں لازم آتا ہے کہ فدک اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے حضرت فاطمہؑ رضی اللہ عنہا کی ملک میں ہو حالانکہ یہ بات خلاف مزموم شیعہ ہے کیونکہ بیع کے انعقاد سے تو شیعوں کو بھی انکار ہے، ہاتی رہا ہبہ، سودہ بن کے اعتقاد کے موافق بعد نزول اس آیت ہی کے واقع ہوا، اس لیے کہ وہ اس آیت ہی کو قبلہ ہبہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس آیت مذکورہ سے صاف ظاہر ہے اور ظاہر ہے کہ شے مہوب قبل از ہبہ اب ہی کے ملک میں ہوتی ہے تو پھر فدک کو حق کی تفسیر میں کہنا روایت کے بنانے والے کی کمال خوش فہمی پر دلالت کرتا ہے۔ کسی نے بیع کہا ہے، عیب کرنے کی ہنر چاہیے۔

پانچواں بنی ہاشم کے لیے خمس حرام

اور اگر پاس خاطر حضرات شیعہ مولوی صاحب کی بات کے بنانے کے لیے موافق لقل مشہور

”درد غم راجز ابا شد دروغ“ ہم بھی یوں کہنے لگیں کہ ہاں سچ ہے، یہ دایت گئی جاوہر ”ذا القربنی“ سے مراد حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حقہ کے معنی فداکری میں ہیں تو مولوی صاحب اس کا کیا جواب دیں گے کہ اس صورت میں جہاں کہیں کلام اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب کا ذکر ”ہلفظ ذا القربنی“ ہوگا تو لازم ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی مراد ہوں اور جب یہ قرار پایا تو بعد حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے کسی اور کو بنی ہاشم میں سے خنس کا حصہ لینا درست نہ ہو اور جاس نادرستی کی (در صورت مرقومہ) یہ ہے کہ آیت ”وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ خُسُوفٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ“ کا ترجمہ یہ ہے ”اور رسول کے واسطے اور قرابت والے کے واسطے اور محتاج کے لیے اور مسافر کے لیے فقط“

اب خنس کی یہ تقسیم جو اس آیت میں مذکور ہے ہماری تمہاری مقرر کی ہوئی نہیں خدا کی مقرر کی ہوئی ہے اس میں کمی و بیشی مسلمانوں سے تو ہو ہی نہیں سکتی، پھر جب کہ ”ذا القربنی“ حضرت فاطمہ ٹھہرس تو بعد ان کے اور کسی کو اولاد میں سے یا بنی ہاشم میں سے ان کے خنس میں سے لینا درست نہ ہو؟ حالانکہ مذہب شیعہ اس باب میں یہ ہے کہ نصف خنس امام وقت کا اور نصف باقی یتامی اور مساکین اور ابن السبیل کے لیے، اور ظاہر ہے کہ امام شیعوں کے نزدیک سوائے دوازہ آئمہ کے اور کوئی نہیں۔ سو وہ سب کے سب باتفاق شیعہ معصوم ہیں، سو شیعوں کی تقسیم کے موافق جو کچھ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی خلافت میں خنس میں سے لیا، یا حضرت امام مہدی رضی اللہ عنہ لیں گے۔ بخولے روایت مرقومہ بالا ظلم اور حرام ہوگا اور اگر کوئی شیعہ مذہب جو دست طبع کو کار فرما کر یوں کہے کہ ہر چہ ”ذا القربنی“ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی ہیں اور خنس اصل میں انہیں کے لیے ہے لیکن آئمہ کو بوجہ میراث خنس کا لینا جائز ہے تو میری یہ عرض ہے کہ اول تو میراث بقدر حصہ وارث چاہیے، سو کیا بعد حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اماموں کے وقت میں سوائے اماموں کے سادات میں سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا اور کوئی وارث ہی نہ تھا؟ جو نصف خنس سارے کا سارا امام کے لیے تجویز ہو۔ چھٹا، بعد وفات سیدہ جو غنائم آئیں وہ انکی ملک نہ تھیں تو حقہ کیوں فرمایا؟

اور سلنا کہ حضرت زہرا کے مال کی وراثت انہیں اشخاص محدودہ کے لیے ہے لیکن جو چیز کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ اور حضرت امام مہدی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں قیمت آئی یا آئے گی وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ملک ہی میں نہیں، مالک ہونے کے لیے حیات ضروری ہے تو اس صورت میں اول تو خداوند عظیم حکیم کے اس فرمانے کے کیا معنی ہوں؟ کہ جو کچھ قیمت لاؤ اس کا خنس ذا القربنی یعنی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور یتامی وغیرہ کے لیے ہے؟

ساتواں، مالِ غنیمت آئمہ کیلئے حرام ورنہ دیگر مستحقین کیلئے بھی جائز

دوسرے جب وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ملک ہی نہ ہوئی تو بوجہ وراثت اماموں نے کیوں لیا اور یہ بھی نہ سکی خُس وراثت میں نہ آیا ہو بلکہ استحقاق خُس وراثت میں آیا ہو لیکن یہ کیا انصاف ہے کہ "ذا القربنی" یعنی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا استحقاق خُس تو بطور وراثت اولاد میں منتقل ہو جائے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یتیموں اور مساکین اور مسافروں کا استحقاق خُس بطور وراثت ان کی اولاد میں منتقل نہ ہو، اگر یہی توریت ہے تو اس زمانے کے یتامی اور مساکین اور ابناء سبیل کی اولاد بھی ہرچہ بادا باد یتیم ہوں کہ نہ ہوں اور مساکین ہوں کہ غنی، مسافر ہوں یا یتیم، مصرف خُس ہوں اور اماموں کے زمانہ کے یتیم اور مسکین اور ابناء سبیل کو اس میں سے دینا درست نہ ہو، وہ یوں ہی خاک پھانکتے پھریں، مع ہذا جو خن شناس ہیں وہ اس لفظ "ذات القربنی حقہ" سے یوں سمجھتے ہیں کہ جناب باری کا حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یوں ارشاد ہوا ہے کہ "ذا القربنی" کا حق پورا پورا ادا کر دو۔

آٹھواں، سیدہ کیلئے صرف فدک اور اغیار کیلئے سب کچھ

سوا کہ "ذا القربنی" حضرت فاطمہ ہوئیں اور ان کا حق فدک ٹھہرا تو اس صورت میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے تو ادا ہو گئے، باقی جو کچھ بچا اور جو کچھ سوا اس کے بطور فنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں آیا، یا اس کے بعد غنیمتوں میں سے خُس میں آیا یا اس سے پہلے غنیمت میں سے خُس میں آیا تھا یا سوا اس کے جو کچھ اس آیت کا مفہوم قرار دیجئے، وہ سب مساکین اور ابن سبیل کا رہا اور ظاہر ہے کہ فدک اس قدر مجموعہ کے ساتھ ہزارویں حصہ کی نسبت بھی نہیں رکھتا، سو موافق گفتار ہیجان "قدر شناسی عالم بالا معلوم" اس تقسیم میں خدا سے بھی بڑی افراط و تفریط ہوئی کہ حضرت فاطمہ سیدۃ النساء جگر گوشہ سید المرسلین صلوات اللہ علیہ علی آلہ اجمعین کے لیے تو فقط فدک اور باقی ساری دولت اغیار کے لیے اگر دنیا سے بچانا تھا تو اس قدر کی بھی کچھ ضرورت نہ تھی، قوت لایموت تو فدک سے پہلے بھی ملے تھے، نعوذ باللہ منہا خداوند کریم عادل کجا اور یہ تقسیم ناموزوں کجا، یہ بعینہ اسی ہی تقسیم ہے جیسا کہ مشہور ہے "از من خانہ تالجب ہام از آن من وز ہام کاخ تابہ ثریا از آن تو"

نواں، خدا پر بے انصافی کا الزام

سینوں کے طور پر تو اس تقسیم کے جواز کی ایک صورت بھی ہے، وہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی شان وہی

ہے جیسے کلام اللہ میں ہے: "ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ يُوَفِّيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ يُزَادُ مَنْ يَشَاءُ" لیکن شیعہ تو خداوند احکم الحاکمین کے ذمہ عدل بمعنی معلوم ایسے امور میں واجب بتلاتے ہیں۔ سو بڑے خیف کی بات ہے کہ (نعوذ باللہ) خدا ہو کر ایسی نا انصافی کہ زیادہ استحقاق والوں کو کم، اور کم استحقاق والوں کو زیادہ اور اگر کوئی صاحب یوں ارشاد فرمائیں کہ یہ روایت سنیوں کی کتابوں کے حوالوں سے ملوگی صاحب نے بیان فرمائی ہے، اگر غلط ہو تو شیعوں کو کیا نقصان، سنیوں کے ائرام کے لیے اتنا بھی بہت ہے کہ ان کی کتابوں میں یہ روایت موجود ہے تو اس کا جواب ہم سے سنئے، ازل تو یہی غلط روایت شیعوں کی نہیں کیونکہ مجمع البیان طبری میں حضرت ابو سعید خدری اور حضرت امام محمد باقر اور حضرت حضرت امام جعفر صادق کے حوالے سے یہ روایت موجود ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک عطا فرمایا اور اس کو ان کے سپرد کر دیا۔

اہل سنت کے یہاں روایت کے صدق و کذب کا معیار قرآن مجید ہے باقی رہا سنیوں کی کتابوں میں یہ روایت پائی جاتی ہے تو اس کا جواب معقول ہم سے سنئے۔ جناب کن یہ روایت سراسر دروغ ساختہ پر داخہ حضرات شیعہ ہے، چنانچہ تقریر ماستقی میں بخوبی اس بات کی تحقیق مندرج ہو چکی ہے لیکن مزید تسکین کے لیے اتنا اور بھی سنئے کہ سنی ازل تو ایسے بے عمل نہیں کہ جھوٹ سچ کی تمیز ان کو نہ آتی ہو، اس پر کلام اللہ کے حرف، حرف کے اکثر سنی حافظ اور حافظ، ان کو ہر آیت کے سیاق سابق پر نظر رہتی ہے اور ایک مضمون کی جتنی آیتیں ہوتی ہیں ان سب کی خبر رکھتے ہیں، جیسے شیعہ بہ سبب اپنی تیرہ درونی اور کج عقلی اور کلام اللہ کے محفوظ نہ ہونے اور موقع استدلال کے سیاق سابق کے یاد نہ ہونے کے باعث صحیح مطلب کی جگہ غلط سمجھ جاتے ہیں، سنی غلط نہیں سمجھ سکتے کیونکہ وہ بفضلہ تعالیٰ ان عیوب سے پاک ہیں بلکہ جیسے کوئی پر چاندی سونے کو لگا کر کھرا کھوٹا پرکھ لیتے ہیں، سنی روایات کو کلام اللہ پر مطابق کر کے صحیح ضعیف کو دریافت کر لیتے ہیں، سودہ کیونکر ایسی روایات بے سند کو کہ قطع نظر بے سند ہونے کے اس آیت کا سیاق اور سابق بلکہ خود اس روایت کے لفظ اور معنی اس کے غلط ہونے کے گواہ ہوں، اپنی کتب میں درج کریں، یہ سب مقتدایان شیعہ کی چالاکی ہے تاکہ عوام اہل سنت کو اس تلخس ابلیس سے جادہ مستقیم سے برطرف کر دیں۔

روایت فدک آیت کے سیاق سابق کی مخالف ہے

ازل سیاق سابق آیت کی مخالفت تفسیر مذکور سے گوش گزار اہل انصاف ہے، خدا را غور سے

نیں، میں نہیں کہتا کہ میری رو رعایت کریں، ہاں البتہ انصاف کا خواہاں ہوں، سورۃ بنی اسرائیل میں دوسرے رکوع ”وَقَضَىٰ رَبُّكَ“ سے لے کر مابعد تک آیت ”وَأَتِذَا الْقُرْبَىٰ خَفَا“ ملاحظہ فرما کر دیکھیں کہ حرف خطاب سے مقصود فقط نفس نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا تمام امت؟ سوائل فہم جانتے ہیں کہ مقصود خطاب سے تمام امت کا خطاب ہے کیونکہ ”لَا تَعْبُدُوا“ اور ”رَبُّكُمْ أَعْلَمَ بِمَا لِيْ نَفْسُكُمْ الْخ“ اور ”لَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ“ وغیرہ میں تو ضائر جمع ہی کے ہیں، باقی رہا ”إِنَّمَا يَتْلُقُ عِنْدَكَ الْكِبَرُ وَأَتِذَا الْقُرْبَىٰ“ وغیرہ میں ہر چند بظاہر بوجہ وحدت خطاب اور قرینہ ”وَقَضَىٰ رَبُّكَ“ جس میں ظاہر خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب معلوم ہوتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ”وَأَتِذَا الْقُرْبَىٰ“ وغیرہ میں خطاب خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے مگر نظر مبہوم حکم و لحاظ قرینہ ”لَا تَعْبُدُوا“ وغیرہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب ہر شخص کے لیے ہے اور اس کا مخاطب ہر عام و خاص ہے، اس میں اور ”لَا تَعْبُدُوا“ میں اگر فرق ہے تو یہی ہے کہ وہاں ”اعني لا تعبدوا“ وغیرہ میں مخاطب متعدد، پر خطاب ایک، اور یہاں دونوں متعدد ہیں، جتنے مخاطب، اتنے ہی خطاب۔

یعنی یہ بات کہ قرینہ ”وَقَضَىٰ رَبُّكَ“ خطاب بجانب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام و علی آلہ الکرام معلوم ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جملہ ”وَقَضَىٰ رَبُّكَ“ اس امر کے لیے جب ہی قرینہ ہو سکتا ہے کہ جملہ و آت ذالقرنی وغیرہ اس پر معطوف ہوں، سو اس بات کو اہل معانی و بیان سے دریافت کرنا چاہیے کہ انشاء کا عطف خبر پر اور ماضی کا عطف امر پر درست ہے کہ نہیں؟ حق یہی ہے کہ جملہ ”وَأَتِذَا الْقُرْبَىٰ“ مگر معطوف ہے تو ”لَا تَعْبُدُوا“ پر معطوف ہے اور اگر یوں کہئے کہ ”وَقَضَىٰ رَبُّكَ“ اگرچہ بظاہر خبر ہے پر حقیقت میں بمعنی امر ہے قرینہ ”لَا تَعْبُدُوا“ موجود ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں بھی ”لَا تَعْبُدُوا“ کا قرینہ اس بات پر بھی شاہد ہے کہ اگر یہ جملہ خبر بمعنی امر ہے تو خطاب بھی عام ہے۔

ہاں یہ بات اس صورت میں قابل استفسار ہے کہ جب دونوں جگہ مخاطب تمام امت ہی تھی تو لفظ و نسق عبارت یوں مختلف کیوں ہوا؟ یا دونوں جگہ ضمیر جمع ہوتی؟ یا دونوں جگہ ضمیر واحد آتی؟ سو وجہ اس تغیر و تبدل کی بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب کوئی حکم احکام متعددہ میں سے جو ایک ساتھ صادر فرمائے جائیں، بہ نسبت اور احکام کے زیادہ تر عظیم الشان ہوتا ہے یا بہ نسبت کسی خاص حکم کے مخاطبوں کی طرف سے تقاعد اور کاسل کا گمان ہوتا ہے تو ایسی صورت میں حکام والا شان بنظر مزید

تاکید ہر ہر فرد بشر کی طرف خطاب کر کے حکم کیا کرتے ہیں۔ سو یہاں بھی ہاں لحاظ کہ شرک کی ہدائی اور والدین کی بھلائی ہر عاقل کی عقل میں خود بخود جمی ہوئی ہے، اس کی ضرورت نہ کسی کجہد سے منع فرمائیں اور بتا کید راہ پر لائیں، فقط تقدیم ذکر ہی پر، کہ یہ بھی ایک قسم کی تاکید ہے، الکفار مایا۔

ہاں اداء حقوق ذوی القربیٰ علیٰ ہذا القیاس اس لحاظ سے صرف بیجا میں، اکثر بشر کا صرا اور عاقل نظر آئے، مناسب مقام یہ ہوا کہ زیادہ تر اہتمام کیا جائے۔ علاوہ بریں امر دنیوی دربارہ توحید و شرک سے یہ مطلب ہوتا ہے کہ خالق سے کیونکر معاملہ رکھنا چاہیے، ادھر ادا امر ادائے حقوق اہل حقوق اور ادائی اسراف و تبذیر سے یہ غرض ہوتی ہے کہ خلائق کے ساتھ کیونکر رہنا چاہیے۔ غرض معاملات کی دو قسمیں ہیں، ایک خالق کے ساتھ ایک مخلوق کے ساتھ، علیٰ ہذا القیاس اور امر دنیوی بھی منقسم بدو قسم ہیں چونکہ اصلاح معاملات منظور ہے اور ہر معاملہ دو ہی شخصوں سے تمام ہوتا ہے سو معاملہ خالق میں تو تمام مخلوق برابر ہیں، ایک ہی خالق اور پھر سب کے ساتھ ایک ہی نسبت اس لیے اس کو تو ایک ہی معاملہ تصور کیجئے اور معاملہ مخلوق میں ہر شخص کا حال جدا کیونکہ اول تو ہر ایک کے اقرباء جدا، پھر اقربا میں سے بھی ہر شخص سے جدا قرابت، اس لیے ہر قرابتی کے ساتھ ایک جدا ہی معاملہ ہوگا۔ جب یہ بات ذہن نشین ہو چکی تو اب سنئے کہ اول صورت میں تو لحاظ وحدت معاملہ ایک ہی خطاب مناسب ہے اور صورت ثانی میں بنظر تعدد معاملہ خطاب بھی جدا جدا چاہیے۔

وآت ذی القربیٰ میں مخاطب خاص اور خطاب عام ہے

اور اگر اب بھی کسی کے دل سے خلجان نہ جائے تو پھر بجز اس کے اور کیا کہا جائے کہ یہ تعصب بیجا ہے مگر تاہم ہمارا مطلب کہیں نہ گیا اگر خطاب خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف ہوگا تب بھی صحیح یہ ہے کہ مخاطب ساری ہی امت رہے گی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ”إِنَّمَا يَتَلَفَعْنَ عِنْدَكَ الْكِبَرِ أَحَلُّهُمَا الْخ“ کے معنی یہی ہیں ”اگر پہنچ جائیں تیرے سامنے بڑے کو ماں باپ میں سے ایک یا دونوں، تو نہ کہہ ان کو ہوں اور نہ جھڑک ان کو، اور کہہ ان کو بات ادب کی الخ فقط“ اب میں پوچھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بعد چالیس برس کے کلام اللہ نازل ہونا شروع ہوا اور والدین آپ کے چھٹپن ہی میں گزر گئے تھے، پھر جو آپ کو یہ حکم سنایا گیا تو بجز اس کے اور بھی کچھ معنی ہیں کہ انہیں کو سنا سنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کرتے ہیں۔ سو اسی طرح لفظ ”آت ذی القربیٰ“ کو سمجھنا چاہیے اور بیشتر اس قسم کے خطاب کہ سب سے بڑے کو منہ پر دھر لینا وہاں کہا کرتے ہیں کہ کسی وجہ سے اس کام کا زیادہ تر اہتمام اور عوام کی طرف سے اس میں کسی طرح کا تقاعد

ظہور میں آیا ہو یا تقاعد کا گمان ہو تو ایسے میں بڑے محبوبوں اور مقربوں اور افسروں کو منہ پر دھر کے کہا کرتے ہیں تاکہ سب سمجھ جائیں کہ جب ایسے محبوب اور مقرب کو اس حکم کی یہ تاکیدیں ہیں تو وہاں تو کیا ذکر ہے ہم کو بدرجہ اولیٰ اس حکم کی رعایت چاہیے، بالجملہ ”إِنَّمَا يَتَلَفَعْنَ“ کے قرینہ سے مثل آفتاب روشن ہے کہ گو مخاطب خاص ہے پر خطاب عام ہے۔ چنانچہ ”لَا تُكَلِّمُوا كُنُوزَكُمْ فِي الْحَرْبِ“ اس کی طرف اشارہ کرے ہے کیونکہ تہذیر سے منع کرنا کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں اور پھر یہ بات بھی قرینہ مذکورہ سے واضح ہوگئی کہ ماں باپ بھی ذالقرنیٰ میں داخل ہیں بلکہ اس آیت میں زیادہ تر لحاظ انہیں کی طرف ہے لیکن خطاب عام جمعی ہو سکتا ہے کہ لفظ حقہ سے مطلقاً صلہ رحمی مراد ہو۔ چنانچہ ظاہر اور متبادر بھی یہی ہے ورنہ حقہ کا مصداق اگر فدک ہی ہو تو پھر کس کس مؤمن مسلمان کے پاس فدک ہے جو اقربا کے حوالے کرے۔ بالجملہ سیاق سباق آیت ”آتِ ذَا الْقُرْبَىٰ الْخ“ مندرجہ سورہ بنی اسرائیل تو شہادت و جود مذکورہ اس تفسیر سے انکار کرتا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس سورہ روم کو خیال فرمائیے کیونکہ ”اللہ یسطر الزق“ سے لفظ ”آتِ ذَا الْقُرْبَىٰ“ کے مابعد تک اگر بغور تامل کیا جائے تو صاف واضح ہو جائے کہ یہاں بھی گو مخاطب خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں لیکن خطاب عام ہے کیونکہ پہلے تو یہ مضمون ہے کہ اللہ کو اختیار ہے جس کو چاہے روزی فراخ دے، جس پر چاہے تنگ کر دے، اسی پر تفریع کر کے فرماتے ہیں کہ تو قرابتیوں اور مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق دیتا رہ۔ یعنی ہم نے اپنی بے نیازی سے کسی کسی کو مفلس اور محکوم بنا دیا سو تو ان میں سے اس ترتیب کے موافق خبر لیتا رہ۔ پھر اس کے بعد یہ مضمون ہے کہ یہ بات بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور وہی لوگ فلاح کے پہنچنے والے ہیں اور اس کے بعد اور بھی ایسے ہی مضمون عام ہیں۔ الغرض یہ جو لفظ ”ذالک“ کا اشارہ ہے یعنی یہ جو ارشاد ہوا کہ یہ بات بہتر ہے یہ اسی قرابتیوں کے حقوق اور مساکین اور یتیم بچوں کے حقوق کے ادا کرنے کی طرف اشارہ ہے، سوائے طرح سے اشارہ فرما کر کہنا کہ یہ بات بہتر ہے ایمان والوں کے لیے، جب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ کوئی حکم عام ہو۔ سو در صورت یہ کہ فدک مراد ہو تو اس تفسیر کا حال ہم تو نہیں کہہ سکتے، ایسا ہو جائے گا جیسے نعوذ باللہ مشہور ہے ”من چدی گویم و ظہور من چدی گوید“ الغرض دستاویز ہبہ فدک و فرمان عطاء فدک شیعوں کے نزدیک سورہ روم کی آیت تھی۔ سو اس کے سیاق سباق کا بھی حال معلوم ہو گیا۔

حَقُّہُ کا معنی فدک کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا

مع ہذا حقہ کی تفسیر فدک ہی ہو تو در حال سے خالی نہیں یا معنی حقیقی ہو یا معنی کا ایک فرد ہو اور جیسے

کوئی شخص گھوڑے کو نہ جانتا ہو اور وہ کسی سے پوچھے کہ گھوڑا کیا شے ہوتا ہے اور اتفاق سے کوئی گھوڑا اس وقت سامنے آ جائے تو وہ دوسرا کہنے لگے کہ دیکھو یہ ہے گھوڑا، تو یہ جواب بیان معنی اور تفسیر حقیقت نہیں بلکہ حقیقت اسی کے ایک فرد کو بتا کر گویا یوں سمجھا دیتا ہے کہ ہائی افراد بھی اسی پر تپاس کر کے حقیقت مشترکہ کو سمجھ لو۔ ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حقیقت حق ذی القربیٰ کو نہ جانتے ہوں؟ اور حضرت جبریل علیہ السلام نے ایک فرد کو افراد حقوق ذی القربیٰ میں سے بتلا کر مطلب کا براہ نکال دیا ہو؟ یا یوں کہئے کہ نہ یہ معنی لغوی ہیں اور نہ کوئی فرد محض مجملہ افراد کے بلکہ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فقط مقدار حق ذی القربیٰ کو نہ جانتے ہوں، سو اسی کا سوال کیا اور حضرت جبریل علیہ السلام نے اس مقدار ہی کا ذکر فرمایا۔ بالجلہ ان تمن احتمال سے زیادہ اور کوئی احتمال نہیں جس کو فرض اصلی تفسیر مذکورہ کی قرار دیجئے اور حقیقت میں دیکھئے تو ایک بھی احتمال نہیں، مطلب آیت کا ظاہر ہے تفسیر کی کچھ حاجت نہیں۔

سو خیر اگر اس معنی کو معنی لغوی قرار دیجئے تو یہ ظاہر ہے کہ ظاہر المطلق ہے کہ کونسا کون ہیں کہہ دے گا کہ اس لفظ کے معنی لغوی اور موضوع لہ مطابقی یہ معنی ہیں؟ اور اگر یوں کہئے کہ مدیۃ العلم اور معدن حکمت یعنی سرور کائنات علیہ علی آلہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات حقیقت حق ذی القربیٰ کو نہ جانتے تھے اور حضرت جبریل علیہ السلام نے ایک فرد کا بیان فرما کر حقیقت الامر سے مطلع فرما دیا تو یہ جرات بھی مولوی ہمارا علی صاحب جیسے صاحبوں سے ہو سکتی ہے، بالکل فہم کی زبان تو ایسی باتوں کے لیے نہیں اٹھتی، مائل چھوڑ دیوانے بھی اتنا تو جانتے ہیں کہ حقیقت حق ذی القربیٰ یہی دُنیا دلانا ہے۔ چنانچہ لفظ آت خود صاف یہی کہتا ہے پھر جب کبھی کچھ دینے دلانے کا اتفاق ہوگا مدعی ایک فرد اس حقیقت کا ہو جائے گا۔ باقی رہا تیسرا احتمال بادی النظر میں البتہ فی الجملہ کچھ آیت مذکورہ کے پاس پاس کو پھرتا ہے لیکن بغور دیکھئے تو جواب خیر سے یہ بھی بعید ہے کیونکہ اوّل تو اقرہا کے حق کی کوئی حد نہیں۔ شیعوہ سنیوں کا سب کا اس پر اتفاق ہے کہ جتنا کرے اتنا تھوڑا، دوسرے اس صورت میں لازم تھا کہ ہیکھوں سے یا جریوں سے مثلاً، یا ہاتھ بار ریل یا ٹکٹ مال کے تعین مقدار بیان فرماتے۔ اس صورت میں اس سوال و جواب کی وہی شکل ہو جائے گی، سوال از آسمان۔ جواب از رہِ سماں۔ نعوذ باللہ، اگر اس احتمال پر حضرات امامیہ جمیں تو غرابیہ کے اس عقیدہ کو بھی منظور فرمائیں کہ خداوند کریم کی طرف سے حکم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس وحی کے لے جانے کا ہوا تھا، پر حضرت جبریل علیہ السلام نے غلطی کے باعث حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی پہنچا دی کیونکہ اس

جواب سے بھی حضرت جبریل علیہ السلام کی خوش فہمی کچھ اس خوش فہمی سے جو غرابیہ کے طور پر دربارہ وحی رسائی ان سے ظہور میں آئی ہے کم نہیں۔

القصہ یہ تینوں احتمال اس تفسیر کے ابطال سے مالا مال ہیں۔ ہاں اگر فدک پہلے سے مملوکہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہوتا اور بوجہ غلطی مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں ہوتا تو البتہ یہ تفسیر باعتبار ظاہر ٹھیک ہو جاتی لیکن اس کو کیا کہجئے کاتنی بات کے سنی تو درکنار شیعہ بھی قائل نہیں بلکہ با اتفاق شیعہ فدک مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھا، پر بعد نزول اس آیت کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے حوالے کر دیا۔ علی ہذا القیاس ذالقرنی کی تفسیر میں جو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا نام ہے اس میں بھی ان تینوں احتمالات کا بطلان سمجھئے۔

ابن بسمل اور مسکین بھی استحقاق میں ذالقرنی کے ہم پلہ ہیں

اور ان سب باتوں کو جانے دیجئے۔ اگر ذالقرنی اور حقہ کے معنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم نہ تھے تو لفظ مسکین اور ابن بسمل بھی اس طرح کے اشکال اور خفاء معنی میں کچھ ذالقرنی اور حقہ سے کم نہ تھا۔ علی الخصوص تعین مقدار حق مسکین اور حق ابن بسمل کہ ان دونوں کا عرف میں بھی کوئی قانون نہیں بخلاف قرابتوں کے کہ ان کے لینے دینے کا ہر قوم میں ایک دستور بندھا ہوتا ہے، پھر کیا وجہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اور اقرہا کے حقوق کو تو حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا اور مسکین اور ابن بسمل پچاروں کی بات بھی نہ پوچھی؟ اگر یہ حذر ہے کہ اس روایت میں نہ سہی، کسی اور روایت میں ہوگا تو مسلم، لیکن کسی دوسری ہی روایت سے مثل ذالقرنی کے مسکین اور ابن بسمل کے اشخاص معین کہجئے اور تعین مقدار حق مسکین اور ابن بسمل بیان فرمائے اور قطع نظر اس بات کے جناب باری تعالیٰ اس آیت میں ایک ساتھ تینوں کو ذکر فرماتا ہے۔ آیت ”واعلموا انما غنمتم“ وغیرہ کے ملاحظہ سے بھی یوں سمجھ میں آتا ہے کہ مسکین اور ابن بسمل استحقاق میں ذالقرنی کے ہم پلہ ہیں، جیسا ان کا دینا ضروری ہے، ویسا ہی ان کا، پھر کیا وجہ ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذالقرنی کے حق کے ادا کرنے کا تو فکر ہوا اور اس باب میں کنج کا ذکر اور تفتیش اور استفسار فرمایا اور دربارہ مسکین اور پچارہ ذلیل ابن بسمل کچھ لب کشا نہ ہوئے؟

باقی روایات طرفین کی جو درباب فضیلت خدمت گزاری مساکین اور اہماء بسمل کے وارد ہیں، سو ایسی روایتیں صلہ رحمی کے فضائل میں بھی صدہا مشہور معروف ہیں، اگر مساکین اور ابن بسمل اور ان کے حقوق کی تفصیل اور تحقیق کا پہلے سے معلوم ہوتا، اس قسم کی روایات سے معلوم ہوتا ہے تو ذال

القربیٰ اور ان کے حقوق کی تفصیل اور تحقیق کا معلوم ہونا بھی صلہ رحمی کے فضائل کی روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ مسکین اور ابن سبیل کے باب میں اگر پوچھنے کی حاجت نہ تھی تو یہاں بھی نہ تھی اور اگر احادیث فضائل صلہ رحمی میں یہ احتمال ہے کہ شاید بعد اس آیت کے نزول کے لب مبارک نبوی سے صادر ہوئی ہوں تو یہاں بھی وہی احتمال، ننان کی کسی کے پاس تاریخ لکھی ہوئی ننان کی۔

آیت ذالقرنیٰ اگر مدنی ہے تو واعلموا کی طرف اشارہ ہے

یہ سب رد و کد تو اس صورت میں ہے کہ جیسا تمام امت خاص کر شیعاں آیت کو لکھی کہتے ہیں، مکی ہی کہیں، اور اگر سارے جہان کے برخلاف جیسے مولوی صاحب نے واقدی اور بشیر بن ولید کے حوالہ سے اس آیت کا مدنی کیا؟ بعد خیبر کے نازل ہونا بیان فرمایا ہے۔ ہم بھی اس کے بعد خیبر کی فتح کے قائل ہوں تب ایک بات میں جھگڑا ہو چکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر یہ آیت بعد خیبر کے نازل ہوئی تو آیت ”وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ“ پہلے نازل ہوئی ہے کیونکہ یہ تقسیم آیت واعلموا میں ہے۔ اسی تقسیم کے موافق فتح خیبر سے پہلے ہمیشہ غنیمتیں تقسیم ہوتی رہیں۔ سو اس صورت میں کیا حاجت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا؟ کیونکہ ظاہر ہے کہ اس تقدیر پر آیت ”آت ذالقرنیٰ حقہ“ میں تقسیم مذکور کی طرف اشارہ ہوگا اور چونکہ اس تقدیر پر ذوی القرنیٰ اور مسکین اور ابن سبیل تینوں کے حق سے شرح مشرح معلوم ہو جائے گی تو جو جو خرابیاں بر تقدیر صحت روایت معلومہ معلوم ہوتی تھیں، سب کی طرف سے اطمینان حاصل ہو جائے گا۔ بہر حال چار طرف وجوہات متعددہ اور قرآن داخلی خارجی اس بات پر شاہد ہیں کہ یہ روایت محض دروغ اور سراسر بہتان ہے، بالجملہ ہاتھ باری روایت کے تو سنیں کو اس روایت کے غیر مستحبر ہونے میں ان وجوہ سے تامل نہیں اور بے تامل یہ سمجھتے ہیں کہ مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ مؤمنو اقربا اور مساکین اور مسافروں سے سلوک کرتے رہو اور اقربا میں سے ہر ایک کے ساتھ درجہ بدرجہ احسان اور محبت اور ادب اور تواضع سے پیش آؤ۔ ماں باپ کے ساتھ ادب اور خدمت گزاری اور اولاد کے ساتھ محبت اور خبرداری اور بھائی بند کے ساتھ حسن اخلاق اور مددگاری سے ملتے رہو۔ القصہ علی العموم سب مؤمنوں کو یہ حکم ہے، گو مخاطب فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، نہ یہ کہ فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو فقط مذکور حوالہ کر کے اس بار حکم سے سبکدوش ہو کر فارغ البال ہو جائیں۔

روایت مذکورہ کے وضعی ہونے کی دلیل خود عمار علی ہے

بقی رہا بطور قواعد روایت کے اس روایت کا غلط ہونا، سواؤل تو اس روایت کے غلط ہونے میں اس وجہ سے شک و شبہ نہیں کہ مولوی عمار علی صاحب اس بات کے ناقل ہیں کہ یہ روایت سنیوں کی معتبر کتابوں میں ہے۔ اس سے زیادہ اس روایت کے غلط ہونے کی اور کیا نشانی ہوگی؟ کیونکہ مولوی صاحب کا صدق مقال اور راستی گفتار دربارہ تعلیمات (ان تحریروں سے جو قریب ہی حضرت رقیہ اور حضرت اُم کلثوم دختران مطہرہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت اُم کلثوم جگر گوشہ حضرت بتول رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مقدمہ میں گزری ہیں بلکہ سوا اس کے اور تحریروں سے بھی) واضح ہو چکا ہے۔ پھر جب مولوی صاحب روایت میں ایسے امانت دار ٹھہرے کہ شیعوں کی ضد میں اپنے علماء اور اپنی معتبر کتابوں کو جھوٹ کی طرف نسبت کر دی ہو اور اپنے سب دین و آئین کا اعتبار کھو دیا ہو، سنیوں کے ذہن کے ایک بہتان باندھتے ہوئے ان کو کیا اندیشہ رہ گیا؟ ایسی باتوں میں یا خدا کا ڈر ہوتا ہے یا دنیا کی شرم ہوتی ہے۔ سو قربان جائے تقیہ کے، اس کے صدقہ سے دونوں کو بغل میں مارا مگر بایں ہمہ خنکروں کے اطمینان خاطر اور ناظرین کے دفع غلبان کے لیے لازم ہے کہ کچھ مفصل بھی بیان کیا جائے تاکہ یہ جو بالا بحال مولوی صاحب کا جھوٹا ہونا ثابت ہوا ہے، خوب دل نشیں ہو کر اہل فہم کو اہل سنت کی حقانیت اور شیعوں کا بطلان کا لعلیان ہو جائے مگر شاید مولوی صاحب کو اپنی لہانت کی شکایت ہو، سو ملا زمان مولوی صاحب کی خدمت میں یہ التماس ہے کہ معاذ اللہ ہم سے ایسا کب ہو سکتا ہے؟ آپ کے دین کو تو دروغ ہی سے فروغ ہے۔ سو فروغ کی باتوں میں اگر آپ کی استقامت ہماری تقریر یا تحریر سے ثابت ہو جائے تو ہمارا ممنون احسان ہونا چاہیے۔

فصل، کتاب و مصنف کتاب کے قابل قبول ہونے کی چھ شرطیں

بالمجملہ حرید اطمینان کے لیے اس باب میں کچھ دل لبریز نوکریز قلم ہے مگر اوّل بطور تنبیہ یہ گزارش ہے کہ کتابیں آدمیوں ہی کی تصنیف ہوتی ہیں، جیسے آدمی سب طرح کے ہوتے ہیں، جھوٹے سچے مستحیر غیر مستحیر، لمیدہ غیر لمیدہ، ایسے ہی کتابیں بھی سب طرح کی ہوتی ہیں، ملحدان بے دین نے بہت سی کتابیں تصنیف کر کے اچھے اچھے بزرگوں کے نام لگا دیئے ہیں اور اس میں اپنے دامیات سینکڑوں بھر دیئے ہیں اور جو کتابیں کہ کبرائے اہل سنت کی تصنیف ہیں، اس میں سے بھی اکثر ایسی ہیں کہ وہ لوگوں کی فیض رسانی کے لیے تصنیف نہیں ہوئیں بلکہ بطور بیاض کے جمع

کی نہیں تاکہ نظر ثانی کر کے ان کی روایات کا حال معلوم کریں اور اتفاق سے نظر ثانی کا اتفاق نہ ہوا ہو اور کسی وجہ سے وہ بیاضیں لوگوں کے ہاتھ پہلے پڑ گئیں اور بعضی کتابیں ایسی ہیں کہ وہ بہت کماب اور بدرجہ غایت نادر الوجود بلکہ بمنزلہ مفقود ہیں اور وہ طہروں اور مبتدعوں کے ہاتھ لگ گئی ہیں انہوں نے اپنی گھڑی ہوئی روایتیں اس میں داخل کر دی ہیں، یا اہل سنت کے مقابلے کے وقت کسی روایت کو ان کتابوں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں تاکہ اہل سنت خاموش ہو جائیں۔

سوال تشیع اکثر ایسا ہی کرتے ہیں اور ایسی ہی کتابوں کا حوالہ دیا کرتے ہیں اس لیے اہل حق کو لازم ہے کہ جب کسی شیعہ سے کسی کتاب کا حوالہ سنے تو اول تو یہ دریافت کرے کہ یہ روایت اس کتاب میں ہے کہ نہیں؟ دوسرے اس کتاب کا حال تحقیق کرے کہ محترم ہے کہ نہیں؟

پہلی شرط

اور محترم ہونے کی یہ صورت ہے کہ کسی کتاب کی روایات کے معبر ہونے میں چند باتیں ضروری ہیں۔ اول تو یہ کہ اس کتاب کے مصنف کو تفرغ طالع مخروہ کے لیے فقط قصہ گوئی اور افسانہ خوانی مد نظر نہ ہو بلکہ واقعات واقعی کے مشاققوں کی تسکین کے لیے اس کتاب کو تصنیف کیا ہو ورنہ چاہیے کہ بہار دانش اور بوستان خیال کے افسانے اور چہار درویش اور بکاؤلی کی کہانیاں اور لسانہ عجائب اور فسانہ غرائب کے طوفان، سب کے سب دستاویز خاص و عام ہو جائیں۔

دوسری شرط

دوسرے یہ کہ مصنف کتاب کسی کی رو رعایت اور کسی سے بغض و عداوت نہ رکھتا ہو اور اس کا حفظ اخبار اور صدق گفتار اس وجہ کو مشہور ہو کہ اس کی تحریر کی نسبت کسی کے دل میں شک و شبہ نہ ہو، ورنہ طومار کے طومار اخباروں کے لڑکیوں کی زبانوں میں اپنے بزرگوں کی شجاعت اور ان کے غیموں کی بزدلی سے مٹھون ہوا کرتے ہیں، بالاتفاق مسلم ہو جائیں؟ اور یہ جو زبان مذہب خاص و عام ہے کہ اخباروں کا کیا اعتبار؟ ایک حرف بچا اور عقیدہ ناسزا ہو جائے اور شیعہ سنیوں کی اور سنی شیعوں کی سندیات برسرِ چشم رکھے لگیں اور ہر کس و ناکس کی بات قبول کرنے لگیں اور یہ فرق قوت و ضعف، حفظ و تفاوت، صدق و کذب اور علیٰ ہذا القیاس یہ تہمت رد و رعایت، اور کینہ و عداوت، ہرگز قابل لحاظ نہ رہے۔

تیسری شرط

تیسرے یہ کہ مصنف کتاب ہا و جو صدق و دیانت اور حفظ عدالت کے اس فن میں جس فن کی

وہ کتاب ہے دستگاہ کامل اور ملکہ کا بیٹی رکھتا ہونہ یہ کہ دین میں مثلاً نیم ملا ہو جس سے خطرہ ایمان ہو یا طب میں مثلاً نیم طبیب ہو کہ بیماروں کو خطرہ جان ہو۔

چوتھی شرط

چوتھے یہ کہ وہ کتاب باوجود شرائط مذکورہ کے قدیم سے مشہور و معروف اور ایسے قسم کے لوگوں کے واسطے سے جو مجموعہ اوصاف مرقومہ ہوں دست بدست ہم تک پہنچی ہو ورنہ لازم کیا الزم تھا کہ انجیل اور توریت جو کلام ربانی ہیں اور اس خدا کی تعریف ہیں جو بوجہ اتم جامع اوصاف مذکورہ کیا۔ مجموعہ جمیع صفات کمال اور معدن جملہ کمالات جلال و جمال ہے۔ اعتبار اور اعتماد میں ہم پہلے قرآن مجید اور فرقان حمید کے ہو جائے؟

پانچویں شرط

پانچویں یہ کہ روایت کی کتاب میں اعتبار کے لیے ضروری ہے کہ مصنف کتاب نے اول سے التزام اس بات کا بھی کیا ہو کہ جو صحیح روایتوں اور محقق حکاموں کے اور روایتیں اپنی کتاب میں درج نہ کروں گا جیسے صحاح ستہ کہ ان کے مصنف نے یہ شرط کر لی ہے کہ جو صحیح روایت کے اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے۔ اسی واسطے ان کتب کا نام صحاح ستہ مشہور ہو گیا۔ سواگر کوئی کتاب کسی کی بیاض ہو کہ اس نے اس میں ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں اور صحیح غلط حکایتیں اس غرض سے فراہم کر لی ہیں کہ بعد میں نظر ثانی کر کے صحیح صحیح کو قائم رکھ کر باقیوں کو نقل کے وقت حذف کر دوں گا۔ جیسا کہ امام بخاری اور امام مسلم نے کیا یا صحیح کو صحیح بتلا کر موضوع یعنی بنائی ہوئی باتوں اور گھڑی ہوئی حکایتوں اور ضعیف وغیرہ کو لکھ کر اس کے بعد لکھ جاؤں گا کہ یہ موضوع ہے یا ضعیف ہے۔ مثلاً جیسے امام ترمذی نے کیا لیکن اتفاقات تقدیر سے ان کا یہ ارادہ پیش نہ کیا اور یہ آرزو پوری نہ ہونے پائی تھی، حتیٰ کی حتیٰ ہی میں تھی کہ اجل نے آدبا تو ایسی کتاب کی روایات کا ہرگز اعتبار نہ ہو گا ورنہ کون سا مصنف نہیں کہ اس نے اول ایک مجموعہ بیاض بطور کلیات کے فراہم نہیں کیا؟ امام بخاری سے بہت سندوں سے منقول ہے کہ انہوں نے چھ لاکھ حدیثوں سے چھانٹ کر بخاری شریف کی حدیثیں نکالی ہیں اور عبدالرزاق بخاری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری نے کوئی تین دفعہ حدیثوں کی بیاض اکٹھی کی تھی، چھانٹ کر بخاری شریف کا مسودہ کیا تھا۔ چنانچہ یہ مضمون بخاری شریف مطبوعہ دہلی مطبع احمدی کے مقدمہ کی دوسری اور تیسری فصل میں مندرج ہے۔

بہر حال ایسی بیاضوں کا جمع کرنا ایسے ایسے آئمہ حدیث کی نسبت بھی ثابت ہے، سو اگر اتفاق سے امام بخاری مثلاً بعد فراہمی بیاض کے قبل اس کے کہ بخاری شریف کی حدیثیں اس میں سے جانت کر بخاری تصنیف کریں، اس دایرہ فانی سے کوچ کر جاتے تو گو وہ بیاض امام بخاری ہی کی تصنیف سمجھی جاتی لیکن کوئی بتائے تو کیا وہ قابل اعتبار کے ہو جاتی؟ سب جانتے ہیں کہ اگر وہ ایسی ہوتی تو امام بخاری کو چھانٹنے ہی کی کیا ضرورت تھی؟ تو اس صورت میں خود امام بخاری ہی اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ میری بیاض قابل اعتبار نہیں، پھر ہم کیونکر فقط اس سبب سے اس کا اعتبار کرنے لگیں کہ وہ ایسے بڑے محدث امام احمد ثین کی تصنیف ہے کہ جہاں میں نہ کوئی ثانی ان کا ہوا ہے نہ ہو۔ غرض اگر کوئی کتاب اس قسم کی کسی کو مل جائے اور اس کے مصنف کو کتنا ہی بڑا محدث کیوں نہ ہو، اس کی تہذیب اور تالیف کا اتفاق نہ ہوا ہو تو وہ کتاب کسی طرح علماء کیا جہاں کے نزدیک بھی بھہادت عقل قابل اطمینان نہیں۔ ہاں مولوی عمار علی صاحب جیسے ماہر فن حدیث کا ذکر نہیں کہ وہ اُلٹی کے سمجھن ہار ہیں۔ وہ اگر ایسی نامستقیم بات کہہ پڑیں۔ چنانچہ ان کا خط ایسی باتوں سے مٹھون ہے تو اس کا جواب بجز اس کے کچھ نہ ہوگا کہ باضافت صدر الیٰ المسعود کسی نے کہا ہے، جواب جاہلان باشد خموشی۔ بہر حال یہ نکتہ محفوظ رکھنا چاہیے کہ بسبب اس کے ملحوظ نہ رہنے کے اکثر عالم نام سے، گرفتار دام اوہام ہو جاتے ہیں۔ چہ جائیکہ جاہل۔

چھٹی شرط

مجھے یہ کہ اگر چند روایتیں باہم مختلف ہوں اور پھر اختلاف بھی حد تضاد یا تافض کو پہنچ جائے، دونوں کا صحیح ہونا فقط مستبعد ہی نہ ہو تو پھر ترجیح باعتبار قوت سند ہی کے ہوگی ورنہ لازم ہے کہ شیعوں کے نزدیک روایات شیعہ اور روایات اہل سنت جو مخالف روایات شیعہ ہیں، دونوں صحیح ہوں، ایسے ہی کلینی کی یہ روایت کہ کلام اللہ کی سترہ ہزار آیتیں تھیں لیکن ماسواہ مندرجہ مصاحف متداولہ کے سب چوری گئیں اور ابن بابویہ صدوق کی روایت کہ کلام اللہ اتنا ہی تھا، جتنا اب ہے، دونوں صحیح ہو جائیں۔ سو سب جانتے ہیں کہ اجتماع نقیضین اور ارتقاہ نقیضین دونوں محال ہیں جب یہ بات مقرر ہو چکی تو گوش گزار اہل انصاف ہو کہ اول تو یہ روایت اور نیز باقی روایتیں جو الزام اہل سنت کے لیے اہل سنت کی کتابوں کے حوالہ سے مولوی عمار علی صاحب نے اپنے رقیہ میں درج فرمائی ہیں ان کتب میں نہ سمجھنی چاہیے کیونکہ اعتبار کے ساقط ہو جانے کے لیے آدی کا ایک جھوٹ بھی بہت ہے۔ مولوی صاحب کا دروغ تو امور متعددہ میں تحقیق ہو چکا۔ چنانچہ ناظران ابحاث متعلقہ

نکاح حضرت اُم کلثوم جگر گوشہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور ملاحظہ کنان تقریر نسب حضرت رقیہ اور حضرت اُم کلثوم بنات مطہرہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود جانتے ہیں۔ گزارش مکرر کی کچھ حاجت نہیں، اگر یاد نہ رہا ہو تو پانچ سات درق پلٹ کر ملاحظہ فرمائیں۔ معلوم ہو جائے گا کہ جب مولوی عمار علی صاحب نے اپنی کتب مشہورہ معتبرہ کی مرویات سے چشم پوشی کر کے ایک غرض خفیف یعنی سنیوں کی بات کے ہلکا کرنے کے لیے رقیہ موسومہ میرنا در علی صاحب میں بہت سا کچھ خلاف واقع لکھ دیا اور پھر جرأت کر کے یہ کہہ دیا کہ اگر سند مطلوب ہو تو روانہ کر دی جائے اور یہ خیال نہ فرمایا کہ ہماری صحیح روایتیں غلط ہوئی جاتی ہیں۔ اگر سنیوں کے سر پر بھی ایک طوفان دھرویں تو اس میں تو یہ بھی اندیشہ نہیں اور بڑی دلیل اس بات کی یہ ہے کہ جن کتابوں کے حوالے سے یہ روایت درج رقیہ مولوی صاحب ہے، خود انہیں کتب کے مصنفوں کی مشہور کتابیں، اس روایت کو رد کرتی ہیں۔ چنانچہ ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ مذکور ہوگا۔

اہل سنت کی کتب میں اہل تشیع کے الحاقات

اور سہنا کہ یہ روایتیں سنیوں کی بعضی کتابوں میں ملتی ہیں لیکن وہ کتابیں ایسی غیر مشہور ہیں کہ کیابلی میں بیضہ سہنا سے کم نہیں، سنیوں کو ان کتابوں کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا۔ حفظ اور ضبط تو وہ کنارہ سوا اگر یہ روایتیں ان کتابوں میں ہوں بھی تو بیش بریں نیست کہ جیسے بعض سیہ کاران قبیلہ یہود نے منافقانہ نصرانی بن کر انجیل میں بہت سی خرافات خلاف عقل مرتع اور مناقض نقل صحیح درج کر دی ہیں۔ ایسے ہی مقتدیان عبد اللہ بن سبا یہودی منافق اہل حضرات شیعہ بھی کہ بالیقین تبدیل و تحریف میں کو چک ابدال یہود مردود اور موافق نقل مشہور ”سگ زاوہر اور شغال“ تیرہ صدی میں ان کے ہمرنگ اور قسادت قلبی اور سنگدلی میں ان کے ہم سنگ ہیں، مقدم سے درپے تخریب دین احمدی اور ہمتن مصروف تحریف آئین محمدی علیہ علی آلہ الصلوٰۃ والسلام ہے ہیں اور اہل سنت و جماعت کی جماعت پر دانت پیتے چلے آئے ہیں لیکن بایں وجہ کساتیان سچ علیہ السلام کو نہ حفظ و محافظت انجیل سے کچھ کام تھا اور نہ اس کی تلاوت اور یادداشت میں چہاں اہتمام تھا، یہود مردود کا انجیل پر بھی داؤ چل گیا، چہ جائیکہ دیگر کتب زائد غیر مشہور۔

اہل سنت کا نظام حفاظت

لیکن یہاں یہ حال ہے کہ ایک ایک حرف قرآن پر لکھو کھا سنیوں نے جمہور پڑا ہا نہ رکھا ہے اور ہر روایت صحاح ستہ وغیرہ کتب صحاح احادیث پر ہزاروں محدثین بیدار مغز نے تنقیح اور

تسل اور حفظ و ضبط کی یہ نوبت پہنچادی کہ کسی لمحہ بے دین کو ہمال زیادہ کم کرنے کی ہاتی نہ رہی۔
 ہاتھ کڑت حلاقر آنی اور شیوع محدثین رہانی فرقہ اہلسنت میں اس درجہ کو پہنچی ہے کہ بابہ الامتياز
 و ماہ الافتراق اہل سنت اور شیعہ ایک یہ بات بھی ہوگئی ہے الغرض اس وجہ سے کتاب اللہ اور
 صحاح ستہ وغیرہ کتب مشہورہ اہلسنت تک تو ان تیرہ درونوں کا دست تقا دل نہ پہنچا۔ گو بہت کچھ
 ائمہ ہاؤں مارے اور وعدہ ہائے "اِنَّا لَهٗ لَحَافِظُونَ" اور "وَاللّٰهُ مُقِيمٌ نُّوْرَهٗ" نے ان نابکاروں
 کی سلی سچا کو انجام تک نہ پہنچایا لیکن نقل مشہور ہے۔ "اصل بد از خطا خطا نہ کند" جیسے اس بات سے
 اے تھے جبکہ مار کر چپ ہو رہے۔ لاچار ہو کر کتب غیر مشہورہ کی طرف متوجہ ہو کر اپنے دل کے
 پیولے پھوڑے اور بہت سے طوفان ایسے جوڑے کہ عوام کیا بعض علماء سادہ لوح بھی ایک دفعہ کو
 ہل جائیں۔ سو منجملہ ان کے روایات مندرجہ رقیمہ مذکور بھی ہیں لیکن بھلا اللہ فرقہ اہل سنت
 جماعت کہ ایک جماعت کلاں ہے۔ محققین سے کبھی خالی نہیں رہا، ان کو خداوند کریم جزائے خیر
 دے وہ لوگ ان کی دھوکہ بازیوں کو سمجھ گئے اور ہمارا خداوندی انہیں روایات میں سے طلا مات اور
 لدا ست کذب و دروغ نکال کر عاقلوں کو متنبہ کر دیا اور عاقلوں کو طریقہ تمیز حق و باطل کا بتلادیا۔
 چنانچہ ان روایات کے ابطال کی تقریر کو دیکھ کر ان شاء اللہ یہ دعویٰ مدلل ہو جائے گا۔

القصد دعا باز ان شیعہ کی یہ چالاکی کتب غیر مشہورہ میں چل گئی، اسی واسطے علمائے اہل سنت ان
 کتب کو ہم سنگ تو ریت و انجیل سمجھتے ہیں اور ان کی روایات کو معتبر نہیں رکھتے۔ ہاں ان کی روایات کو
 روایات صحاح ستہ و دیگر کتب صحاح مشہورہ پر پیش کر کے جو مطابق لکھے اس کو برسرہ چشم رکھتے ہیں اور
 جو مخالف لکھے اس کو لمحہ ان بدعت کیش دروغ پیشہ شیعہ و خوارج وغیرہ کے سرمارتے ہیں اور جو
 روایات خلاف و وفاق سے برطرف ہو، اگر دلائل عقلیہ کے مخالف ہو تو اس کا بھی یہی حال ہے ورنہ
 اگر تکذیب نہیں کرتے تو تصدیق بھی نہیں کرتے۔ بہر حال جو روایت کہ ان کتب میں بلا شرکت غیر
 بھی پائی جائے، اگر روایت صحاح کے مخالف بھی نہ ہو تب بھی قابل تمسک اور لائق حجت نہیں سمجھتے
 اور مثل روایات اہل کتاب بلکہ خود انجیل و توریت نہ ان کی تصدیق کرتے ہیں نہ تکذیب۔

مصنف معتبر ہو تو ضروری نہیں کہ تصنیف بھی معتبر ہو

سو اگر کسی شیعہ کم فہم کو ان کتب کے غیر معتبر ہونے میں اس وجہ سے وثوق نہ ہو کہ ان کتب کے
 مصنف منجملہ معتقد ایان اہلسنت ہیں تو کوئی ان سے پوچھے کہ انجیل و توریت کے مصنف تو خداوند
 اکرم الاکرمین ہیں اگر مصنف کا معتبر ہونا موجب اعتبار کتاب ہو جائے تو قرآن تو قرآن انجیل و

توریت شیعوں کے نزدیک معتبر ہو جائیں ورنہ لازم آئے کہ (نحوذ باللہ) جناب خداوند تعالیٰ کا شیعوں کے نزدیک کچھ اعتبار نہ ہو؟ مگر ہم جانتے ہیں کہ شیعوں کو اس الزام سے کچھ اندیشہ نہیں کیونکہ وہ اب کون سے خدا کا اعتبار کرتے ہیں، اس سے زیادہ اور کیا بے اعتباری ہوگی کہ خدا کی رائے اور علم کو قائل اعتبار نہیں سمجھتے اور بد کے قائل ہو گئے "لعنة الله على هذا المذهب"۔ بہر حال اہلسنت وجماعت کب غیر مشہور غیر متداولہ کو ہرگز قائل اعتقاد نہیں جانتے اور بملاحظہ عداوت اور تحریہ و عادات دروغ بزرگواران شیعہ اس سے مطمئن نہیں کہ جیسے انجیل و توریت کو دشمنان دین نے تحریف کر دیا، کب غیر مشہورہ کو ان حضرات نے حسب مطلب بدل دیا ہو۔

مصنف تحفہ کی ایک عبارت

اور اگر کوئی سادہ لوح میری اس بات کو کوہلوں کی بات اور واہیات سمجھے تو بیڑوں کی بات تو بیڑی ہوتی ہے دیکھئے شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو شیعوں سے بھی زیادہ شیعوں کی عادات اور اصول و فروع مذہب سے واقف ہیں تحفہ اثنا عشریہ میں باب مکائد شیعہ میں جو دوسرا باب ہے، کیا فرماتے ہیں، احتیاطاً لہجہ انہیں کی عبارت بلاغت آمیز نقل کرتا ہوں۔

کید ہی و دوم ۳۲ آنکہ جمعی کثیر از علماء ایشان سعی بلیغ نموده اند، و در کتب اہل سنت خصوصاً تفاسیر کہ بیشتر دستمال علماء و طلباء سے باشند و بعضی از کتب احادیث کہ شہرہ مدارند، و نسخ آن کتب متحد بدست نمی آید، اکاذیب موضوعہ کہ مویذ مذہب شیعہ و مظل مذہب سنیان باشند الحاق نماید، چنانچہ قصہ مہمہ فدک در بعض تفاسیر داخل نموده اند کہ سیاق آن حدیث چنین روایت نموده کہ لَمَّا نَزَلَتْ وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ دَعَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاطِمَةَ وَاعْطَاهَا ذَلِكَ أَمَّا بَكْمُ آنکہ "دروغ گور احافظ باشد" یہاں نشان نمائند کہ این آیت کی است و در کہ فدک کجا بود؟ و نیز بایست کہ برائے مساکین و ابن السبیل نیز چیزے وقف می کرد تا عمل بر تمام آیت میسر می شد و نیز اعطایا لہک دلالت صریح بر بہ و تمسک نمی کند پس لفظ و ہمہا بایست وضع کرد۔ و علی ہذا القیاس در تفاسیر و سیر جتہ جتہ الحاقات ایشان یافتہ میشود، و درین کید ہم اکثر مغفلان از علمائے اہل سنت خطی کنند و تشویش می کنند، و در شہر دہلی در عہد ہادشاہ محمد شاہ دو کس بودند از امراء این فرقہ کہ کتب اہل سنت را مثل صحاح ستہ و مشکوٰۃ و بعض تفاسیر بخط خوش سے نویسانیدند و در آن حدیث مطلب خود از کتب امامیہ برآوردہ داخل نمودند، و آن نسخ را محمد ول و مظل و مذہب نمودہ بمقیمتہ سہل در گزرے میلر دھند، و در اصنفان آغا ابراہیم ابن علی شاہ کہ یکے از امراء کبار سلاطین صفویہ

ہو، ہمیں اسلوب عمل کردہ لیکن بایں کید ایشان حاصلے نشد، زیرا کہ کتب مشہورہ اہلسنت بجمہ کمال شہرت و کثرت نسخ قابل تحریف، میستند و کتب غیر مشہورہ را اعتبارے نہ، ولہذا محققین اہلسنت از کتب غیر مشہورہ نقل را جائز نداشتہ اند، مگر در ترغیب و ترہیب، و در حکم صحائف انبیاء پیشین می شمارند کہ بیچ عقیدہ و عمل رازان اخذ نتوان کرد بجمہت احتمال تحریف اتھی، کلامہ الشریف۔

ترجمہ: جیسواں ۳۲ مکر۔ ان کے علماء کے بڑے گروہ نے بے حد کوشش کی ہے کہ کتب اہل سنت میں (خصوصاً تفاسیر میں) جو ان کے طلباء و علماء کی دستمال بنی رہتی ہیں (اور بعض کتب احادیث میں جو غیر مشہور ہیں اور ان کے متعدد نسخے ہاتھ نہیں لگتے) خود ساختہ ایسے بڑے جھوٹ شامل کر دیں جو شیعہ مذہب کی تائید کریں اور مذہب اہل سنت کی جڑ کاٹ دیں۔ چنانچہ ہبہ فدک کا قصہ بعض تفاسیر میں داخل کر کے یوں روایت لاتے ہیں کہ جب آیت "وَأَبِذْ الْقُرْبٰی حَقُّہٗ" نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور ان کو فدک عطا فرمایا لیکن موافق مثل مشہور "جھوٹے کی یادداشت نہیں ہوتی" ان کو یہ یاد نہ رہا کہ یہ آیت مکی ہے اور مکہ میں فدک کہاں تھا؟ اور یہ بھی تو چاہیے تھا کہ آپ ابن سبیل اور مساکین کے لیے بھی کچھ وقف کرتے تاکہ پوری آیت پر تو عمل ہو جاتا۔ نیز "أَعْطَاهَا لِذٰکَ" یہ الفاظ بہد تملیک پر صریح دلالت بھی نہیں کرتے۔ "وَهَبَهَا" کا لفظ گھڑنا چاہیے تھا۔ الفرض اس جیسی کئی مثالیں تفسیرات اور کتب سیرت میں پائی جاتی ہیں اور اس چال میں کئی سیدھے سادھے علمائے اہل سنت بھی چکر اجاتے ہیں۔ شہر دہلی میں محمد شاہ کے عہد میں دو آدمی جو فرقہ شیعہ کے امراء میں سے تھے، اہل سنت کی کتابیں مثل صحاح ستہ، مشکوٰۃ اور بعض تفسیریں خوش خط لکھتے اور ان میں کتب شیعہ سے ایسی روایتیں داخل کر دیتے جو ان کے مطلب کی ہوتیں، پھر ان کی اعلیٰ جلد بندی، جس پر سونے چاندی کا کام بنا ہوا ہوتا، کرا کے سستے داموں کسی راہ گزر میں فروخت کر دیتے۔ اسی طرح اصفہان میں آغا ابراہیم ابن علی شاہ جو سلاطین صفویہ کے بڑے امراء میں سے تھا، یہی چال چلتا تھا لیکن اس مکر سے ان کو کچھ حاصل نہ ہوا کیونکہ اہل سنت کی مشہور کتابیں بے حد شہرت اور کثرت تعداد کی وجہ سے تحریف اور تبدیل کو قبول نہیں کرتیں اور غیر مشہور کتابیں ان کے ہاں معتبر ہی نہیں، یہی وجہ ہے کہ محققین نے کتب غیر مشہورہ سے سند لانے کو جائز نہیں رکھا (سوائے ترغیب و ترہیب کے) بلکہ ان کو صحف انبیاء جیسا سمجھا ہے جن پر عقیدہ و عمل کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ کلام مبارک ختم ہوا۔ ترجمہ از ناشر

عمار علی نے بعض کتب شیعہ بھی اہل سنت کی طرف منسوب کر دیں

اگر ہم پاس خاطر مولوی عمار علی صاحب اور بھی چشم پوشی کریں اور ان کے اور ان کے بزرگواروں کے ذمہ اس بات کی نسبت نہ کریں کہ انہوں نے اپنے مطلب کے موافق بعضی روایتیں سنیوں کی غیر مشہور کتابوں میں رلا ملا دی ہیں، تب بھی مولوی عمار علی صاحب کی بات کا پتہ معلوم کیونکہ جن کتابوں کا حوالہ مولوی صاحب نے درج رقیمہ کریمہ فرمایا ہے، ان میں بعضی کتابیں تو ایسی ہیں کہ سنیوں میں سے کسی نے ان کا نام بھی نہیں سنا اور نہ ان کے مصنفوں کا اہل سنت میں سے کوئی نام نشان جانے، مثل تاریخ آل عباس کہ علماء سنت نے اس کتاب کو شاید کبھی سنا بھی نہ ہو بلکہ یہ اس قسم کی کتابیں ہیں جیسے شاہ عبدالعزیز صاحب نے لکھا ہے۔

”کید بست و کیم آنکہ کتابے رانبت کنند یکے از کبراء اہل سنت دوران مطاعن صحابہ و مہملات مذہب اہلسنت درج نمایند الے آخرہ“

ترجمہ از ناشر، اکیسواں مکر: ”کسی کتاب کو اکابر علمائے اہلسنت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، پھر اس میں مطاعن صحابہ اور اہل سنت کے مذہب کو باطل کرنے والی روایتیں گھڑ کر داخل کر دیتے ہیں۔“
سو اگر یہ کتاب موجود بھی ہو تب کسی شیعہ مکار کی ہوگی اور بعضی کتابیں اس قسم کی ہیں کہ ان کے مصنفوں کو فہم حدیث اور فہم تاریخ میں دستگاہ کامل اور تمیز صحیح و غلط ہرگز نہ تھی، جیسے معارج النبوة، ہاں مدارج النبوة کا حوالہ اگر زیب رقیمہ ہوتا تو ہمارے برسر و چشم تھا لیکن ایسی معتبر کتاب میں سے مولوی صاحب کے ہاتھوں میں کیا آتا؟

علامہ سیوطی کی تصانیف پر مصنف کتاب کی رائے

اور بعضی کتابیں ایسی ہیں کہ ہرچند ان کے مصنف فن حدیث میں مہارت کامل اور مشق کما بغنی اور تبحر وافر رکھتے تھے۔ جیسے شیخ جلال الدین سیوطی وغیرہ، لیکن انہوں نے اپنی ان کتابوں میں جن کا حوالہ مولوی صاحب کے رقیمہ میں مندرج ہے یہ التزام نہیں کیا کہ بجز روایات صحیحہ اور کچھ داخل نہ کریں گے بلکہ رطب و یابس بطور بیاض کے جمع کر لیا ہے۔ جیسے جمع الجوامع کہ اس کا نام ہی اس بات پر شاہد ہے اور نیز اس کا حال شہرہ علمائے آفاق ہے۔ یا بغرض تفریق و تمیز صحیح و غلط جمع کیا ہے۔ جیسے تفسیر درمنثور اور علی ہذا القیاس موضوعات ابن جوزی کہ ان دونوں کتابوں میں اگرچہ ہر قسم کی مخالف موافق روایتیں پائی جاتی ہیں لیکن ان روایتوں کے ساتھ اس میں یہ بھی ساتھ ہی لگا ہوا ہے

کہ یہ روایات غلط ہیں اور یہ اس واسطے کیا ہے کہ کل کو مولوی عمار علی صاحب جیسے مکار دغا باز ان روایتوں کے بھروسے کسی سادہ لوح کو دھوکا نہ دے بیٹھیں اور اسی فرض کے لیے حقد میں مہر میں بھی ایسا کرتے ہیں۔ چنانچہ امام ترمذی اور امام ابو داؤد اکثر جگہ لکھ جاتے ہیں ہذا حدیث ضعیف۔ اور بعضی کتابیں ایسی کیا ہیں کہ اگر مولوی عمار علی صاحب یوں فرمانے لگیں کہ اس کی تمام روایتیں ہو بہو مطابق مذہب شیعہ اور اصول و فروع شیعہ بنامہا اس کی روایات کے مطابق ہے تو بوجہ کیا بالی ان کتب کے مولوی صاحب کی کسی سے زبان نہ پکڑی جائے، سچا تو خدا سے ڈرے جو نے کو کس کا ڈر، اس کی زبان کو لگام بھی نہیں ہوتی مگر جتنا کچھ اس خط میں مولوی صاحب نے کیا ہے وہ بھی کچھ کم نہیں اور انہوں نے کیا کیا، یہ مکاریاں اور دغا بازیاں تو میراث بزرگواران شیعہ ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی قدس سرہ العزیز رقم فرماتے ہیں۔

”کید بست و دوم آنکہ مطاعن صحابہ و مہملات مذہب اہلسنت از کتب نادر الوجود کیا اب ایٹان نقل نمایند حالانکہ در آن کتب اثرے ازان نباشد و بسبب آنکہ آں کتب پیش ہر کس و در ہر وقت و ہر مکان موجود نمیشود اکثر ناظران در شبہ و شک افتند و بطاظرشان رسد کہ اگر ایں نقل صحیح باشد تطبیق در میان ادو دیگر روایات اہل سنت چہ قسم خواهد بود۔ حالانکہ ایں بچار ہا عبث در سرے کشند و نمی فهمند کہ اگر بالفرض نقل صحیح ہم باشد محتاج تطبیق و قعے خواہیم باشد کہ ہر دو روایت در یکدجہ باشند از شہرت و صحت ماخذ و صراحت دلالت و کیت رواد و چون ایں امور در ان نقل مخفی مستور است مقابل روایات مشہورہ صحیحہ الماخذ صریحہ الدلالت چہ اہایہ کرد و کتابہائے کہ ازان فرقہ شیعہ برائے الزام اہل سنت نقل می کنند ہمہ ازیں قبیل است کہ نادر الوجود کیا اب میباشند و علی تقدیر الوجدان مصنف آن کتب التزام صحت جمیع مافیہا نہ کردہ اند بلکہ بطریق بیاض و یابس در آں جمع نمودہ محتاج نظر ثانی گذاشتہ اند، اردنبلی صاحب کشف الغمہ و حلی صاحب البیعین از ہمیں قبیل دختر دفتر نقل کنند و بزم خود گوئے از میدان مناظرہ برند و ابن طاؤس نیز در مؤلفات خود از ہمیں جنس خرد و ہا پر کردہ و اعتقاد خود اہلسنت را الزام دادہ و الحقہ کلامہ الشریف“

ترجمہ از ناشر: ہائیسواں مکر: ”یہ ہے کہ اہل سنت کی نادر الوجود کیا اب کتابوں سے صحابہ کی اہانت کرنے والی اور اہل سنت کے مذہب کو باطل کرنے والی روایات نقل کرتے ہیں حالانکہ ان کتابوں میں ایسی روایات کا نام نشان بھی نہیں ہوتا لیکن چونکہ ہر جگہ ہر وقت ہر ایک کے سامنے نہیں ہوتیں۔ لہذا اکثر سننے دیکھنے والے شک و شبہ میں پڑ جاتے ہیں اور ان کے دل میں یہ آتا ہے

کہ اگر یہ نقل صحیح ہوئی تو اس میں اور دیگر روایات اہل سنت میں مطابقت کس طرح ہوگی حالانکہ (۱) ہمارے مفت پریشان ہوتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے) اگر بالفرض یہ روایت صحیح بھی ہو تو تعلیق کی ضرورت اس وقت پڑے گی جب دونوں روایتیں شہرت و صحت ماخذ و صراحت دلالت و حد و درجہ وغیرہ میں برابر ہوں اور جب یہ باتیں اس نقلی روایت کے بارے میں معلوم ہی نہیں تو روایات مشہورہ مجتہد الماخذ و مرصحة الدلالات کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہے اور وہ کتابیں جن سے اہل شیعہ اہل سنت کو الزام دینے کے لیے روایات نقل کرتے ہیں، وہ ایسی ہی ہیں جو ہاتھ نہ آنے والی اور کیا ب ہوں اور اگر طبعی بھی تو ایسی دیکھی ہوتی ہیں کہ مصنف نے ان میں مندرجہ تمام روایات کی صحت کا التزام نہیں کیا ہوتا بلکہ بطریق بیاض و یابس اس میں جمع کر کے نظر ثانی کے لائق چھوڑا ہوتا ہے۔ اردبیلی صاحب کشف الخمر اور چلی صاحب البقیع اس قسم کی روایتوں کے دفتروں کے دفتر نقل کر کے اپنے خیال میں گویا میدان مناظرہ میں جیت جاتے ہیں اور ابن طاووس نے بھی اپنی مؤلفات اسی طرح کی دھوکہ بازیوں سے بھر رکھی ہیں اور بزرگ خود اہل سنت کو بڑے بڑے الزام دے دیئے ہیں۔“

بہر حال جب ان بزرگواروں کی ایسی ایسی بزرگیاں سنا کر یہ معلوم ہو چکی ہوں تو پھر کتب کیا ب کے حوالہ کا کیا اعتبار رہ گیا؟ اول تو یہی یقین کرنا چاہیے کہ ان کتب میں اصل سے ان روایات کا نام و نشان بھی نہیں اور اگر اس پر تسکین نہ ہو تو بالفرض اگر ایسی روایتیں ان کتب میں ملیں بھی تو وہ انہیں کذابوں کی تراشی ہوئی ہیں۔ پھر اس پر اکثر یہ کتابیں بطور بیاض کے مجموعہ رطب و یابس ہیں ان کے مصنفوں کو نظر ثانی کا اتفاق نہ ہوا جو تلخیص کر کے صحیح صحیح روایتیں جدا کر کے باقیوں کو حذف کر دیتے، یا لکھ جاتے کہ یہ روایتیں موضوع ہیں یا ضعیف ہیں۔

واقدی کے بارے میں آئمہ محدثین کی رائے

مع ہذا مولوی صاحب نے بعض ایسی کتابوں کا حوالہ لکھ دیا ہے کہ نہ ان کتابوں کو کوئی جانے نہ اس کے مصنف کو کوئی پہچانے، جیسے تاریخ آل عباس، پھر جرات تو، دیکھو کس دلیری سے کہتے ہیں کہ تاریخ آل عباس اہل سنت کی معتبر کتابوں میں سے ہے۔ پھر اس پر اس کتاب میں یہ روایت بھی ہے تو واقدی کی روایت سے جن کی جھوٹی تو جھوٹی ہی بات بھی جھوٹی ہی سمجھی جاتی ہے، ان کی تعریف میں جو کچھ محدثین نے لکھا ہے دیکھئے پیش نظر کرتا ہوں، مجمع البحار میں امام نسائی کے حوالے سے جوئن حدیث میں امام ہیں اور ان کی کتاب من جملہ صحاح ستہ ہے یوں لکھا ہے کہ امام نسائی نے فرمایا ہے کہ ایسے کذاب جو حدیثوں کے بنانے میں معروف ہیں، چار ہیں۔ ابن ابی یحییٰ مدینہ میں واقدی بغداد

میں متقابل بن الیمان خراسان میں، محمد بن سعید مصلوب شام میں اور پھر زید نے شرح النہاء کے حوالے لکھا ہے کہ واقدی کے ضعف پر سب کا اتفاق ہے۔ بعد ازاں امام شافعی کا قول واقدی کی شان میں مقاصد کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ واقدی کی کتابیں جھوٹی ہیں۔ اب مولوی صاحب انصاف فرمائیں کہ جب تاریخ آل عباس کا تو یہ حال ہو کہ علماء اہل سنت میں سے کوئی اسے جانتا ہی نہیں اور پھر ان کے راوی ایسے نور علی نور ”وزیرے چنناں شہر یارے جنیں“ تو پھر اہل سنت کی نگران روایات پر احماد کریں، اگر شیعوں کی طرح سنیوں کے دین کا جھوٹ پر دار و مدار ہوتا تو البتہ مضائقہ نہ تھا، سوائے کتابوں کا ناواقفان اہلسنت کے سامنے حوالہ دینا کمال بددیانتی اور دعا بازی اور بے حیائی کی بات ہے مائل فہم پر مثل آفتاب روشن ہے کہ یہ کتاب اگر ہے بھی تو کسی شیعہ عاباذ کی تصنیف ہے۔

عمار علی کی تاریخ دانی

پراس دعا کا حوصلہ مولوی صاحب کا تو معلوم نہیں ہوتا ہاں البتہ کسی پرانے اہلسنت کی کرکوت ہے ورنہ اس استعداد اور اس سلیقہ پر کہ مامون عباسی کے نام پر لفظ رشید بھی بڑھا دیا، یہ قنہ گری ممکن معلوم نہیں ہوتی کیونکہ عیب کرنے کو ہنر چاہیے۔

فلک کا منہ نہیں اس قنہ کے اٹھانے کا ستم گرا ایک تیرا ناز ہے سارے زمانے کا سبحان اللہ! مولوی صاحب کو اس تاجر اور اس علم و فضل پر کہ اب تک یہ بھی نہیں جانتے کہ لقب رشید ہارون تھا یا مامون تھا؟ دربارہ غصب فدک یہ یقین ہو گیا ہے کہ خدا کی وحدانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا شاید اب تک آپ کو اتنا یقین نہ ہو؟ اور تہائی میں سنیوں پر یہ جوش و خروش ہے کہ جامہ سے ہا ہر لٹکے جاتے ہیں۔

فدک فنی تھا موہوب و مملوک نہ تھا

کوئی مولوی صاحب کو تھامے تو ہم مولوی صاحب کو سارے مراتب سمجھا کر اتنا اور سمجھائیں گا کہ ہم ان سب مراتب سے درگزر کریں تو ہمیں ابھی اور بہت گنجائش باقی ہے کیونکہ اقول تو آیت ”مَا آتَاكَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ“ جو سورہ حشر میں واقع ہے اس بات پر شاہد ہے کہ قریہ فدک ہوا غیر، بالاتفاق از قسم فنی تھا، مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نہ تھا۔ چنانچہ ان شاء اللہ بحث میراث میں جو حدیث ”لَا نُورُثُ مَا تَرَكَنَا صَلَافًا“ سے متعلق ہے، معلوم ہو جائے گا۔ یہ بہ ہونے کی کون سی صورت ہے جو روایت ہے فدک کو صحیح سمجھئے؟ بلکہ اہل یقین لفظ ہوگی کیونکہ اس

صورت میں روایت یہ کلام اللہ کی مخالف ہوگی اور جو روایت کہ کلام اللہ کے مخالف ہو، وہ بالاجماع بالیقین لاط ہے۔ مع ہذا مشہور کتابوں میں جو تمام علماء کی دستمال رہتی ہیں اور اہتبار میں قریب قریب کلام اللہ کے ہیں، وہ روایتیں موجود ہیں کہ وہ فدک کے بہت نہ ہونے پر ایسی واضح دلائل دلا کر کرتی ہیں کہ مولوی صاحب نے جو روایتیں اپنے صحیفہ میں درج فرمائی ہیں، وہ فدک کے بہت ہونے پر اتنی دلائل نہیں کرتیں، سو ان روایتوں کی شہرت اور صحت اور صراحت دلائل کو چھوڑ کر ایسا کون نادان ہوگا کہ مولوی صاحب کے ان ہدیات پر کان لگائے گا اور سوائے مولوی صاحب کے ایسا کون ہے کہ ان افسانہ ہائے بے سند پر تکیہ جمائے گا، اگر ہمارے مولو ملاحظہ فرمائیے۔

فدک کے مختلف تاریخی دور

ملکوتہ شریف جو اشہر کتب الہیہ است ہے اس میں یہ روایت موجود ہے۔ ابو داؤد کی روایت سے حضرت مغیرہ کے واسطے سے بیان کرتے ہیں کہ جب عمر بن عبدالعزیز بن عمر بن مروان خلیفہ ہوئے تو انہوں نے مروانوں کو جمع کیا اور یہ کہا کہ:

”إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ لَهُ فِدْكَ لَكَانَ يُنْفِقُ مِنْهَا وَيَعُوذُ مِنْهَا عَلَى صَغِيرِ بَنِي هَاشِمٍ وَيُزَوِّجُ مِنْهَا أَبْنَهُمْ وَإِنَّ فَاطِمَةَ سَأَلَتْهُ أَنْ يَجْعَلَهَا لَهَا لَابَنِي لَكَانَتْ لِي خِيَاةَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى مَضَى بِسَبِيلِهِ فَلَمَّا أَنْ وَلِيَ أَبُو بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَمِلَ بِهَا بِمَا عَمِلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِي حَتَّى مَضَى بِسَبِيلِهِ فَلَمَّا أَنْ وَلِيَ عُمرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَمِلَ فِيهَا بِمَا عَمِلَ حَتَّى مَضَى بِسَبِيلِهِ ثُمَّ أَطْلَقَهَا مَرْوَانَ ثُمَّ صَارَتِ الْعُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ فَرَأَيْتُ أَمْرًا مَنَعَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاطِمَةَ لَيْسَ لِي بِحَقٍّ وَإِنِّي أَشْهَدُكُمْ أَنِّي رَدَدْتُهَا عَلَى مَا كَانَتْ، بَعَثَ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ“

”حاصل اس کا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فدک تھا۔ سو اس میں سے خرچ کیا کرتے تھے اور دیتے رہتے تھے۔ بنی ہاشم میں کے یتیموں کو اور بے شوہر عورتوں کے نکاح اس مال میں سے کرادیا کرتے تھے اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے یہ درخواست کی کہ فدک حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو محتات فرمائیں اور بہہ کر دیں، سو آپ علیہ السلام نے اس بات سے انکار فرمایا اور بدستور مذکور اسی طرح آپ اس میں سے تمام واپس خرچ مذکور بنا چکے رہے، یہاں تک کہ آپ اس عالم سے تشریف لے گئے، بعد میں جب حضرت ابو بکر خلیفہ ہوئے تو انہوں نے بھی جیتے جی

پی مل کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے یہاں تک کہ وہ بھی واصل تک ہوئے، پھر جب حضرت عمر واصل ہوئے تو وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سابق مل کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ بھی مل دیئے، پھر جب مروان کا (یعنی باپے وقت میں) کاہنہ ۳۷۸ میں اس نے اسے اپنی جاگیر کر لیا، پھر رفتہ رفتہ مجھ تک نوبت پہنچی اور یہ چیز میرے قبضہ میں آئی ہو میری رائے میں یوں آتا ہے کہ جو چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو نہ دی ہو مجھے سزاوار نہیں اور میں تمہیں گواہ کرتا ہوں کہ میں نے فدک کو اسی امتداد پر کر دیا جیسے صلہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں تھا۔

یہاں تک حاصل مطلب روایت تھا اب اول تو عرض یہ ہے کہ اس روایت میں جو بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذکر کے مروان کی جاگیر بتانے کا ذکر ہے تو مولوی صاحب یا کوئی ان کا مرگہ سمجھ کر یہ نہ سمجھ جائے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد متصل ہی فدک پر اس کا قبضہ و تصرف ہو گیا تھا بلکہ یہاں قصہ کو مختصر کر کے یوں کہہ دیا ہے کہ انجام کار مروان کے قبضہ و تصرف میں آ گیا ورنہ باتفاق اہل تواریخ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی بدستور سابق ہی رہا اور قصہ کے مختصر کرنے کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اول تو لفظ ”اقطعہا“ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ کام اس نے اپنی خلافت میں کیا۔ چنانچہ عربی دان جانتے ہیں کہ اقطاع کے معنی جاگیر کر دینے کے ہیں، سو جاگیر کر دینے کا اختیار بجز خلیفہ اور کسی کو نہیں ہوتا، دوسرے اگر قصہ مختصر نہ ہو تو یہ معنی ہوں کہ بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متصل ہی مروان کا قبضہ ہو گیا اور علی الاتصال قبضہ رہا اور پھر بعد اس کے متصل ہی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے قبضہ و تصرف میں آ گیا۔

سو اتفاقاً قین تاریخ پر روشن ہے کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں، بعد حضرت عمر کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے اختیار میں تھا اور ان کے بعد باتفاق شیعہ و سنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اختیار میں تھا، پھر جب کبھی مروان کا زمانہ ہوا تو البتہ اس نے اس کو اپنی جاگیر کر لیا، پھر اس کے مرنے کے بعد کئی خلیفہ ہوئے ان کے بعد کہیں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی نوبت آئی اور یہ قصہ کا مختصر کرنا کلام اللہ میں بیسیوں جگہ موجود ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت یوسف علیہم السلام کے قصہ کو ملاحظہ فرما دیکھیں۔ بہر حال قصہ مختصر یہ ہے ہا جماع الہیہ و تواریخ و علمائے حدیث ۴۱ بت اور تحقیق ہے کہ فدک وغیرہ متروکہ، نبوی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے قبضہ میں تھا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قبضہ رہا، حضرت

عباس کا دخل اٹھ گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسن، حضرت حسن کے بعد حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما، پھر امام زین العابدین اور حضرت حسن بن حسن رضی اللہ عنہما کا قبضہ رہا۔ اس کے بعد زید بن حسن برادر حسن بن حسن کا قبضہ رہا رضی اللہ عنہم اجمعین، یہاں تک تو اس کا جمع خرچ بدستور قدیم رہا، ان سب کے بعد مردان کے بیٹوں میں پھنس گیا، یہاں تک کہ نبوت حضرت عمر بن عبدالعزیز کی آئی، انہوں نے بہ سبب کمال عدل کے پھر بدستور قائم کر دیا۔

جب یہ گزارش ہو چکی تو اب یہ التماس ہے کہ مشکوٰۃ تو شہرہ آفاق ہی ہے۔ ابو داؤد، صحاح ستہ میں سے ہے تو جو روایت کہ ایسی کتابوں میں ہو اس کی صحت اور شہرت کو خیال کرنا چاہیے کہ کس قدر اور کس مرتبہ کی ہوگی۔ مع ہذا یہ روایت کتنی صاف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تادم واپسین فدک جناب سرور کائنات علیہ علی آلہ افضل الصلوٰۃ واکمل التحیات کے قبضہ میں رہا اور باوجود استدعاء حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فدک عنایت نہ فرمایا بلکہ جیسے حکیم حاردار بیمار سے ان چیزوں کے دینے سے انکار کیا کرتا ہے جو اس کو غفل کرے، ایسے ہی حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلاصۃ المل بیت سے فدک کے دینے سے جو مال دینا تھا انکار فرمایا۔ (اور کیونکر انکار نہ فرمائیں آیت ”إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا“ جس کا یہ حاصل ہے کہ ”اللہ کا ارادہ اے المل بیت یوں ہے کہ تم سے ناپاکی دور کر دے اور تم کو خوب پاک کر دے۔“ اس مال دنیا ہی کی طلب گاری کے مقدمہ میں نازل ہوئی)۔

ہبہ اور عطاء میں فرق

بہر حال یہ روایت فدک کے ہبہ نہ ہونے پر مثل آفتاب روشن دلالت کرتی ہے اور وہ روایت جو بزم عم شیعہ دستاویز ہبہ ہے، ہبہ کے ہونے پر مصراحتاً دلالت نہیں کرتی کیونکہ عربی کی روایت میں جس کا ترجمہ مولوی صاحب نے زیب رقم فرمایا ہے لفظ ”أَعْطَاهَا“ ہے سو یہ لفظ عام ہے ہبہ میں بھی بولا جاتا ہے اور عاریت میں بھی استعمال کرتے ہیں، سرمو تفاوت نہیں، دونوں موقع میں بلا تفاوت بولتے ہیں اور بڑی دلیل اس کے عموم کی یہ ہے کہ اعطاء کا ترجمہ ہندی زبان میں دینا ہے۔ سوسب جانتے ہیں کہ بسا اوقات عاریت کو کہا کرتے ہیں کہ فلا نے شخص کو دی ہے یا دے رکھی ہے۔

القصہ لفظ اعطاء سے ہبہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ سواب روایت مشکوٰۃ کو تو ایک طرف دھریئے اور اس روایت کو جو مولوی صاحب نے درج صحیفہ شریفہ فرمائی ہے، ایک طرف رکھئے اور پھر اس کی صحت اور شہرت اور مصراحت دلالت کو اس روایت کے ضعف اور اخفاء اور عدم دلالت مقصود سے موازنہ

فرمائیے اور پھر فرمائیے کہ کس طرف پہلے جھٹکتا ہے؟ سو اگر مولوی صاحب عقل کو کار فرمائیں گے تو یہک اس بات کو تسلیم فرمائیں گے کہ واقعی قابل اطمینان اور لائق اعتماد روایت منکھوۃ ہی ہے۔

اس روایت مندرجہ منکھوۃ سے صاف واضح ہو گیا کہ اگر بغرض محال روایت ہیہ فدک کتب مذکور میں ہو بھی اور یہ کتابیں بھی سب کی سب ایسے لوگوں کی تصنیف ہوں جو موصوف بشرائط اعتبار روایت اثنی صدق و صلاح و فہم و فراست و حفظ و دیانت ہوں اور پھر اس کے بعد اعطاء سے مراد بھی ہیہ ہی ہو تو ہمیشہ برین نیست کہ ان کتب کے مصنفوں نے یہ کتابیں بطور بیاض کے اکٹھی کر لی تھیں اور رطب و یابس غلط صحیح سب ان میں جمع کر لیا تھا، تاکہ بعد ان فراغ جمع نظر ثانی کر کے تخصیص کریں گے۔ چنانچہ سب مصنفین کرتے ہیں لیکن اتفاقات تقدیر سے ان کی عمر نے وفات کی یا فرصت نہ ملی۔ سو اس لیے بہت سی روایتیں شیعہوں کی بنائی ہوئی ان کی کتب میں درج ہو گئیں اور کم فہم اپنی غلطی فہم سے ان روایات کو اکابر محدثین کی تصنیفات میں دیکھ کر بچل گئے۔

اہل شیعہ کی مستندات رطب و یابس سے زیادہ نہیں

چنانچہ شاہد اس کا موجود ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب جو عمدۃ المحدثین اور زبدۃ المورخین ہیں، تحفہ میں رقم فرماتے ہیں کہ ”صاحب جامع الاصول نے نقل کیا ہے کہ خطیب نے جو متاخرین محدثین اہلسنت سے ہے، شریف مرتضیٰ سے جو اہل علمائے شیعہ میں سے ہے اور علامہ رضی شیعہ مذہب کا بھائی ہے، شیعہوں کی حدیثیں اسی غرض سے نقل کیں کہ بعد جمع و تالیف کے ان میں نظر کرے کہ ان کی کچھ اصل بھی ہے کہ نہیں اور اس سے اول شاہ صاحب عمدۃ المحدثین شاہ عبدالعزیز صاحب ہی رقم فرماتے ہیں کہ جو محدثین کہ فرقہ اہلسنت میں آخر میں پیدا ہوئے ہیں، انہوں نے جو دیکھا کہ پہلے محدث روایات صحیحہ اور حسنہ کو تو خوب ضبط کر گئے ہیں اور ان میں سعی کی گنجائش نہیں تو وہ ایسی حدیثوں کی طرف جن کی سندیں ضعیف ہیں یا وہ جھوٹی بنائی ہوئی ہیں یا غلطی سے کسی حدیث کی سند کسی متن کے ساتھ لگ گئی ہے، ایسے متوجہ ہوئے تاکہ سب کو بطور بیاض کے ایک جا فراہم کر کے نظر ثانی کریں اور موضوعات کو حساس وغیرہا سے جدا کر دیں لیکن بسبب کوتاہی عمر اور قلت فرصت کے یہ مہم ان سے تمام نہ ہو سکی مگر جو محدث کہ ان کے بھی بعد پیدا ہوئے، انہوں نے ان کی بیاضوں کی حدیثوں میں باہم امتیاز کر دیا۔ چنانچہ ابن جوزی نے جس کا حوالہ مولوی صاحب بھی اپنے رقیبہ میں رقم فرماتے ہیں موضوعات کو جدا کر دیا اور اس کے مقابل میں حسان لغیرہا کو مقاصد حسنہ میں جدا لکھ دیا اور ایسے ہی سیوطی نے تفسیر درمنثور میں کیا اور خود ان محدثوں نے اپنی کتابوں کے مقدمہ میں جو بطور بیاض کے ہیں، اس غرض کو کھول کر لکھ دیا ہے۔ اچھے“

اہلسنت نے جو روایات بغرض تردید نقل کی ہیں شیعہ ان کو سند بناتے ہیں اس نقل سے ہر کس و ناکس سمجھ جائے گا کہ جن کتب کا حوالہ مولوی صاحب نے اپنے خط میں درج کیا ہے وہ اکثر ایسی ہیں کہ ایسی ایسی روایتوں کے رد کرنے اور حقیقت حال کے تلاش کے واسطے جمع کی گئی تھیں جن روایتوں کو مولوی عمار علی صاحب اور ان کے پیشوا گاتے پھرتے ہیں لیکن اتفاقات سے ان کے مصنفوں کو اجل نے آدھایا اور بعض ایسی کتابیں ہیں، جیسے تفسیر دُر مشور اور کتاب ابن جوزی کہ ان میں اگر ایسی روایتیں ہیں بھی جن سے شیعہ تمسک کرتے ہیں تو وہ اس طور پر ہیں جیسے تحفہ اور منہی الکلام اور صواق وغیرہ میں بہہ فذک کی روایت مندرج ہے تو ایسا کون ہے جو یہ نہیں جانتا کہ تحفہ میں اس روایت کو لکھ کر یہ لکھ دیا ہے کہ یہ روایت بتائی ہوئی ہے۔ سو مولوی عمار علی صاحب بڑے چوٹے کہ تحفہ اثنا عشریہ اور منہی الکلام وغیرہ تعنیفات مولانا خیر علی کا نام نہیں لکھا، اس میں دو قاعدے تھے ایک تو کتابوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی جس سے ہر کس کے ایک دفعہ کو کان کھڑے ہو جاتے، دوسرے عوام اور جہال اہل سنت شاہ عبدالعزیز اور مولوی حیدر علی صاحب کو جس قدر جانتے ہیں۔ اتنا حقد میں کو نہیں جانتے اور پھر اس پر یہ مشہور ہے کہ ان دونوں صاحبوں نے رد نفی پر کمر چست باندھ رکھی ہے۔ سو اگر ان صاحبوں کا نام بھی ہوتا تو چنداں جھوٹ بھی نہ تھا اور عوام کو ایک بار تو یہ وہم ہو ہی جاتا کہ جب شاہ عبدالعزیز صاحب نے باوجود شہرہ علم و فضل و جعفر بن حدیث و بایں ہمہ صرف ہمت در بارہ رد و انفیض اس روایت کو اپنی کتاب میں درج کر دیا تو ہونہو یہ روایت صحیح ہی ہوگی مگر شاید یہ اندیشہ ہوا ہو کہ یہ کتابیں فارسی زبان میں اور پھر کثیر الوجود اور فارسی خوان بکثرت مبادا قلعی کھل جائے۔

بہر حال زوف ہے اس دینداری پر اور اس پر ہیز گاری پر، اگر شیوہ دعا بازی اختیار ہی کرنا تھا تو اس کے لیے بھی دنیا جف تھی۔ دین کو کیوں بٹھ لگایا اور دین احمدی کو خراب کرنے کا ارادہ کیا لیکن پھر بھی خیر گزری کہ آپ نے سینوں کے دعا دینے کا ارادہ کیا جو ایسے ایسوں کو لا حول میں اڑا دیتے ہیں اور ایسے ویسے دام میں نہیں آتے لیکن شیعوں کی خیر نظر نہیں آتی کیونکہ جب ان کے ایسے مقدمہ کا یہ دماغ چلا ہے کہ یہ تیز باقی نہیں رہی کہ فلائی زوایت فلائی کتاب میں کس غرض سے بیان کی ہے؟ آیا بطور رد کے یا بطور اعتبار کے اور اعتماد کے تو لا جرم عنقریب ہی مولوی صاحب اس بات کو تشہد کریں کہ معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خداوند کریم ساحر اور مجنون اور کاہن اور مفتری فرماتا ہے اور پھر شیعوں کی اندھی عقل سے یقین ہے کہ اس کو تسلیم کر جائیں اور یہ نہ سمجھیں

کہ کلام اللہ میں کفار کا قول منقول ہے اور وہ بھی ہاں فرض کہ ان کے قول کو رد فرماتے ہیں، بہر حال مولوی صاحب کی یہ چالاکیاں دیکھ کر مجاہد دینی اور دیندارانہ یعنی کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ ان مکاریوں پر نہ جائیں۔ ایسے ہی دجالوں نے دین میں رخنہ ڈالا ہے، اس علم کے پردہ میں انہوں نے جالوں کے نام کو بھی عیب لگایا، عالم تو درکنار۔

در منشور کے حوالہ کی حقیقت

اب آگے عرض یہ ہے کہ مجملہ تو اس روایت کا ہونا نہ ہونا بہ نسبت سب کتابوں کے معلوم ہو گیا لیکن اگر مفصل بھی کچھ بیان کیا جائے تو اور اچھا ہے اس لیے ایک دو کتابوں کو بالخصوص ذکر کر کے ان میں اس روایت کا ہونا نہ ہونا بیان کرتا ہوں تاکہ موافق مثل مشہور ”میں نمونہ خوارے“ مولوی صاحب کے سب جوابوں کا حال معلوم ہو جائے مگر چونکہ ان سب کتابوں میں سے تفسیر در منشور کا حوالہ عوام تو عوام بعض علماء سادہ لوح کو بھی شاید مترد کر دے کیونکہ مصنف شیخ جلال الدین سیوطی خاتم المحدثین اور خلاصۃ المفسرین ہیں اور بسبب کثرت تصانیف اور رواج جلالین وغیرہ کے ان کا نام شہرہ آفاق ہو گیا ہے تو اس لیے میں بھی انہی کی کتابوں کی نسبت اس روایت کے ہونے نہ ہونے کی تحقیق کرتا ہوں، سو اس لیے گوش گزار اہل انصاف ہوں کہ تفسیر در منشور میں اس روایت کے ہونے کا کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ وہ موضوعات وغیرہ اسی کے امتیاز کے لیے تصنیف ہوئی ہے۔ سو اس میں یہ کیا اور بہت سی موضوع روایتیں ہیں لیکن موقع سند میں اس کا نام لینا مولوی صاحب کی کمال حیا اور خوبی ذہن و ذکا پر دلالت کرتا ہے۔ سو اگر یہی استدلال ہیں تو کل کو کہنے لگیں گے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں کیونکہ کلام اللہ میں موجود ہے۔

جلالین اور اتقان میں ذالقرنیٰ اور حقہ کی تفسیر

اور اگر بیجہ کیا بی در منشور اس بات کی تسلیم میں تامل ہو تو جلالین اور اتقان تو کثیر الوجود ہیں یہاں تک کہ دونوں چھپ گئی ہیں۔ خصوصاً جلالین کہ تفسیروں میں میزان الصرف کا حکم رکھتی ہے بلکہ تفسیر کی بسم اللہ کہئے۔ سو اس میں ملاحظہ فرمادیکھیں کہ آیت ”وَآبَ ذَ الْقُرْنٰی“ کی تفسیر میں ذالقرنیٰ اور حقہ کی کیا تفسیر کی ہے، اگر ان کے نزدیک روایت متنازع فیہا مستبر اور صحیح ہوتی تو ازل تو مع حوالہ اس حوالہ کو لکھتے نہیں تو اختصار ہی کرتے تب بھی اس میں کیا دربلغ تھا کہ ذالقرنیٰ کے بعد حضرت فاطمہ ہرا رضی اللہ عنہا کا نام اور حقہ کے بعد لفظ فدک لکھ جاتے؟ حالانکہ اور جالیساں کیا کہ جو تفسیر کسی لفظ کی کسی

صحیح حدیث سے ثابت ہوئی ہے وہی حمید لکھدی ہے بلکہ حدیثوں کے حوالے تک لکھ دیے ہیں۔

مع ہذا اتفاق کے مضامین سے صاف واضح ہوتا ہے کہ یہ روایت جھوٹی بنائی ہوئی ہے کیونکہ اس میں اول ہی نوع میں اسانید متعددہ سے کہ جن میں سے بعضی سندوں کو اپنے آپ حمید لکھتے ہیں۔ سورہ روم اور سورہ بنی اسرائیل کا کئی ہونا مرقوم ہے اور پھر بعد اس کے سورہ قرآنی کی تفصیل کی ہے کہ فلانی فلانی سورتوں میں اختلاف ہے کہ کئی ہے یا مدنی؟ اور فلانی فلانی میں اتفاق ہے کہ یہ کئی ہے یا مدنی؟ اور پھر اس پر سورہ روم اور سورہ بنی اسرائیل کو ان میں داخل رکھا ہے جو باتفاق کئی ہیں، کسی ایک تخلص کو بھی اس کے کئی ہونے میں خلاف نہیں اور اسی اثناء میں یہ بھی تحقیق کی ہے کہ فلانی سورہ اگر کئی ہے تو اس میں فلانی فلانی آیت مدنی ہے، پر ان دونوں سورتوں میں سے کسی آیت کو استثناء نہیں کیا اور اس بات کی سند بھی وہی سند ہے جس کو وہ حمید لکھتے ہیں اور اگر بعض علماء کے اقوال کے موافق ان دونوں سورتوں میں سے کسی آیت کا استثناء کیا بھی ہے تو اور ہی آیتوں کا استثناء کیا ہے، پر اس آیت کو کسی نے یوں نہیں کہا کہ یہ مدنی ہے۔ الغرض اتفاق کی عبارات با واز بلند یوں کہتی ہے کہ یہ دونوں سورتیں خاص کر یہ دونوں آیتیں باتفاق المل ملت کئی ہیں اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ شیعہ بھی اس بات میں سنیوں کے موافق ہیں۔ چنانچہ طبری صاحب مجمع البیان کا قول پہلے مرقوم ہو چکا ہے کہ سورہ روم سوا۔ آیت ”لصبحان اللہ“ کے سب کئی ہے۔ الغرض اول تو اتفاق کی اس تحقیق سے محقق ہو گیا کہ آیت ”آبِ ذَا الْقُرْبَى“ مکہ ہی میں نازل ہو چکی تھی تو اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال و جواب میں حضرت جبریل علیہ السلام کا یوں کہنا کہ ذالقرنی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں، ان کا حق فدک ہے، ہرگز درست نہیں ہو سکتا اور ایسا جواب نامعقول حضرت جبریل علیہ السلام سے نہیں ہو سکتا، ہاں اگر حضرت جبریل علیہ السلام شیعہ مذہب ہوتے تو البتہ کم فہمی کا احتمال ہو سکتا تھا۔

سیوطی نے اس روایت کو موضوع سمجھ کر نقل نہیں کیا

دوسرے انہتر (۶۹) ویں نوع میں جو دربارہ معرفت شروط مفسر ہے۔ فصل اختلاف تفسیر میں یوں رقم فرماتے ہیں کہ ایسی تفسیریں جن کی سند صحیح ہو بہت کم ہیں اور پھر اس میں بھی ایسی جن کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی اور بھی کم ہیں اور پھر وعدہ کیا کہ میں ان سب کو برابر ترتیب وار بیان کروں گا۔ چنانچہ موافق اپنے وعدہ کے ہر ترتیب سورہ قرآنی ان تفاسیر کو مع بیان ماخذ بیان کیا اور اس پر نہ سورہ بنی اسرائیل میں اس روایت متنازع فیہا کو بیان کیا اور نہ سورہ روم میں جس کی آیت کو شیعہ دستاویز بہ فدک سمجھتے ہیں بلکہ ”وَالنَّاسُ“ کے متعلق کی جو روایت تھی اس کو لکھ کر آخر

میں یہ لکھا کہ یہ ہے جو کچھ مجھے معلوم ہے اور حاضر ہے تفاسیر مرفوعہ میں سے جن کے مرفوع ہونے پر لوگوں نے تصریح کی ہے۔ خواہ وہ صحیح ہیں، خواہ حسن ہیں، خواہ ضعیف..... خواہ مرسل خواہ معطل لیکن موضوعات اور باطلیل کو میں نے نہیں لیا۔

اب عرض یہ ہے کہ اس وعدہ اور وعدہ کے قرینہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ حودایت لکھی ہے وہ سمجھ کر لکھی ہے اور جو باوجود معلوم ہونے کے چھوڑ دی ہے وہ سمجھ کر چھوڑ دی، بھولے چوکے نہیں چھوڑی۔ سو یہ روایت متنازعہ فیہا جو نہیں لکھی تو دیدہ و دانستہ نہیں لکھی اس کو موضوعات اور باطلیل میں سے سمجھا ہوگا جو نہیں لکھا ورنہ اس کتاب میں ضعیف اور مرسل اور معطل تک نہیں چھوڑا تو اس سے معلوم ہوا کہ اہل سنت کی کتابوں میں کسی ضعیف طریق اور ضعیف روایت سے یہ بھی نہیں ثابت ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد نزول آیت مذکورہ کے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو فدک بہہ کیا ہے جو روایت اس بات پر دلالت کرے وہ لاریب موضوع ہے بلکہ صحیح بھی ہے کہ فدک تامہ واپس جناب پاک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبض و تصرف میں تھا۔ چنانچہ روایت صحیح اس مضمون کی گزر چکی۔

فدک کے معاملہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رویہ

اس روایت کے بطلان کی بڑی دلیل ہے

اور قطع نظر قوت سند اس روایت کی بڑی دلیل اس کی صحت کی (اور دلیل بھی کون سی جس کو شیعہ بھی مان جائیں) یہ ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی موافق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے فدک میں عمل کیا اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے وارثوں پر اس کو تقسیم نہ کیا بلکہ بدستور قدیم فقراء اور مساکین اور ابن سبیل میں تقسیم کرتے رہے، اگر اپنا حصہ خدا کی راہ میں دیا تھا تو سب وارثوں کو کیوں محروم رکھا؟ اور یہ بات شیعوں کے نزدیک بھی مسلم ہے۔ اسی واسطے اس کے چار جواب دیتے ہیں، ان چاروں جوابوں کو مع ان کی تردید کے پیش نظر کرتا ہوں تاکہ خوش فہمی اور انصاف پرستی علماء شیعہ ہر کس و ناکس پر آشکارا ہو جائے۔

اہل شیعہ کی طرف سے حضرت علی کے رویہ کی پہلی تاویل

اول تو یہ ہے کہ اہل بیت رضی اللہ عنہم غصب کی ہوئی چیز کو نہیں لیا کرتے، چنانچہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر کو جو بعد ہجرت کے کفار نے دہالیا تھا کفار سے نہ لیا، یہ اسی قسم کا جواب ہے۔ جیسا مثل مشہور ہے کہ مرد کے ہاتھ چلیں اور نامرد کی زبان چلے۔

میں یہ لکھا کہ یہ ہے جو کچھ مجھے معلوم ہے اور حاضر ہے تفاسیر مرفوعہ میں سے جن کے مرفوع ہونے پر لوگوں نے تصریح کی ہے۔ خواہ وہ صحیح ہیں، خواہ حسن ہیں، خواہ ضعیف..... خواہ مرسل خواہ معطل لیکن موضوعات اور اہاطیل کو میں نے نہیں لیا۔

اب عرض یہ ہے کہ اس وعدہ اور وعدہ کے قرینہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جو روایت لکھی ہے وہ سمجھ کر لکھی ہے اور جو باوجود معلوم ہونے کے چھوڑ دی ہے وہ سمجھ کر چھوڑ دی، بھولے چوکے نہیں چھوڑ دی۔ سو یہ روایت متنازعہ فیہا جو نہیں لکھی تو دیدہ و دانستہ نہیں لکھی۔ اس کو موضوعات اور اہاطیل میں سے سمجھا ہوگا جو نہیں لکھا اور نہ اس کتاب میں ضعیف اور مرسل اور معطل تک نہیں چھوڑا تو اس سے معلوم ہوا کہ اہل سنت کی کتابوں میں کسی ضعیف طریق اور ضعیف روایت سے یہ بھی نہیں ثابت ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد نزول آیت مذکورہ کے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو فدک ہمہ کیا ہے جو روایت اس بات پر دلالت کرے وہ لاریب موضوع ہے بلکہ صحیح بھی ہے کہ فدک تادم واپس جناب پاک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبض و تصرف میں تھا۔ چنانچہ روایت صحیح اس مضمون کی گزر چکی۔

فدک کے معاملہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رویہ

اس روایت کے بطلان کی بڑی دلیل ہے

اور قطع نظر قوت سند اس روایت کی بڑی دلیل اس کی صحت کی (اور دلیل بھی کون سی جس کو شیعہ بھی مان جائیں) یہ ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی موافق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے فدک میں عمل کیا اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے وارثوں پر اس کو تقسیم نہ کیا بلکہ بدستور قدیم فقراء اور مساکین اور ابن سبیل میں تقسیم کرتے رہے، اگر اپنا حصہ خدا کی راہ میں دیا تھا تو سب وارثوں کو کیوں محروم رکھا؟ اور یہ بات شیعوں کے نزدیک بھی مسلم ہے۔ اسی واسطے اس کے چار جواب دیتے ہیں، ان چاروں جوابوں کو مع ان کی تردید کے پیش نظر کرنا ہوں تاکہ خوش فہمی اور انصاف پرستی علماء شیعہ ہر کس و ناکس پر آشکارا ہو جائے۔

اہل شیعہ کی طرف سے حضرت علی کے رویہ کی پہلی تاویل

اول تو یہ ہے کہ اہل بیت رضی اللہ عنہم غصب کی ہوئی چیز کو نہیں لیا کرتے، چنانچہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر کو جو بعد ہجرت کے کفار نے دہا لیا تھا کفار سے نہ لیا، یہ اسی قسم کا جواب ہے۔ جیسا مثل مشہور ہے کہ مرد کے ہاتھ چلیں اور نامرد کی زبان چلے۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے نہ لینے کو اسی پر محمول کیا ہے ورنہ اگر گھر کے نہ لینے کی یہ وجہ ہو کہ اہل بیت شیعہ مضموب کو نہیں لیا کرتے، جیسے شیعہ فرماتے ہیں تو یہ تو بھہادت مولوی عمار علی بلکہ بھہادت عام اسلاف شیعہ غلط ہے کیونکہ مولوی عمار علی صاحب اپنے رقیہ کریمہ میں رقم فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں بھی حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے دعویٰ فدک کا کیا۔ سو اگر شیعہ مضموب اہل بیت نہیں لیا کرتے تھے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کس لیے یہ دعویٰ کیا تھا؟

اور اگر یوں کہئے کہ ان دونوں خلافتوں میں دعویٰ کیا، سنیوں کی روایتوں کے حوالے سے بیان کیا ہے، ان کو اس سے الزام نہیں دیا جاسکتا تو یہ شیعوں کے نزدیک بھی مسلم ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فدک غصب کر لیا اور زہرا کا دعویٰ ہیہ نہ سنا تو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے میراث کا دعویٰ کیا۔

از روئے قواعد شیعہ سیدہ رضی اللہ عنہا کا مطالبہ فدک غلط تھا

سو اگر اہل بیت نبوی رضی اللہ عنہم شیعہ مضموب کو نہیں لیا کرتے تو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے پھر کیوں فدک طلب کی؟ اور اگر عقلاء شیعہ سنیوں کی ضد میں عقل و انصاف کو طاق میں دھر کر یوں فرمانے لگیں کہ یہ دونوں دعویٰ اگرچہ بصورت دو ہیں لیکن چونکہ متصل بلا فصل واقع ہوئے ہیں ہم ایک ہی دعویٰ اسے قرار دیتے ہیں۔ سو بعد گفت و شنود کے ختم ہو جانے کے غصب حقیق ہو اور پہلے غصب تھا ہی نہیں، جو کچھ خرابی لازم آدے۔

تو اس کا جواب تو یہ ہے کہ یہ ہمارا احسان ہے کہ ہم ایسا بے فہمروں میں درگزر کر جاتے ہیں ورنہ اسی بات سے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا فدک مضموب کی نسبت دعویٰ کرنا ثابت کیا؟ محل آفتاب روشن ہے لیکن چونکہ علماء شیعہ خصوصاً مولوی عمار علی صاحب کی عقل کی رسائی معلوم ہے اس لیے اس بات سے چشم پوشی کر کے ہم اور جواب دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہی فدک عمر بن عبدالمعز کے وقت میں حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ نے لیا اور وہ انہیں کے ہاتھ میں رہا۔ پھر خلفاء عباسیہ اس پر متصرف ہو گئے۔ یہاں تک کہ سن دو سو بیس میں مامون عباسی نے اپنے عامل حم بن جعفر کو لکھا کہ فدک حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی اولاد کے حوالے کر دے۔ سو اس وقت امام علی رضی اللہ عنہ نے لیا، پھر متوکل عباسی اس پر متصرف ہو گیا۔ بعد ازاں معتضد نے پھر ہٹا دیا۔ چنانچہ یہ سب قصہ مفصل قاضی نور اللہ نے مجالس المؤمنین میں لکھا ہے مگر کوئی سنی لکھتا تو شیعوں کے نزدیک اعتبار کے قابل بھی نہ ہوتا۔

قواعد شیعہ کی رو سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خلافت قبول کرنا بھی درست نہ تھا اور اس کو بھی جانے دیجئے۔ مجالس المؤمنین کا حال تو پڑھے لکھے یا صحبت یافتہ علماء جانتے ہوں گے یہ تو سب جانتے ہیں کہ حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ نے بعد شہادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلافت منصوبہ قبول کی اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ یزید پلید سے خلافت منصوبہ کے طالب ہوئے، یہاں تک کہ نوبت شہادت کی پہنچی اور اگر ان امور میں سے ایک بھی ظہور میں نہ آتا تو شے منصوبہ کے لینے کے جواز میں اور دلانے کے وجوب میں عقلائے ابوالباب کے نزدیک پھر بھی کچھ تامل نہ تھا کیونکہ سابق میں تحقق ہو چکا ہے کہ آیت ”وَأَبِ ذَا الْقُرْبَىٰ“ میں گو مخاطب خاص ہے لیکن خطاب عام ہی ہو۔ اگر ”ذَا الْقُرْبَىٰ“ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قرائع مراد ہوں تو ان کے حق کا دلائل مناسب کے ذمہ واجب ہو۔

اور نیز وجوب عدل و انصاف کی فرضیت سے کلام اللہ بھرا ہوا ہے اور عدل و انصاف اسے ہی کہتے ہیں کہ ال حق کے حقوق دلائے جائیں۔ سو بعد غصب کے اگر مالک کا حق باقی رہتا ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذمہ فدک کا حضرت زہرا کے وارثوں کو پہنچانا فرض تھا اور اگر بعد غصب ال بیت کا حق ساقط ہو گیا تو اس میں اور غموں کیا فرق ہے؟ جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے باب میں یہ زبان درازیاں ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رویہ کی دوسری تاویل

دوسرا جواب علمائے شیعہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فدک میں تصرف مالکانہ نہ کرنے کا اس طرح دیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا اقتداء کیا۔ یعنی جیسے انہوں نے فدک سے کچھ انتفاع نہیں اٹھایا، اس جواب پر تو مناسب یوں ہے کہ علمائے شیعہ کے قربان ہو جائیے۔ سبحان اللہ کیا فہم کی رسائی ہے۔ خیر ہمیدہ لوگوں کے لیے تو اس جواب کی تردید کی کچھ ضرورت نہیں کیونکہ عقل خود اس جواب کے مضمون کو ایسے اُگلتی ہے جیسے کھسی کو معدہ۔

تاویل کا جواب

لیکن چونکہ سب ایک قسم کے نہیں ہوتے تو اس لیے یہ گزارش ہے کہ جن اماموں نے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہا قرار سرگرد و شیعہ قاضی نور اللہ فدک کو لیا، چنانچہ ابھی مذکور ہوا ہے۔ انہوں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بلکہ حضرت امیر کا بھی کس لیے اقتداء نہ کیا؟ اور نیز یہ اقتداء

فرض تھا یا لعل؟ اگر فرض تھا تو اور اماموں نے کیوں نہ کیا؟ اور اگر لعل تھا تو اول تو آئینہ بیت سے ایسی سلت معمول بہا حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما بلکہ معمول بہا حسنین اور معمول بہا حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہما کا ترک کرنا مستبعد ہے اور معمول بہا ہونا حسنین اور امام زین العابدین رضی اللہ عنہما کا خود ظاہر ہے کیونکہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا جیسے بنا چاری فدک سے منقطع نہ ہوئی تھیں، ایسے ہی یہ بزرگوار بھی بنا چاری منقطع نہ ہو سکے، دوسرے حضرت امیر المؤمنین نے اس لعل کے واسطے حق داروں کے حق پہنچانے کو جو ان کے ذمہ فرض تھا کیوں ترک کیا؟

اقتداء کن افعال میں ہوتا ہے؟

اور نیز کسی کا اقتداء احتمال اظہار یہ میں ہوا کرتا ہے۔ افعال خطراریہ میں کوئی کسی کا اقتداء نہیں کیا کرتا ورنہ لازم آئے کہ حضرت امام مہدی حضرت آئمہ مہیین کا اقتداء تقیہ میں جو بھجنا چاری وہ کیا کرتے تھے کریں اور ایسے ہی حضرت امام حسین تقیہ میں اتباع حضرت امیر کرتے، سوا اگر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کسی کے ظلم و ستم کے باعث فدک سے منقطع نہ ہو سکیں تو ناچار تھیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے وقت خلافت میں اس مظلومیت کے اقتداء کے کیا معنی؟ ہاں ہمارے حضرت امیر کو حضرت زہرا کا اقتداء ہی کرنا تھا، اپنے حصہ میں کیا ہوتا۔ حضرات حسنین اور ان کی بہنوں کو کیوں محرم الحرام اٹھ کر دیا۔

اہل شیعہ کی تیسری تاویل

تیسرا جواب جو شیعوں نے اعتراض معلوم کا دیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت امیر اس لیے فدک سے منقطع نہ ہوئے تاکہ لوگوں کو تحقیق ہو جائے کہ حضرت امیر کی گواہی دربارہ ہبہ فدک "حبۃ للہ" تھی اپنے نفع کی امید پر نہ تھی۔

تاویلی کا جواب

یہ جواب بھی مثل جواب ہائے سابق سر تا پا خلل ہے، اول تو جو لوگ اس مقدمہ میں حضرت امیر کی طرف سے گمان فاسد رکھتے ہیں، وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے حضرت امیر کی گواہی کو قبول نہ کیا، سو وہ لوگ پہلے ہی اس جہان سے چل دیئے تھے، ان کی خلافت میں ان میں سے کون تھا جو اس کے جتلانے کے لیے آپ نے فدک نہ لیا؟ اور اگر مردوں کا جتلانا نہ نظر تھا تو اول تو ان کو اطلاع نہیں ہو سکتی، دوسرے اپنے مرنے کے بعد ان کو خود حضرت امیر کی حقانیت اور اپنا ظالم ہونا معلوم ہو گیا ہوگا۔ سو یہ نہ لیتا ہوں ہی رائیگاں گیا، بے وجہ حضرت امیر نے مال حلال کو ہاتھ سے کھویا، نہ نفع دین نہ نفع دینا۔

اور اگر یوں کہئے کہ خلفاء ثلاثہ مر گئے تھے تو کیا ہوا، ان کے معتقد اور نو اصحاب تو موجود تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یوں تو یہ احتمال پھر بھی باقی رہا۔ جب آپ کی بعض اولاد نے لیا۔ خصوصاً مامون کے زمانہ میں کہ وہ مائل بہ تشیع تھا اور فدک کو حق الملکیت ہی سمجھ کر حضرت امام علی رضا کے حوالہ کیا، جب بھی آخر نو اصحاب کو یہ شبہ پیدا ہوا ہوگا کہ حضرت امیر کی گواہی اس پیش بندی کے لیے تھی بلکہ بیشتر اولاد ہی کے لیے ایسی ایسی تدبیریں دور دراز کیا کرتے ہیں۔ سو نو اصحاب بحکم المراء بقیس علی نفسہ کے بالضرور یہ سمجھے ہوں گے کہ حضرت امیر کی گواہی فقط اس لیے تھی کہ اگر یہ تیر ہمارے زمانہ میں نشانہ پر نہ میٹھا، تو کبھی نہ کبھی تو کارگر ہو گا ہی، سو اگر یہی رفع تہمت مد نظر تھا تو لازم تھا کہ اپنی اولاد کو وصیت کر جاتے کہ ہرگز اس مال کو نہ لیجیو، نہیں تو میری شہادت میں خلل آ جائے گا۔

اہل شیعہ کی چوتھی تاویل

چوتھا جواب شیعوں کی طرف سے یہ ہے کہ یہ سب پرہیزگاری اور فدک سے دست برداری تقیہ کی وجہ سے تھی۔ القصہ شیعہ لاچار ہو کر پہیوں پر آ گئے لیکن ”دروغ گورا حافظہ باشد“ علما نے شیعہ کو اس جواب کے وقت یہ یاد نہ رہا کہ سب آدمیوں کا مذہب تقیہ میں یہ ہے کہ جب امام جہاد کے لیے تیار ہو اور قتل و قتال میں مشغول ہو تو پھر اس پر تقیہ حرام ہو جاتا ہے۔ اس لیے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے ہرگز تقیہ نہ کیا۔ سو اگر حضرت امیر اپنی خلافت کے زمانہ میں تقیہ کرتے تو اور اُلٹے مرکب فعل حرام کے ہوتے، نعوذ باللہ اس جواب والوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وہی حل کردی ہے جیسے کہا کرتے ہیں ”یکے نقصان مایہ دیگر ثنات مسایہ“ مال کا مال گیا و بال گناہ پہلہ بندھا، خدا نادانوں سے باہنہ اندالے، کسی نے سچ کہا ”دشمن دانا بہتر از نادان دوست“

تاویل کا جواب

مع ہذا اگر تقیہ خلفائے ثلاثہ سے تھا تو وہ خود پہلے ہی اس جہان سے چل دیئے تھے اور مردوں سے تو نامردوں کو بھی اندیشہ نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ علی شیر خدا رضی اللہ عنہ یا باقی ماعدوں سے؟ سو وہ یا تو آپ کے لشکر ہی تھے اور شیعہ قلع یا منجملہ رعیت، سوریت میں سے ایسے امور میں اگر اندیشہ ہوتا ہے تو ان سے ہوتا ہے جن کی آمدنی کم ہو جاتی ہے۔ سو یہاں وہ فقراء اور مساکین اور ابن سبیل تھے، ان سے ڈرنا بھی ہم وزن خوف مُردگان ہے۔ سوائے ان کے اور کسی کی بلا کو کیا غرض تھی کہ فدک کے سبب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابل ہو کر اپنی جان کو خطرہ میں ڈالتا؟

اور اگر بفرض محال یہ صورت ظہور ہی پکڑتی تو اوّل تو حضرت امیر کے برابر کسی میں زور اور مل اور شجاعت اور لشکر نہ تھا، اگر کچھ گمان ہو بھی تو امیر معاویہ یا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف ہوتا ہے۔ سوانہوں نے اب کون سی کمی کی؟ دوسرے ایسے مفندے، بجز اس کے کہ رعیت بادشاہ کے مقابلہ پر مجتمع ہو جائے..... تصور میں نہیں آتے۔ حضرت ابوبکر صدیق جب خلیفہ ہوئے تو ربح حکم اسلام سواء ملک عرب اور کچھ نہ تھا، سودہ بھی ہجر دو فات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب کے سب منحرف ہو گئے۔ چنانچہ مختصر اس کا بیان ہو چکا ہے۔

لیکن ابوبکر صدیق بایں ہمہ تنہائی کہ سوائے سکان مکہ و مدینہ اور کوئی ان کا یا ر اور مددگار نہ تھا اور لشکر عظیم حضرت اُسامہ کے ساتھ بنی حسان کی طرف بھیج چکے تھے، ہرگز نہ ڈرے اور ماخنین زکوٰۃ کی نسبت باوجود یہ کہ اکثر صحابہ بسبب قلت اعموان و انصار کے ان پر جہاد کرنے سے امدیشہ مند تھے۔ یوں فرمایا کہ واللہ! اگر وہ ایک رسی بھی جو خدا کی راہ میں دیا کرتے تھے نہ دیں گے تو میں ان سے جہاد کروں گا بلکہ یوں بھی کہا کہ اگر اور کوئی نہ جائے گا تو میں تنہا جاؤں گا۔

خلیفہ چہارم کے پاس خلیفہ اوّل کی نسبت اعموان و انصار کی کثرت

جب ابوبکر باوجود اس بے سرو سامانی اور کثرت اعداء کے ایسی ناچیز چیزوں پر تنہا جہاد کرنے کو تیار ہو جائیں تو حضرت امیر تو اشیع الناس تھے اور لشکر کثیر جس میں سے اکثر وہ لوگ جنہوں نے ایک بنی بنائی خلافت کو درہم برہم کر دیا، ان کے ہمراہ اور جس مال پر تکرار وہ مالیت فراوان اور حق بھی ایسے مظلوموں کا کہ ان پر ظلم ہونا دوسری قیامت، پھر نہ جانے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تقیہ ہونے کے کیا معنی؟ بہر حال جوابات شیعہ تو جیسے ہیں، سب ہی جان گئے، ان جوابوں سے حصول مطلب شیعہ بھی معلوم ہو گیا۔

لیکن انہیں ان جوابوں سے نفع ہو کہ نہ ہو، سنیوں کو یہ فائدہ حاصل ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کافدک میں تصرف مالکانہ نہ کرنا اور بدستور سابق رہنے دینا جو سنیوں کا دعویٰ تھا، سچا ہے، پھر جو ان جوابوں کی تردیدوں کو دیکھے گا، وہ آپ سمجھ جائے گا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کافدک کو بدستور سابق رہنے دینا فقط اسی وجہ سے تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تادم وقات کسی کو بہہ نہیں کیا تھا اور پھر مترکہ نبی میں وراثت جاری نہیں ہو سکتی، چنانچہ عنقریب ان شاء اللہ شروعاً مفصلاً اس کا اثبات آتا ہے، جب یہ بات محقق ہو چکی تو ہر دانا و نادان کو محقق ہو گیا کہ روایت متنازعہ فیہا جو مستند شیعہ ہے، سراسر بہتان اور دروغ تراشیدہ حضرات شیعہ ہے اور جیسے حسب روایت اس کا غلط ہونا

صحیح ہو گیا تھا باعتبار تو انہیں روایت بھی ایک انسانہ بے اصل لکھا، علیٰ ہذا القیاس مامون عباسی کے زمانے میں اولاد حسنین کا بہ نسبت فدک دعویٰ کرنا اور اس کا دو سو علماء اہل سنت کو جمع کر کے دربارہ فدک استفسار کرنا، الی غیر ذلک بمنزلہ خیالات بوستان خیال اور حکایات ہائے بہار ہے، اگر سر اسر غلط نہیں تو مثل مرویات صحیحہ بالکل صحیح بھی نہیں۔

اتنی بات بیشک ظہور میں آئی کہ مامون عباسی نے بوجہ میلان تشیع فدک کو اولاد حسنین کے حوالے کر دیا۔ القصہ جب ان افسانوں کا جھوٹا ہونا ثابت ہو گیا تو دعویٰ ثبوت ہبہ جس پر مولوی عمار علی صاحب بیڑا اٹھا کر عزم اثبات غصب کیا تھا۔ مثل خانہ شیخ چلی مکہ سوائے خیال اور کچھ نہ تھا، بتایا یا ڈھ گیا اور بعد ازیں ہم کو کچھ ضرورت تردید نہ رہی کہ اہل انصاف کے لیے فدک کے غصب نہ ہونے میں اتنا ہی سامان اور سامان علم الیقین ہے اور حضرات شیعہ جیسے نا انصافوں کے لیے اسی قدر جواب دندان شکن اور قاطع ہر مہینہ و کہین ہے۔

کتب اہل سنت میں دعوائے سیدہ برائے فدک بروایت ضعیف بھی مذکور نہیں

لیکن بایں ہمہ اور زیادہ طریق تنزل مناظرہ میں علامت حقانیت ہوتا ہے۔ اس لیے بطور تنزل معروض ہے کہ اہل سنت کی کتابوں میں سند ضعیف سے بھی یہ روایت نہیں کہ بعد وفات سرور کائنات علیہ علی آلہ..... افضل الصلوات واکمل التحیات حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے دعوائے ہبہ فدک کیا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کا دعویٰ نہ سنا اور گواہ مانگے اور حضرت زہرا حضرت علی اور حضرت ام ایمن یا حسنین رضی اللہ عنہم اجمعین کو علی اختلاف الروایات گواہ لائیں اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے (بسبب نہ ہونے دو مردوں یا ایک مرد و دو عورتوں کے) ان کی گواہی کو رد کر دیا، یہ سب خوبی اور بزرگی انہی بزرگوارین شیعہ کی ہے کہ ان روایات کو گھڑ کر زوراہ جہنم تیار کیا اور سرمایہ نعمت ابدی بہم پہنچایا اور پھر جرأت تو دیکھو کہ علمائے اہل سنت سے جواب طلب ہے۔

مجان دین کی خدمت میں یہ اتہاس ہے کہ اہل سنت کا شیوہ یہ نہیں کہ وقت پڑے پر جھوٹ بول جائیں۔ ان کے مذہب میں تقیہ کے جواز کی بھی کوئی صورت ہوتی تو مضائقہ نہ تھا۔ اس لیے جو امور واقعی ہیں، اگرچہ ظاہر نظر میں جائے گرفت اور محل طعن ہوں، اپنی کتابوں میں درج کرتے ہیں اور انکار نہیں کرتے۔ مثلاً حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا میراث کا دعویٰ کرنا اور حضرت ابو بکر صدیق کا نہ دینا اور قضیہ قرطاس اور واقعہ جمل کہ یہ سب امر واقعی ہیں اور ان کے جواب معقول رکھتے ہیں، اگر جھوٹ ہی بولتے تو جیسے شیعہ وقت پڑے پر جاہلوں کے سامنے اپنی مرویات صحیحہ سے بھی انکار کر جاتے ہیں، سنی

بھی ایسے امور سے انکار کیا کرتے تھے لیکن جو بات اصل سے باطل تھی اس کو یکسر مہر دیتے۔
 پر اس عداوت اور اس دیانت کو دیکھئے کہ سنیوں کے دین کی خوبی کے حسد میں مقتدایانِ شیعہ اور
 پیشوایانِ امامیہ اپنے دین کو بھی خراب کرنے لگے اور جھوٹی روایتیں تراش کر سنیوں سے گریباں گیر
 ہونے لگے، سودر و غ پسندوں کو جھوٹی باتیں ہی سن کر اطمینان ہوتا ہے، اس لیے ہم بھی ان کی خوشی
 کے لیے یہی کہتے ہیں کہ جو کچھ شیعہ فرمائیں سب سچ ہے۔ ع..... ”دروغہ ماجرا باشد و دروغے“

روایتِ ہبہ کے غلط ہونے کی دو دلیلیں

مگر پاس خاطر اہل صدق اس روایت کے غلط ہونے کی دو دلیلیں بیان کرتا ہوں، ایک سنیوں
 کی طرف سے، ایک شیعوں کی طرف سے، سنیوں کی طرف کی دلیل تو ایسی لیجے کہ جس سے اپنے
 دل کا تردد رفع ہو جائے اور دشمن کا اعتراض دفع ہو جائے، سو وہ دعویٰ روایت مشکوٰۃ ہے جس میں عمر
 بن عبدالعزیز کا فندک کو بدستور سابق کر دینا مذکور ہے۔ اس روایت کی صحت اور شہرت کی طرف
 پہلے بھی اشارہ گزرا، اور اب بھی کہنا پڑا کہ مشکوٰۃ کی شہرت تو سب ہی کو معلوم ہے اور ابوداؤد جو اس
 روایت کا ماخذ ہے وہ خود صحاح ستہ میں سے ہے۔

بالجملہ یہ روایت صحیح سنیوں کی کتابوں میں موجود، پھر جو روایت اس کے مخالف ہو اور وہ بھی
 ایسی کہ نہ اس کی سند اس کی سند کے برابر اور نہ اس کا ماخذ اس کے ماخذ کے برابر، وہ ہر گز صحیح نہیں
 ہو سکتی۔ پھر اس کے بعد اگر کوئی کہے کہ سنیوں کی کتابوں میں بطریق صحیح ایسی حدیث موجود ہے
 جس سے ہبہ ہونا فندک کا ثابت ہوتا ہے تو نادان بھی سن کر یقین کر لے گا کہ یہ بات غلط ہے اور اگر
 صحیح بھی ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ بطور تردید کے یعنی اس بات کے بتلانے کے لیے کہ یہ روایت غلط
 ہے۔ اس روایت کو کسی کتاب میں داخل کیا ہوگا، یا کسی نے اپنی کتاب میں اور رطب یا بس کے
 ساتھ اس روایت کو بھی داخل کر دیا ہوگا کہ بعد میں نظر ثانی کر کے صحیح غلط میں امتیاز کر دیا جائے۔
 سوطاء شیعہ نے بوجہ چالاکی اور غلط انداز سے ایسے مواقع سے اس قسم کی روایات کو جن لیا ہے۔

دوسری دلیل شیعوں کی طرف سے جس سے وہ اُلٹے الزام کھائیں اور خاموش رہ جائیں۔ سو وہ
 حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فندک کو بدستور سابق فقراء اور مساکین اور ابنِ سبیل پر تقسیم کرنا اور آپ نہ لینا
 اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے وارثوں کو نہ دینا ہے جس کو شیعہ برسرِ چشم رکھتے ہیں اور اس کے واقعی
 ہونے سے انکار نہیں کرتے۔ چنانچہ اس کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے اور یہ بھی گزر چکا کہ شیعوں نے اس
 کے عذر میں ہر چند بہت دست و پا مارے لیکن سب رائیگاں گئے۔ بالجملہ اس قضیہ مسلم الثبوت طرفین

اور نیز روایت مشکوٰۃ سے ہبہ کا معین ہونا سراسر بہتان اور غلط ہے۔ پھر کیا امکان کہ سیدۃ النساء جگر گوشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو شیعوں کے نزدیک معصوم اور ہمارے نزدیک محفوظ ہیں، ایسا دعوائے دروغ ہائیں بزرگی سرزد ہوا؟ اور پھر حضرت علی اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما جو ہا اعتبار طریقین یا معصوم ہیں یا محفوظ، شہادت زور جو ہمسگ کفر ہے، اس طرح بر ملا علی الاعلان ادا کریں۔

بہر حال یہ روایت سنیوں کی کتاب میں اصلاً موجود نہیں۔ شیعوں کا افترا اور بہتان ہے، پھر ایسی روایتوں سے سنیوں کے التزام کے درپے ہونا اور ان سے ان کا جواب طلب کرنا کمال سفاہت اور عین حماقت کی دلیل ہے۔ باقی یہ جو مولوی صاحب نے نو دس کتابوں کے نام لکھ دیئے ہیں، یہ وہی قدیمی کید ہے اور پرانی دعا اور فریب کی بات ہے جو مولوی صاحب کو سینہ بسینہ پہنچی ہے اور ہم نے اس کی طرف بحوالہ تحفہ اشارہ کیا جس کا یہ مضمون ہے کہ شیعہ اکثر اپنے مطلب کی باتیں کیا اب نادرا لوجود کتابوں سے نقل کر دیتے ہیں حالانکہ ان کتابوں میں اس بات کا نشان بھی نہیں ہوتا اور اگر ایک دولسہ میں کسی کتاب کی یہ روایت ہووے بھی تو وہ بھی بیشک ایسے ہی دعا بازوں کی چالاکی ہے کیونکہ ان کی ایک یہ بھی عادت ہے کہ کتب غیر مشہورہ میں جو خال خال ملتی ہیں، اکثر روایات اپنے مذہب کی یا اپنے آپ تراش کر داخل کر دیتے ہیں، چنانچہ تحفہ ہی کے حوالے سے یہ بات بھی مفصل مرقوم ہو چکی ہے۔

کتب محولہ کے مؤلفین نے صحت کا التزام نہیں کیا

اور اگر فرض کیجئے کہ ان سب کتابوں کے سبھی نسخوں میں یہ روایت ہے تو اول اس بات کا اثبات چاہیے کہ ان کتابوں کے مصنفوں نے التزام کر لیا ہے کہ جو کچھ ہم ان کتابوں میں درج کریں، صحیح صحیح درج کریں گے، ضعیف اور موضوع درج نہ کریں گے۔ سو اس بات کا ثابت ہونا تو معلوم، البتہ معاملہ برعکس ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رسالہ اصول حدیث کے آخر میں جو مشکوٰۃ مطبوعہ مطبع دہلی کے اول میں لگا ہوا ہے، یوں رقم فرماتے ہیں کہ شیخ جلال الدین سیوطی نے جمع الجوامع میں کوئی پچاس کتابوں سے زیادہ کتابوں کی حدیثیں جمع کی ہیں اور پھر اس میں صحیح حسن ضعیف ہر قسم کی حدیث لائے ہیں، اسی پر اور کتابوں کو بھی قیاس کر لیجئے ”شے نمونہ خردارے“ ع ”قیاس کن ز گلستان من بہار مرا“

الغرض ان کتابوں کے مصنفوں نے یہ التزام نہیں کیا کہ ان میں بجز صحاح کے ضعیف حدیثیں داخل نہ کریں گے اور یہ بات ویسے بھی تو ظاہر ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو ان کو بھی بمنزلہ صحاح ستہ سمجھتے اور صحاح میں داخل رکھتے اور اگر فرض کیجئے کہ ان کے مصنفوں نے اپنی طرف سے التزام ہی کیا تھا کہ بجز صحیح اور کسی قسم کی روایت ان میں درج نہ کریں گے، تب بھی اطمینان کے قابل نہیں

کیونکہ اہل سنت کے نزدیک صحت و ضعف حدیث کے باب میں ایک آدھ کا کہا نہیں چلتا کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی غلطی کھا جاتا ہے، اس لیے ان امور میں ضروری ہے کہ اگر سب محدثین کا اتفاق بھی نہ ہو تو اکثر تو اس کی صحت کے یا ضعف کے قائل ہوں۔

اور یہ بات اول تو بشہادت عقل ضروری ہے، دوم بہت سے شیعہ خبیث ہاٹن نے بوجہ تقیہ حورع اور متقی بن کراؤل تو اپنا اعتبار پیدا کیا اور پھر محدثین اہل سنت کی خدمت میں رہ کر ان سے صحیح حدیثیں روایت کیں اور انہیں سندوں سے اپنے مطلب کی باتیں بھی ان کے ساتھ لا کر عالم میں پھیلا دیں اور بوجہ تقوایں ظاہر اور پردہ تقیہ یہ بیچ ان کا چل گیا۔ اکثر ثقافت نے بھی ان کو متورع اور متقی گمان کر کے ان کی روایتیں قبول کر لیں اور بوجہ حسن ظن استاد کو ثقہ سمجھا اور سوا اس کے اوپر کے اساتذہ کو آئمہ حدیث پایا، اس کی وجہ سے ان کی روایات کو من جملہ صحاح سمجھا اور اس دعا میں آگئے۔

تقیہ کے پردہ میں اہل شیعہ کی خطرناک خیانت

گستاخرین نے ہمارا خداوندی اس دعا کو سمجھا اور ان حدیثوں کو موضوع قرار دیا اور مردود اور متروک ٹھہرایا۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب ثقہ میں باب مکاید میں مکاران شیعہ کی شان میں رقم فرماتے ہیں:

”کید شازدہم آنکہ جماعت از علماء ایشان خود را از محدثین اہل سنت و انمودہ بعلم حدیث مشغول شدند، و از ثقافت محدثین اہل سنت سماع حدیث حاصل کردند، و اسامین صحیحاً نرایا و گریہید، و بظاہر بحلیہ تقوے و ورع متعلی کشید تا طالبان را اعتقاد صادق در حق آنها بکرسید، و اخذ علم حدیث از آنها شروع نمودند، و احادیث صحاح و حسان روایت کردند، و در اثناء روایت بہمان اسانید صحیح موضوعات را کہ مطابق مذہب ساختہ بودند، نیز در جملہ مرویات درج نمودند، این کید ایشان را بہ بسیاری از خواص اہلسنت زدہ است چہ جائے عوام۔“

زیرا کہ تمیز در میان احادیث موضوعہ صحیحہ رجال سند است، و چون رجال بسبب اس و غل و تلمیس متعہ شدند تمیز مشکل افتاد، و ما بہ الامتیاز مفقود گشت، اما چون حمایت الہی شامل علوم اہلسنت بودہ، آنساین فن بعد از تحقیق و تعقیب اس و غل را دریا بھید و متنبہ شدند و بعد از انکشاف جلیہ جال طائفہ از ایشان بوضع اقرار نمودند و طائفہ صریح اقرار نہ نمودند لیکن امارات اقرار در انہا قائم شدہ و تا حال آں احادیث در معاجم مصنفات و اجزاء و سائر است، و اکثر تفصیلیہ متشیعین ہاں احادیث تمسک کنند،

اول کیسکہ اس و غل را موجد شد جابر جہلی است کہ بعد از تحقیق حال ابو بخاری و مسلم بنا بر احتیاط مطلق مرویات اور از درجہ اعتبار ساقط و مطروح ساختہ، و ترمذی و ابو داؤد و نسائی با متعاجبات و شواہد قبول

کند، و آنچہ ابدان متفر دست رد نمایند و ابو القاسم سعد بن عبد اللہ ابی خلف قمی نیز دریں باب استاد ہر کارست، اکثر نادانان اہلسنت بجہت تلمس اسانید و گمان برند کہ از رجال معتبرین ماست، حالانکہ چنین نیست نجاشی کہ صاحب نقد رجال شیعہ است اور اقلیہ طائفہ وجیہ طائفہ قرار دادہ لہجے ملفظ

ترجمہ:..... ”پندرہواں مکر یہ ہے کہ اہل شیعہ کے علماء میں سے ایک جماعت اپنے آپ کو محدثین اہل سنت ظاہر کر کے علم حدیث میں مشغول ہوئی اور ثقات محدثین اہل سنت سے سماع حدیث حاصل کیا اور ان کی اسانید صحیحہ کو یاد کر لیا اور بظاہر تقویٰ و پرہیزگاری سے آراستہ ہو گئے۔ حتیٰ کہ طلباء علم کو ان کے بارے میں بھی عقیدت پیدا ہو گئی اور انہوں نے ان سے استفادہ علمی شروع کر دیا اور صحیح اور حسن حدیثیں روایت کیں اور اثنائے روایت میں اسناد صحیحہ کے ساتھ اپنے مطلب کی وضع کی ہوئی روایات بھی درج کر دیں۔

علمائے شیعہ کے اس مکر نے بہت سے خواص اہلسنت کا راستہ کاٹ دیا ہے، عوام کا تو ذکر ہی کیا، وجہ یہ کہ احادیث صحیحہ اور روایات موضوعہ میں امتیاز تو صرف رجال سند ہی سے ہو سکتا ہے۔ جب اس مکر و فریب سے رجال سند ہی گڈمڈ ہو گئے تو تمیز مشکل ہو گئی اور جس امر سے امتیاز حاصل ہوتا وہ مفقود ہو گیا۔ لیکن چونکہ تائید خداوندی اہل سنت کے علوم کو حاصل تھی۔ اس لیے آئمہ فن نے تحقیق و تفتیش کے بعد اس فریب کو سمجھ لیا اور متنبہ ہو گئے۔ پھر حقیقت حال کے ظہور کے بعد علماء شیعہ کے ایک گروہ نے وضع احادیث کا اقرار کر لیا اور دوسرے نے صریح اقرار تو نہ کیا لیکن ان روایات میں اقرار کی علامتیں قائم ہو گئیں اور اس وقت بھی وہ روایات معاجم، مصنفات و اجزاء میں دائر و سائر ہیں اور اکثر تفصیلیہ اور متعینین ان سے تمسک کرتے ہیں۔

پہلا شخص جو اس فریب کا موجد ہے وہ جابر ہٹی ہے کہ اس کی حقیقت کھل جانے کے بعد بخاری و مسلم نے احتیاطاً اس کی تمام مرویات کو ساقط الاعتبار اور مطروح قرار دیا اور ترمذی اور ابوداؤد اور نسائی اس کی روایات کو شواہد اور متابعات ملنے پر قبول کرنے لگے اور جن روایات کے شواہد و متابعات نہیں ملے، ان کو مردود قرار دیا۔ نیز ابو القاسم سعد بن عبد اللہ ابی خلف قمی بھی اس فریب کاری میں استاذہ کار ہے۔ اکثر نادانان اہل سنت اسانید کی گڑبڑ کی وجہ سے خیال کرتے ہیں کہ وہ ہمارے راویان موثقہ میں سے ہے حالانکہ یہ خیال خلاف واقعہ ہے۔ نجاشی جو ناقہ روایات شیعہ ہے۔ اس نے قمی کو فقیہ طائفہ اور وجیہ طائفہ قرار دیا ہے۔ اٹھی ترجمہ از ناشر

اب عرض یہ ہے کہ شاہ صاحب کا لکھنا تو آنکھوں کے دیکھے کے برابر ہے۔ شیعہ سنی سب ان

کے علم اور تاریخ دانی اور تبحر مذہب طرفین کے قائل ہیں حتیٰ کہ علم اہلسنت تو انہا علم تھا، علم مذہب شیعہ بھی اس قدر رکھتے تھے کہ علماء شیعہ کو بھی میسر نہیں، چنانچہ تھنائٹا مشر یہ اس کے لیے گواہ موجود ہے لیکن اگر شاہ صاحب نہ فرماتے، کوئی اور کہتا، تب بھی اس بات کا شیعوں کی نسبت یقین بے ساختہ ہو جاتا کیونکہ اس تفریق کی بیچ پر جھوٹ کو ان کے لیے حلال طیب کیا واجب اور فرض تک کر دیا ہے۔

لسان المیزان میں چند فریب کاروں کی نشان دہی

لسان المیزان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام بہت سے ضیعان نابکار نے کیا ہے، مجملہ حارث بن غصین ہے جو غمش سے روایت کرتا ہے، اور اسی قبیل سے حارث بن محمد مکوف ہے اور از ان جملہ حسن بن علی بن زکریا بن صالح ابو سعید عدوی مصری ہے جو ثقات کے نام سے جھوٹی باتیں روایت کرتا ہے، خیر کہاں تک بزرگواران شیعہ کی بزرگی کی تعریف اور مدح میں رطب اللسان رہے کہ اس قسم کے مضمون بہت ہی تھوڑے ہیں۔

پر رفع استبعاد اور تسکین خاطر سادہ لوحان کے لیے یہ معروض ہے کہ آیت ”فَقَدْ أَظْلَمَ مَعْنَى الْفَرَى عَلَى اللَّهِ كَلْبًا“ سے جس کا یہ ترجمہ ہے کہ ”ان سے زیادہ اور کون ظالم ہوگا جنہوں نے اللہ کے ذمہ بھی بہتان لگا دیئے۔“ یوں معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ایسا بھی کرتے ہیں کہ امت کے ذمہ طوقان جوڑ لیا کرتے ہیں اور کم عقلوں اور سادہ لوحوں کو بمنزلہ شیاطین، راہ سے بے راہ کر دیتے ہیں۔ سو (اس آیت میں) اس فن میں حضرات شیعہ سے زیادہ اور کوئی چالاک معلوم نہیں ہوتا اور کیوں نہ ہو، جھوٹ سان کے دین کا قوام ہے، اگر یہ جھوٹ نہ بولیں تو اور کون بولے۔ سو ان کی نسبت جتنا کچھ کہئے تھوڑا ہے، بالجملہ اگر کتب مذکورہ میں روایت دعویٰ فذک ہو بھی؟ تو بوجہ حسن فتن علمائے اہل سنت اور تفریق مکاران مذہب شیعہ اول وہ روایت سائر ہوگئی، پیچھے سے محققین نے گو اس کے بطلان کا اشتہار کر دیا لیکن تاہم کہاں تک؟ پھیلی ہوئی بات کا سیٹھا چھوٹے ہوئے تیر کے ہٹانے کے برابر ہے۔

بہر حال وہ روایتیں مشہور ہو گئیں اور مغفلین کو ہراسیمہ کر دیا اور متعینین اور مردمان تفضیل کے لیے سامان اضلال ہو گئیں، جیسا کہ توریت و انجیل کی تحریفات باعث ضلال و اضلال عالم ہو گئیں، پر جیسے قرآن مجید نے توریت و انجیل کی غلطیوں کی اصلاح کر دی اور قسمت دلوں کو ظلمات سے نکال کر نور میں پہنچا دیا، ایسے ہی روایات صحاح اور تحقیقات محققین اولوالابصار نے بھی ان تحریفات کا تذکرہ کر دیا اور جن کا مادہ قابل اصلاح تھا، ان کو ہدایت کر دی اور ضلالت سے نکال دیا۔ باقی مولوی عمار علی صاحب یا ان کے اقران و امثال کی اگر اصلاح نہ ہو تو کیا بعید ہے؟ جن کے دلوں پر مہر لگی ہوئی تھی ان کے لیے

قرآن جیسی حتمی کتاب سے اصلاح نہ ہوئی بلکہ تحریفات آبائی اور تبدیلیات اسلاف کے پابند رہے۔
ایسے ہی مولوی عمار علی صاحب بھی اس بات میں انہیں کے قدم بقدم ہیں اور موافق لقل مشہور ہے:
کند ہم جنس باہم جنس پرداز کبوتر با کبوتر زاغ با زاغ
کذابوں کی روایات پر جم گئے اور اہل صدق کی بات کو نہ مانا، سودہ کیا کریں؟
”مَنْ يَضِلُّ اللَّهَ فَلَا هَادِيَ لَهُ“

دعوائے فدک کی روایت اگر صحیح بھی ہو تو بھی کام نہیں چلتا

اور اگر ہم تسلیم کریں اور مناظرہ میں شیعوں سے نرمی ہی برتیں اور اس بات کے قائل ہوں کہ اس روایت میں کسی طرح کا قصور نہیں، ہاں تولہ پاؤرتی ہے تب بھی شیعوں کی آنکھوں میں خاک ہی رہے گی کیونکہ اگر یہ روایت صحیح ہے تو مشکوٰۃ کی روایت اصح ہے، اور یہ قوی ہے تو وہ روایت اقویٰ ہے، اس کو اس پر ترجیح نہیں ہو سکتی، وہی بہر طور مرجع رہے گی اور یہ بات کچھ ہمیں نہیں کرتے کہ اصح اور اقویٰ کو صحیح اور قوی پر مقدم رکھتے ہیں، تمام عالم ہی کرتا ہے، عقل اسی بات کی شاہد ہے، شیعہ ہر چند عقل سے کچھ غرض نہیں رکھتے۔ اسی طریق پر چلتے ہیں اور اگر یہ نہ کریں تو پھر دین سے دست بردار ہوں کیونکہ ان کے یہاں کے اختلاف کے برابر کسی مذہب میں اختلاف ہی نہیں، چنانچہ ناظران تحفہ اثنا عشریہ اور منتہی الکلام وغیرہ مصنفات مولانا حیدر علی پر پوشیدہ نہ رہے گا اور قدر قلیل کچھ اس کا پتہ اس رسالہ میں سے بھی ملے گا..... اور دور کیوں جائیے، مولوی عمار علی صاحب تو یوں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے اور کوئی بیٹی ہی نہ تھی اور کلینی بصراحت اور نہج البلاغہ بلکہ خود کلام ربانی تعدد نبیات نبوی پر شاہد ہیں، چنانچہ اوپر مفصل مذکور ہوا۔

تو اب ہم مولوی صاحب سے استفسار کرتے ہیں کہ (آپ اگر چہ جھوٹے ہیں، پر بزم خود تو سچے ہی ہیں اور معتقدوں کے نزدیک تو آپ کی بات سے پھرنا، خدا کی بات سے پھرنا ہے تو آپ کی روایت بھی خواہ مخواہ آپ کو صحیح ماننا پڑی اور کافی کلینی خود اصح الکتب ہے اور نہج البلاغہ بمنزلہ وحی آسمانی اور قرآن خود وحی آسمانی ہے۔ پھر آپ نے بایں وجہ کہ خدا کے فرمودہ میں توبہ کا احتمال ہے اور کافی اور نہج البلاغہ میں آئمہ کا قول اس بات میں منقول ہے اور ان کے علوم، علم خداوندی اور علم نبی سے ماخوذ ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی خدا ہی سے لیتے ہیں تو اس صورت میں بھی ان کے اقوال میں بھی وہی احتمال رہا اور آپ کو نہ خدا سے واسطہ نہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے واسطہ) آپ نے جو اپنے ہذیان اور بکواس کو کافی کی روایت اور حضرت امیر اور خدا

کی شہادت سے اصح سمجھ کر مقدم رکھا، یہ ترجیح آپ کے نزدیک صحیح ہے یا غلط؟ اگر صحیح ہے تو فہم الراہ، ورنہ ”چشم مارو شن دل ماشاد“ یہ بات تو آپ مانیں گے کہ ہاں میرا (یعنی مولوی عمار علی کا) یہ قول کہ ”سوائے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی جہنمی نہیں“ غلط ہے۔ باقی اس ترجیح کو کہ صحیح اصح پر رائج ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول سے ہم مرجوح کر دیں گے جو نج البلاغت میں مندرج ہے۔

الزمو السواد الاعظم فان يد الله على الجماعة واثاكنم والفرقة فان الشاذ
من الناس للشيطان كما ان الشاذ من الغنم

یعنی ”مردہ اعظم کے ساتھ رہو، اس لیے کہ اللہ کا ہاتھ بڑی جماعت کے سر پر ہے اور دیکھو مجمع سے الگ مت ہو، اس لیے کہ مجمع سے نکلا ہوا آدمی شیطان کے لیے ہے۔ جیسا کہ ریوڑ سے الگ رہی ہوئی بکری بھیڑیے کے لیے ہوتی ہے۔“ سو بالفرض بغرض محال مولوی صاحب کی جھوٹی بات یعنی فقط حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی کا بیٹی ہونا اگر صحیح بھی ہو تب مرتبہ صحت سے تو آگے چلنے کی نہیں، پھر اس کو اصح اقوال پر ترجیح دینے میں تمام عالم سے علیحدہ ہونا ہے۔ سو اس وجہ سے شیطان کے زمرہ میں داخل ہونا مولوی صاحب کو مبارک سبحان اللہ۔

ہر یکے را بہر کارے ساختہ مہر او اندر دیش انداختہ
شیعوں کو خداوند کریم نے غلطی ہی پر جے رہنے کے لیے پیدا کیا ہے جو ایسے ایسے براہین قاطعہ سن کر بھی باز نہیں آتے اور جیسے اندھادن کو بھی نور آفتاب سے فیضیاب نہیں ہوتا، یہ کو راہن دین بھی ان دلائل سے جو مثل آفتاب روشن ہیں، مستغنی نہیں ہوتے، الغرض روایت مشکوٰۃ کے مرنج ہونے میں وہی متردد ہو سکتا ہے جو دن کو آفتاب کے ہونے میں متردد ہوتا ہے۔

شیعوں کی پیش کردہ روایت سے بشرط صحت بھی ہبہ فدک ثابت نہیں ہوتا لیکن ایسے جتنی لا اُمتیوں کی حجت جواب بھی نہ مانیں ہمیں بھی ختم کر دینی ہے، اس لیے ہم کہتے ہیں کہ سلمنا علماء شیعہ کی رائے غلط ہی صحیح سہی اور روایت مشکوٰۃ کو روایت مندرجہ صحیحہ مولوی صاحب پر ترجیح نہ سہی لیکن جھوٹی بات کسی طرح پاؤں نہیں چلتی، اب بھی شیعوں کی مطلب براری اس روایت سے نہیں ہو سکتی کیونکہ جو روایت اس مضمون کی شیعوں کی چالاکی سے بعض گم نام کیا ب سنیوں کی کتابوں میں داخل ہو گئی ہے، تب اس میں ایسا لفظ کوئی نہیں جس سے ہبہ ثابت ہو جائے بلکہ لفظ ”أَعْطَى“ واقع ہے جو ہبہ اور عاریت دونوں میں

استعمال کرتے ہیں، دفع تردد کے لیے اس روایت ہی کو بعینہ نقل کیے دیتا ہوں۔
 صواعق محرقہ میں جو در باب ردّوافض تصنیف ہوئی ہے، ابن حجر مکی (فضائل میں ابو بکر صدیق کے) اس روایت سے اگرچہ شیعوں کی گمڑی ہوئی ہے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت ہی نکلتی ہے اور شیعوں نے ہر چند طعن کی بات گمڑی تھی پر خوبی قسمت سے تعریف ہو گئی ہے گو مولوی صاحب اور ان کے اتباع کو وہ پھر بھی عیب ہی نظر آئے۔

چشم بد اندیش کہ بر کندہ باد عیب نماید ہنرش در نظر
 خیر وہ روایت یہ ہے:

اخرج الحافظ ابن شيبه ان زيدا هذا الامام الجليل قيل له ان ابا بكر انتزع من فاطمة، فقال انه كان رجوما وكان يكره انم يغير شيئا تركه رسول الله صلى الله عليه وسلم فاتته فاطمة رضي الله عنها فقالت ان رسول الله صلى الله عليه وسلم اعطاني ذلك فقال هل لك شاهد فشهد لها علي وام ايمن فقال لها لرجل وامرأة تستحقينها ثم قال والله لو رجع الامر فيها الى لقضيته بقضاء ابي بكر.

حاصل یہ ہے ”حافظ عمر بن شیبہ نے کسی سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت زید سے جو امام جلیل القدر ہیں، یعنی زید بن امام زین العابدین سے کسی نے کہا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فدک چھین لیا تھا، انہوں نے فرمایا کہ وہ بڑے رحم دل ہیں (یعنی ان سے ایسا کام کب ہو سکتا ہے یہ تو سنگ دلوں کا کام ہے وہ تو بڑے رحم دل تھے، پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی انداز کے بدلنے کو ان کا جی نہیں چاہتا تھا اور اس کے بدلنے سے ان کو کراہت آتی تھی، سو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ان کے پاس تشریف لائیں اور یہ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو فدک دیا تھا، سو انہوں نے فرمایا کہ تمہارا کوئی گواہ ہے؟ اس پر حضرت علی اور حضرت ام ایمن نے گواہی دی، انہوں نے فرمایا کہ ایک مرد اور ایک عورت سے تو حق ثابت نہیں ہو سکتا، اس کے بعد حضرت زید فرماتے ہیں کہ واللہ! اگر یہ مقدمہ میرے یہاں رجوع ہو، تو میں اس میں دینی حکم دوں جو ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم دیا۔ فقط“

اب خود فرمائیے کہ یہ ہر چند انفرادی کذابان شیعہ ہے جو بظاہر بحیلہ تقیہ متقی اور بہاطن بد کردار تھے لیکن موافق مثل مشہور ”حق بر زبان جاری شود“ لفظ ”وہبھا“ جو صریح ہبہ اور تسلیم پر دلالت کرتا تھا، واضعان روایت کو نہ سوجھا لیکن تعریف صدیق اکبر رضی اللہ عنہ صاف صاف کہنی پڑی اور یہ تعریف بھی

کبھی کبھار وہ بھی امام زادہ سے، اور امام زادہ بھی کون؟ جو خود بھی طویل القدر اور اللہ ماجد تو ہیں ہی۔
خیر منصفوں کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ اگر یہ روایت جملہ صوب قادیان اقبالہ سے مبرا ہو اور
پھر ہم درجہ روایت مشکوٰۃ بھی ہو تب بھی اعطاء سے بدو وجہ بہ ثابت نہیں ہوتا۔ ازل تو یہ کہ حضرت
زید رضی اللہ عنہ کا یہ جواب از قبیل ”معاشات مع الخصم“ یعنی بطور تنزل اور تسلیم ہے، یعنی
اگر تسلیم کیجئے کہ چھین ہی لیا تھا تو اس کی فلانی وجہ تھی، مگر ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس روایت
سے بہ کاشبوت نہ ہوگا بلکہ انکار نکلے گا۔

لفظ عطاء ہب اور عاریت میں مشترک ہے اس پر مسلمہ حدیث سے استدلال

دوسرے یہ کہ اردو میں اعطاء کا ترجمہ دینا ہے۔ سو جیسے ہب میں دینا اور اعطاء بولتے ہیں ایسے ہی
ماریت میں بھی یہ دونوں لفظ دونوں زبانوں میں مستعمل ہوتے ہیں اور سند اس کی حدیث صحیح مقبول
الطرفین ہے، وہ حدیث یہ ہے: ”إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَوْمَ خَيْبَرَ لَا أُعْطِيَنَّ
الرَّيْبَةَ غَدًا رَجُلًا يُحِبُّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيُحِبُّهُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ الْخ“ مطلب یہ ہے کہ ”غزوہ
خیبر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جھنڈا اعانت کرنے سے ایک روز پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے یہ ارشاد فرمایا کہ کل کو لشکر کا جھنڈا ایسے شخص کو دوں گا جو خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محب اور
خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب ہے۔ فقط“ اب غور فرمائیے کہ اس حدیث میں بھی اعطاء کا مادہ
موجود ہے، پر کسی نادان کو بھی یہ وہم نہیں ہو سکتا کہ جھنڈا ہب کر دیا بلکہ جیسا دستور ہے کہ چہر اس
سپاہیوں کو اور قلمدان وزارت و زیروں کو اور خزانہ کی کتجیاں خزانچوں کو دے دیا کرتے ہیں اور وہ دینا
بطور امانت ہوتا ہے، اسی لیے جب ان کو معزول یا موقوف کر دیتے ہیں، تو یہ سب اشیاء چھین لیتے
ہیں، ایسے ہی پہ سالاران کو جھنڈے کا دے دینا بھی بوجہ دیانت ہوتا ہے، خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے زمانہ میں کہ اس زمانہ میں بلکہ اصحاب کرام کے زمانہ میں ہر مہم کیا ہر لڑائی کا ایک جدائی
افسر ہوتا تھا، اور اس لڑائی میں تو خود سرور کائنات علیہ علی آلہ افضل الصلوٰت واکمل التحیات ہی پہ
سالار تھے، فقط لڑائی کے وقت حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کو اس قدر انبوهہ کا افسر کر دیا تھا جو
مقابلہ پر بھی بھیجے گئے تھے۔ الغرض جھنڈا اعطا کرنا بطور امانت تھا۔

اور جب عطاء اور اعطاء امانت میں بھی مستعمل ہوا تو ہو سکتا ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ
عنہا کا یہ فرمانا ”إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَعْطَانِي بِذَلِكَ“ یعنی رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو فدک عطا فرما دیا ہے۔ ہاں معنی ہو کہ فدک مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے کھانے پینے کے لیے مستعار دے رکھا ہے اور محاصل اس کا میرے لیے معاف تھا۔ سو گو اس کو اپنا مملوک نہیں سمجھتی لیکن آخر تم کسی نہ کسی کو اس کو یا اس کے محصول کو دو گے ہی، سو مناسب یوں ہے کہ ہمارے ہی پاس رہے کیونکہ ہمارے پاس پہلے سے بھی ہے اور اس کے محصول کو ہم مدت سے کھاتے ہیں، تم اس کے محصول کو مثل محصول دیگر متروکہ نبی علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ و سلام کے فقراء اور مساکین اور ابن سبیل پر تقسیم نہ کرو۔

اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے گواہوں کا طلب کرنا (ہاوجود یہ کہ رحم دل تھے، چنانچہ حضرت زید نے فرمایا ہے اور رحم دلوں کا یہ کام نہیں کہ ایسی سنگدلی برتیں، ماورود بھی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا بنت رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ جن پر مکافات رحمت پھری تمام عالم کو رحم کرنا چاہیے۔ چہ جائیکہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا بانیِ اہل بیت (علیہ السلام) اس وجہ سے تصور فرمانا چاہیے کہ مثلاً قریب و فاق سرور کائنات علیہ السلام افضل الصلوٰۃ و اکمل التسلیمات نے فدک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو برائے چندے مستعار عطا فرمایا ہو پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ قصہ معلوم نہ ہوا ہو بلکہ بایں نظر کہ ہم فدک میں تصرف مالکانہ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو کرتے ہوئے دیکھا تھا، بجائے خود یہ سمجھے ہوئے تھے کہ فدک بھی حسب ایما حدیث ”مَا قَرَّ كُنْهًا صَلَافَةً“ کے (جس کا مذکور عنقریب ہی آتا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ) وقف عام ہے۔ اس میں اچانک حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے یہ بات سن کر اس وقت جانِ صدیق رضی اللہ عنہ عجب کھنجہ میں آگئی کہ نہ ادھر ہوئے بنے، نہ ادھر ہوئے، رعایت رضا، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ایک طرف اور پابندی اتباع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جس کی طرف حضرت زید نے بایں لفظ اشارہ فرمایا ”وَ كَانَ يَكْفُرُهُ أَنْ يُغَيَّرَ الْخ“ ایک طرف اور دونوں جا نہیں واجب رعایت۔

مگر چونکہ رعایت جانب حضرت زہرا رضی اللہ عنہا بھی مبنی وجوب اتباع نبوی واقعہ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر تھی اور پاسداری قرابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت اور فرضیت ہر چند براتب موکد ہے لیکن لم اسکی یہی ہے۔ جیسا کہ مشہور ہے ”بمرکش گیر تا بہ تپ راضی شود“ تو جیسا کہ آیت ”لَا تَقْلُ لَهُمَا أَفْ وَلَا تَنْهَرُهُمَا“ میں ممانعت تو بظاہر ہوں، کہنے اور جھڑکنے سے ہے لیکن مطلب یہ ہے کہ جب ہوں کہنے اور جھڑکنے سے زکیں گے تو گالی گفتار اور جوتی ہیزار بدرجہ اولیٰ نہ ہوگی تو ایسے ہی پاسداری قرابت سے بھی مقصود یہی ہے کہ جب امور دینی میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناخوشی گوارا نہ کریں گے تو امور اخرویہ میں تو بالاولیٰ مطیع و منقاد

رہیں گے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رسول کر کے بھیجنا اصل امور دینی کی اصلاح کے لیے ہے، خصوصاً حقوق مالی میں اور وہ بھی فدک کہ شہادت دستور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم فقراء اور مساکین اور ابن سبیل کی حق تلفی کا فی الجملہ خلجان ساتھ لگا ہو کیونکہ تادم آخریں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ لوگ مصرف فدک رہے۔ مع ہذا ال حق موقع رعایت میں رعایت والوں کو زیادہ دیا کرتے ہیں، اس لیے انصاف والے اپنوں کی رعایت نہیں کیا کرتے تو ان وجوہ سے مرجع اور موجب ہی تھا کہ محاصل فدک میں دستور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہرچہ با د اباد دستور العمل رکھے۔

لیکن بحکم ”مَالَا يَمْلِكُ كُثْلُهُ لَا يَتَوَكَّ كُثْلُهُ“ کے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بسبب کمال اخلاص اور نہایت پاس و نیاز کے اس بات کے جو یا ہوئے کہ تا مقدور دل داری حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی جائے اور جس قدر بن سکے خاطر مبارک حضرت زہرا رضی اللہ عنہا پر میل نہ آنے دیجئے۔ بایں ہمہ اپنی غلط فہمی کا جدا احتمال۔ اس لیے طالب شہود ہوئے تاکہ شاید کسی گواہ کی تقریر سے کوئی اشارہ نبوی اس بات کی طرف پایا جائے کہ گو تر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقف عام ہے لیکن پھر بھی مستحکم یا اقربا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اولیٰ اور اقدم ہیں چونکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بوجہ پاسداری قرابت نبوی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سامنے دونوں بات کہنے میں متامل اور متردد تھے اور اپنا مافی الضمیر (یہ بات کہ میں وہی کروں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے) بلحاظ دل شکنی جگر گوشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آشکارا نہیں کہہ سکتے تھے۔

تو خدا ساز غیب سے تدارک ہوا اور بحکم ”وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا“ یعنی ”جو شخص خدا سے ڈرے، خدا اس کے لیے بلاؤں سے نکاسی کی صورت کر دے ہے۔“ وہ لطیفہ غیبی پیدا ہوا کہ جس سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی رنجش کا کھٹکا بھی جاتا رہا یعنی گواہ طے تو ایک مرد اور ایک عورت علیٰ مناصب شہادت بھی پورا نہ ہوا، جو کسی کو کچھ کہنے کی گنجائش باقی رہے بلکہ ایک عذر مقبول ہاتھ آیا اور عذر مقبول اہل عقل اور دین داروں کے نزدیک مقبول ہی ہوتا ہے۔ ”وَالْعَلُو عِنْدَ كَرَامِ النَّاسِ مَقْبُولٌ“ اس لیے ہم بالیقین جانتے ہیں کہ یہ بات موجب حریہ اقدار حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نہیں تو ہا عشد فزع رنج قلب پاک حضرت زہرا رضی اللہ عنہا تو ضروری ہوئی ہوگی۔

چنانچہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے راضی ہو جانا جو شیعوں کی کتابوں کے حوالے سے عنقریب ان شاء اللہ مذکور ہوگا۔ اس بات پر شاہد ہے اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کا یہ قول ”وَاللَّهِ لَوْ رَجَعَ الْأَمْرُ إِلَيَّ لَعَنُكُمُ لِبَيْهَا بِمَا خَنَكُمُ أَبُو بَكْرٍ“

یعنی واللہ اگر یہ مقدمہ میرے پاس رجوع ہوتا تو میں وہی حکم کرتا جو ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا تھا۔ از بلند یہ کہتا ہے کہ حضرت زہر رضی اللہ عنہا کو حضرت ابو بکر سے کچھ ملال نہ تھا اور تھا تو انجام کار باقی نہیں رہا بلکہ مبذل بخوشی ہو گیا تھا ورنہ اگر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے حضرت قاطمہ زہر رضی اللہ عنہا اس جہاں سے ناخوش تشریف لے جاتیں تو اہل بیت میں سے ایک بھی ابو بکر کو بھلائی سے یاد نہ کرتا، چہ جائیکہ ایسی بڑھ کے تعریف؟ القصد اگر علمائے شیعہ کو ہمارا یہ کہنا کہ یہ روایت موضوع ہے، مسلم ہو تو فیہا، ورنہ اس روایت میں کوئی بات خلاف اہل مذہب ثبوت کو نہیں پہنچتی جو علمائے شیعہ دہن دریدہ ہو کر زبان درازی کریں اور الزام اہلسنت کے لیے اس روایت کو زبان پر لائیں، ہاں اگر توجید وجہ جو مذکور ہوئی نہ بن پڑے تو البتہ شیعوں کی فی الجملہ کچھ بن پڑے۔

لفظ عطا کو بمعنی ہبہ بنانے کی ناکام کوشش

مگر شاید علماء شیعہ بعد تجسس بسیار و جدوجہد بے شمار یوں بات بنانے لگیں کہ ہر چند عاریت کے موقع میں اعطاء کا مستعمل ہونا مسلم لیکن یہ معنی حقیقی ہیں اور عاریت معنی مجازی، اس لیے استعمال میں جب تک کوئی قرینہ صارفہ معنی ہبہ سے نہ پایا جائے تب تک معنی عاریت مفہوم نہیں ہو سکتے۔ سواؤل تو یہ بات ہی غیر مسلم، متدل و مدعی کو لازم ہے کہ دعویٰ بے دلیل زبان پر نہ لائے ورنہ ایک حرف خفیف ”لا نسلم“ میں وہ دعویٰ مسترد ہو جائے گا۔

اور یہ بھی نہ سکی، جیسے علمائے شیعہ ایک دعویٰ بے دلیل پیش کر کے بزعم خود اہلسنت کے سامنے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں، ہم بھی ایک بے دلیل یوں دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ لفظ ان دونوں فردوں میں مشترک لغوی ہے، یا ان دونوں معنوں میں مشترک لفظی ہے اور یہ دعویٰ ایک وجہ سے بہ نسبت دعویٰ علمائے شیعہ معقول بھی ہے کیونکہ اصل یہی ہے کہ لفظ اپنے معنی موضوع لہ میں مستعمل ہو، سو اس صورت میں ہر ایک معنی کے لیے کوئی قرینہ چاہیے جو دوسرے معنی سے صارف ہو۔

تعیین معانی کے لیے قرائن کی بحث

مع ہذا یہ کچھ ضرور نہیں کہ قرینہ مذکور لفظی ہی ہوا کرے اور وہ بھی لفظ کثیر المعنی کے پس و پیش ہی لگا ہوا ہو بلکہ قرینہ کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ مخاطب کو فہم مطلب میں غلطی نہ پڑے، سو ہو سکتا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بعد زبیب دینے مسند خلافت اس بات کی تحقیق کی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ مملوکہ کیا گیا ہے، سو اس تحقیقات میں یہی تحقیق

ہو گیا ہو کہ فدک تادم باز پیس مملوکہ مقبوضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی رہا بلکہ خود حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اور دیگر اہل بیت کے اقراروں سے یہ بات ثابت ہو گئی ہو اور ظاہر بھی یہی ہے کیونکہ ایسی بات گھر ہی کے لوگ جانا کرتے ہیں۔

لیکن جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بطور خود اس کا بندوبست اور جمع خرچ کرنا چاہا، تب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بایں وجہ کہ مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دے رکھا ہے، حرام مال ہوئی ہوں اور اس حجت سے یہ غرض ہو کہ گو فدک ہمارا مملوک نہیں لیکن اولیٰ یہ ہے کہ یہ ہمارے پاس ہی رہے اور اس کی آمدنی ہمارے ہی پاس آیا کرے، اب منصفان شیعہ کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ شہادت قواعد علم مناظرہ مدعی کے خصم کے لیے بھی تو احتمالات ممکنہ خلاف دعویٰ مدعی کفایت کرتے ہیں۔ سو اس احتمال کے امکان میں اہل عقل تو کیا امکان ہے جو انکار کریں؟ اور ایسے ہی یہ بھی ظاہر ہے کہ بعد وقوع اس ماجرا کے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا یہ فرمانا کہ مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے، بجز عاریت اور کسی معنی پر محمول نہیں ہو سکتا اور باوجود مملوک نہ ہونے کے پھر اتنا حکم بوجہ ناز اہل بیت و نیاز صدیق اکبر جو خصوصاً اس موقع میں کہ رعایت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی ہو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیے اور کہے کے پھر وہ ہر صحابی خلفاء پر حکم کر لیتا تھا، چہ جائیکہ اہل بیت؟ اور ان میں سے بھی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اور وہ بھی حضرت صدیق اکبر پر، کہ نیاز مند خاص اہل بیت تھے، رضوان اللہ علیہم اجمعین

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بوجہ قرب مسجد حضرت عباس کے پرنا لے کا توڑ ڈالنا اور ان کا یہ حکم کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کا لگایا ہوا تھا، تم نے کیوں توڑا؟ اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس پرنا لے کو اپنے ہاتھ سے درست کرنا کتابوں میں مذکور ہے لیکن۔ ع۔۔۔۔۔ ”ہر سخن وقیعہ و ہر نکتہ مکانے دارد“ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا یہ حکم برسر، لیکن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بوجہ حدیث ”مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةً“ جس کا ذکر قریب ہی ان شاء اللہ تعالیٰ آتا ہے، مجبور تھے اور پھر گواہوں کی تقریر سے بھی کچھ عقدہ کشائی نہ ہوئی، کوئی اشارہ کسی قسم کا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے پاس رہنے دینے پر گواہوں کی تقریر سے ظاہر نہ ہوا۔

فدک کیلئے سیدہ کی شہادت بھی نامکمل تھی

مع ہذا گواہی بھی اپنی مقدار معین کو نہ سمجھی اور اوپر شہادت دستور نبوی شرکت فقراء اور مساکین اور ابن سبیل کی جس قسم اور جس مرتبہ کی کہی جائے، اس مال میں ثابت، القصر روایت قنارہ فیہا،

اگر پاس خاطر شیعہ ہم تسلیم ہی کریں تو کوئی بات خلاف مذہب اہلسنت اور مناقض حدیث مکتوہ؟ اس روایت سے نہیں نکلتی بلکہ الٹی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تعریف نکلتی ہے۔ سوعلمائے شیعہ اگر اس روایت کو موضوع بحثیں تو فہم اور نہ اگر تسلیم کریں تو مجمع اجزا نہ تسلیم کریں۔

حضرت زید کے بارے میں دریدہ دہنی اور اس کا جواب

اور اگر یہ عذر نامعقول پیش کریں کہ ہر چند یہ روایت صحیح ہے لیکن حضرت زید ہمارے عقیدہ کے موافق (نعوذ باللہ منها) کافر مرے ہیں کیونکہ امامت حق حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا تھا کہ وہ امام وقت تھے اور امام ہر زمانہ میں ایک ہی ہوتا ہے۔ پھر جو انہوں نے جہاد کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے آپ کو امام سمجھتے تھے اور جو شخص کہ امام نہ ہو اور بائیں ہمہ دعویٰ امامت کا کرے تو وہ معینہ ایسا ہی ہے، جیسا کوئی نئی نہ ہو اور پھر دعویٰ نبوت کا کرے، سو جیسا وہ کافر ہے بلکہ کافروں میں بھی اشد، ایسا ہی یہ ہے۔ پھر ان کی بات کا اپنے مذہب کی تائید میں کیا اعتبار؟ ہاں ہمہ ہوتا فذک کا جو مخالف مذہب حضرت زید یعنی مذہب اہل سنت ہے۔ البتہ مقبول ہوتا لیکن اس کو توجیہ عاریت نے نہ چلنے دیا تو اس کا جواب قاضی نور اللہ صاحب، سنیوں کی طرف سے آپ دے گئے ہیں، اس لیے ہم کو کیا ضرورت کہ حضرت زید کی بزرگی کے اثبات میں دردمسائل؟ ان کی روایت نقل کیے دیتا ہوں کہ ان کا لکھا شیعوں کے نزدیک وق آسانی سے بھی زیادہ ہے، مثل نو حنیہ تقدیر کوئی اس کو ماننا نہیں سکتا۔ قاضی نور اللہ صاحب مجالس المؤمنین میں فضیل بن یسار کے احوال میں امالی شیخ ابن ہابوہ سے نقل کر کے بروایت فضیل بن یسار ہی رقم فرماتے ہیں کہ ”گفت در محاربہ زید بن علی با طاغیان لشکر ہشام با او ہمراہ بودم، و چون بعد از شہادت زید بمدینہ قدم و بخدمت حضرت امام جعفر صادق رسیدم، آنحضرت از من پرسید کہ اے فضیل ہاں من در قتال اہل شام حاضر بودی؟ گفتم بے، انکاہ پرسید کہ چند کس را از ایشان کشتی؟ گفتم شش کس را، فرمود مبادا تر شکے در استخلال خون ایشان باشد؟ گفتم اگر شکے در ان میدانستم چرا ایشان را می کستم آنکاہ شنیدم کہ آنحضرت گفت، ”أَشْرَحْنِي اللَّهُ لِي يُلْكَ الْبِغَاءَ وَاللَّهُ زَيْدٌ عَيْيٌ هُوَ وَأَصْحَابُهُ هَؤُلَاءِ بِمَثَلِ مَا مَضَى عَلَيَّ مِنْ أَبِي طَالِبٍ وَأَصْحَابِهِ“ اتھی بلفظہ“

ترجمہ: از ناشر: ”فضیل نے کہا کہ زید بن علی کی لڑائی جو طاغیان ہشام کے ساتھ ہوئی تھی میں اس میں شریک تھا۔ حضرت زید کی شہادت کے بعد جب مدینہ گیا اور حضرت امام جعفر صادق کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے مجھ سے پوچھا کہ اہل شام کے ساتھ جو میرے بچانے قتال کیا تو اس میں حاضر تھا؟ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ اس وقت آپ نے پوچھا کہ تو نے کتنے شامی قتل کیے؟

میں نے عرض کیا چھ آدمی، فرمایا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہیں ان کا خون حلال ہونے میں شبہ ہو؟ میں نے عرض کیا کہ اگر مجھے کوئی شک ہوتا تو میں ان کو قتل کیوں کرتا۔ اس وقت میں نے سنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ الخ“

فارسی کا ترجمہ تو اکثر جانتے ہی ہیں، پر عربی کا ترجمہ لکھنا پڑا۔ وہ یوں ہے ”خدا مجھ کو ان خبیثوں کے ثواب میں شریک کرے، واللہ! حضرت زید میرے چچا اور ان کے اصحاب سب شہید ہیں اور یہ سب قصہ ایسا ہی ہے جیسا حضرت علی اور ان کے یاروں پر گزرا فقط“ اب حضرت امام باقر علیہ السلام جعفر صادق کی اس تمنا اور اس تشبیہ کو دیکھنا چاہیے! امام کے منہ سے جو لفظ نکلے تو سر اسرج ہے، سواگر یہ تشبیہ صحیح ہو تو یہ معنی ہوں کہ حضرت زید کا حال حضرت امیر المؤمنین کے حال کے ہم پلہ تھا، تو اس صورت میں حضرت زید کا کافر ہونا تو غلط۔ البتہ زبدۃ اولیاء اور عمدۃ اقیام میں سے ہوں گے ورنہ شہید ہونا کجا؟ اور پھر حضرت امیر کے حال کا ان کے حال سے مماثل ہونا تو محال ہی ہوگا؟ یہ بات جب ہی ہو سکتی ہے کہ عقیدہ اور عملاً اور حالاً حضرت زید قبیح اور مطابق حضرت امیر کے ہوں، فرق ہو تو مقدار ہی کا ہو، یعنی جیسے چھوٹی تصویر اپنے سے بڑی ذی تصویر کے ہر بات میں موافقہ کے مطابق ہے، حضرت زید بھی حضرت علی رضی اللہ عنہما کے سوائے عظمت اور زیادتی مراتب کے ہر بات میں مطابق ہوں، سو یہ فرق اور آئینہ میں بھی ہے۔ حضرت امام باقر اور حضرت امام جعفر صادق وغیرہم بلکہ حسین رضی اللہ عنہم اجمعین درجہ میں کون سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے برابر ہیں؟

فدک کے بارہ میں حضرت زید کا قول ہی صحیح ہے

بہر حال حضرت زید کی بات باون قولہ پاؤرتی کی ہوگی۔ خصوصاً ایسی اختلافی بات کہ جس میں بے غور لب کشائی نہیں کی جاتی کیونکہ سنی شیعہ دونوں کے قول کے موافق بالاتفاق اس خلاف میں ایک طرف جنت اور ایک طرف جہنم ہے، بالجملہ روایت متنازعہ فیہا بالیقین موضوع ہے اور بایں ہمہ موضوعیت جو سنیوں کی بعضی کتابوں میں پائی جاتی ہے تو اول تو اس کا حال خوب مفصل معلوم ہو چکا۔ دوسرے اس روایت کو بغرض التزام شیعہ بھی صریح کرتے ہیں کہ جو روایت تمہاری بٹلی ہوئی اور تمہاری دستویز امتراض ہے، وہی روایت ہمارے مفید مطلب ہے، چنانچہ صامق محرقہ میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فضائل ہی میں اس کو لکھا ہے پر جو اٹلی کے ٹھمن ہار ہیں، وہ اٹلی ہی سمجھتے ہیں اور بے سوچے سمجھے ایسے ایسے مواقع میں سے بھی لوگوں کے دھوکا دینے کو (جیسا کہ مولوی صاحب نے کیا ہے) نقل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ مولوی عمار علی صاحب نے ایسا ہی کیا ہے اور پھر گزشتہ مہینہ پاس کو بھی نہیں چھوڑی۔

شیعہ قرآن وحدیث کے کسی لفظ کے معنی متبادر مراد نہیں لے سکتے

اور اگر اس پر بھی علماء شیعہ اپنی ہٹ دھرمی سے ہانڈہ آئیں اور شرم کی آنکھیں بند کر کے ہوں فرمانے لگیں کہ گواہی بمعنی عاریت بھی آتا ہے لیکن تاہم متبادر معنی ہیہ ہی ہیں، خصوصاً۔ اس روایت میں تو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ متبادر ہونا ہیہ کا لفظ اعطی سے اس روایت میں مسلم، لیکن اول تو شیعہ ملفوظات آئمہ خصوصاً کلمات مرتضوی کے جو صحابہ کرام اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم اجمعین کی مدح میں صادر ہوئے ہیں اور ان میں سے کچھ اس رسالہ میں بھی منقول ہوئے ہیں، معنی متبادر ہی لے کر شیعہ ہونے سے دست بردار ہوں، اور ایسے ہی آیات قرآنی جو صحابہ کی مدح میں وارد ہوئی ہیں، ان کو اپنے معنی متبادر ہی پر رکھ کر بدل و جان معتقد ہو جائیں، اس وقت اگر ہم سے اس قسم کی درخواست کریں تو فی الجملہ بجا بھی ہے۔ اگر وہاں وہ مان جائیں تو خیر جو توں یہاں ہم مان جائیں، دوسرے اگر معنی متبادر ہی ہر کلام کے لیے جایا کریں تو پھر یہ فرق باریک بینی وغیرہ سراسر لغو ہو جائے اور اکثر غلط فہمیاں درست ہو جائیں کیونکہ بیشتر سبب غلط فہمی کا یہ متبادر فہم ہوتا ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے۔

اور اختلافات آئمہ اہلسنت اور ایسے ہی اختلافات باہمی مجتہدین شیعہ یعنی اس اصل پر ہیں، خاص کر اصولیوں اور اخباریوں کا اختلاف جو شیعوں میں باہم پیدا ہوا ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ اخبار ظاہرہ پر عمل کرتے ہیں اور جو معنی متبادر ہوتے ہیں، اسی کو پیش نظر رکھتے ہیں اور اصولی اپنے عندیہ میں غور کر کے معنی مقصود شارع پر عمل کرتے ہیں اور متبادر معانی ظاہر اخبار کا لحاظ نہیں کرتے، سو حضرت مولوی عمار علی صاحب اگر اس روایت میں بوجہ متبادر معنی ہیہ ہم سے اُلجھنے کو تیار ہوتے ہیں تو پہلے اپنے مذہب اصولیین سے دست بردار ہو کر اخباری بن جائیں، پھر ہم سے دو چار ہوں، اس وقت ہم بھی ناچار تجکم ”كَلِمُوا النَّاسَ عَلَى قَلْبٍ غَفُولٍ لَهُمْ“ اس رد و کد سے (کہ عاقل کو ہر جگہ معنی متبادر ہی ملحوظ رکھنا چاہیے، جیسے عوام کا کام ہے؟ یا معنی محقق کی تحقیق ضروری ہے جیسے محققین کا شیوہ ہے؟) اعراض کر کے دوسری طرح مولوی صاحب کے کان کھولیں گے۔

روایت فدک منقطع ہے

امنی ہم نے مانا کہ لفظ اعطاء کے معنی روایت متنازعہ فیہا میں یہی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدک حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو ہیہ ہی کر دیا تھا لیکن مولوی عمار علی صاحب بلکہ تمام علمائے شیعہ اس میں کیا ارشاد کریں گے کہ یہ روایت منقطع ہے۔ حضرت زید اس زمانہ میں کہاں

تھے؟ جب حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے دعویٰ بہ فدک کیا؟ یہ بات اگر بالفرض واقع میں وقوع میں آئی ہے تو قریب وفات حضرت سرور کائنات علیہ علیہ السلام افضل المصلوات والتسلیمات ظہور میں آئی ہے بلکہ متصل بعد وفات ہی۔ چنانچہ سب جانتے ہیں۔ سو اس زمانہ کے وقائع کا مشاہدہ اور ان کی روایت اور شہادت۔ بجز صحابہ اور کسی کا کام نہیں۔

القہ۔ حضرت زید کا یہ قول ایک قول بے سند ہے۔ کوئی بات بے سند متصل لائق اعتبار نہیں، ہاں اگر حضرت زید شیعہوں کے امام ہوتے تو علم غیب کی وجہ سے شیعوں کو نہیں، تو شیعوں ہی کے نزدیک اُن کا قول حجت ہو جاتا؟ پر شیعوں کے نزدیک تو مؤمن بھی نہیں، چہ جائیکہ علم غیب اور امامت؟ ہاں منکر امامت امام وقت تھے جس سے دلی بھی کافر ہو جائے اور شیعوں کے نزدیک گو حضرت زید اکابر اولیاء میں سے ہوں لیکن تاہم آدمی ہیں۔ جب تک سند نہ ہو کیونکر معلوم ہو کہ انہوں نے جس سے یہ بات سنی ہے وہ معتبر ہے کہ نہیں؟ صحابہ کی ملاقات میں تو احتمال ہے، باقی رہے تابعین سوان میں جھوٹے، سچے، نیک و بد سب طرح کے ہیں۔

اور اگر بالفرض کسی معمر صحابی سے ان کی ملاقات ہوئی بھی تو بھی کیا لازم ہے کہ وہ صحابی اس وقت حاضر ہی تھے؟ یا ان کو کسی دوسرے صحابی سے یہ بات پہنچی ہی تھی اور پھر حضرت زید نے بھی انہیں سے سنا ہو! احتمال ہے کہ جس صحابی سے ان کی ملاقات ہوئی، ان کو یہ بات معلوم نہ ہوئی ہو؟ اور اگر معلوم بھی ہو تو انہوں نے ان سے نہ سنا ہو بلکہ کسی تابعی سے سنا ہو؟ بلکہ زبان زد عوام ایک بات دیکھ کر اسی کے موافق نقل کر دیا ہو یا بطور تسلیم قول معترضین یہ بات فرمائی ہو؟ بہر حال احتمالات چند در چند قاصر اعتبار روایت موجود ہیں، پھر بایں ہمہ احتمالات کوئی کیونکر اس روایت کو دربارہ دعویٰ بہ فدک قبول کر لے۔

مشکوٰۃ کی روایت مرفوع متصل ہے

خصوصاً در صورت یہ کہ آیت اور روایت صحیح متصل بلکہ مرفوع اخی روایت مشکوٰۃ اس کے مخالف موجود ہو مگر شاید کوئی کم فہم اس کے وقوع ہونے میں اس وجہ سے کلام کرے کہ روایت مشکوٰۃ میں بھی عمر بن عبدالعزیز سے جو تابعی ہیں ایک روایت بے سند منقول ہے کیونکہ وہ بھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود نہ تھے۔ سو گوہم کو بعد غیر معتبر ہو جانے روایت متنازعہ فیہا کے اس روایت کا غیر معتبر ہونا معترض نہیں لیکن تاہم یہاں خاطر شیعہ اس کسر کو بھی مٹائے دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ روایت مشکوٰۃ میں ہر چند حضرت عمر بن عبدالعزیز ہی کا قول ہے لیکن اس قول کو

مغیرہ بن شعبہ جو صحابی ہیں، نقل کرتے ہیں اور صحابی کا ایسی بات کو بیان کرنا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے، یا فرمایا ہے، حکماً مرفوع ہے۔ چنانچہ واقفانِ اصول حدیث جانتے ہیں۔

مع ہذا قرینہ نقلیہ بھی اس بات کو تقاضا کرتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا یہ فرمانا صحیح ہو کیونکہ اس قول کو حجت (نہ لینے فذک کی) قرار دیتے ہیں، کوئی بات مفید مطلب اس سے ثابت نہیں کرتے اور نہ لینے کے لیے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فذک کا نہ دینا حجت ہو سکتا ہے، اس سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہبہ کر دینا ہو سکتا ہے۔ سو اگر یہ قضیہ ان کے نزدیک صحیح نہ ہوتا بلکہ الٹا ہبہ کا کرنا صحیح ہوتا تو ان کو کیا ضرورت تھی کہ نقصان دہ باتوں کو کہتے کہ فذک کو دے دیا اور نقصان دین یوں کرتے کہ جھوٹ بولا، اور جھوٹ بھی کس پر؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر! جس کی سزا میں جہنمی ہونے کا وعدہ ہے اور وعدہ بھی متواتر، کیوں کہ حدیث ”مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ“ جس کا ترجمہ یہ ہے ”جو شخص جان بوجھ کر میرے ذمہ کوئی جھوٹ بات لگا دے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں کر لے۔“ بالاتفاق محدثین کے نزدیک متواتر ہے بلکہ متواتر باللفظ اگر ہے تو یہی ہے۔ بہر حال اگر روایت حضرت زید بن علی بن الحسین رضوان اللہ علیہم اجمعین کو تو ہم موضوع نہ کہیں اور چشم پوشی کر کے یوں تسلیم ہی کر لیں کہ واقعی یہ بات حضرت زید بن علی کی فرمائی ہوئی ہے۔ تب اس کے آگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مٹ گیا ہے۔

فذک تادم آخر خاتم الانبیاء کے تصرف میں تھا

مع ہذا جیسے علاماتِ صحت روایت مشکوٰۃ ظاہر ہیں، چنانچہ مذکور ہو چکا، ایسے ہی روایت متنازعہ فیہا کے علاوہ بے سند ہونے کے امارات کذب بھی ظاہر و باہر ہیں کیونکہ باتفاق مؤرخین فذک تادم باز پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبض و تصرف میں تھا اور بے قبض ہبہ موجب ملک موہوب نہ نہیں ہوتا، واہب ہی کی ملک میں رہتا ہے اور ملک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال خود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ بعد وفات وقف ہو جاتی ہے، پھر جو دربارہ ہبہ گواہ طلب کیے تو یوں کہئے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دنیا کی ہوشیاری اور ان مسائل کی واقف کاری کے کہ جو امور دنیا میں مفید پڑیں، شیعہ بھی معتقد ہیں، جب نہ دنیا ہی ٹھہرا تو ایسی مشکل راہ کیوں چلے جس میں اندیشہ ہار جانے کا ہو؟

کیونکہ اگر گواہ اپنی مقدار معین کو پہنچ جاتے تو پھر یہ عذر بھی بے جا تھا کہ ہبہ بے قبض تمام نہیں ہوتا، ہر کوئی یوں جانتا کہ سارے نہ دینے کے بہانے ہیں، اگر یہ عذر قائل سماعت تھا، تو پہلے ہی کیوں نہ پیش کیا اور اگر گواہوں کے طلب کرنے کو شیعہ معمول تحقیق حق پر کرتے ہیں تو اس کے بعد

جو کچھ پیش آیا، وہ خواہ مخواہ عدل و انصاف ہوگا کیونکہ حکم خداوندی ہی کے موافق حکم کیا ہے، کوئی قاعدہ نہیں گھڑ لیا، باقی میں نے جو کچھ تقریر دربارہ طلب گواہان لکھی ہے، اگر اس کو شیعہ تسلیم کر لیں تو ”چشم ماروشن و دل ماشاد“ ورنہ ان کی کوتاہ فہمی سے اُمید تو یہ نہیں۔

اگر فردک ورشہ تھا تو شخص واحد کا قبضہ بقیہ ورثاء پر ظلم تھا

علاوہ بریں جب بالا جماع یہ بات مقرر ہوئی کہ فدک نامہ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبض میں رہا تو باتفاق شیعہ سنی اگر آپ نے ہبہ کیا بھی تب بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ملک میں نہ آیا۔ پس حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جو شیعوں کے نزدیک معصوم اور ہمارے نزدیک محفوظ ہیں کہیں ایسا غلط دعویٰ کرتیں، جس میں بہر حال حق تلفی خلافت ہے؟ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترک میں میراث جاری ہوتی ہے تو وارثوں کی حق تلفی ظاہر ہے ورنہ فقراء اور مساکین کی حق تلفی یہ بھی نہ سہی بلکہ آپ کا ترک وقف ٹھہرا، خلیفہ کو اختیار ہے جسے چاہے دے۔ پس اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آ گیا تو اور بھی اچھا ہے لیکن اس طرح فن و فریب سے لیٹا فریب بازوں اور دنیا سازوں کا کام ہے۔

بہر حال علامات صدق روایت مشکوٰۃ اور امارات کذب روایت متاخر فیہا اہل فہم کے نزدیک تو ایسی روشن ہیں، جیسے اہل نظر کے سامنے آفتاب اور یوں مولوی عمار علی صاحب بیان کے اقران و امثال اگر نہ سمجھیں تو پھر ہمیں کوئی یوں نہ کہے کہ یہ کیا کہتا ہے، ان کے حسب حال پھر یہ شعر پڑھا جائے گا۔

گر نہ بیند بروز شہر چشم چشمہ آفتاب را چہ گناہ

غرض روایت مشکوٰۃ کی وہ روایت ہم پہلے نہیں ہو سکتی جو اس کو چھوڑ کر اس روایت پر یقین کریں بلکہ موافق قواعد مرقومہ بالا کے لازم ہے کہ بسبب تعارض روایت مشکوٰۃ کے (کہ وہ در حقیقت روایت ابوداؤد ہے جو صحاح ستہ میں سے ہے اور صحاح ستہ کی روایات کی صحت اور قوت کو یہی بہت ہے کہ ان کا نام صحاح ہے) اس روایت کو جو حضرت زید کے نام لگا رکھی ہے، رد کریں۔

دعویٰ ہبہ بغیر قبض مسلم نہیں، علامہ حلی کا فرمان

اور سلمنا کہ روایت بھی صحیح اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا ہبہ کا دعویٰ کرنا بھی درست لیکن اتنی بات سنی و شیعہ کے نزدیک بالاتفاق مسلم ہے کہ ہبہ بے قبض تمام نہیں ہوتا۔ تاویلی قبض و تصرف واجب کا رہے گا، اسی کی ملک بھی رہے گی۔ چنانچہ ارشاد علامہ حلی میں مطلب اول مقصد

دعویٰ میں مرقوم ہے "فَلَا تُسْمَعُ دَعْوَى الْهَبَةِ مُجَوِّدَةً عَنْ دَعْوَى الْقَبْضِ"..... "یعنی نہ سنا جائے گا دعویٰ ہبہ بے دعویٰ قبض کے" اور فدک بالاجماع تادم واپس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبضہ میں تھا، آپ عین حیات تک فدک میں تصرف مالکانہ کرتے رہے۔ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا دخل آپ کی زندگی میں نہیں ہونے پایا، اس بات میں مورخین طرفین بلکہ محدثین فریقین متفق ہیں۔ مورخین کے اخبار کے لکھنے کی اول تو اس وجہ سے حاجت نہیں کہ کتب تواریخ پر ہر کسی کو عبور میسر آ سکتا ہے، پر علم حدیث تک نوبت کسی کسی کی پہنچتی ہے، اکثر وں کو مضامین احادیث کی اطلاع نہیں ہوتی، دوم تواریخ کی بات اعتبار میں احادیث کے ہم پلہ نہیں ہو سکتی۔

دعویٰ ہبہ فدک کے بطلان پر احادیث طرفین سے استدلال

اس لیے طرفین کی روایات احادیث ہی کی طرف اشارہ کیے جاتا ہوں، پہلے تو یہ وقف ہونے کے معنی میں ہی نہیں تراشے، سنو کی روایت لیجئے، اول تو وہی روایت مشکوٰۃ جو مرقوم ہو چکی، اس بات پر بتصریح شاہد ہے۔ دوسرے مشکوٰۃ ہی میں ابوداؤد کی حدیث بروایت مالک بن انس بن الحدادان مرقوم ہے جس میں اس بات کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کے استدلال میں کہ مال فنی قابل تقسیم نہیں کچھ ایسا بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تین چیزیں جدا جدا مصرف کے لیے وقف رکھی تھیں۔ بنو النضر، خیبر، فدک، سو فدک کے مصرف کے بیان میں فرماتے ہیں "وَأَمَّا ذَلِكَ فَكَانَتْ خَبَسًا لِإِنْبَاءِ السَّبِيلِ" یعنی "فدک مسافروں کی خدمت گزاری کے لیے وقف ہے۔" اب بحکم قواعد مناظرہ تو ہمیں اپنی ہی کتابوں کا حوالہ بہت ہے کیوں کہ ورود اعتراض کے لیے ضروری ہے کہ ایسی بات ہو کہ جس پر وہ اعتراض ہو، اس کے مسلمات اور مانی ہوئی باتوں کے خلاف ہو اور در صورت یہ کہ اس کے مسلمات کے خلاف نہ ہو تو اعتراض اعتراض ہی نہیں۔ سو در صورت یہ کہ ہم نے اپنی کتابوں سے یہ ثابت کر دیا کہ فدک تادم باز پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبضہ میں رہا اور پھر کتاب بھی ایسی معجز کہ حجت، مجملہ صحاح ستہ ہے تو پھر از روئے دعویٰ ہبہ اعتراض ہی لغو ہو گیا کیوں کہ ہبہ بالاتفاق طرفین بے قبض موجب ملک ہی نہیں۔

لیکن معترض کا سکوت اور ہے اور اطمینان کچھ اور، اتنی بات سے شیعہ ساکت ہو جائیں گے لیکن بجائے خود سنیوں کی بات سے ان کا دل مطمئن نہیں ہو سکتا، اس لیے گزارش دیکر ہے، عجاج السالکین جو کتاب معتبر امامیہ ہے اور نیز دیگر کتب معتبر امامیہ میں روایت ہے جس کا اس جگہ مضمون ہی لکھے دیتا ہوں، عبارت عینہا ان شاء اللہ آئندہ مرقوم ہوگی۔ اس کا مضمون یہ ہے:

”جب ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے دیکھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ان سے کچھ لگی ہو رہی تھی اور ملنا جھوڑ دیا اور پھر فدک کے مقدمہ میں کچھ نہ بولیں تو یہ بات انہیں بڑی دشوار معلوم ہوئی۔ اس لیے یوں چاہا کہ انہیں راضی کیجئے، سو ان کے پاس جا کر عرض کیا کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی! آپ کا دعویٰ سچا ہے پر کیا کروں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ تمہارے خرچ کے موافق تمہیں دے کر اور عاتلوں کی مزدوری دے کر جو کچھ چاہتا تھا اسے فقرا اور مساکین اور ابن سبیل میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے۔ انہوں نے فرمایا تو اچھا اسی طرح کرتے رہو۔ جس طرح میرے باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ لو میں قسم کھاتا ہوں کہ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے ویسے ہی کیے جاؤں گا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا، کیا قسم بھی کھاتے ہو کہ اس طرح ہی کرو گے؟ آپ نے مکرر عرض کی کہ قسم خدا کی میں اسی طرح کروں گا، اس پر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے یوں فرمایا کہ خدایا تو گواہ رہ، سو اس بات پر راضی ہو گئیں اور عہد لے لیا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما ان کا خرچ دے کر باقی کو فقرا اور مساکین اور ابن سبیل کو دیدیا کرتے تھے۔ فقط“

سنئے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ عذر کرنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کرتے ہوئے دیکھا ہے، اس لیے آپ کے حوالے کرنے میں معذور ہوں اور پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا اس میں کچھ انکار نہ کرنا بلکہ یوں فرمانا کہ اچھا یونہی کیے جاؤ اور پھر اس پر خوشی سے راضی ہو جانا، صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تادم باز ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا قبض و تصرف تھا۔ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔

پس حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے دعویٰ پر یہ میں تکذیب نہیں کی، تصدیق ہی کی لیکن قانون شرعی کے موافق عمل کیا تا کہ آپ ناحق دینے کے وبال سے اور حضرت فاطمہ ناحق لینے کے عذاب و نکال سے محفوظ رہیں اور بایں ہمہ جو گواہ طلب کیے تو اسی لیے طلب کیے ہوں کہ اگر گواہوں سے یہ بات ثابت ہو جائے کہ واقعی فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو ہیہ کر دیا تو گو بسبب عدم قبض کے اب تک ان کی ملک میں نہیں آیا لیکن پھر اوٹی یہی ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے حوالہ کیا جائے، پر اس کو کیا کیجئے کہ شہادت اپنے نصاب کو نہ پہنچی اور پھر دعویٰ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا جو ان کے حوالہ نہ کیا تو اس کی وجہ ان شاء اللہ آگے مذکور کی جائے گی، امیدوار باید بود۔

مگر شاید کسی شیعہ مذہب کو یہ خلیان ہو کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی یہ احتیاط کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہہ میں بھی (اور بہہ بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے) وہی شرط قبض و تصرف ملحوظ رہی، کچھ دل کو نہیں لگتی بلکہ از قبیل دعا و فریب معلوم ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تو اشارہ بھی کافی تھا، آپ کا اشارہ اور اوروں کا فعل تام بھی برابر نہیں ہو سکتا، سو اس وہم کو خدا ہی دل سے کھوئے تو کھوئے، یہ اسی قسم کا وہم ہے جو ہنود اور یہود اور نصاریٰ اور مجوس کے دل میں بہ نسبت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خوارج کو بہ نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کھٹکتا ہے، ان مردودوں کو بھی نہی گمان ہے کہ یہ دعویٰ رسالت اور امامت جو ان دونوں صاحبوں سے منقول ہے۔ ایک دنیا طلبی کا ڈھنگ تھا، کچھ دل کو نہیں لگتا بلکہ از قبیل دعا و فریب معلوم ہوتا ہے۔

.....ع..... ”بدگماں وہم کی دار و نہیں لقمان کے پاس“

دوستو! اہل عقل اور اہل انصاف سے بات کہہ کر ہر کسی کا دل شاد ہوتا ہے، پر جاہل نادان نا انصاف دریدہ وہان دراز زبان سے بات کہہ کر بجز اس کے کہ اپنا مغز خالی ہو اور کچھ حاصل نہیں ہوتا، ان کا علاج تو ذرہ ہے، یہاں حدیث و قرآن اور دلائل عقلیہ کا بیان نہیں چلتا، پر یوں سمجھ کر کہ جہاں چار نادان ہوتے ہیں، وہاں ایک عاقل بھی ہوتا ہے۔ مولوی صاحب سے اُمید فہم نہیں تو کیا سارے علماء شیعہ ایک ہی سانچے کے ڈھلے ہوئے ہیں؟ اپنا مافی الضمیر عرض کرتا ہوں۔

مسئلہ شہادت اور شاہدین کی تعداد پر محققانہ بحث

جناب من اگر یہ ماجرا اور یہ سرگزشت بلا کم و کاست اس طرح ہو جس طرح شیعہ گاتے پھرتے ہیں اور بغرض محال حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے گواہ طلب کیے ہی، تو اول تو اس کی وجہ کہ کیوں گواہ طلب کیے؟ مذکور بھی ہوئی ہے۔ دوم ان شاء اللہ اور وجہ بھی معلوم ہو جائے گی لیکن در صورت یہ کہ یہ مقدمہ کسی وجہ سے ہو۔ گواہ طلب کرنے کے قابل ہو تو بلاشبہ پھر گواہ گواہوں ہی کی طرح چاہیے۔ نہیں تو مفت کا درد سر تھا۔ سو علماء شیعہ ہی فرمادیں کہ گواہوں کی کیا مقدار کلام اللہ میں بیان فرمائی ہے؟ اور اس میں پھر کسی کی کچھ تخصیص بھی ہے کہ فلاں قسم کے آدمی ہوں؟ تو پھر کچھ اس عدد اور اس کیفیت کی ضرورت نہیں، مع ہذا صدق نیت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر یہ بات گواہ ہے کہ ان کی خلافت میں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے یہ بات کہی کہ میں نے مرض وفات میں سرور کائنات علیہ افضل الصلوٰات و اکمل التحیات سے ”حکم“ کے بلوائے کی اجازت لے لی ہے تو انہوں نے ان سے بھی گواہ طلب کیا۔ اگر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو

حاذی اللہ کچھ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے بزم شیعہ کاوش بھی تھی تو حضرت عثمان سے تونہ شیعہ دینی محبت اور موافقت اور دوستی ہی تھی، پھر کچھ دینا بھی نہیں پڑتا تھا۔ شیعہ مذہب سنتے تو توجہ کا احتمال ہو، پھر جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے انہوں نے گواہ طلب کیے تو کیوں کیے؟ یہ باتیں کمال دیانت اور استقامت پر دلالت کرتی ہیں۔

لیکن شیعہ اپنی عداوت سے ناچار ہیں۔ کہنے بجانے ان کا قلب تیرہ دتار کر دیا ہے حق و باطل کی تمیز نہیں رہی، اچھی باتوں کو برا اور بری باتوں کو اچھا سمجھتے ہیں۔ سو اس کا حجاب تو ہماری طرف سے چھ سو برس پہلے شیخ سعدی کہہ گئے ہیں:

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد عیب نماید هنرش در نظر

باقی یوں کہتا کہ گواہ ثبوت دعویٰ کے لیے ہوتے ہیں اور جب مدعی کی طرف سے خاطر جمع ہو کہ یہ جھوٹ نہیں بولتا، تو پھر کیا ضرورت ہے کہ گواہ طلب کیے جائیں تو اس کی جواب دہی خدا کے ذمہ ہے کیونکہ خدا ہی نے علی الاطلاق یہ حکم دیدیا ہے کہ بدوں دو گواہ اعتبار نہ کیا کرو یہ قانون سنیں نے نہیں گھڑ لیا، بہر حال خداوند کریم نے اہل بیت یا اصحاب یا کسی ولی یا صالح کا استہنام نہیں کیا، سنیں کو تو خدا کے اتباع سے کام ہے۔ شیعہ بھی اگر اتباع خداوندی کریں تو فیہا نہیں تو اپنا سر کھائیں۔

اگر یہ بات نہ ہوتی تو سنی یہ حکم کا ہے کہ اگر کوئی شخص چارہ دیکھے اور اس کی گواہی بسبب تنہائی یا اتہام فسق و فجور قاضی قبول نہ کرے تو لازم ہے کہ وہ سب کے شریک حل رہے اور روزہ رکھے یا اگر دو غبار میں محاق کے دو روز کے اعتبار سے اگر کبھی ائمہ یوں کا چارہ ہوتا تو ائمہ یوں کو اظہار کر لیا کرتے۔ علیٰ ہذا القیاس صلحا اور علماء یا صالحات عورتوں کی گواہی میں یہ قید تو ہو جاتی بلکہ جن کفار کا صدق مقال تجر بہ معلوم ہو جاتا ہے اور بہت سے نام کے مسلمانوں سے زیادہ سچے نکلتے ہیں ان کا کہنا خواہ ایک ہو یا زیادہ قبول ہوا کرتا، بالجلہ اس بات میں اپنے اطمینان کا اعتبار نہیں، پابندی قوانین مد نظر ہے تاکہ امتحان عبودیت اور خود مختاری ہو جائے۔

ہاں حکمت اور مصلحت اس قانون میں البتہ یہی ہے کہ ثبوت حق ہو جایا کرے، سوائے رائے پر حکام وقت کے چھوڑا جائے تو اوّل تو امدیشہ رود رعایت، دوسرے ہر کسی کو یہ دعویٰ ہو سکتا ہے کہ میری بات قابل اطمینان ہے۔ بس جس صلح اور انتظام کے لیے کام مقرر کیے جاتے ہیں، وہ صلح اور انتظام تو درکنار؟ البتہ فساد اور جنگ و جدال کی توقع ہے۔ اس لیے قانون کلی مقرر کر دیا جس میں اکثر مصلحت مذکورہ پائی جائے، سو برخلاف اس کے اگر کسی

صورت میں کبھی مصلحت مذکورہ نہ بھی پائی جائے گی تو اس کا اعتبار نہ ہوگا۔

الغرض یہ وہم (کہ ہم حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے صدق مقال کے ہالاتفاق شیعہ و سنی قائل ہیں۔ پھر کیا ضرورت ہوئی کہ گواہ طلب کیے گئے؟ اس مطالبہ گواہان سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے بدگمانی ٹپکتی ہے، یا نادہندی کی مؤآتی ہے) بسبب کوتاہ فہمی کے پیدا ہوتا ہے۔ یہاں فہم والوں سے کلام ہے، نادانوں سے کام نہیں۔

سیدہ تو ضابطہ شہادت کی بہت زیادہ پابند ہوں گی

مع ہذا سب جانتے ہیں کہ مدار بزرگی اطاعت خداوندی پر ہے۔ چنانچہ کلام اللہ میں خود فرماتے ہیں ”اَنْ اَكُوْمَكُم عِنْدَ اللّٰهِ اَتَقَكُم“ یعنی بیشک اللہ کے نزدیک زیادہ تعظیم و تکریم اسی کی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو، تو اس صورت میں لازم پڑا کہ ان قوانین کی رعایت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو زیادہ تر ہو اور جو ان قوانین کی رعایت کرے وہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو زیادہ محبوب اور اس کی آپ کے دل میں زیادہ جگہ ہو۔ سو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا گواہوں کا طلب کرنا بقرینہ آیت مذکورہ موجب نشاط خاطر مبارک حضرت زہرا رضی اللہ عنہا ہوا ہوگا، پھر نہ معلوم کہ شیعہ کیوں لڑتے مرتے ہیں، یہ وہی مثل ہے کہ مدعی اور مدعا علیہ تو راضی ہو گئے، پر قاضی جی راضی نہیں ہوتے۔ اور اس تقریر سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ گواہوں کا جھوٹا جاننا کچھ اور ہے اور ان کی گواہی کے موافق حکم نہ دینا کچھ اور ہے؟ جب تک کہ شہادت اپنی مقدار کو نہ پہنچے، یعنی دو مرد عاقل بالغ یا ایک مرد اور دو عورتیں ہاں صفت موصوف نہ ہوں، تب تک حاکم کو جائز نہیں کہ ان کے کہے کے موافق مدعی کی ڈگری کر دے۔ اگرچہ کیسے ہی معتبر کیوں نہ ہوں اور ان کے کہنے سے کتنی ہی تسلی کیوں نہ ہو جائے، سو اس حکم نہ دینے اور ڈگری نہ کرنے کو کوئی نادان ہی یوں سمجھے تو سمجھے کہ گواہوں کی تکذیب کی۔ ہاں در صورت یہ کہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ایک مقدمہ میں موافق مدعی کے متفق اللفظ ایک بات کہیں تو پھر بجز عدم اعتبار گواہان کے کوئی صورت ڈگری نہ کرنے اور مدعا علیہ سے قسم لینے اور مدعی کے دعویٰ کے نہ سننے کی نہیں۔ سو شیعوں کے کہے موافق اگر اس روایت کو ہم تسلیم بھی کر لیں تب ظاہر ہے کہ حضرت علی اور حضرت ام ایمن کی گواہی نصاب مذکور کو نہیں پہنچتی بلکہ حضرت حسنین کی گواہی مل کر بھی (جیسا کہ جناب دروغ مآب مولوی عمار علی صاحب پچر لگاتے ہیں) مقدار مذکور اور حد مسطور کو نہیں پہنچتی کیونکہ دونوں صاحبزادے اس زمانہ تک نابالغ تھے۔

سو اس گواہی کے موافق حکم نہ کرنے میں یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے

حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو اور ان کے گناہوں یعنی حضرت علی اور حضرت امین ابی بنی ہاشم کو بھی جاناہلان کی استقامت شریعت اور سنت پر ثابت ہوتی ہے لیکن نقصان فہم کا کچھ علاج نہیں، بیوقوفوں کی اصلاح انبیاء سے بھی نہیں ہوتی، ہم تو کس شہر میں ہیں۔ شاہد اس کا یہ ہے کہ امام خزانہ کی بعض کتابوں میں کچھ ایسا لکھا ہے کہ ایک بار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سار کی طرف بھاگے جاتے تھے کسی نے عرض کیا، آپ ایسا اتنا خزانہ اس طرف کیوں جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ایک بلبل آتا ہے جس نے عرض کی کہ پھر آپ کو کیا اندیشہ؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ بیوقوفی کا کچھ علاج نہیں، وہ کسی کے فعلِ محبت یا برکت سے ذرا اٹھ نہیں ہوتی، اُلٹے اُلٹے کا اثر پڑ جائے تو پڑ جائے فقط ملوہ کسی نے سچ کہا ہے کہ:

لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ وَإِذَا يُسْتَطِبُّ بِهِ إِلَّا الْجَنَافَةَ دَاءٌ لَا دَوَاءَ لَهَا

”یعنی ہر بیماری کا کچھ نہ کچھ علاج ہے جس سے اس کے زائل ہونے کی تدبیر کی جاتی ہے پر حماقت ایسی بیماری ہے کہ اس کا کچھ علاج ہی نہیں۔“

منہج الکرامت کی روایت کے مطابق

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فدک سیدہ کو دے دیا تھا

اور اگر بایں ہمہ بیان واضح شیعوں کی دل کی گھمٹ نہ کھلے اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ جیسے صادق کی طرف گمان قاسد ہی رہے تو لیجئے اب تو زبان کو لگا دو بجے اور اپنا کام کیجئے یہ روایت کتاب منہج الکرامت میں جو شیخ ابن مطہر علی کی تصنیف ہے، موجود ہے۔ انہوں نے سنیوں کی طرف سے جواب شافی و کافی لکھ رکھا ہے۔ القصہ اہل سنت کو تخفیف تصدیق ہوئی اور انہیں کی ملاٹھی انہیں کا سر۔

”وَكَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ وَكَانَ اللَّهُ فَوْقًا غَزِيرًا“ وہ روایت یہ ہے ”لَمَّا وَغَطَّتْ فَاطِمَةُ أَبَا بَكْرٍ لِيُفِدَكَكَ كَتَبَ لَهَا بِحَاثَا وَرَدَّهَا عَلَيْهَا“

”یعنی جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دربارہ فدک دینا و پسند کیا تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فدک کی جاگیر کا کاغذ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نام لکھ کر فدک انہیں کو ہٹا دیا۔ فقط“

در صورت یہ کہ یہ روایت صحیح شیعوں کی ایسی معجز کتاب میں جس کا نام منہج الکرامت اور پھر تصنیف ایسے علامہ کی جس کا نام ابن مطہر علی ہو پائی جائے تو پھر سنیوں سے کیوں اُلجھتے پھرتے ہیں؟ اس روایت کے قربان جائیے، اس روایت نے تو شیعوں کو تین پانچ کے قابل نہیں رکھا، اب

تک مولوی صاحب نے بہہ اور میراثی کا دعویٰ کیا تھا۔ وصیت یا بیع یا کسی عمل کی اجرت کا احوال باقی ہے۔ سو ہماری طرف سے اس کی بھی اجازت ہے کہ لگتے ہاتھ ان وجوہ سے بھی طعن کر لیں، کسر نہ چھوڑیں، سنیوں کا کچھ لحاظ نہ کریں، اول تو ان کو یہ روایت مل گئی ہے، دوسرے ان کی پشتی پر خدا ہے جہاں اس روایت کا پتہ لگا دیا، آگے بھی وہ کام چلا دے گا۔

اب سننے کی بات ہے کہ مولوی صاحب ہر بات میں اپنی کتابوں سے جھوٹے ہوتے جاتے ہیں اور سنیوں کی کتابوں سے مات کھاتے جاتے ہیں یہاں تک تو ناظرین کو معلوم ہی ہو گیا اور آگے اور ان شاء اللہ معلوم ہو جائے گا، سوخن ہائے گزشتہ کے دروغ ہونے سے علاوہ اب جس بات کا جملہ ناظر نظر ہے۔ وہ یہ ہے کہ اول تو مولوی صاحب کا یہ طوفان دیکھئے کہ حضرت علی اور ام ایمن کی گواہی کا بیان لکھتے لکھتے یہ جولانوں پر آئے کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو بھی ساتھ سان لیا۔ یہ نہ شرمائے کہ الزام خصم کے لیے ضرور ہے کہ وہ بات لکھئے جو اس کے نزدیک بھی مسلم ہو۔ سو مسلم ہونا تو معلوم؟ جو روایت کہ سنیوں کے نام لگا رکھی ہے۔ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کا نام تو اس میں بھی نہیں، اور اگر اپنے بہتانوں اور اپنے کتب خانوں کے بھروسے سنیوں کو الزام دیتے ہیں تو یہ الزام تو مثل فوارہ انہیں کے سر پر پڑے گا ورنہ یوں تو پھر ہر بات ہر شخص سے ہاریں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر عمار علی کا بہتان

دوسرے مولوی صاحب کا یوں رقم فرمانا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تو جاگیر نامہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے نام لکھ دیا تھا، پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھاڑ ڈالا، مولوی صاحب نے کیا سمجھ کر لکھا ہے؟ یا بے سمجھی لڑنے کو دوڑتے ہیں، سنیوں کی کتابوں سے اگر لکھتے ہیں تو سنیوں کی کتابوں میں تو اس بات کا پتہ بھی نہیں اور اگر اپنی کتابوں کے بھروسے پر زبان درازیاں ہیں تو اس کا اول تو یہ جواب ہے کہ ”جواب جاہلاں باشد خوشی“ سبحان اللہ ایسا مناظرہ کسی نے نہ سنا ہو گا کہ اپنی کتابوں کے کیا بلکہ اپنے خوابوں کے بھروسے دوسروں کو الزام کا ارادہ رکھیں، دوسرے منہج الکرامت کون سی سنیوں کی کتاب؟ اور شیخ ابن مطہر علی کون سے سنی؟ یا حضرت عمر اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما کی خالہ کے بیٹے تھے؟ جو اتنا جملہ زائدہ یعنی پھاڑ ڈالنے کا قصہ ہضم کر گئے؟

مولوی صاحب تو نئے ہی مفتری ہیں، شیخ ابن مطہر علی ان کے بھی پیشوا اور استاد ہیں اور حقد میں سابقین میں سے ہیں جو بات مولوی صاحب میں ماشہ بھر ہوگی۔ وہ ان میں من بھر سمجھنی چاہیے، اگر اس بات کا جھوٹا سچا کچھ بھی پتہ ہوتا تو وہ تو سوئی کو بھالا کر دکھاتے، ہاں مجھ سے غلطی

ہوئی، بہت سے شاگرد رشید استاد سے بڑھ جاتے ہیں، شیخ مطہر علی میں ایک بڑا قصور رہ گیا تھا، وہ اپنے محل طور رکھتے تھے پر چشم بد دور مولوی صاحب اس قصور سے بھی مبرا ہیں۔

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے حضرت جابر رضی اللہ عنہ

کو بغیر شہادت کے مال دینے کے وجوہ

اب مولوی صاحب کی یہ شکایت باقی رہی کہ ابوبکر صدیق نے حضرت جابر رضی اللہ عنہما کی بات تو بے گواہوں کے مان لی، پر ستم تو یہ ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہما کی بات باوجود ایسے سحر گاہوں کے بھی نہ مانی، سو اس کا اول جواب تو یہی ہے کہ یہ روایت اگر سنیوں کی کتابوں میں ہوتی تو البتہ اس شکایت کا کم فہموں کے نزدیک محل اور موقع تھا اس روایت کا سنیوں کی کتابوں میں ہونا نہ ہونا اور اس کا موضوع ہونا نہ ہونا دیکھنے والوں پر ان شاء اللہ بخوبی واضح ہو جائے گا اور بے اس کے کہ سنیوں کی کتابوں میں یہ روایت پائی جائے یہ شکایت کرنی اپنی فہم و فراست کی خوبی بیان کرنی ہے۔ اگر یہی الزام ہوا تو کل کو سنی پنڈتوں کی پوتھیوں اور سکھوں کی گرتھ اور یہود و نصاریٰ کی توریت و انجیل محرف کے لکھے ہوئے سے ملزم ہو جائیں گے؟ اور ان کتابوں کی باتیں مان جائیں گے اور شیعوں کو تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان کا سب طرف لیکھا ہے۔ ہندو یا سکھ بن جاتے ہیں تو انہیں کچھ نقصان نہیں اور یہود و نصاریٰ کے ہم مذہب ہو جاتے ہیں تو انہیں کچھ زیاں نہیں، اگر اعدائے تلویل نہ ہوتا تو مٹا دیتا کہ شیعوں کو ان سب کے ساتھ ایسی نسبت ہے جیسے حیوان مشہور سکی بہ اثر گاؤں پلنگ کو اونٹ اور بتل اور چیتے سب کے ساتھ نسبت مشابہت ہے۔

اور سلنا کہ یہ روایت سنیوں کی ان کتابوں میں جن کا حوالہ مولوی صاحب دیتے ہیں، کسی ایک دو نسخہ میں ہے بھی؟ تو اول تو وہ کتابیں غیر مشہور اور غیر معتبر، دوسرے وہ بھی شیعوں کا الحاق ہے۔ چنانچہ تحقیقات مسطورہ بالا کو دیکھ کر ناظرین کو ان شاء اللہ شبہ نہ رہے گا اور بایں ہمہ پھر وجہ طلب گواہاں معلوم ہو چکی ہے، اس کے ملاحظہ سے آپ واضح ہو جائے گا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قصہ (یعنی ایسے مال کا بے شاہد دے دینا جو ایسوں ہی کے دینے کے لیے ہے اور قسم کا ہی اعتبار کر لینا، اس کو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہما کے قصہ کے ساتھ (جس میں بے تحقیق دے دینے میں اعدائے حق تعلق فقراء و مساکین و ابن سبیل تھا) کچھ نسبت نہیں جو اس کو اس پر قیاس کیا جائے۔ مع ہذا گواہوں کا طلب کرنا قضیہ فداک میں ہو سکتا ہے کہ بوجہ خیر خواہی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہما ہو۔

تفصیل اس اجمال کی ہر چند معلوم ہو چکی، پرانا انصافوں سے کام پڑا ہے۔ اس لیے مکرر عرض ہے کہ باتفاق شیعہ و سنی اس میں تو کلام ہی نہیں کہ تادم باز پسینہ فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبض و تصرف میں رہا، پھر جب ابو بکر صدیق کو یہ بات معلوم ہو چکی ہو کہ متروکہ انبیاء وقف ہو جاتا ہے اور بہہ بے قبض مفید ملک نہیں ہوتا تو اس میں تو کلام ہی نہ تھا کہ یہ چیز حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی ملک تو نہیں، پھر جو گواہ طلب کیے جائیں تو اس لیے تو ہو ہی نہیں سکتا کہ تحقیق ملکیت مد نظر تھی جو کسی نادان کو یہ شبہ پڑے کہ ہائے افسوس حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بات تو گواہوں کی گواہی سے ثابت ہو اور جابر رضی اللہ عنہ کی خبر بے گواہوں کے سنی جائے اور بے تکرار مسلم ہو۔ بجز اس کے اور کوئی احتمال نہیں کہ شاید گواہوں کی تقریر سے کوئی اشارہ نبوی اس جانب پایا جائے کہ فدک کو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا ہی کو دے دینا چاہیے، اب کوئی عاقل غور کر کے فرمائیں کہ یہ بات حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی دوستی اور خیر خواہی کی بات ہے یا دشمنی اور بدخواہی کی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو نہ دینے میں خلاف وعدہ کا احتمال

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف عائد ہوتا ہے

مگر مولوی صاحب کی عقل تو حاشیہ نشین لے اڑے ہیں، وہ بھی سمجھتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا اعتبار نہ ہوا اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا اعتبار ہوا۔ مع ہذا حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے نہ دینے میں یہ احتمال تھا کہ ہر خبر جموٹی تو ہوتی ہی نہیں۔ اگر واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے وعدہ کیا تھا اور پھر ان کو اس وعدہ کے موافق نہ دیا جائے گا تو ایک گونہ خلاف وعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف عائد ہوگا اور یہ خلاف وعدگی ہر چند مجبوری تھی کیونکہ تادم آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مال بحرین نہ آیا لیکن شان نبوت بہت رفیع ہے اور پھر نبوت بھی کس کی نبوت؟ اس مرتبہ رفیع پر اتنا قصور بھی نازیبا ہے خصوصاً جب یہ لحاظ کیا جائے کہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم روضہ مبارک میں زندہ اور حضرت ابو بکر بمنزلہ داروغہ آپ کے کارکن اور مال بحرین موجود، اگر واقع میں وعدہ وقوع میں آیا ہے اور در صورت طلب گواہان حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے پاس گواہ نہ لکھے؟ کیونکہ کچھ ضروری نہیں کہ کسی کے سامنے ہی وعدہ کیا ہو تو اس صورت میں لاریب مالکوں کے نزدیک اخلاف وعدہ بجانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عائد ہوگا۔

القہ متقضائے احتیاط ایسے امر میں یہی تھا کہ بے طلب گواہان کا مطالبہ پورا کیا جائے، اگر

وعدہ واقعی تھا تو فیہا ورنہ کچھ نقصان نہیں۔ آخر وہ مال صحابہ ہی پر تقسیم ہوا۔ خلاف مذک کے کس کے دینے میں لاریب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی نظر آتی تھی، بسبب بعدہ محترہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ تادم آخر مذک مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھا اور جب آپ کی وفات ہوئی تو وہ بمقتضائے حدیث ”مَا تَرَ كُنْهَ صَدَقَةٌ“ کے جس کی تحقیق کا ہم وعدہ کرتے چلے آتے ہیں اور اب ان شاء اللہ تعالیٰ بہت ہی قریب اس کا ذکر آتا ہے، وہ وقف ہو چکا تھا، کسی جینا جی یا بھائی برادر، بیوی، باندی کا اس میں حق نہ تھا۔ پھر اس کو کسی کے دعوئی کے باعث دے دیا۔ اس حدیث کے موافق عمل نہ کرنا ہے مگر مولوی صاحب کے مذہب میں جو ارشادات نبوی پر چلے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایفاء وعدہ اور اداء قرض کا بے وصیت خیال رکھے، اس سے ہر ما کوئی نہیں، آپ عمل نہیں کرتے، پھر جو عمل کرے گا، وہ آپ پر اگلے گا۔

ال انصاف کے نزدیک تو اتنی بات بھی (کہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور مال بحرین آیا تو انہوں نے یہ منادی کرا دی کہ اگر کسی کا کچھ قرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ہو، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے کچھ وعدہ کیا ہو تو وہ ہمارے پاس آئے، ہم اس کو بھگتا دیں گے اور پھر بے دستاویز، بے گواہ دینا شروع کیا۔ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اسی منادی کے باعث چند سوکھا لیے) اس بات کے لیے دلیل کامل ہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حق تلفی الی بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کا خطرہ بھی نہیں گزرا۔ چہ جائیکہ کوئی چیز دہالیں، کسی عاقل کے تصور میں آ سکتا ہے کہ جو شخص نقد اس خیال پر کہ مبادا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ کسی کا قرض رہ جائے یا آپ کی بات میں فرق آ جائے، بے تحقیق تھیلیوں کا منہ کھول دے، ایسا کھلا ہوا حق پھر وہ بھی جگر گوشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس طرح سے دبا بیٹھے۔

علاوہ بریں نہ آپ کھایا نہ اپنوں کو کھلایا بلکہ بدستور قدیم الی بیت اور مصارف مقررہ میں صرف کیا اور مفت دنیا کی ملا تیں اور بار عذاب آخرت سر پر لیا، کوئی حضرات شیعہ سے پوچھے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ جیسے ہوشیار کو کہ جس کی ہوشیاری کی قسم کھائی جائے، غصب کرنا بھی نہ آتا تھا اور ان سب کو جانے دیجئے۔ ایسا فرق لیجئے کہ الی عقل حضرات ابو بکر کی فہم و عقل پر آفرین اور علماء شیعہ کی کچی عقل اور بلا دلت طبع پر نفرین کریں۔ وہ فرق یہ ہے کہ دعوئی بہ مذک جو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا سے بزعم شیعہ ظہور میں آیا تو سنیوں کے طور پر تو منشاء حدیث صحیح ”مَا تَرَ كُنْهَ صَدَقَةٌ“ کے جس کا عنقریب ان شاء اللہ ذکر آتا ہے۔ معارض اور مخالف تھا اور شیعوں کے طور پر استحقاق

ورثہ نبوی کے منافع اور دعویٰ جابر رضی اللہ عنہ کے کوئی استحقاق یا کوئی حدیث معارض اور مخالف نہ تھی کیونکہ جس مال میں سے ان کو دیا گیا، وہ مال کسی کے ترکہ کا نہ تھا اور نہ کوئی حدیث اور نہ آیت اس کے بیان تصرف کے لیے نازل یا وارد ہوئی تھی بلکہ وہ مال یا خمس یا عشر یا خراج کی قسم کا تھا۔ سو حضرت جابر رضی اللہ عنہ بہر طور اس کا استحقاق رکھتے تھے۔

اور یہ بھی اہل عقل پر ظاہر و باہر ہے کہ گواہ تعارض کے رفع کے لیے ہوتے ہیں اور ایک جانب رائج کر دیتے ہیں۔ اسی واسطے دو متضامین کے رفع مخالفت کے لیے گواہوں کی ضرورت پڑی اور در صورت یہ کہ کوئی خبر یا دعویٰ بلا حرام عقلی یا نقلی، یا خبری یا عیانی کے پایا جائے اور مخبر اور مدعی بھی مؤمن مسلمان ہو تو پھر حکم نبوی یہ ہے کہ ”ظَنُّوا الْمُؤْمِنِينَ خَيْرًا“ اب التماس یہ ہے کہ حضرات شیعہ اگر دو چار گمڑی کے لیے کسی سے عقل مستعار لے کر اس فرق میں غور فرمائیں تو اس فرق کے مان جانے میں کچھ کلام نہیں ورنہ ایسے ہی عقل کے دشمنوں کے لیے کلام اللہ میں ”أَفَلَا تَعْقِلُونَ“ آیا ہے۔ اگر بوجہ یاد نہ ہونے کلام اللہ کے یہ خطاب کان تک نہیں پہنچا تو یہ سفارت ہمیں کرتے ہیں۔

جب نوبت یہاں تک پہنچی تو اب یہ اور التماس ہے کہ دقیقہ سنجان معانی رس پر تقریر سے واضح ہو گیا ہو گا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے گواہوں کا طلب نہ کرنا، چنانچہ روایات صحاح میں موجود ہے اور نیز حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے گواہوں کا طلب کرنا، اگر بالفرض و تقدیر بغرض محال جیسے حضرات شیعہ فرماتے ہیں، واقع میں وقوع میں آیا ہو؟ تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کمال فہم اور نہایت اطاعت و اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دلالت کرتا ہے، اگر یہ دونوں باتیں معیوب ہیں تو مولوی صاحب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر بایں وجہ طعن کرنے میں معذور ہیں اور لاجرم طاعمان ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مصیب بصواب اور ماجور ہیں لیکن اس صورت میں بڑی تعریف کی بات یہ ہوگی کہ فلا نا بڑا گدھا ہے اور سر تا پا بیوقوف ہے، فسق و فجور میں یکتائے روزگار، دروغ و بے دماغی میں مشہور ہر کوچہ بازار۔

سو اس صورت میں ہم کو مولوی صاحب کی تعریف کرنی لازم ہے مگر نظم تو سر دست بن نہیں پڑتی، ملا زمان مولوی صاحب کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ آپ عنایت فرما کے یہ قدر قلیل نثر ہی قبول فرمائیں۔ سبحان اللہ اس فہم و فراست پر اصحاب کبار پر یہ زبان درازیاں؟ پھر اس پر یہ دھوکے بازیاں؟ کہ عوام کو ایک ہار تو یہی یقین ہو جائے کہ مولوی صاحب کی بات سراسر بجا و درست۔ اُغنی آپ میرا در علی صاحب کو رقم فرماتے ہیں ”اب فرمائیے یہ غصب نہیں تو کیا ہے؟ سو اس کے اور

نصب کس کو کہتے ہیں اور یہ عداوت ہے یا دوستی؟ اور مروت اور رعایت حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ اور حق اور سچ تو یہ ہے کہ اہل بیت کی دشمنی میں حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی رعایت نہ کی، آپ نے لکھا تھا مجھے غصب فدک کی کسی سے صحت نہیں ہوتی، اب آپ کو چاہیے کہ میری صحت علماء اہلسنت سے کرائیے اور میری باتوں کا جواب لکھوا کر بجھوادئیے کہ کیا سبب ہے کہ جابر کو چاچا جانا اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جھوٹا سمجھا؟ اور اس مظلومہ کے گواہوں کو بھی رذ کیا، اتنی بلفظ۔ سو منصفان لہمیدہ اور لہیمان سنجیدہ کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ مولوی صاحب کو میرے لکھے ہوئے جواب سمجھا کر یہ سمجھا دیں کہ دیکھو یوں جواب لکھا کرتے ہیں لیکن اس کا کچھ علاج نہیں کہ مولوی صاحب کی یہ درخواست ہے کہ میری صحت علماء سنت سے کرائیے۔ مولوی صاحب تو سراپا غلط ہیں، غلط کا صحیح کرنا اور صحیح کہنا سنیوں کو نہیں آتا، ہاں غلط کی جگہ صحیح بنا سکتے ہیں۔ اس لیے اتنا ہو سکتا ہے کہ ملازمان مولوی صاحب سے یہ کہا جاوے کہ مولوی صاحب غلط ہیں، جب ہی تو اپنی صحت کراتے ہیں، ملاحظہ و باطن سے صحیح علماء اہل سنت ہیں، اگر ہدایت منظور ہے تو غنیمت سمجھو۔

خیر یہ قصہ تو بہت دور دراز ہے، مولوی صاحب کی ہدایات بے معنی کا جواب چاہیے اور ان کی حقیقت الامر کھول کر دکھلائیے تا کہ معلوم ہو جائے کہ مولوی صاحب اپنے ہوش میں نہیں۔ اس بیداری میں جو اوروں کے خواب سے بدتر ہے۔ مولوی صاحب پڑے بڑاتے ہیں ورنہ عقل کا کام نہیں کہ باوجود ایسے دلائل واضحہ کے جن کا مذکور ہو چکا، پھر بھی غصب فدک کا ان کے دل میں خیال آئے اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے عادل متقی اور مطہع خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ظالم ٹھہرائے، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس اگر اور فضائل گونا گوں نہ ہوتے تو یہی حکایت ان کی فضیلت کے لیے بہت تھی کیونکہ عاقل سمجھتے ہیں کہ ملامت دنیا خاص کر اہل عزت سے بے سبب نہیں اٹھائی جاتی۔ دین دار دین کی عزت اور دنیا دار دنیا کی عزت کو جان و مال سے عزیز سمجھتے ہیں اور عزت بھی عزیز نہ ہو تو پھر کون سی چیز عزیز ہوگی، اسی کا عزیز ہونا ہے کہ عورتیں باوجود یہ کہ مرد نہیں نامرد ہیں، غیرت کے پتے جان کو تلف کر دیتی ہیں اور ڈوب مرتی ہیں، یا زہر کھالتی ہیں، مردوں کا تو کیا ذکر؟

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جان بوجھ کر ہدف تیرہائے ملامت ناکساں ہونا کیونکہ ایسے مواقع میں ہر کوئی جانتا ہے کہ یہی انجام ہوتا ہے۔ بجز اس کے نہیں ہو سکتا ہے کہ پابندی خداوند عظیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مجبور تھے ورنہ جو شخص نہ خود کھائے نہ اپنوں کو کھلائے، کاہے کے لیے کسی کی چیز دبائے؟ ایسا شخص اگر ایسے موقع میں ایسے شخصوں سے تو گواہ طلب کرے اور حضرت جابر

رضی اللہ عنہ سے طلب نہ کرے (قطع نظر وجوہ مذکورہ بالا کے)۔ بجز اس کے اور کوئی احتمال نہیں ہو سکتا کہ انصاف اور اہل انصاف کو لازم ہی ہے کہ رو در رعایت کے موقع میں زیادہ تشدد اور سخت گیری سے پیش آیا کریں اور غیروں سے بہ نسبت انہوں کے نرم رہا کریں اور ظاہر ہے کہ اپنے اقرباء کی رو رعایت نہ کرنے میں بوجہ محبت فقط اپنا دل ہی دکھا کرتا ہے۔ کچھ اندیشہ ملامت نہیں ہوتا بلکہ اُمید کلمۃ الخیر ہوتی ہے اور اپنے پیر زادوں اور بزرگ زادوں کی رو رعایت نہ کرنے میں مریدانِ جان نثار کا بوجہ محبت دل جدا دکھا کرتا ہے اور بوجہ اندیشہ ملامت جان پر جدا ہی بنا کرتی ہے۔

سو جب اپنے قرابتیوں کی رو رعایت نہ کرنی اور غیروں سے نرمی برتنی محمودِ خلاق ہوئی تو پیر زادوں کی رو رعایت نہ کرنی اور بھی زیادہ سمجھنی چاہیے اور جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی پیر زادی ہو کہ نہ اس رُتبہ کا کوئی پیر زادہ ہوا ہے، نہ ہوا اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا مرید ہو جس کی صدق و وفا اور جاں نثاری اور اُلفت اور محبت اور خدمت گزاری کے کلام اللہ اور اقوالِ عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، چنانچہ گزرا، دو گواہ عادل کیا بلکہ اس بات کے گواہ ہوں کہ ایسا یا روفا دار نہ کوئی ہوا ہے نہ ہو کیونکہ ایسے رُتبہ والے ایسے ویسے کی ایسی تعریف نہیں کیا کرتے تو اس صورت میں حکمِ خداوندی پر قائم رہنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے مرد کا کام ہے، نہ وہ ہوں نہ اتنی دشواری اور اس قدر ملامت عوام کا لانعام اور دشنام ہائے حیثیتانِ نافر جام اپنے سر پر اٹھائیں، پر زوف ہے شیعوں کی عقل پر کہ ان کو خوبیاں بھی برائی ہی نظر آتی ہیں۔

چشم بد اندیش کہ بر کندہ باد عیب نماید ہنر تو در نظر
”مطیعانِ خدا پر طعن اور تشنیع کرتے ہیں، سمجھتے ہی نہیں یہ رافضی ان کو خدا سمجھے۔“

شیعوں کی اہل بیت سے اور نصاریٰ کی

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ایک جیسی محبت ہے

طرفہ تماشا ہے کہ بیدین دینداروں پر بے دینی کی تہمت لگائیں اور مخلصانِ قدر شناس کو مقتدیانِ عبد اللہ بن سبا یہودی دشمن اہل بیت بتائیں۔ اگر قدر شناسوں سے حد سے گزر جانے والے بڑھ جایا کریں اور قدر شناس دشمن سمجھے جایا کریں؟ تو نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے محبت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دشمن ہونے چاہئیں۔ غور کر کے اگر دیکھیں، مفرطانیِ محبت اس کا محبت نہیں جس کی محبت کا مدعی ہوتا ہے بلکہ اپنی خیالی تصویر

حاجب ہوتا ہے۔ نصاریٰ جو دعویٰ محبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کرتے ہیں تو حقیقت میں ان سے محبت نہیں کرتے کیونکہ دار و مدار ان کی محبت کا خدا کے بیٹا ہونے پر ہے۔ سو یہ بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں تو معلوم؟ البتہ ان کے خیال میں تھی۔ اپنی تصویر خیالی کو پوجتے ہیں اور اسی سے محبت رکھتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خداوند کریم نے ان کی واسطہ داری سے برطرف رکھا ہے۔

ایسے ہی شیعہ بھی اپنی خیالی تصویر سے محبت کرتے ہیں۔ آئمہ اہل بیت سے محبت نہیں کرتے، اس محبت پر محبان قد رشناس کو دشمن اہل بیت سمجھتا ایسا ہی ہے جیسا نصاریٰ بزم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت کو دشمن عیسیٰ سمجھتے ہیں۔ دشمن اہل بیت تو اسے کہتے ہیں کہ حضرت زقیہ اور حضرت ام کلثوم دختران مطہرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو آپ کی بیٹیاں ہی نہیں سمجھتے حالانکہ کلام اللہ اور احادیث کلینی وغیرہ اور اقوال حضرت امیر رضی اللہ عنہ اس بات پر شاہد ہیں اور حضرت عائشہ محبوبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ محدوحہ جناب کبریا کو جن کی طہارت اور بزرگی میں سورۃ نور میں آیات متعددہ موجود ہیں اور سوا ان کے اور بیسیوں کو جو شہادت آیت کریمہ ”وَآزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ“ تمام مؤمنین کی مائیں ہیں اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ عم بزرگوار سید الارسل اللہ علیہ علی آلہ البجبار اطہار کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کے بیٹے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو جو سوا اس کے اور بھی نام طے رکھتے ہیں اور حضرت سید الشہداء شہید کربلا رضی اللہ عنہ کے داماد مصعب بن زبیر اور حضرت عمر فاروق داماد حضرت زبیر رضی اللہ عنہا اور حضرت زید شہید فرزند سعید حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ اور سوا ان کے اور اقربا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اولاد امجاد آئمہ اطہار کو جو شہادت لفظ محترت اور اہل بیت میں داخل ہیں۔ شیعہ کافر اور مرتد سمجھتے ہیں اور دشنام ہائے نافر جاہودیتے ہیں۔

چنانچہ کچھ کچھ اوپر گزرا، پھر ان بے حیاؤں کو غیرت نہیں آتی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو دشمن اہل بیت بتاتے ہیں۔ اگر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے عداوت ہوتی تو اہل سنت میں سے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کوئی نام بھی نہ لیتا یا مثل خوارج کوئی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جعظیم یاد بھی نہ کرتا بلکہ الٹی نحوذ ہا اللہ جیسے شیعہ اصحاب کفار پر حرا کرتے ہیں، حرا کیا کرتے، اب مولوی صاحب کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ آپ کا یہ کہنا وائے بردینداری اہلسنت ارنخ، انصاف فرمائیے صحیح ہے یا ہمارا یہ کہنا کہ وائے بردینداری و عقل و ہوشیاری شیعہ خصوصاً مولوی عمار علی صاحب کہ صحابہ کی دشمنی میں حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی رعایت نہ کی بلکہ خدا کی شہادت اور آئمہ اطہار کی گواہی کو رد کیا، اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جس کو یوں سمجھا

کہ اس کا گوشہ عاطفت صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف مائل ہے اسی کو کافر اور مرتد جو چاہا سو کہا۔
 اگر عذرنا معقول تھی نہ ہوتا تو حضرت علی اور حسین اور امام زین العابدین اور امام محمد باقر اور
 امام جعفر صادق رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بھی خیر نہ تھی کیونکہ ان بزرگواروں نے اصحاب کبار کی
 تعریف میں کیا کی کی ہے؟ خصوصاً حضرت علی اور حضرات حسین رضی اللہ عنہما کہ ہمیشہ ہمہ اور
 معاون اور ہم نوالہ وہم پیالہ اصحاب کبار خصوصاً اصحاب ثلاثہ رہے۔ پھر ہم سے تو اس بات کا فرق
 پوچھتے ہیں کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے تو گواہ طلب کیے اور جابر رضی اللہ عنہ سے کیوں نہ طلب کیے،
 اب ان سے کوئی پوچھے، کیا سبب ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ و دیگر بعض ائمہ کی تعریفوں اور
 محادثوں اور موافقتوں کو تو تعلقہ پر محمول کرتے ہیں۔ حضرت عمر اور حضرت عباس وغیرہم کی ابو بکر
 صدیق رضی اللہ عنہما کے ساتھ موافقتوں اور ان کے حق میں ان کی تعریفوں کو تعلقہ پر کیوں نہیں محمول
 کرتے؟ یا مثل حضرت عباس اور حضرت عمر اور حضرت زید شہید حضرت علی رضی اللہ عنہم اور دیگر
 ائمہ اطہار کے اقوال اور احوال کو نفاق اور ریاء سے خالی کیوں نہیں سمجھتے؟

اگر اُم ایمن اور حضرت علی کی گواہی اتنی اہم ہے تو خدا اور رسول و قرآن و

آئمہ اہل بیت کی گواہی صحابہ کے بارے میں کیوں کراہم نہ ہوگی

اور نیز کوئی ان سے یہ سوال کرے کہ ہم نے مانا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت علی اور
 حضرت اُم ایمن وغیرہما کی گواہی کے موافق عمل نہ کیا لیکن وہ حکم خداوندی سے مجبور تھے۔ خداوند کریم کا
 حکم یہی ہے کہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ ہونی چاہئیں۔ حضرات شیعہ جو خدا کی اس شہادت کو کہ
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ایک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی نہ تھی بلکہ آپ کی کئی بیٹیاں تھیں تسلیم
 نہیں کرتے اور علیؑ ہذا القیاس حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اسی تعدد بیانات میں ہم صغیر خداوندی ہونا جو شیعوں
 کے نزدیک سچا نہ ہوا اور ان کا کہا مقبول نہ پڑا تو کیا بلا پیش آئی؟ یہاں تو یہ عذر بھی نہ تھا خدا تعالیٰ اور
 حضرت علیؑ و اذن مل کر تو دہر دیا ایک مرد اور دو عورتوں سے زیادہ ہی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت علی اور
 اُم ایمن کی گواہی تو قابل سند ہو اور حضرت علی اور جناب پاک کبریائی کی قابل سند نہ ہو؟

اور اگر مولوی صاحب کی خاطر سے اس طوفان ہی کو تسلیم کریں کہ حضرت علی اور حضرت اُم
 ایمن اور حسین رضی اللہ عنہما چاروں نے گواہی دی تھی؟ تب قطع نظر اس کے کہ اب بھی مقدار مقررہ
 شہادت کو یہ شہادت نہیں پہنچی اور شیعوں کو جائے دم زدن نہیں، شیعہ اس کا کیا جواب دیں گے کہ

۱۔ اے صحابہ سے کلام اللہ تو مشعشع تھا ہی، اقوالِ معترت طاہرہ اور ملفوظاتِ آئمہ اطہار بھی ان کی ملت و ثناء سے مملو ہیں اور اماموں میں سے بھی ایک آدھا نہیں بلکہ تین چار کے قول تو اس احقر نے بھی اس رسالہ میں نقل کیے ہیں۔

پھر باوجود یہ کہ اس گواہی میں عددِ آئمہ اطہار ہی دو سے بڑھ گیا خدا تو دور کنار؟ پھر کیوں اعتبار نہیں کرتے، اب روضہ شہادت اسے نہیں کہتے تو اور کسے کہتے ہیں؟ وائے بردینداری۔ شیعہ کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی عداوت میں نہ خدا کا اعتبار کیا نہ آئمہ اطہار کا نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کا خیال کیا نہ بزرگوارانِ مذکور کے افعالِ حمیدہ اور احوالِ پسندیدہ پر دھیان دیا۔ پھر اُلٹے چور کتوال کو پکڑیں اور اُلٹے نکلے ناک والوں کو ہنسیں؟ مولوی عمار علی اور ان کے ہم مذہب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر طعن کریں جن کی بزرگی کا خدا بھی گواہ ہو اور آئمہ اطہار بھی اقرار کریں، کفر اسے نہیں کہتے تو اور کسے کہتے ہیں؟ اور دشمنیِ اہل بیت یہ نہیں تو اور کیا ہے؟

تفصیل ان امور کی اور سندیں ان روایات کی سب اس رسالہ میں مندرج ہو چکی ہیں اس لیے ان کی تقریر میں تقصیر کی۔ ناظرین رسالہ ہذا بے دماغی نہ فرمائیں بلکہ پلٹ کر نہ دیکھیں کیا ستم ہے؟ کہ اگر ایک روایت موضوع بے سند میں جس کا اعتبار کسی طرح نہیں ہو سکتا اور نہ اہل سنت کی کسی معجز کتاب میں اس کا نشان ہے۔ یہ دیکھ لیا ہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے گواہ طلب کیے اور ان کی بات بے گواہوں کے نہ مانی اور پھر گواہوں پر بھی ان کے دعویٰ کو مسترد کیا، تو ان سب خواہن اہل طین کا وظیفہ ہی یہ ہو گیا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ اور حضرت علی اور حضرت ام ایمن رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو جھوٹا جانا حالانکہ اس روایت میں تکذیب اور سوء ظن کی کوئی بات نہیں آتی بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ بسبب پابندیِ قانونِ خداوندی حکم موافق مرضی حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نہ دے سکے اور اپنے آپ آیاتِ قرآنی اور شہادتِ آئمہ ربانی کو جو بطریق متواترہ یا اسانید معتبرہ ثابت ہوتی ہیں اور کسی طرح لائقِ اعتراض و انکار نہیں، بہر طور قائلِ اعتبار ہیں، ہضم کیے بیٹھے ہیں اور زبان تک نہیں لاتے حالانکہ اعتبارِ احادیث و آثار کے لیے باتفاق ایک زن معتبر بھی کفایت کرتی ہے۔ نصابِ شہادت کی حاجت نہیں، چہ جائیکہ تو اثر اور نکاثر؟

چونکہ یہ قضیہ بہت دور جا پڑا اور جس قدر لکھا گیا مگر قلیل ہے لیکن اہل فہم کے لیے کثیر ہے۔ اس لیے عرض رسا ہوں کہ اگر بالفرض بغرضِ محال روایتِ بہہ اور قضیہ طلب گواہانِ صحیح بھی ہو تب بھی دامنِ حال صدیق اکبر لوٹ خطا اور آلودگی جفا سے صاف مٹتی ہے۔ معذور روایت منہج الکرامت

ابن مطہر علی سے یہ بات تو صاف ہی معلوم ہو گئی کہ گناہ حق غلطی فذک تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے سر نہیں لے گئے۔ باقی رہا اُن سے گواہوں کا مانگنا اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے گواہوں کا نہ مانگنا تو اوّل تو وجہ متعددہ اس کے مرقوم ہو چکیں۔ الٰہ فہم سمجھتے ہیں کہ وہ وجہ کیسی برجستہ اور ایک سے ایک چڑھتی ہوئی ہیں۔

سیدہ سے گواہی طلب کرنا خطا اجتہادی تھی جو باعثِ قدح نہیں

علاوہ بریں ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کچھ معصوم نہ تھے، ایک امام مجتہد تھے اور مجتہد سے اہل سنت کے نزدیک خطا بھی ہو جاتی ہے بلکہ مجتہد تو مجتہد انبیاء سے اجتہاد میں خطا ہو جاتی ہے اور یہ بات شیعوں کو بھی چارنا چارمانی پڑے گی کیونکہ سورۃ انبیاء میں رکوع ”وَنُوحًا اِذَا نَادٰی مِنْ قَبْلِ“ کے شروع ہی میں ایک کھیتی کے تنازع میں جو مقدمہ حضرت داؤد کے دربار میں پیش ہوا تھا مذکور ہے۔ سو اس قصہ میں جو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کی رائے مختلف ہوئی اور خدا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی رائے کو پسند کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ”فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمٰنَ“ (یعنی ہم نے سمجھا دیا وہ فیصلہ سلیمان کو) تو اس سے معلوم ہوا کہ حضرت داؤد سے جو بالاتفاق نئی ہیں اور معصوم ہیں، اجتہاد میں غلطی ہوئی۔ سو اسی طرح حضرات شیعہ اگر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کہ بعد نفسی اجتہاد معذور رکھیں اور یوں سمجھیں کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یا حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے گواہوں کے نہ طلب کرنے میں غلطی کی یا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے گواہوں کے طلب کرنے میں غلطی کھائی تو کیا نقصان ہے؟ بہت ہوگا تو یہ ہوگا کہ جس کی خدا اور آئمہ تعریف کریں اس کے برا کہنے سے بچ گئے۔

اور اگر یوں بھی ناک سیدمی نہیں ہوتی تو نہ سہی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نحوذ باللہ اوّل مرتبہ میں نیت بد ہی تھی؟ اور اس سبب سے ٹالتے تھے کہیں گواہ طلب کیے کہیں جھوٹے خدا کہنے والوں کو پکڑے بتالیے تھے لیکن روایت منج الکرامت ابن مطہر علی اس بات پر شاہد ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے وعظ و پند سے انہوں نے فذک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حوالے کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے اس گناہ سے توبہ کی کیونکہ وعظ کے سبب جو کوئی کسی گناہ سے باز آئے تو وہ توبہ ہی ہوتی ہے۔ توبہ کے اور کچھ سرسینگ نہیں اور یہ سب جانتے ہیں کہ ”الْعَابِئُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ“ یعنی توبہ کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے گناہ کا نہ کرنے والا یعنی جیسے وہ عذاب خداوندی سے ناجی ہے ایسے ہی یہ بھی ناجی ہے۔

حضرت سجاد اگر باوجود ابلیس کے کلی تصرف کے

مومن ہیں تو ابو بکر بطریق اولیٰ ہیں

مع هذا اگر توبہ نہ کرتے جب کچھ اندیشہ نہ تھا کیونکہ شہادت آیات مذکورہ الصدراہ کے ساتھ خداوند صادق القول نے وعدہ مغفرت گناہان کر لیا ہے۔ سوسنیوں کو یہاں تک کچھ نہیں کیونکہ ان کی اصطلاح کے موافق ابو بکر صدیق ولی ہیں نبی نہیں جو معصوم ہونا ضروری ہو، پر مشکل تو شیعوں کو ہے شیعہ اور ادوخوان جس نے صحیفہ کاملہ حضرت سجاد زین العباد دیکھا ہے یا سنا ہے وہ جانتا ہے کہ حضرت سجاد جو موافق عقیدہ شیعہ معصوم ہیں اور دست برد شیطان سے مطمئن، اپنے حق میں کیا فرماتے ہیں کہ ”قَدْ مَلَكَ الشَّيْطَانُ عَيْنِي لَمَّا سَوَّيْتُ الظَّنَّ وَضَعْتُ الْيَقِينَ وَإِنِّي أَفْخُؤُ سَوْءَ مُجَاوَرِيهِ لِي وَطَاعَةِ نَفْسِي لَهُ“ یعنی شیطان نے میری باگ پکڑ لی ہے بدگمانی اور ضعف یقین میں اور مجھے شکایت ہے اُس کے برے پڑوس اور اپنے نفس کے مطیع شیطان ہو جانے کی۔ فقط اب التماس یہ ہے کہ امام کی بات جھوٹی تو ہو ہی نہیں سکتی، خاص کر شیعوں کے نزدیک نہیں تو کافر ہو جائیں۔ پھر جو شیطان کی حضرت زین العباد پر یہ چیرہ دستی ہے تو اس کا کیا جواب ان کے لیے تو کلام اللہ میں کوئی ایسا وعدہ بھی نہیں جس کو سن کر اُن کے جتنی ہونے کا قطعی یقین ہو جائے اور کسی طرح کا احتمال باقی نہ رہے۔ گو شیعہ ان کو بجائے خود معصوم و مغفور اور ہم محفوظ و مغفور سمجھتے ہیں۔

مع هذا لفظ سوء ظن اور ضعف یقین اور طاعت نفس ایسے الفاظ ہیں کہ خطائی الاجتہاد پر بھی منطبق نہیں ہو سکتے علیٰ ہذا القیاس نوح البلاغت میں جو مجموعہ خطب حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ ہے اس میں بھی ایسے مضامین مندرج ہیں اور ان سے بڑھ کر یہ ہے کہ کلام اللہ میں بہت سے انبیاء کی نسبت تذکرہ خطا ہے۔ حضرت آدم اور حضرت یونس علیہم السلام کا قصہ مشہور و معروف ہے۔ سوان سب کے مقابلہ میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فقط ارادہ غصب بہت ہی تھوڑا ہے کیونکہ وہ معصوم نہ تھے۔ اے پروردگار بے نیاز اس سراپا نیاز و اخلاص کی جان لے لو آگاہ ہے کہ کس قدر میرے دل میں یہ نسبت حضرت زین العباد و دیگر آئمہ اطہار و انبیاء کبار اخلاص اور اعتقاد اور محبت اور نیاز ہے۔ یہ جو کچھ لکھا جاتا ہے ہاں نظر ”نقل کفر کفر نباشد“ حضرات شیعہ کی کفریات کے مقابلہ میں لکھا جاتا ہے۔

فصل..... حدیث مائتہ کناہ صدقہ کی تحقیق اینق

اب آگے سنئے مولوی صاحب کیا فرماتے ہیں۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں: ”اب اور سننا

چاہیے کہ جب فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جانا کہ ابو بکر نے مجھے بہہ فذک میں جھوٹا سمجھا تو اس معصومہ نے دعویٰ وراثت کا کیا اور ابو بکر سے کہا کہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ہوں مجھے ان حضرات کا مال ارث میں پہنچتا ہے اور فذک میرے باپ کا مال ہے مجھے دے دے اس وقت ابو بکر نے ایک جھوٹی روایت قرآن کے خلاف بنا کر کہا کہ میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، وہ حضرت فرماتے تھے کہ انبیاء کا مال سب صدقہ ہے کسی کو ان کے وارثوں میں سے نہیں پہنچتا۔

اول تو یہ روایت خلاف قرآن ہے۔ دوسرے یہ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وارثوں میں نہ بیٹی سے نہ اپنی بیٹیوں سے کسی سے نہ کہا کہ میرا مال صدقہ ہے ان کو نہیں پہنچتا تم دعویٰ نہ کرنا اور حکم خدا کا جو ان کے واسطے تھا، اس کو ان سے چھپا رکھا اور ایک اجنبی شخص سے کہ اس کو کسی طرح کا دخل پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت میں نہ تھا، اس کے کان میں کہہ دیا اور کسی دوسرے صحابی سے بھی نہ کہا۔ ”تھی بلختہ“ مولوی صاحب تو فرما چکے۔ اب ہماری بھی سنئے قدما فریب بازان شیعہ بوجہ وراثت فذک کے نہ دینے میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر طعن کیا کرتے تھے۔ جب اہل سنت سے جوابات معقول اس اعتراض کے ان نامعقولوں نے سنے اور مجال دم زدن باقی نہ رہی تو ان کے لواحق نے روایات بہہ تراش کر برنگ دیگر طعن شروع کیا اور اس دعویٰ کے ثبوت تک پہنچانے کے بہت سے چلے کیے۔ یہاں تک کہ بعض کتب غیر مشہورہ اہل سنت میں بھی الحاق کیا اور سنی بن کر طالب علمان اہل سنت کو دھوکا دیا اور اس روایت کو روایت کیا۔ لیکن یہ فریب بھی نہ چلا اور بہ سبب وضوح امارات کذب روایات مذکورہ اور کھل جانے جعل راویان روایت۔ اور غیر معتبرہ اور غیر مشہور ہونے ان کتب کے۔ جن میں یہ روایت پائی جاتی ہے۔ اول تو یہ روایت پایہ اعتبار سے ساقط ہو گئی۔ دوم خدا ساز دروغ و اصغان روایت کام آیا اور بمقتضائے مثل مشہور ”دروغ گور حافضہ نباشد“ روایت تو بیانی پر بیانی نہ آئی۔ یہ بھول گئے کہ بہہ بے قبض موہوب لہ مفید ملک نہیں اور نیز ایک مرد اور ایک عورت یا دو لڑکوں سے مدعا ثابت نہیں ہو سکتا۔

گواہوں کی شرعی تعداد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تادم آخر

قبضہ فذک، صدیق کی صفائی کا مضبوط سامان ہے

بہر حال انہوں نے اپنی طرف سے کسی نہیں کی لیکن قربان جانیے خداوند عظیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر شناسی اور طرفداری کے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے طعن سے بری کرنے کی

پہلے ہی وہ تدبیریں کر گئے جس کے سبب شیعوں کو طعن کر کے بجز غوغا سگانا اور شور غرابانا اور کچھ حاصل نہ ہو۔ خداوند کریم نے تو گواہی کے اعتبار کے لیے دوسروں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی قید لگادی اور جناب سرور کائنات علیہ علی آلہ افضل الصلوٰات واکمل التحیات والتسلیمات نے تادم آخرا پنا تعارف رکھا۔ اس لیے ناچار ہو کر شیعہ بیان خراب طینت کو مکررا اپنی عاقبت کے خراب کرنے کا فکر ہوا۔ وصیت کی روایت تراشی مگر پھر وہی بات ہے کہ جھوٹی بات کے پاؤں نہیں چلتے یہ نہ سمجھے کہ وصیت تو اسی مال میں جاری ہو سکتی ہے جس میں میراث جاری ہو، جب میراث جاری ہی نہیں تو وصیت کے کیا معنی۔

القصد جب اس طرف سے بھی قافیہ تنگ ہوا تو علماء شیعہ کو سخت دشواری پیش آئی کہ نہ طعن کیے بن پڑے اور نہ چپ رہے سے کام چلے ہے۔ اگر طعن کریں تو کس منہ سے کریں؟ اور خاموش بنیں اور مذہب سے دست بردار ہوں تو عوام شیعہ کو کیا منہ دکھلائیں؟ اور نذر و نیاز کس سے لیں؟ اور اموال اموات کو کیونکر ہضم کریں؟ تو باقی ماندگان شیعہ نے اپنے حقد میں کے انہیں گوزہائے شتر مذکورۃ الصدر کو کی بیشی کر کے زبان پر رکھا اور پھر زبان درازیاں شروع کیں۔

سومولوی عمار علی صاحب نے بھی اپنے رقیمہ کریمہ اکی میر نادر علی صاحب میں ایسا ہی کیا لیکن بحکم مثل مشہور ”عیب کرنے کو ہنر چاہیے“ ان کا یہ حوصلہ نظر نہیں آتا کہ مضامین مندرجہ رقیمہ کو جو فی الجملہ بطرز جدید ہیں۔ اپنے آپ تراشے ہوں، یہ بات کہ کہیں حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے قبضہ کی پچر لگائی، کہیں حضرت علی اور حضرت ام ایمن کی گواہی کے ساتھ حسین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی گواہی بڑھائی، کہیں ہبہ اور میراث دونوں کی نسبت بہ ترتیب مذکور دعویٰ کرنے کا دعویٰ کیا، کہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کاغذ پھاڑ ڈالنے کا بزم خود الزام دیا، کسی بڑے مکار یکٹائے روزگار کی چالاکی نظر آتی ہے۔ پر مولوی صاحب بحکم میلان طبیعت حیلہ دوست اور نیز بغرض فروغ مذہب سراسر دروغ ان بہتانوں کو نقل کر کے تنہائی میں جامہ سے باہر نکل پڑتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے آج تک کسی سنی واقف کار کی کوئی بات نہیں سنی، نہیں تو یہ سب پوچھک بھول جاتے، انہوں نے شاید یہ سمجھا ہو کہ بہت سی چھینا جھٹی میں فذک میں سے کچھ تو ہاتھ آئے گا، اور بہت سے جھوٹ مل کر ایک سچ کے برابر تو ہو جائیں گے۔

لیکن بفضلہ تعالیٰ مذہب اہل سنت میں یہ قوت ہے اور کیوں نہ ہو۔ سچی بات پکی ہی ہوتی ہے کہ علماء تو ایک طرف امثال احقر ہچمدان بھی جوابات دندان شکن سے شیعوں کے دانت توڑنے کو بہت ہیں۔ چنانچہ اعتراض سابق کا جو کچھ خاکہ اڑا ہے وہ تو ناظرین کو معلوم ہی ہو چکا۔ اسی پر

اعتراض کو بھی قیاس کر لیجئے۔ ع..... ”قیاس کن ز گلستان من بہار مرا“..... اور اگر بے جواب کے اعتراض کا دل سے کھٹکا نہیں جاتا تو لیجئے۔ مولوی صاحب یوں رقم فرماتے ہیں: ”کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے دعویٰ میراث کیا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک جھوٹی حدیث خلاف کلام اللہ کے بنا کر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی بات کو رد کر دیا۔“

مخدوم من سچا آدمی کچی بات کو مان لیا کرتا ہے، اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے دعویٰ میراث کیا، اگر ہم کو ہٹ دھرمی مد نظر ہوتی تو اس روایت کو کتابوں میں سے بھی حذف کر دیتے۔ فقط انکار تو درکنار کوئی موضوع روایت تو تھی ہی نہیں جو بعد عدم اعتبار پیچھا چھڑا لیتے اور اتنی ہی بات منصفوں کے نزدیک ہمارے اس دعوے کے معتبر ہونے کو کہ روایت ہبغر معتبر ہی کفایت کرتی ہے۔ پر خداوند کریم ہم کو مولوی عمار علی صاحب کے ہر رنگ نہ کرے کہ بیخ بلاغت اور کافی کلینی جیسی معتبر کتابوں میں حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں ہونا ثابت اور متحقق ہو اور پھر ان کی بیٹیاں ہونے سے انکار کر جائیں اور اُلٹی اُلٹی جھٹیں لائیں۔ چنانچہ مذکور ہوا۔

حدیث مذکور کلام اللہ کے عین مطابق ہے

مگر مولوی صاحب کا یہ فرمانا کہ ”حدیث خلاف کلام اللہ کے بنائی“ خلاف واقع ہے۔ واقف کار تو اتنی بات سے سمجھ گئے ہوں گے کہ شیعوں کو کلام اللہ سے کیا سروکار؟ جس قوم میں کلام اللہ کا جہ چاندی نہ ہو وہ کلام اللہ کو کیا سمجھیں جو یہ سمجھیں کہ فلائی بات کلام اللہ کے موافق ہے فلائی مخالف۔ مگر علم الیقین عین الیقین کے برابر نہیں ہوتا اس لیے اتنی گزارش کرنی پڑی کہ علماء شیعہ خصوصاً مولوی صاحب اپنے قصور فہم سے ناچار ہیں ورنہ کلام اللہ اور حدیث معلوم جس کی تحقیق کا ہم نے اوپر بھی وعدہ کیا ہے باہم مخالف نہیں بلکہ موافق کیا متعلق ہیں۔ مزید توضیح کے لیے اول سے تقریر مخالفت ایسی طرح بیان کیجئے جس سے شیعہ اور علماء شیعہ بھی ممنون احسان ہوں۔ بعد ازاں اثبات موافقت سے ان کو یہ ثر مائیے کہ سرگرمیاں ہوں۔ مخدوم من ظاہراً مولوی صاحب اوروں کے تیروں کے بھرد سے لڑتے پھرتے ہیں جس قدر کہیں سے سن لی وہی کہہ دی ورنہ خیر و عافیت ہے جو یہ طرز نامعقول اختیار کیا کہ جو باتیں ان کے مفید مطلب تھیں وہی منہ پر مہر لگا کر بیٹھ رہے۔ ان کو لازم تھا کہ اول اثبات مخالفت کرتے جب کہیں کسی سے خواستگار جواب ہوتے۔ یہ کس نامعقول نے ان کو طرز مناظرہ سکھایا کہ دعویٰ بے دلیل پیش کرتے ہیں۔

انصاف کی رو سے تو اس کے جواب میں ہم کو فقط لاسلم کفایت کرتا ہے۔ یعنی اتنا بہت ہے کہ ہم

ہوں کہہ دیں کہ ہم نہیں مانتے اور اگر ہم بھی بے دلیل ایسے ہی دعوے کرنے لگیں بلکہ تمام عقائد اہل سنت کو ہوں ہی بے دلیل پیش کرنے لگیں تو کوئی پوچھے مولوی صاحب کے پاس کیا جواب ہے۔ مع ذہا ہم تو نہیں کہہ سکتے، پر اگر کوئی نامی یا خارجی بہ نسبت ان روایات کے جو فضائل آئمہ اور استحقاق امامت وغیرہ خصوصیات مذہب شیعہ حضرات شیعہ اماموں سے نقل کرتے ہیں۔ ہوں کہنے لگے کہ اپنے مطلب کے لیے اماموں نے یا شیعوں نے خلاف قرآن یہ روایتیں گزلیں تو پھر جو اس کے کہ مولوی صاحب اپنی زبان کو منہ میں سیٹ کر بیٹھ رہیں اور کیا کر سکیں گے لیکن ہمارے احسان کو دیکھئے کہ اول بمقدار رسائی ذہن شیعہ ہی بلکہ کچھ اس سے بھی بڑھ کر تقریر مخالفت تحریر میں لاتے ہیں۔

اہل شیعہ کا حدیث ماتر کناہ صدقہ پر اعتراض

واضح رہے کہ نہایت کوشش کر کے علماء شیعہ نے یہ بات نکالی ہے کہ حدیث ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جس کا یہ مضمون ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوں ارشاد فرمایا ہے کہ ہماری انبیاء کی جماعت کا کوئی وارث ہی نہیں، جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ وقف ہے، باوجودیکہ اس کے راوی فقط ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔ کلام اللہ کے مخالف ہے اور جو حدیث کلام اللہ کے مخالف ہو، مگر بالفرض اس کے راوی بہت سے بھی ہوں تب بھی غلط۔ چہ جائیکہ ایک راوی، بالخصوص اہل سنت و جماعت کے نزدیک کہ ان کے نزدیک کلام اللہ میزان صحت و ضعف و معیار صدق و کذب اخبار ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اول تو حدیث مذکور اس آیت کے مخالف ہے ”يُؤْتِيكُمُ اللَّهُ لِيْ اَوْلاَدِكُمْ لِلَّذِكْرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنثٰى“ جس سے بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں میراث کا جاری ہونا لکھا ہے کیونکہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تم کو پہلے سے کہے دیتا ہے کہ تمہاری اولاد میں لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر ملا کرے۔ سورس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے اور احکام صوم، صلوة، حج، زکوٰۃ میں شریک ہیں ایسے ہی اس حکم میں بھی امت کے شریک رہیں گے۔

مع ذہا اس آیت میں نبی غیر نبی کی کچھ تخصیص نہیں۔ پھر یوں کہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی وارث نہیں۔ اس آیت کی تکذیب کرنا ہے۔ دوسری اور آیت ”وَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذَلِيْلاً يَّرِثْنِيْ وَيَرِثْ مِنْ اِلٍ يَّحْقُوْبُ وَوَرِثَ دَاوُدُ سُلَيْمٰنُ“ کے (جیسے اور انبیاء کے ترکہ میں میراث کا جاری ہونا بھی لکھا ہے) مخالف اور مناقض ہے کیونکہ دوسری کا ترجمہ تو یہ ہے ”کہ وارث ہوئے حضرت سلیمان حضرت داؤد علیہم السلام کے۔“ اور پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام جناب ہاری تعالیٰ سے یہ التجا کرتے ہیں ”کہ الہی مجھ کو اپنے پاس سے

ایک ولی عہد عنایت فرما جو میرا بھی وارث ہو اور اولاد یعقوب علیہ السلام کا بھی وارث ہو۔ فقط“
 سو دوسری آیت سے صاف معلوم ہو گیا کہ حضرت داؤد علیہ السلام جو نبی تھے ان کے ترکہ میں میراث جاری ہوئی اور پہلی آیت سے گویہ بات بتصریح نہیں نکلتی لیکن اول تو حضرت زکریا علیہ السلام سے جو مشہور نبی ہیں، ایسے قدیمی حکم کے خلاف طلب کرنا مستبعد ہے۔ تصور میں نہیں آتا کہ جو حکم حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے لے کر ان کے زمانہ تک برابر معمول رہا ہو ان کو بڑھا پے تک معلوم نہ ہوا اور نہ اس باب میں کوئی وحی آئی۔ حالانکہ زمانہ پیری موت کا مقدمہ ہوتا ہے ایسے وقت میں لازم ہے کہ جو موت نبی کے متعلق مسائل ضروری ہوں ان کی اطلاع کی جائے تاکہ اس کے موافق وصیت کر جائے ورنہ جو بات نبی ہی کو معلوم نہ ہو تو پھر امتیوں کے معلوم ہونے کی کیا امید ہے۔

بائیں ہم جیسے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کی نجات کی دُعا کے جواب میں بطور تنبیہ و عتاب ”إِنِّي أَعْطُكَ أَنْ تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ“ فرمایا اور اس سے معلوم ہوا کہ یہ دُعا خلاف مرضی جناب باری تعالیٰ تھی۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی اس التجا کے جواب میں بشارت قبول دُعا پہنچائی گئی۔ کچھ تنبیہ و عتاب نہیں کیا۔ اس بات کا وہم جاتا کہ یہ عتاب اسی سبب سے ہوا کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے وراثت کا کیوں نام لیا۔ بہر حال ان آیات سے اتنا ثابت ہوا کہ انبیاء کے مال میں بھی میراث جاری ہوتی ہے۔

پھر یہ بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی العموم سب انبیاء کو شامل کر کے فرماتے ہیں کہ ہمارے گروہ کے گروہ کا کوئی وارث نہیں ہوتا کیونکر صحیح ہو بلکہ ان دونوں آیتوں سے تو یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ جو بعض روایات حدیث مذکور میں لفظ ”لَا نَرِثُ“ بھی آیا ہے یعنی ہم بھی کسی کے وارث نہیں ہوتے، یہ بھی غلط ہے کیونکہ حضرت یحییٰ اور حضرت سلیمان علیہم السلام بھی بالاتفاق نبی ہیں۔ جب وہ دونوں اپنے اپنے والد کے وارث ہوئے تو یہ بات کہ کوئی نبی کسی کا وارث ہی نہیں ہوتا سراسر غلط نکلی۔ یہ ہے تقریر مخالفت کلام اللہ و حدیث مذکور۔ اس سے بہتر شاید شیعہ بھی تقریر نہ کر سکیں۔

اعتراض کا جواب

اب ہماری بھی تحقیق صحیح اور تنقیح فصیح کے تراہ عقل آشیانہ کی طرف متوجہ ہو جائے کہ ماشاء اللہ کیا دلکشا اور راحت افزا ہے جس سے کان میں پڑتے ہی اطمینان ہو جائے۔ ظاہر کی مخالفت کا خلجان ان شاء اللہ تعالیٰ ایسی طرح دور ہو کہ پھر کبھی بھی دھیان نہ آئے۔ بہ ترتیب آیات موافقت کی بات تحریر میں آتی ہے لیکن چونکہ ہاں ایک مضامین بے تمہید کے ادا نہیں ہو سکتے، اس لیے اول یہ گزارش ہے کہ

پر چند کلام اللہ من اولہ الی آخرہ حرفاً حرفاً خدائی کا تصنیف ہے اور اسی وجہ سے اس کو کلام اللہ کہتے ہیں۔ لیکن مراسلات اور خطوط بنی آدم کلام ربانی بھی دو قسم پر ہے۔ ایک تو جیسے کوئی نئی اہمی طرف سے کسی کو خط لکھے یا کوئی شخص کسی قاصد کو پیام دے کر بھیجے تو اس صورت میں وہ عبارت بھی اسی نئی اور اسی شخص کی ہوتی ہے اور وہ خط اور وہ پیام بھی اسی کی طرف سے ہوتا ہے۔ خط رساں اور پیام برنق مثل ہوا ہوتے ہیں کہ ایک کے منہ کی آواز دوسرے کے کان تک پہنچا دیتے ہیں۔ اسی قسم کا تو اکثر کلام اللہ ہے مثال کے لکھنے کی کچھ حاجت نہیں۔ یعنی جیسے خدا کا تصنیف ہے، ویسے ہی خدا کی طرف سے اُمت کو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یا دونوں کو یا کسی خاص قوم کو خطاب ہے۔ سوا کثر تو عبارات ایسی ہی ہیں نشان دہی اور تحریر مثال کی کچھ ضرورت نہیں۔

پر شاید شیعہ بے لکھے نہ سمجھیں اس لیے یہ ایک دو مثال کافی دروانی مرقوم ہیں۔ ”تَا عِبَادِ لَا تَقُونُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ الْخ. يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ الْخ“ پہلی آیت میں بے تخصیص کسی نیک و بد کے سب بندوں کو یہ حکم ہے کہ اے میرے بندو! مجھ سے ڈرو۔ دوسری آیت میں بنی اسرائیل کو سنایا جاتا ہے کہ اے گروہ بنی اسرائیل میری فلاتی نعمت یاد کرو اور دو آیتیں باقی ان میں خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو خطاب ہے۔ بہر حال جیسے یہ عبارات خدا کی تصنیف کی ہوئی ہیں، ایسے ہی ان کے مضامین بھی خدائی کی طرف سے ہیں، کسی اور کا پیام سلام نقل نہیں فرماتے۔

دوسری یہ صورت ہے کہ جیسے لکھنا پڑھنا جاننے والے کسی ایسے جاہل کا خط جسے فارسی نہ آتی ہو، فارسی میں لکھ دیا کرتے ہیں تو عبارت گو اس نئی ہی کی ہوتی ہے، کوئی نادان بھی یوں نہیں کہہ سکتا کہ یہ عبارت اس مرد جاہل کی ہے پر مضمون اس جاہل ہی کا ہوتا ہے اور خط بھی اسی کا لکنا جاتا ہے یا جیسے کسی کو کوئی شخص کچھ تلقین کرے کہ تو اپنے فلاتے مطلب کے لیے فلاتے سے یوں کہو، جیسے محکروں اور دیکلوں سے لوگ مسودہ کرا لیا کرتے ہیں۔ تو گو عبارت تلقین کرنے والے ہی کی بنائی ہوئی ہوتی ہے، پر اس کا مضمون کہنے والے یا عرضی والے ہی کا سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ہی کلام اللہ میں بعض بعض عبارات ایسی ہیں کہ گو وہ بھی خدائی کی بنائی ہوئی ہیں لیکن اُن کے مضامین بندوں کی طرف سے سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے ”قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ اور قُلْ هُوَ اللَّهُ اور قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ“ اور سوا اس کے جہاں لفظ قُل یا قُلُوا اوّل میں ہے اور پھر بعد میں ایسے الفاظ ہیں کہ جس کے ملاحظہ سے یوں معلوم ہو کہ حکم مخاطب ہیں۔ مثلاً قُلْ اَعُوذُ کے یہ معنی ہیں کہ اے محمد! میں پناہ

مانگتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکلم جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو بعد قتل کے جتنی عبارت ہے اُس سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف سے سمجھنی چاہیے۔

لیکن جیسے زبانی تلقین میں تو اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ تلقین کرنے والا یوں کہے کہ تو یوں کہو۔ عرض کے سودہ میں اس کی ضرورت نہیں کہ اس کے اوّل میں یوں لکھ دیں کہ تو یوں کہو بلکہ سودہ کر کے یوں ہی حوالہ کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی کلام پاک خداوند کریم میں بھی بعض عبارتیں ایسی ہیں کہ وہ بندوں کی طرف سے علی العموم فقط۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف سے ہیں لیکن اس کے اوّل میں قل یا تو لو انہیں بلکہ بمنزلہ سودہ وکلاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یا سب کی طرف سے تصنیف کر کے ان کے حوالہ کر دیا ہے۔ چنانچہ سورہ فاتحہ اسی قسم کی ہے۔ خاص کر ”ایناک نعبد“ سے لے کر آخر تک جس کا یہ مضمون ہے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں، ہمیں سیدھی راہ چلا اٹخ۔ ظاہر ہے کہ یہ عبارت خداوند کریم نے بندوں کی طرف سے بنا کر ان کے حوالے کر دی ہے تاکہ وقت حضور دربار خداوندی یعنی وقت نماز کے اس طور پر خداوند کریم سے عرض معروض کیا کریں ورنہ اگر خدا کی طرف سے کہے تو خداوند تعالیٰ شانہ سے زیادہ کون ہے جو خداوند کریم اس کی عبادت کرے اور اس سے مدد کا خواستگار ہو؟ اور پھر کون سے جناب باری تعالیٰ بے داعی پر ہیں جو سیدھی راہ کی تمنا اور آرزو ہے؟

”يُؤْصِيكُمُ اللَّهُ“ سے آنحضرت مستثنیٰ ہیں اس کے دلائل

جب یہ بات مقرر ہو چکی تو اب متوجہ ہو کر سنئے کہ آیت ”يُؤْصِيكُمُ اللَّهُ“ بلکہ ابتداء سورہ نساء سے لے کر یہاں تک بلکہ عجب نہیں تمام سورہ کی سورہ بمنزلہ سورہ فاتحہ جناب باری تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تصنیف کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ فرمادی ہے تاکہ آپ بجائے خود لوگوں کو اس طرح سے سمجھا دیں۔ دلیل اس بات کی کہ یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تصنیف کی گئی ہے خدا کی طرف سے نہیں۔ یہ ہے کہ ”يُؤْصِيكُمُ اللَّهُ غَرَّمَا يَأْتِيَا عِبَادَ اَوْصِيكُمُ“ مثلاً نہ فرمایا اگر خدا ہی کی طرف سے بندوں کے خطاب میں یہ آیت ہوتی تو لازم تھا کہ ”يَأْتِيَا عِبَادَ اَوْصِيكُمُ“ مثلاً فرماتے۔ یہ عبارت جواب موجود ہے صاف اسی پر دلالت کرتی ہے کہ حکلم اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور مخاطب امتی۔ آپ اپنی طرف سے ان الفاظ کے پیرایہ میں خداوند کریم کا حوالہ دے کر احکام میراث تعلیم فرماتے ہیں کیونکہ معنی اس کے یہ ہیں کہ پہلے سے تمہیں خدا تعالیٰ نے آگئی دی ہے کہ تمہاری اولاد میں بیٹوں کو دو بیٹیوں کے برابر ملا کرے۔

یہ ایسی بات ہے کہ جیسے سرشتہ دار حج یا کلکٹر کا حکم اہل مقدمہ کے سناتے وقت کہا کرتے ہیں کہ صاحب تمہاری نسبت یہ حکم دیتے ہیں اور اگر حاکم خود کلام کیا کرتا ہے تو اہل مقدمہ کو اس کے نام یا لقب سے جیسے چودھری یا شیخ جی مثلاً پکار کر کہا کرتا ہے کہ ہم تمہیں یوں حکم دیتے ہیں یا ہمارا تمہارے لیے یہ حکم ہے۔ مثلاً نہ یہ کہ اپنا نام لے کر یوں کہیں کہ تمہیں فلاں شخص یوں کہتا ہے۔ پس در صورت یہ کہ ”تہا عباد اَوْصِيكُمْ“ نہ فرمایا جس کا یہ مطلب ہوتا کہ اے میرے بندو! میں تمہیں کہہ دیتا ہوں بلکہ یوں ارشاد ہوا کہ اللہ تمہیں یوں کہتا ہے تو بالیقین معلوم ہو گیا کہ جیسے سورۃ فاتحہ سب کی طرف سے بنا دی ہے ایسے ہی یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بنا دی ہے تاکہ امت سے اس طرح سے باتیں کریں اور ظاہر ہے کہ جب سرشتہ دار کسی اہل مقدمہ کو کوئی حکم سنایا کرتا ہے تو اس حکم سے اپنے آپ خارج ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ سواہ سرشتہ دار جتنے آدمی روئے زمین پر ہیں، اگر اُس وقت موجود ہوں اور یہ بھی سبھی کہ یوں کہے کہ حاکم تمہارے لیے یوں فرماتے ہیں۔ تب بھی اُس وقت کی گفتگو سے کوئی یوں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ سرشتہ دار بھی اس حکم میں داخل ہے۔

علیٰ ہذا القیاس جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی جو اس حکم کے سنانے میں احکم الحاکمین کے سامنے بہ نسبت ہمارے بمنزلہ سرشتہ دار کے ہیں، اس حکم سے خارج سمجھنا چاہیے اور یوں سمجھنا چاہیے کہ حکم فقط امتیوں ہی کے لیے ہے اور حدیث ”لَا تُؤْذُ مَا تَرَ كُنْهَ صَلَافًا“ اس دقیقہ عقلی کے سمجھا دینے کے لیے۔ اس آیت کی تفسیر ہے۔ پر شیعہ بسبب اپنی کم فہمی اور نہایت کچی طبیعت کے باعث تفسیر کو تبدیل اور تغیر سمجھتے ہیں اور حدیث و آیت میں مخالف جانتے ہیں۔ قصور تو اپنا اور طعن ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ذمہ۔ اس تقریر کے بعد تو یقین یوں ہے شیعہ اپنے دل میں پشیمان ہو کر مؤمن خان کا یہ مصرع پڑھیں۔ ع..... ”میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا“ الغرض ذرہ برابر حدیث مذکور اور آیت معلوم میں مخالف نہیں بلکہ حدیث مذکور آیت معلوم کی تفسیر ہے اور سنیوں کی سب حدیثیں کلام اللہ کی تفسیر ہیں۔ اہل فہم سمجھتے ہیں اور کم فہم نہ سمجھیں تو اپنا سر کھائیں اور اس حکم سے اور سوا اس کے جو حکم کہ ایسی ہی عبارات میں مندرج ہیں۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم خارج ہیں جیسے کبھی سرشتہ دار اہل مقدمہ یا رعیت حاکم کو حاکم کا کوئی حکم سناتا ہے اور حاکم کے دل میں سرشتہ دار کی نسبت بھی وہی حکم مکنون خاطر ہوتا ہے۔ تو آگے پیچھے اس کو متنبہ کر دیتے ہیں کہ تمہارے لیے بھی یہی حکم ہے۔ مثلاً کسی ضلع میں کوئی کلکٹر ہو اور اسی ضلع کا رہنے والا کوئی مال گزار اس کی کچھری کا سرشتہ دار ہو اور بہ نسبت مال گزاروں کے کوئی حکم صادر ہو اور وہ سرشتہ دار مال گزاروں کو

یوں حکم سنائے کہ تمہارے لیے یہ حکم ہوا ہے۔ تو گوان الفاظ سے یہ بات نہیں ثابت ہوتی کہ سرشتہ دار کے لیے بھی یہی حکم ہے لیکن بایں وجہ کہ سابقاً خلوت جلوت میں اس کو یہ بات متحقق ہو چکی کہ سب مال گزاروں کے لیے ایک ہی حکم ہے۔ وہ سرشتہ دار بھی وقت تعمیل حکم اسی حکم کا پابند رہے گا۔

سواگر بعض احکام میں مثل صوم، صلوٰۃ، حج، زکوٰۃ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہوں اور پھر بالفرض وہ بھی ایسے ہی الفاظ سے کلام اللہ میں وارد ہوئے ہیں کہ موافق تقریر مسطور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس حکم سے خارج ہونے چاہئیں تو کسی اور قرینہ یا خطاب پنہانی سے آپ کو اپنا شمول اس حکم میں ثابت ہوا ہو مگر چونکہ اس حکم میں یہ متحقق ہو گیا ہو کہ میں اس میراث سے خارج ہوں بلکہ بالخصوص اس بات میں میرے لیے اور حکم ہے تو بایں نظر کہ مبادا صوم و صلوٰۃ کا اشتراک دیکھ کر باقی ماندگان یہ سمجھ جائیں کہ گو اس آیت سے آپ کا شمول اس حکم میں معلوم نہیں ہوتا لیکن کیا عجب کہ مثل صوم و صلوٰۃ اس حکم میں بھی کبھی وحی جدید کے باعث آپ شریک ہو گئے ہوں اور یہ سمجھ کر اموال متروکہ کو جو بغیر وراثت اخراجات روزمرہ کسی کو دیا نہیں گیا تھا تقسیم کر لیں اور تصرف غیر واجبی سے انجام کار دین و دنیا کی خرابی اٹھائیں۔ ”لَا نُورِثُ مَا تَرَكْنَا“ غرمایا ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے استثناء کی دیگر نظیریں

اور یہ تخصیص کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مال بعد وفات میراث میں نہیں آ سکتا کچھ نئی تخصیص نہیں۔ بہت سے حکم ایسے ہیں جس میں اُمت کے لیے کچھ حکم ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کچھ اور حکم تھا۔ بشہادت شروع سورۃ مزل اور آیت ”وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَجَدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر باتفاق اکثر آپ پر فرض تھا اور باقی تمام اُمت پر فرض نہیں، صوم وصال آپ کے حق میں موجب ثواب تھا باقی تمام اُمت کے لیے ممنوع۔ اگر کوئی عورت اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہہ کر دیتی تو آپ کو وہ حلال تھی اور وہ آپ کے لیے حلال نہیں۔ آپ کے ذمہ مہر اور عورتوں کے حق میں عدل یعنی سونے لینے میں برابری بھائی فرض نہ تھی۔ گو آپ نے تمام عمر عدل ہی سے گزاری اور مہر بھی دیا اور باقی تمام اُمت پر یہ دونوں باتیں ضروری ہیں، سب اُمت کے لیے چار عورت کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت ہے۔ چنانچہ اسی سورت کے شروع میں اس تعداد کا ذکر ہے اور باتفاق امامیہ اثنا عشریہ بلکہ اکثر فرقہ ہائے شیعہ و سنی اُس کے یہی معنی ہیں کہ چار تک اجازت ہے آگے نہیں حالانکہ جناب سرور کائنات علیہ وعلی آلہ افضل الصلوٰات واکمل التسلیمات اس حکم سے خارج ہیں۔ آپ کے حق میں سب جانتے ہیں یہ قید نہ تھی۔

اور اس حکم سے آپ کے خارج ہونے کی وجہ بھی یہی نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام خدا کی طرف سے نہیں بلکہ بمنزلہ آیت ”يُوصِيكُمُ اللَّهُ“ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف سے ہے جیسے پکھری کے عرضی نویس کسی کو عرضی لکھ دیتے ہیں اور وہ عرضی لکھوانے والے ہی کی سمجھی جاتی ہے۔ عرضی نویس کی کوئی نہیں کہتا، ایسے ہی اس حساب سے ان احکام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم احکام یعنی وعظ وپند سمجھنا چاہیے کیونکہ اس تعداد کے ذکر سے کچھ ہی پہلے شروع میں اس صورت کے اس طرح سے خطاب ہے ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ“ یعنی ”اے لوگو! ڈرو تم اپنے رب سے جس نے تمہیں ایک جان یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا کیا۔ فقط“ سو یہ کلام اور یہ خطاب ظاہر ہے کہ خدا کی طرف سے تو بندوں کو ہو ہی نہیں سکتا ورنہ یوں فرماتے ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُونِي لَأُنِي رِبَّكُمْ الَّذِي خَلَقَكُمْ“ یعنی ”اے لوگو! مجھ سے ڈرو اس لیے کہ میں تمہارا وہ رب ہوں جس نے تمہیں پیدا کیا ایک جان سے۔ فقط“

اب ہونہ ہو یہ کلام اور یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے اور مخاطب اس حد کے امتی ہیں تو لا جرم یہ احکام بھی بہ نسبت اُمتوں ہی کے ہوں گے، حاردار جو بحکم حکیم حاذق بیمار کو نصیحت کرتے ہیں کہ تو دوا پی لے اور بد پرہیزی مت کر تو کسی کے نزدیک (نہ بیمار کے نہ غیر کے) یہ لازم نہیں کہ حاردار خود بھی دوا پئے اور پرہیز کرے بلکہ سب کے نزدیک حاردار ان احکام سے خارج ہے۔ ایسے ہی جناب سرور کائنات علیہ السلام جو ہم بیماروں کے لیے بحولہ حاردار کے ہیں بحکم حکیم مطلق یہ احکام مندرجہ ذیل ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي“ آخر السورۃ سب اُمتوں کو سناتے ہیں تو لا جرم آپ ان احکام سے خارج ہیں۔

اور اگر کسی حکم میں شریک بھی ہیں تو اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے اُس حاردار کو بھی حفظ صحت کے لئے یا کسی اور مصلحت کی رعایت کے لیے وہ حکیم کوئی دوا یا کوئی پرہیز ہی بتلا دے جو اُس بیمار کے نسخہ اور پرہیز میں داخل ہے اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ تمام سورۃ خاص کر شروع سے لے کر آخر رکوع ”يُوصِيكُمُ اللَّهُ“ تک جتنے احکام مذکور ہیں وہ سب بہ نسبت اُمتوں کے صادر ہوئے ہیں۔ اس میں سے اگر کسی حکم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شریک امت ہیں بھی؟ تو کسی اور اشارہ کنایہ وحی وغیرہ کے سبب ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ تمام سورۃ نہیں تو آخر رکوع مذکور تک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف سے عبارت بتائی گئی ہے۔ بالملہ جناب سرور کائنات علیہ علی آلہ افضل الصلوٰت واکمل التحیات اکثر احکام سے مستثنیٰ ہیں۔

اور مردمان ہمیدہ سوا، امثلہ مذکورہ کے دنیا کے کاروبار میں سے اور اس کی بہت سی مثالیں نکال سکتے ہیں۔ مثلاً افسر بہ نسبت عوام ملازموں کے بہت سے احکام میں مستثنیٰ ہوتا ہے اور بہت سے احکام اسی کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔

پہرہ سپاہی دیتے ہیں افسروں سے معاف ہوتا ہے۔ پہرہ بدلنا اور حکم بولنا اور انتظام کرنا اور موجودات لینی اور امور ضروری کی حکام بالا دست کو اطلاع کرنی افسروں کے ذمہ ہوتی ہے۔ الحاصل حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم مثل حکم تعداد منکوحات اس حکم سے بھی خارج ہیں اور جب خارج ہوئے تو یہ آیت اور وہ حدیث باہم مخالف نہ ہوئی موافق اور متعاقب ہی نکلی ہاں مخالفت اسے کہتے ہیں کہ شیعہ اپنے اماموں سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے والد کے بعض وارثوں کو بعضے ترکہ کا حصہ نہیں دیا بلکہ خود اپنے آپ سب نے لیا ہے جیسے شمشیر اور معصف اور انکشتری اور پوشاک بدنی۔ سو جن روایتوں کی سند سے اماموں نے اوروں کو حصہ نہیں دیا اول تو وہ فقط انہیں کی روایت ہے اور کوئی اس کا راوی نہیں۔ دوسرے یہ بات آیت ”یوٰصیکم اللہ“ کے ہر طور مخالف ہے تطبیق کی کوئی صورت نہیں۔

اب اگر بالفرض یہ حدیث غلط بھی ہو اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی نے بنالی ہو تب مضمون صحیح ہی نکلا۔ حکم بہر حال یہی ہے کہ فدک وغیرہ متروکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں میراث جاری ہونے کا حکم نہیں اور اس لیے اب ہمیں اس کی ضرورت نہیں کہ اس حدیث کی صحت کے دلائل جمع کر کے پیش کریں یا کوئی اور وجہ دربارہ تطبیق حدیث مذکور اور آیت ”یوٰصیکم اللہ“ بیان کریں یا اس حدیث میں اور روایات باقیہ میں موافقت ثابت کر کے شبہ مخالف کو دور کریں کیونکہ کلام فدک میں میراث جاری ہونے میں تھی۔ سو اس کی طرف سے اطمینان ہی ہو گیا لیکن تاہم بایں نظر کہ اولیائے کرام اور مقربان درگاہ خداوندی کی طرف داری اور ان کے بدگوئیوں کی دعدان شکنی میں اُمید نظر عنایت خداوند تعالیٰ و رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور توقع دعاء و شفاعت اولیاء و مقربان خدا ہے جس میں سے خاص ابو بکر صدیق کہ سرفراز مقربان اور سر لشکر اولیاء ہیں۔ اس لیے اس آیت سے مطابقت کی بھی ایک اور وجہ مرقوم ہے اور تطبیق آیات باقیہ بھی معروض خدمت اہل انصاف ہے۔ ازاں بعد بطور شیعہ دینی کچھ بیان صحت و علامات صحت حدیث مذکور بھی ان شاء اللہ کیا جائے گا۔

حدیث معاشر الانبیاء مخصص آیت یہ تو ریث ہے نہ کہ معارض

سوا اول آیت ”یوٰصیکم اللہ“ کے ساتھ مطابقت کی ایک اور وجہ لیجئے۔ اگر بطور مذکور جس سے جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مستثنیٰ ہونا اس حکم سے معلوم ہو جائے یہ حکم بیان نہ ہوتا بلکہ ایسے الفاظ

ہونے کہ جن سے باعتبار الفاظ عموم خطاب ہی سمجھا جاتا یا کوئی عقل کا اندھا نہیں الفاظ کو یوں کہنے لگے کہ عموم پر دلالت کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حکم میں بہر سبب شامل ہی ہیں۔ تب بر تقدیر صحت حدیث مذکور کوئی دُشوار ہی نہیں بہت سے بہت ہوگا تو آیت مذکور کی تخصیص لازم آئے گی، مخالفت پھر بھی نہیں، مخالفت تو تعارض اور تناقض کو کہتے ہیں۔ تخصیص کی صورت میں استثناء کی صحت ہو جائے گی۔ مثلاً کوئی یوں کہے کہ میرے پاس سب آئے مگر زید نہیں آیا تو اس کلام کے اول لہو آ خر میں کوئی نادان بھی تعارض نہیں سمجھتا حالانکہ یوں کہنا کہ سب آئے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ زید بھی آیا۔ یہ کہنا کہ زید نہیں آیا اس کے مخالف ہے۔ سو اس کی لم یہی ہے کہ آخر کا کلام اول کا حصص ہو گیا۔

باقی کوئی یوں کہے کہ اس مثال پر تو جب قیاس کیا جائے کہ جیسا اس کلام میں جملہ حصص ساتھ لگا ہوا ہے ایسے ہی مضمون حدیث کا کوئی لفظ اس آیت کے متصل آگے پیچھے لگا ہوتا؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ حصص کا لفظوں میں اور متصل ہی ہونا کچھ ضرور نہیں۔ اسی کلام میں کہ سب آئے مگر زید نہیں آیا ایک زید کی تخصیص تو لفظی ہے۔ باقی اور جولا کھوں تخصیص اس کے ساتھ لگی ہوئی ہیں وہ لفظوں میں کہاں ہیں؟ تو ضیح اس کی یہ ہے کہ اس قسم کے کلام کا سبھی کو اتفاق پڑتا ہے اور بایں ہمہ تمام مخلوقات بلکہ سب بنی آدم اور سارے روئے زمین کے رہنے والوں کا آنا بھی مثلاً مقصود نہیں ہوتا۔ ایک بستی کے یا ایک گروہ کے یا ایک ذیل خاص کے آدمی مراد ہوتے ہیں۔ سو یہ تخصیص کون سے لفظ سے نکل آئی اور اس پر تسکین نہ ہو تو اب کے ایسی مثال لیجئے کہ پھر کسی کو مجال دم زدن نہ دے۔

جیسے آنحضرت فَاَنْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنْهُنَّ

ایسے ہی یو صیکم اللہ سے ہیں

اول میں اسی سورت کے یہ حکم ہے ”فَاَنْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنْ النِّسَاءِ مَنِّي وَتِلْكَ زُبَانُ“ یعنی ”نکاح کرو عورتوں سے جس قدر تمہاری مرضی ہو، دو، تین، چار، چار، فقط“۔ اب عرض یہ ہے کہ باتفاق سنی و شیعہ خصوصاً امامی و اثنا عشری اس کے معنی یہی ہیں کہ چار نہایت درجہ ہے اس سے زیادہ کی اجازت نہیں۔ سو اگر ”یو صیکم اللہ“ عام ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور غیر کو سب کو شامل ہے تو ”فَاَنْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ“ بھی عام ہے اور سب کو شامل ہے۔ کوئی لفظ ایسا جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سے مستثنیٰ ہونا ثابت ہو، اس کے پس و پیش میں نہیں۔ پھر جیسے کسی کلام منفعصل سے اس آیت کو تخصیص کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مستثنیٰ کر لیا ہے ایسے ہی

حدیث مذکور سے آیت ”یو صبیکم اللہ“ کو مخصوص کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مستثنیٰ کر لیا۔ اور اگر یوں کہے کہ آیت ”فلانکھوا“ کی تخصیص تو دوسری آیت ہی سے کی گئی سورۃ احزاب کی یہ آیت ”یَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَخْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ مِنْ الْمُؤْمِنِينَ“ تک اس پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چار سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرنا جائز ہے کیوں کہ اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ:

”کہ اے نبی ہم نے حلال رکھیں تیرے لیے تیری عورتیں جن کے تو مہر دے چکا اور جو باندیاں تیری ملک میں آگئی ہیں اس لوٹ میں سے جو اللہ نے دلوادی ہے اور تیرے چچا کی بیٹیاں اور تیری پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور خالاؤں کی بیٹیاں جنہوں نے وطن چھوڑ دیا تیرے ساتھ میں اور جو کوئی عورت ہو مسلمان اگر بخشے اپنی جان نبی کو اور نبی چاہے کہ اس کو نکاح میں لے آئے نری تجھ ہی کو سواء اور مسلمانوں کے۔ فقط“

سواس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چار سے زیادہ کی اجازت نہیں تھی تو اتنی کیوں گنا دیتے۔ سو جیسے آیت ”فلانکھوا“ کی تخصیص اس آیت سے ہوگئی، ایسے ہی کوئی آیت تلاؤ جو آیت ”یو صبیکم اللہ“ کی تخصیص اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مستثنیٰ ہونے پر دلالت کرے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم بے جا کس سے روا ہو گیا؟ کہ کلام قصص بھی ہو تو آیت ہی ہو؟ عقل سلیم کو آیت اور غیر آیت اس بات میں دونوں یکساں نظر آتے ہیں اور عقل کے سلیم نہ ہونے کے عذر سے یہ جواب مسلم نہیں تو ہم کہتے ہیں کہ اول تو آیت ”فلانکھوا“ کا مخصوص ہونا آیت ”إِنَّا أَخْلَلْنَا“ سے مسلم نہیں ہے کیونکہ مقام دعویٰ میں لازم ہے کہ ایسی دلیل پیش کی جائے جس میں خلاف دعویٰ کا احتمال نہ ہو اور اس آیت میں احتمال ہے کہ بمنزلہ ”وَأُحِلُّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَلِكَ“ اس امر کے بیان کے واسطے نازل ہوئی کہ تمہارے لیے اس قسم کی عورتیں حلال ہیں، نہ یہ کہ جتنی چاہو نکاح کرلو۔ جیسے ”وَأُحِلُّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَلِكَ“ کے یہ معنی ہیں کہ تمہارے سواء محرمات مذکورہ کے سب قسم کی عورتیں حلال ہیں۔ بشرطیکہ مہروں سے ان کے ساتھ نکاح کرلو۔ سو اس سے یہ نہیں لگتا کہ سواء محرمات مذکورہ جس قدر چاہو ان سے نکاح کرلو اور مؤید اس احتمال کی یہ بات ہے کہ سورۃ احزاب سورۃ نساء سے پہلے نازل ہوئی ہے۔

چنانچہ تفسیر اتقان میں نوع اول میں ترتیب نزول سورت ہائے قرآنی میں ایک حدیث متصل نقل کی ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ سواء تک آیت ”فلانکھوا“ نازل ہوئی ہی نہ تھی جو

آیت ”اِنَّا اَحْلَلْنَا“ نازل ہوئی اور جب تک آیت ”فَالْاَكْحُوَا“ نازل نہیں ہوئی تھی تب تک نواح کے ہاں اب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا تخصیص؟ کسی کو بھی کوئی قید محدود نہ تھی۔ پھر کیا ضرورت تھی جو اس آیت کو نازل کر کے یہ اطلاع کی گئی کہ تمہارے لیے جتنے نواح کو درست ہیں؟ اس صورت میں لاجرم یوں ہی کہا جائے گا کہ آیت ”فَالْاَكْحُوَا“ کی تخصیص کسی اور ہی وجہ سے ہوئی اور اگر یوں کہئے کہ ترتیب مذکور باعتبار فواتح سورہوں، یہ کیا لازم ہے کہ سورہ احزاب کی تمام آیتیں سورہ نساء کی تمام آیتوں سے پہلے ہی نازل ہوئیں؟ چنانچہ حدیث مشارالہ سے کچھ ایسا ہی واضح ہوتا ہے۔ سو ہر چند یہ احتمال ہمیں ساکت نہیں کر سکتا، اسی لیے کہ مدافعت ان احتمالات کی ہمارے ذمہ نہیں، ہم کس بات کے مدعی ہیں جو احتمالات مخالفت کو رفع کریں؟ ہاں اس احتمال کا دفعیہ کہ شاید ساری ہی احزاب یا فقط آیت ”اِنَّا اَحْلَلْنَا“ ساری سورہ نساء یا فقط آیت ”فَالْاَكْحُوَا“ اس سے پہلے نازل ہوئی ہو۔ ان کو ضروری ہے تاکہ ان کا دعویٰ تخصیص ثابت ہو۔

”يُؤْصِيكُمُ اللّٰهُ“ کی تخصیص دوسری آیت بھی ہے

مع ہذا ہماری چشم پوشی دیکھئے کہ ہم اس سے بھی درگزر کر کے آیت ”يُؤْصِيكُمُ اللّٰهُ“ کی تخصیص بھی آیت ہی بتلاتے ہیں۔ سورہ حشر جو باشارۃ حدیث مشارالہ سورہ نساء سے بعد میں نازل ہوئی ہے۔ اس میں یہ آیت موجود ہے ”مَا اٰتٰهُ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهِ مِنْ اَهْلِ الْقُرْبٰى لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِلَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَمٰلًا يَكُوْنُ ذَوْلَةُ بَيْنٍ اِلَّا غَنِيًا مِّنْكُمْ“ مطلب یہ ہے کہ ”جو مال بطور فرائض کے خداوند کریم نے اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دلوادیا۔ بستیوں والوں سے (یعنی بے لڑنے بے صلح فتح ہو گئی) تو وہ اللہ کے واسطے اور رسول کے اور واسطے والے کے اور یتیموں کے اور محتاجوں کے اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ نہ آوے لینے دینے میں دولت مندوں کے تم میں سے۔ فقط“

اب علماء اہل سنت اور مصنفان علماء شیعہ کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ مال فرائض کی تقسیم جناب باری تعالیٰ نے چھ حصوں پر کی۔ سو بعض علماء کا تو یہی قول ہے کہ چھ حصوں پر تقسیم کر کے خدا کا حصہ بیت اللہ اور مساجد کی تعمیر میں خرچ کیا جائے۔ پر اکثر اُمت کا مذہب یہ ہے کہ مال فرائض کے پانچ ہی حصہ ہیں لیکن چونکہ عبارت ”لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَالْبَنِيْنَ“ جو یہاں ہو بہو ہی عبارت ہے جو پارہ دہم کے شروع میں مصرف خمس کے بیان کے لیے وارد ہوئی ہے اور شیعوں کا اس جگہ پانچ حصوں پر تقسیم کرنا بالیقین معلوم ہے تو بالیقین معلوم ہوا کہ یہاں بھی شیعوں کے نزدیک وہی تقسیم ہوگی۔ سو اس

مذہب کے موافق ذکر خدا کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ جو چیز خداوند کریم کے ارشاد کے باعث اس کی رضا کے موافق خرچ کی جاتی ہے تو اس کو خدا کے ساتھ اور نیز اُن کے ساتھ جو موافق ارشاد خداوندی اس کے مصرف مقرر ہوئے ہیں، ایک نسبت حاصل ہو جاتی ہے۔

خدا کے ساتھ تو یہ نسبت کہ اس کی راہ میں خرچ ہوئی اور اہل مصرف کے ساتھ یہ نسبت کہ ان کے لیے مقرر ہوئی تو اس کو خدا کے واسطے بھی کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ عرف ہی یہ ہو گیا ہے کہ جو چیز بہ نیت ثواب دیا کرتے ہیں، اس کو خدا کے واسطے کہا کرتے ہیں اور اہل مصرف کے واسطے بھی۔ چنانچہ عرف میں ان کی طرف بھی نسبت کرتے ہیں اور بولا کرتے کہ فلانی چیز فقیروں کے یا مسکینوں کے واسطے ہے۔ مثلاً تو اس صورت میں حاصل یہ ہوا کہ مال فقی خدا کے واسطے ہے اور فلانی فلانی قسم کے آدمیوں کے واسطے۔ یعنی خدا کی رضا مندی کے لیے اُن کو دیا جائے اور ضرورت اس کہنے کی یہ ہوئی کہ مال فقی تو اُسے کہتے ہیں کہ جو کفار کے بنجوں میں سے بے لڑے بھڑے بسبب رعب لشکر اسلام کے یا بطور صلح اہل اسلام کے قبضہ میں آجائے۔ سو یہ مال حقیقت میں تو جناب باری تعالیٰ نے اپنے فضل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبض و تصرف میں داخل کر دیا۔

لیکن چونکہ بظاہر اس کا باعث رعب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوا ہے اور رعب میں فی الجملہ جمعیت لشکر کو مداخلت ہے تو لشکریوں کو اس میں طمع ہو سکتی تھی۔ اس لیے یوں ارشاد ہوا کہ جو مال بے لڑے بھڑے ہم نے اپنے رسول کو دلوادیا ہے اس میں تمہیں جاں فشانی کی نوبت نہیں آئی کہ کسی قسم کی مشقت تم پر نہیں پڑی۔ سو مناسب یوں ہے کہ اس کو خدا کے واسطے چھوڑ دو تا کہ مصارف مذکورہ میں صرف ہودے لیکن پہلی آیت میں جو یہ جملہ ہے ”فَمَا أَوْ جَفْتُمْ“ سے لے کر ”قَلِيدُو“ تک اس جملہ کے مناسب یوں ہے کہ یوں کہئے کہ جب خداوند کریم نے تمہاری بے سعی و کوشش کے یہ مال اپنے رسول کو دلوادیا تو اس میں تمہارا کچھ حق نہیں۔ جیسا مال غنیمت بسبب اس کے کہ بظاہر تمہاری جانفشانیوں کے باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ آیا تھا، تم پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایسے ہی جو مال فقط خدا کی عنایت سے ہاتھ آئے وہ خدا کا ہونا چاہیے اور جو لوگ اللہ والے ہیں اور خدا کے نام پر بیٹھے ہیں یہ خدا کے نام کا مال اُن کو ملنا چاہیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فدک کے مالک نہ تھے متولی تھے

بہر حال لفظ ”علی رسولہ“ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبض و تصرف ثابت ہوا لیکن جیسا لفظ علی رسولہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبض و تصرف ثابت ہوا ویسا ہی لفظ ”لِللّٰہ“ سے یہ بھی

ثابت ہوا کہ وہ قبض و تصرف مالکانہ نہیں بلکہ متولیانہ ہے۔ یعنی آپ خازن اور امین ہیں مالک نہیں
 ورنہ اس مصرف کے مقرر کرنے کے کیا معنی؟ مالک کو اپنی چیز کا اختیار ہوتا ہے؟ اور اگر بالفرض واقعہ یہ
 اہل فنی مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہو اور ایک قدر معین کے لیے ذوی القربیٰ اور یتیمی اور
 مساکین اور ابن سبیل کو مقرر کر دینا ایسا ہی ہو جیسا زکوٰۃ کے لیے (جو ایک حصہ معین ہے) فقراء اور
 مساکین وغیرہما کو مقرر کر دیا ہے تو قطع نظر اس کے کہ یہ بات شہادت عبارت آیت ظاہر المطلاق ہے
 اس کے یہ معنی ہوئے کہ (نعوذ باللہ) سرور کائنات علیہ علی آل الفضل الصلوات والتسلیمات جو باتفاق
 سراسر معصوم ہیں۔ اس جہان سے ہر حقوق مندرجہ آیت اپنے سر پر لے گئے، سو اس کے قائل ہونے
 کی جرأت شیعوں ہی میں نظر آتی ہے اہل سنت کو ایسی بات کہہ کر اپنا لٹکا نظر نہیں آتا۔

باقی رہائی کے اندر فنی کا مصارف مذکورہ میں خرچ کرنا۔ سو اس صورت میں اس سے کام نہیں
 چلتا کیونکہ لفظ ”الاء اللہ“ اس صورت میں صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ذوی القربیٰ اور
 یتیمی وغیرہ کو اصل زمین بانٹ کر دینی چاہیے۔ الفرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مملوک ہونے
 کی کوئی صورت نہیں۔ پھر نہ معلوم کہ کس وجہ سے روایت یہہ فدک کو علمائے شیعہ صحیح سمجھتے ہیں یا فدک
 کو بنامہ حق و ارثان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم؟ بلکہ فقط حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حق خاص قرار
 دے کر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بلکہ تمام اکابر صحابہ خصوصاً خلفائے ثلاثہ پر زبان طعن دراز
 کر کے اپنی عاقبت خرات کرتے ہیں۔ اگر پہلے سے عذر جہل تھا تو البتہ یہ عذر معقول ہے لیکن بعد
 استماع ان کلمات طیبات اور مضمون آیت سر اپادایت کے توبہ و استغفار میں کیا توقف ہے؟

ہاں اگر قریہ فدک بطور فنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبض و تصرف میں نہ آیا ہوتا یا بعد ادائے
 قدر ما وجب من جملہ اراضی وسیعہ اور قریات کثیرہ قریہ فدک خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس
 رہ جاتا تو البتہ در صورت احتمال مفروض فی الجملہ جائے گرفت تھی لیکن شیعہ ہی فرمائیں کہ فدک کا فنی
 ہونا اور پھر غیر مقسوم ہونا کس کے نزدیک مسلم نہیں؟ بلکہ انصاف سے دیکھئے تو اس قسم کی تقسیم بھی
 مفید مطلب شیعہ نہیں کیونکہ اگر بالفرض قریات تقسیم ہوئی تھیں تو ہر قریہ والوں سے جدا جدا صلح واقع
 ہوئی تھی کسی ایک کی سلطنت ہی نہ تھی جو فقط اسی سے صلح کرنی کافی اور منطقی ہو جاتی۔ سو اس صورت
 میں لازم تھا کہ ہر قریہ میں سے تقسیم کر کے حقوق واجہہ کو ادا کرتے کیونکہ لفظ ”ما جو الاء اللہ“ میں ہے
 عموم اور شمول افراد پر دلالت کرتا ہے۔ مثل غنیمت ہر فنی کو جدا گانہ تقسیم کرنا چاہیے تھا۔

اور اگر کوئی عقل کا اندھا اور تعصب کا پورا سینوں سے دامن چھڑانے کے لیے فدک کو کسی

قیمت کا حصہ جس بہرہ کر سنیوں کے سامنے آنکھیں کرنے کا ارادہ کرے، تب بھی موافق مثل مشہور
 ”بہرہ کہ رسیدیم آسمان پیدا است“ دعی خرابی کی خرابی برسر رہے گی کیونکہ جن الفاظ اور
 جس مبروت سے مال فنی میں سواہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصناف اربعہ ذی القربیٰ وغیرہ
 کے حقوق کا قصص ثابت ہوتا ہے۔ دعی الفاظ بھیہا نفس کے مصرف کے بیان کے لیے جناب ہاری
 تعلیٰ نے ارشاد فرمائے ہیں۔ اگر علماء شیعہ کو بوجہ یاد نہ ہونے کلام اللہ کے بحکم ”المرء یقسی
 علی نفسه“ اس گفتار میں میری طرف دروغ کا احتمال ہو تو کلام اللہ تو ہر جا موجود ہے۔ سیپارہ
 دہم کی پہلی آیت کو مطالعہ کر دیکھیں۔

مع ہذا نفس تو مال غنیمت میں سے ملتا ہے۔ سوا کہ بالفرض فدک جنگ و جدال سے فتح ہوا ہوتا تو
 چار نفس تو پھر بھی غنیمت کے ہوتے۔ علیٰ ہذا القیاس سوائے اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ
 اگر کہے تو جو حال اور مجاہدین کا ہے دعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ سو کسی طرح سارے فدک کے
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مملوک ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ یہ بھی احتمال نہیں کہ فدک کسی قریب
 کے اس حصہ معین کا نام ہے جو بعد ادائے حقوق واجبہ رہ گیا تھا کیونکہ بالاتفاق المل لغت صاحب
 قاموس وغیرہ اس بات پر متفق ہیں کہ فدک ایک قریب کا نام ہے۔ علماء شیعہ کو بھی اس میں کلام نہیں اور
 جاہلوں سے اپنی کلام نہیں۔ بہر حال قبل اس بات کے کہ بعد تقسیم اراضی کثیرہ فدک خاص رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے پاس رہ گیا تھا۔ یہ احتمال باطل ہے کہ اراضی فنی بلکہ اراضی نفس بھی مملوک
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نہیں (مثل خیال محال مجاہدین پریشان ہی رہے گا۔

آیت کے ہر لفظ سے فدک کا مملوک نہ ہونا ظاہر ہے

مگر شاید کسی عقل کے دشمن کو اس احتمال کے بطلان کی حقیقت میں غلبان رہے۔ اس لیے ہم کو
 بھی لازم ہے کہ اس احتمال کے بطلان کے وجوہ جن سے مال فنی بھی ثابت ہو جائے۔ بیان کر کے
 ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی برآۃ بلکہ حقانیت اور علماء شیعہ کی خوش فہمی کو آشکارا کر دکھلائیں۔ سوا قول تو
 اس احتمال کے بطلان کے لیے کہ فدک جو من جملہ اراضی فنی ہے مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھا
 (اور ان مصارف مظلوم کا مقرر کردہ پانچویں ایسا ہے جیسا اموال مملوکہ میں قدر زکوٰۃ کے لیے فقراء اور
 مساکین وغیرہم کو مقرر فرمایا ہے) قطع نظر اس کے کہ ادنیٰ سے عربی داں کو بھی یہ وہم نہیں گزر سکتا۔
 چنانچہ ظاہر ہے یہی ایک لفظ ”لله“ کافی ہے کیونکہ مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہونا اموال
 فنی کا اس لفظ سے ظاہر و باہر ہے۔ چنانچہ مطالعہ کنان تقریر مسطور بالا پر ان شاء اللہ غفلت نہ رہے گا۔

دوسرے اگر لفظ ”مَا آفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ“ تملیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دلالت کرتا ہو، ”لِلرَّسُولِ“ کہنے کی کیا حاجت تھی؟ بلکہ مثل ”وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ خِسْفٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُمْسَهُ وَلِلرَّسُولِ الْخ“ یہاں بھی جس قدر خداوند کریم کو مد نظر ہوتا کہ اس کی راہ میں خرچ کیا جائے اس کی تعیین فرما کر ”لِللَّهِ“ کے بعد ”وَلِلَّذِي الْقُرْبَىٰ وَالْبَتَاغَى الْخ“ فرما دیجے ”لِلرَّسُولِ“ نہ فرماتے۔ اور اگر یوں کہے کہ لفظ ”مَا آفَاءَ اللَّهُ“ سے تو تملیک نہیں ثابت ہوئی پر ”لِلرَّسُولِ“ تملیک پر دلالت کرتا ہے تو البتہ یہ بات نادانوں کے نزدیک داناؤں کی سی بات ہے لیکن سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ اگر ”لِلرَّسُولِ“ میں لام تملیک کے لیے ہو تو لاجرم ”لِللَّهِ“ وَلِلَّذِي الْقُرْبَىٰ کا لام بھی تملیک ہی کے لیے ہوگا اور ظاہر ہے کہ اس جگہ تملیک بے اس کے ہو ہی نہیں سکتی کہ جس کی ملک کیا گیا ہے پہلے سے اس کی ملک میں نہ ہو بلکہ بعد اقامہ یعنی مسلط کر دینے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ اصناف مندرجہ آیت مال فنی کے مالک ہوئے ہوں کیونکہ اول تو بات ظاہر ہے قبل اقامہ اموال فنی میں کفار کے سب تصرفات مثل بیع شراء ہبہ وغیرہ کے سب کے نزدیک صحیح ہیں۔ مع ہذا اگر وہ قبل اقامہ مسلمان ہو جائیں یا جزیہ قبول کر لیں تو بہ نسبت اموال کوئی ان کا حرام حال نہ ہو، یعنی اس سے معلوم ہوا کہ قبل اقامہ کفار ہی مالک تھے۔

لام تملیک کیلئے ہو تو اموال فنی غیر مملوکہ خدا ہوں گے

دوسرے فاء تعقیب خود اس بات پر شاہد ہے کہ اگر لام ”لِلرَّسُولِ“ وغیرہ سے ملکیت ثابت ہوئی، تب اس کا خداوند مالک الملک خالق ارض و سما کا پہلے سے مالک نہ ہونا شیعوں ہی کے نزدیک ہو سکے تو ہو سکے؟ کیونکہ پہلے سے مالک نہ ہونے کی وجہ اگر ہو تو یہ ہو کہ اموال فنی قبل اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر قابض ہوں، کفار کے مملوک تھے اور ایک شے کے بے مہا ایک وقت میں دو مالک نہیں ہو سکتے۔ پھر خداوند کریم کو بھی کس طرح مالک کہہ دیجئے لیکن یہ استبعاد جب ہی ہو سکے ہے کہ ملک خداوند کریم، ہم پہلے ملک کفار ہو سوشیعہ برہمک معتزلہ جیسے بدعہ مخلوق کو کہ افعال اختیار یہ کا خالق قرار دے کر خالق حقیقی کے برابر سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی اگر ملک میں بھی خالق اور مخلوق کو برابر سمجھنے لگیں تو کون روکتا ہے، عقیدہ غلط سے بجز عقل کے اور کوئی نہیں روک سکتا۔ سو وہ پہلے ہی نصیب دشمنان ہوئی اور اہل سنت جو بندوں کے ملک کو مالک الملک کے ملک کے سامنے بھولہ قہرہ خزانچی بلکہ مسعیر مالک اصلی کے ملک کے سامنے سمجھتے ہیں تو ان کو مالک الملک کے ملک اور بندوں کے (خصوصاً کفار کے) ملک کے اجتماع میں کوئی محال نظر نہیں آتا۔

آیت کا مقصد بیان تملیک نہیں ہے

اور سنا کہ تملیک بمعنی مذکور نہ ہو بلکہ مقصود فقط بیان ملک ہو اور موافق عقیدۃ اہل سنت "لِلّٰہِ وَلِلرَّسُولِ" کے یہ معنی ہوں کہ مالک حقیقی خداوند مالک الملک ہے اور مالک مجازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیکن "لِلّٰہِ الْقُرْبٰی الْخ" کے لام سے جو ذی القربٰی و یتامی وغیرہ کی ملکیت ثابت ہوتی ہے اس کا کیا جواب؟

مع ہذا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ذی القربٰی وغیرہ ہر ایک ہر ایک کو خصل خداوند مالک الملک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام اموال فنی کا مالک کہئے۔ چنانچہ بظاہر "لِلرَّسُولِ" اور "لِلّٰہِ الْقُرْبٰی" کا عطف "لِلّٰہِ" ہی پر ہے اور وہ اسی بات کو مقتضی ہے۔ تب تو اس کے محال ہونے میں کلام ہی نہیں اور اگر یوں کہئے کہ "لِلّٰہِ الْقُرْبٰی" کا عطف "لِلرَّسُولِ" پر ہے اور یہ دونوں معطوف معطوف علیہ ل کر "لِلّٰہِ" پر معطوف ہیں۔ تب اس سے بھی کیا کم کہئے کہ اموال فنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصناف باقیہ میں اور خدا میں مشترک ہوں۔

سو یہ بات اول تو یوں کسی مسلمان کے دھیان میں نہیں آ سکتی کیونکہ اس صورت میں لازم تھا کہ جیسے غنیمت غانمین پر تقسیم کی جاتی تھی، اموال فنی اصناف معلومہ پر تقسیم کیے جاتے تاکہ ہر کوئی اپنے حسب دلخواہ اس میں تصرف کرتا۔ ضرورت ہوتی تو کسی کے ہاتھ بچ دیتا نہیں تو آپ رکھتا یا کسی کو دے دیتا۔ سو یہ وبال کس کی گردن پر رہا کہ مالکان اشیاء کو دخل نہ ملا؟

سوال سنت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو درکنار اُن کے خدام کی طرف بھی یہ وہم نہیں آ سکتا کہ ایسے ظلم عظیم کے مرتکب ہوئے ہوں۔ ہاں شیعہ کہیں تو اُن سے کچھ دور بھی نہیں۔ اُن کی اور خرافات کو اگر ٹٹولے تو اس سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہیں۔ دوسرے اگر تقسیم بھی وقوع میں آتی تب یہ بات تصور میں نہیں آ سکتی کہ شرکاء غیر معین میں ایک چیز مشترک ہو۔ غانمین کی تو ایک تعداد معین ہوتی ہے ان کو غنیمت میں شریک کہئے تو زیبا ہے۔ ذی القربٰی اور یتامی وغیرہ کا کوئی عدد معین کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا اور معلوم بھی ہو تو سب کو اُن کا حق پہنچانا بندوں سے محال ہے۔ مع ہذا اصل زمین کا دینا تو ایک طرف اراضی فنی کی آمدنی بھی تمام ذی القربٰی اور تمام جہان کے یتامی اور مساکین اور ابن سبیل کو نہیں پہنچی نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے۔ اور اگر ان اصناف اربعہ کو اہل اسلام ہی میں منحصر رکھ کر کلام کیجئے تب بھی شیعوں کا قافیہ تنگ ہی رہے گا۔

اور اگر بالفرض بغرض محال مقصود جناب ہاری تعالیٰ "لِلّٰہِ" سے تو یہ ہو کہ مالک حقیقی جناب ہاری

تعالیٰ ہے اور ”فللرسل“ سے یہ مطلب ہو کہ مالک مجازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ”للی القریٰ الخ“ بیان مصرف کے لیے ہو تو اہل سنت کو سوائے اس کے کہ اس صورت میں خدا کی طرف حرف عائد ہوگا۔ چنانچہ معلوم ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اس کی تسلیم میں کچھ دشواری نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک جو اس صورت میں فقط برائے نام ہی ہوگی مگر بالقرض بطور وراثت وارثوں کی طرف منتقل بھی ہو جائے گی تو استحقاق اصناف باقیہ تو کسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارثوں کی طرف منتقل ہو ہی نہیں سکتا۔ جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اصل کایا آمدنی کا خرچ کرنا ضروری تھا، بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح بدستور رہے گا۔

اور اگر بقرض محال منتقل بھی ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے اصناف اربعہ کے وارثوں کی طرف منتقل ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارثوں سے کچھ تعلق نہیں۔ سوا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو نہیں دیا تو لم اس کی بھی ہے کہ ان کی طلب گاری سے یہی بات ٹپکتی تھی کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا فدک کو جو بطور فنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبض و تصرف میں آیا تھا مثل اور املاک ہر قسم کے تصرف فنی قابل سمجھ کر فقط اپنی گذران کے لیے طلب کرتی تھیں بطور تولیت نہیں مانگتی تھیں ورنہ دعویٰ ہبہ اور دعویٰ میراث کے کیا معنی؟ مع ہذا روایت عجیب السالکین جس کا ترجمہ تو مذکور ہو چکا اور عبارت بھی ان شاء اللہ قریب ہی مذکور ہوگی اس دعویٰ کے لیے دلیل کامل ہے۔ اہل فہم اس روایت سے آپ سمجھ جائیں گے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نہ دینا فقط اسی وجہ سے تھا کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا فدک کو اپنے مصرف کے لیے طلب فرماتی تھیں ورنہ اگر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا بھی اس لیے طلب فرماتیں کہ مصرف مذکور میں صرف کریں تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ یوں کیوں عذر کرتے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مصرف میں صرف کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

مگر چونکہ اہل حق بعد ظہور حق کے مان لیا کرتے ہیں جب حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی فہم مبارک میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بات آگئی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اسم باسکن صدیق صادق پایا، یہ گمان خود پہلے سے نہ تھا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ خورد برد کر لیں گے۔ اس کام کے اپنے سر رکھنے میں خلجان دیکھا تو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا عذر قبول فرمایا اور ان کا قول مسلم رکھا اور فدک کی آمدنی کے مصرف کا انتظام اور اہتمام ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کے سر ڈالا اور راضی ہو گئیں۔ چنانچہ ناظران روایت مذکور پر غفلت نہ رہے گا۔

اس پر بھی شیعہ نہ مانیں تو اور کیا کہا جائے کہ ان تالپوں کو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے اجتماع سے غرض نہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی عداوت کے لیے اہل بیت کے نام کو آ ذکر رکھا ہے۔

آیت میں لام کے مختلف معنی مراد لینے پر مفاسد

الحاصل اگر بفرض محال ”لله“ سے تو یہ مراد ہو کہ مالک حقیقی خداوند کریم ہے اور ”لِلرَّسُولِ“ کا یہ مطلب کہ مالک مجازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ”لِلدِّي الْقُرْبَنِی الْخِ“ کے یہ معنی ہوں کہ ان مصارف میں صرف کیا جائے تو اہل سنت کو تو اس کی تسلیم میں کچھ دشواری نہیں، مالک فدک بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور وراثت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی کسی لیکن ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے خرچ کرنے کے داروغہ تھے۔ برضائے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا فدک کی آمدنی کو مصارف معلومہ میں صرف کرتے تھے۔ پر سینوں کی اس طفل تسلی سے شیعوں کے کیا ہاتھ آئے گا۔ اُلٹا بیس طرح کی خرابیاں اور جوابدہی سردھرنی پڑے گی۔

اول تو نعوذ باللہ یہ لازم آئے گا کہ خداوند کریم نے بایں ہمہ عنایت اس تملیک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مقرب اور محبوب کے ساتھ وہ معاملہ کیا جیسے کہا کرتے ہیں ”گھربا ہر سب تیرا ہے پر کوشی کھلے کو ہاتھ نہ لگاتا“ سبحان اللہ جو بات مخلوق کے حق میں بھی معیوب ہو، وہ شیعوں کو اس صورت میں جناب باری تعالیٰ کی نسبت تجویز کرنی پڑے گی۔ دوسرے یہ کہ قرآن شریف کے اعجاز کا شہرہ اور بوجہ فصاحت و بلاغت اور خوبی عبارت و مضامین جناب باری تعالیٰ کا یوں دعویٰ کرنا ”فَلَا تُؤْتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ“ یعنی ایسی کوئی ایک سورت ہی لے آؤ زیادہ نہیں تو ”إِنَّا أَعْطَيْنَا“ ہی کے برابر کسی۔ اس صورت میں محض بے جا اور بے موقع ہو جائے گا۔ مضمون ایسا کچھ کہ مالک تو کر دیا پر اختیار ذرہ برابر نہ دیا اور عبارت ایسی کچھ کہ معنی مقصود سے کچھ لگاؤ نہیں۔ اگر اس وجہ سے اس موقع میں یوں کہا جائے کہ ”المعنی فی بطن الشاعر تو بے موقع نہ ہو۔

بلکہ انصاف سے دیکھئے تو خلاف مقصود پر البتہ دلالت موجود ہے قرینہ عطف سے ”لِلرَّسُولِ“ و ”لِلدِّي الْقُرْبَنِی“ سے ایک طرح کا استحقاق ثابت ہوتا ہے۔ ہاں اگر کوئی اور قرینہ اس سے اقویٰ اس کے معارض ہو جاتا جیسے ”لله“ میں موجود ہے تو کچھ مضائقہ بھی نہ تھا۔ اس لیے سوا اس کے کہ بطور احوال میری زبان پر آ گیا، آج تک کسی نے اس کا یہ مطلب ہی نہ سمجھا اور ہاں ہمہ قرآن قرآن مبین بھی رہا۔ تیسرے ”لله“ کے لام کو اگر تملیک کے لیے اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ تملیک

وہاں ہوا کرتی ہے جہاں پہلے سے ملک نہ ہو تو یہ مسلم۔ لیکن "لِلّٰہِ الْقُرْبٰی الْخ" کے لام کے یہ معنی کیوں نہیں؟ ذی القربٰی وغیرہ تو کچھ ہم پایہ خدا اور شریک موجودات نہیں جو مالک حقیقی اور مالک قدیمی ان کو کہا جائے؟ اور تملیک بمعنی مذکور کے گنجائش نہ ہو۔

چوتھے یہ کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک مثل ملک جملہ بنی آدم ہے اور آپ اس قسم کی ملک کے قائل ہیں تو قرینہ عطف یوں تقاضا کرتا ہے کہ جو بات "لِلرَّسُولِ" کے لام سے ثابت ہو وہی "لِلّٰہِ الْقُرْبٰی" کے لام سے ثابت ہو ورنہ ترجیح بلا مرجع ہے اور اگر مثل ملک خداوندی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک بھی عوام کی ملک سے ممتاز ہے اور ایک نوع جداگانہ ہے تو ہم یوں کہتے ہیں کہ جیسے باری تعالیٰ کی ملک میں وراثت جاری نہیں ہو سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک میں بھی وراثت جاری نہیں ہو سکتی۔

آپ کی ملک میں وراثت جاری نہیں ہو سکتی کیونکہ آپ زندہ ہیں

اور یہ بات دو وجہ سے قرین قیاس بھی ہے۔ اول تو یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ تمام انبیاء بالیقین قبر میں زندہ ہیں تو اس صورت میں آپ کی ملک زائل ہونے ہی نہیں پائی جو وارثوں کی ملک اس کے قائم مقام ہو بلکہ جیسے ہم تم کہیں چلے جائیں یا چدے کسی گوشہ میں بیٹھ رہیں اور ہمارے لواحق وغیرہ ہماری اشیاء کو برتنیں تو اس سے ہماری ملک زائل نہیں ہوتی اور برتنے والے وارث مالک نہیں ہو جاتے۔ ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی گوشہ قبر میں نہاں ہو گئے ہیں اور آپ بدستور اپنی اشیاء اموال کے مالک ہیں، کوئی اور مالک نہیں ہو گیا اور حدیث "لَا نُورِثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃً" جو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس حدیث کی "لِہِ" بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ آپ اب تک بقید حیات ہیں۔ پر شیعہ نہ سمجھیں تو کیا کیجئے؟

خدا کی مالکانہ شان آپ کو اتنی مشاہد تھی کہ اپنی ہر چیز کو عاریت یقین کرتے تھے

اور اگر شیعہ یا کوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زعمہ ہونے کو نہ مانے تو دوسری وجہ یہ ہے کہ انبیاء خاص کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بسبب کمال درجہ کی حقیقت شناسی کے ہر دم و ہر لمحہ خداوند کریم مالک الملک کی ملکیت کو دیکھتے ہیں اور اس کا مالک ہونا ہر وقت ان کے پیش نظر ہے۔ اس لیے اپنی ملک کو ملک ہی نہیں سمجھتے بلکہ جیسے کوئی کسی کے گھر دعوت کھانے جاتا ہے اور اس کے کھانے کو بمنزلہ اور اثاثہ البیت کھانا کھلانے والے ہی کی بلک سمجھتا ہے۔ پر خاص اس

کھانے کی نسبت جو اُس کے سامنے رکھا جاتا ہے فقط کھالینے کی اجازت سمجھتا ہے۔ نہ یہ کہ اپنا کچھ کر کسی کو دے دے یا بیچ ڈالے یا اپنے لواحق کے لیے یجائے بلکہ اپنے لیے یجانا بھی ممنوع جانتا ہے۔ نہیں تو عرف و شرع میں اس بات کو کوئی معیوب نہ سمجھتا۔

ایسا ہی انبیاء بھی ان اشیاء کو جو ان کے قبضہ میں بطور ملک ظاہر کے آجاتی ہیں اپنی ملک نہیں سمجھتے بلکہ ملک مالک الملک سمجھ کر بمنزلہ مہمان یا دعویٰ کہ جو کچھ اُس سے کھایا گیا یا کیا باقی مالک خانہ کا ہے جو کچھ اپنے کام آیا اپنے کام میں لائے، باقی کو خدا کی ملک سمجھ کر اس دارِ دنیا سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر جب ان کے نزدیک اُن کا ترکہ ان کی چیز ہی نہ ہوئی تو یہ قبض حین حیات اور استعمال بمنزلہ قبض طعام و عوت اور استعمال مال مستعار ہوگا اور ان کے عندیہ میں وارثوں کو اُس میں سے کچھ حق نہ پہنچے گا۔ اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہو: ”لا نورث ما ترکناہ صلۃ“

ایک شبہ کا ازالہ

اور یہ بات کہ اگر انبیاء کا مقبوضہ ان کی ملک ہی نہیں تو اُن کی بیع و شرا بھی چاہیے کہ نافذ نہ ہوا کرے، کسی نادان ہی کے دل میں کھٹکے تو کھٹکے؟ کیونکہ جن سے محبت ہوتی ہے بسا اوقات اہل دنیا بھی اُن کو اس بات کی اجازت دے دیا کرتے ہیں کہ وقت ضرورت ہماری چیز کو بیچ لیتا خداوند کریم تو درکنار بلکہ یا راہِ بے تکلف تو اجازت کے بھی محتاج نہیں ہوتے۔ دوستوں کی چیز میں اجازت ہی سمجھتے ہیں لیکن اس اجازت کو موجب ملک کوئی نہیں سمجھتا۔ یہاں تک کہ اُس کے وارث بھی اُس کے مستحق ہو جائیں۔ الحاصل انبیاء کی حقیقت شناسی اسی بات کو مقتضی ہے کہ اپنے مقبوضہ کی نسبت اپنے آپ کو مالک نہ سمجھیں۔ ہاں اُس کو من جانب اللہ وقف سمجھ کر اور ملک خداوند کریم جان کر حسب ضرورت اپنے کام میں لاتے ہیں۔

باقی رہے عوام اور سوائے انبیاء کے اور لوگ ہر چند کتنے ہی باکمال کیوں نہ ہوں بمنزلہ عوام ہی کے ہیں، سوان کو انبیاء کے مقابلہ میں بمنزلہ اطفال اور مجانین کے بڑوں بوڑھوں، عقل مندوں کے مقابلہ میں سمجھتا چاہیے، یعنی جیسے اطفال بے تمیز اور مجنونان اطفال سیرت دعوت یا غیر کی کسی قسم کی چیز کو اگر اُن کے پلے پڑ جائے، اپنی سمجھ کر اگر مالک بھی اُن سے لینے لگے تو غل مچا دیتے ہیں اور رونے دھونے لگتے ہیں اور مالکان سیر چشم چشم پوشی کر کے چپ ہو رہتے ہیں اور اُس کھانے کو انہیں کو یجانے دیتے ہیں اور اُن اشیاء کو انہیں کے پاس چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ ایسے ہی عوام بھی اس متاع دنیا کو جو حقیقت میں ملک مالک الملک۔ مالک حقیقی کی ہے اُن کے پاس مستعار ہے۔ گو

زہان سے خدا کی کہے جائیں پر دل سے اپنی ہی سمجھتے ہیں اور اگر کسی ایک آدمی نے اُس کو دل سے بھی خدائی کی سمجھا تو اول تو پورا پورا سمجھنا کہاں؟ دوسرے کسی کو کیا معلوم؟ دل کی بات سوا خدا کے کون جانتا ہے؟ جو اُن کے مال میں وراثت جاری نہ کی جاوے۔ مثل نبوت اگر ان کے اندر بھی اس کی کوئی علامت ہوتی تو یوں بھی ہوتا، اس لیے خداوند اکرم الاکرمین نے براہ چشم پوشی اُن کے متروکہ کو انہیں کی ملک قرار دے کر بقدر مناسب اُن کے پس ماندوں کو تقسیم کر دیا۔

القصة ان وجوه سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ملک انبیاء بریگ ملک خدا قائل وراثت نہیں اور اگر براہ تعصب ان وجوہ کو کوئی تعصب سمجھے تو یہ احتمال تو کہیں نہیں جائے گا کہ ملک انبیاء شاید قائل وراثت نہ ہو۔ یہ وجوہ غلط ہیں تو ہوا کریں، شاید کوئی اور ہی وجہ ہو۔ مدعیان وراثت کو جب بھی مشکل ہی رہے گی۔ القصة "لِلرَّسُولِ" سے ایسی ملک کو ثابت کرنا جو برائے نام ہو، اہل سنت کو تو کچھ معز نہیں۔ پر شیعہ اتنا تو سمجھ لیں کہ کوئی اجنبی ایسی نامعقول باتوں پر کیا کہے گا؟ القصة اہل دانش و ہم کے نزدیک لام "لِلرَّسُولِ وَلِلَّذِي الْقُرْبَىٰ" سے ملکیت اور استحقاق اصناف مندرجہ آیت محل لام "لِلذِّكْرِ مِثْلَ حَظِّ الْأُنثَىٰ" یا لام "لَكُمْ رُؤُسُ أَمْوَالِكُمْ" جو پہلا ملکیت اور دوسرا استحقاق پر دلالت کرتا ہے ہرگز ثابت نہیں ہو سکتا۔

آیت میں لام بیان مصارف کیلئے ہے

ہاں اگر محل لام "أَمَّا الصَّلَافَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ الْخ" بیان مصرف کے لیے کہا جائے تو البتہ قرین عقل اور شیعوں کے نزدیک بھی واجب التسليم معلوم ہوتا ہے کیونکہ اول تو اس میں کچھ خرابی نہیں، بے غل و غش عقل اسے مسلم رکھتی ہے اور بوجہ بے عقلی اگر عقل کی بات کے تسلیم کرنے میں شیعوں کو کچھ عذر ہو تو آیت "وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ" میں جو بھیہنا آیت "مَا آتَاكُمُ اللَّهُ" کے مطابق ہے۔ اتفاقات سے شیعوں کے نزدیک بھی لام بیان مصرف ہی کے لیے ہے۔ چنانچہ ابوالقاسم صاحب شرائع الاحکام نے جو مطلب محقق ہے اور سوا اُس کے اور علماء امامیہ نے اس بات کو تصریح کیا ہے بلکہ اس مذہب کے اماموں سے بھی یہ سند بیان کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جو کوئی کسی چیز کا مصرف ہوتا ہے، اگر مالک مال اُس کو نہ دے تو اہل مصرف اس کے داد خواہ نہیں ہو سکتے۔ ہاں جملہ اہل مصرف قبل عطاء مالک نہیں ہوتے۔ اس لیے فقراء وغیرہ کو زکوٰۃ اور صدقات کا قبل از عطا کوئی مالک نہیں سمجھتا تو اس صورت میں اس آیت میں بھی لام ملکیت اور استحقاق پر دلالت نہ کرے گا اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدک وغیرہ اراضی فنی کا تقسیم کرنا

ضروری نہ سمجھا بلکہ آمدنی کو ہمیشہ تقسیم فرماتے رہے۔ اگر لام ”للمّٰسول“ وغیرہ ملکیت اور استحقاق پر دلالت کرتے تو قرینہ لفظ ”ما الاء اللہ“ کا اس بات کو مقتضی تھا کہ اصل زمین کو بانٹ کر مستحقوں کو حوالہ فرماتے کیونکہ اصل زمین صدق ”ما الاء اللہ“ ہو سکتی ہے نہ کہ آمدنی۔ چنانچہ ظاہر ہے۔

اہل شیعہ کا اعتراض کہ ما الاء اللہ کا مقتضی زمین کی تقسیم تھا

اور آپ آمدنی تقسیم فرماتے رہے؟

یہاں اگر شاید کسی عقل کے دشمن کو یہ شبہ حیران کرے کہ ہم نے مانا یہاں مصرف سے ملکیت اور استحقاق ثابت نہیں ہوتا تا وقتیکہ اہل مصرف کو کچھ عطا نہ کیا جائے، ان کی ملک میں نہیں آتا لیکن لفظ ”ما الاء اللہ“ اس بات کو تقاضا کرتا ہے کہ اصناف مندرجہ آیت مصرف اہل زمین ہوں تو اس صورت میں لازم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصل زمین کو تقسیم فرماتے، آمدنی کا تقسیم کرنا بظاہر خلاف آیت ہے۔ سو اس خاکپائے علماء کی گزارش یہ ہے کہ اس قسم کے شبہ کا جواب اہل سنت تو ان شاء اللہ بطور معقول دے سکیں گے لیکن شیعہ اتنا تو سمجھیں کہ یہ اعتراض اہل سنت پر نہیں بلکہ صاحب سنت سرور کائنات خاتمہ موجودات علیہ علی آلہ افضل الصلوٰات والتسلیمات پر ہے۔ سو اس صورت میں اپنے مذہب کی بھی خیر نہیں، ایسے شبہ کا جواب ہماری طرف سے تو وہی شعر مشہور بہت ہے۔

شام کہ از رقیبان دامن کشاں گذشتی گوشت خاک ما ہم برباد رفتہ شد

بائیں ہمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فدک کو تقسیم کر کے نہ دینا، ہمیں تو ایمان کے لیے کچھ اور افعال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کم نہیں۔ ہم تو بے دلیل اس کو صحیح سمجھتے ہیں لیکن در صورت یہ کہ ابو بکر صدیق وغیرہ اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرف داری میں ہم کو اتنا بکھیزا کرنا پڑا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف داری اور حمایت کیونکر نہ کریں گے۔ اگر شیعوں کو خلفاء کے بغض اور حسد کے باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اس بات کا طعن ہے کہ آیت سے تو آمدنی کا مصارف مندرجہ آیت میں صرف کرنا معلوم نہیں ہوتا۔ اگر اہل مصرف کا دینا اس آیت سے لکھا بھی ہے تو اصل زمین کا لکھا ہے۔ پھر آپ نے اصل زمین ہی کیوں نہ تقسیم فرمائی؟ تاکہ سب نہیں تو کچھ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ پر آتا اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا بہ نسبت فدک دعویٰ وراثت صحیح ہو جاتا اور یہ طعن جو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر (بوجہ نہ دینے میراث کے) ہم کرتے تھے، حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا پر حسب مزموم شیعہ پلٹ کر نہ آتا

ہونکہ وہ معصوم تھیں اور معصوم سے یہ بات کہ جو اپنے مورث کی چیز ہی نہ ہو، اس میں دعویٰ وراثت ہارے (اس اہتمام سے کہ شیعوں سے سب ہی نے سنا ہوگا) ہرگز تصور میں نہیں آ سکتا۔

اور ایک شے اگر مالک اہل مصرف میں سے کسی ایک کو اس غرض سے عطاء کرے کہ اس قدر روٹوں کو دے کر باقی جو بچے اس کو اپنے آپ رکھ لے تو اور دینا لیتا تا دقتیکہ جس کو وکیل تقسیم بنایا ہے تقسیم نہ کرے، اُس قدر میں کہ جس قدر بعد تقسیم اس کے پاس باقی رہ جائے گا اس کے لیے موجب ملک نہیں ہو سکتا اور وجہ اس کی ظاہر ہے کیونکہ ہبہ اشیائے مشترکہ میں باتفاق فریقین بے نفع موجب ملک نہیں ہو سکتا اور قبض بے تقسیم تصور نہیں تو اس صورت میں یوں بھی نہیں کہہ سکتے کہ خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قابض تو تھے ہی، اگر اور کوئی اصناف مندرجہ آیت میں سے بائیں ہبہ مالک نہیں ہو سکتا کہ اہل مصرف قبل عطاء اور قبل قبض مالک نہیں ہوا کرتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو سب ہی پر قابض تھے اپنا حصہ بھی اس میں آ گیا۔

بہر حال کوئی صورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مالک ہونے کی نہیں نکلتی جو دعویٰ وراثت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا صحیح ہو۔ بالجللہ ان مقامات میں تصدیق اور انفاق ہے اور موصوف بعدق اور انفاق (یعنی اموال) کا لحاظ شیعوں کے اطوار سے یوں ٹپکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تقسیم نہ کرنے میں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دوجہ سے حرف ہو۔ ایک تو یہ کہ بظاہر خلاف آیت کیا۔ دوسرے اس تقسیم نہ کرنے کی بدولت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی معصومیت بالکل ہی تھامنی مشکل پڑ گئی۔ اس لیے ہمیں بھی اپنا مافی الضمیر ضرور عرض کرنا پڑا تا کہ بسبب طرف داری جناب رسالت مآب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم دامان رحمت خدا دہی میں ہمیں بھی جگہ ملے اور شیعہ جواب دندان شکن سن کر اپنے کردار کو پہنچیں۔

اعتراض کا جواب کہ اموال فنی وقف ہیں نہ کہ ملکیت

جناب من شیعوں کا ایسے مقامات میں لڑنا (قطع نظر اس کے کہ اہل سنت پر کیا اعتراض کرتے ہیں) اپنے مذہب پر کرتے ہیں (اس مثل مشہور کا مصداق ہو جانا ہے۔ ع..... "نحن شائس نہ دلبر اخطا انجاست" کیونکہ "ما الاء اللہ الخ" جملہ اسمیہ ہے اور جملہ اسمیہ کلام بلغاء اور فصحاء میں موجب دوام وثبوت ہوتا ہے اور کوئی بشر بمقتضائے بشریت اس قاعدہ کی رعایت میں چوک جائے تو چوک جائے۔ خداوند عظیم چوک نہیں سکتا، مگر اس صورت میں لازم ہے کہ "اللہ نور" "الرسول" اور "المدی القربی" ہونے کی صفت "ما الاء اللہ" سے زائل اور منقطع نہ ہو اور ہاں صفت موصوف ہونے سے

اس کی ذات میں کچھ انکار نہ ہو، سو یہ بات جیسی بن پڑتی ہے کہ اموال فنی کو، چنانچہ مرقوم ہو چکا وقف کہا جائے کیونکہ وقف کو ”دائمًا للہ“ بھی کہہ سکتے ہیں اور اہل معرف کے لیے بھی کہہ سکتے ہیں۔

فنی اور صدقات کا ایک لطیف فرق

باقی رہا جملہ ”انما الصدقات للفقراء الخ“ ہر چند وہ بھی جملہ اسیہ ہی ہے لیکن اہل دانش و فہم پر غصی نہ ہوگا کہ صدقہ ہونا کسی چیز کا خود ایک آنی بات ہے۔ یعنی کبھی آپن واحد کے لیے اس صفت کو اپنے موصوف سے ارتباط پیدا ہوتا ہے اور پھر مثل حرکات کہ سر بیع الزوال ہوتی ہیں، اپنے موصوف سے جدا ہو جاتی ہیں کیونکہ اس صفت کے وجود کے یہی معنی ہیں کہ قدر مقرر اس کی کسی کو دیدیجئے ورنہ قبل دینے کے صدقہ نہیں۔ والا تمام احکام صدقات مثل اداء فرض اور حصول ثواب اور اطعام غضب رب وغیرہ بے دیئے اس پر مرتب ہوا کریں اور جب دے چکے جب ہی وہ صفت صدقہ ہونے کی اس سے زائل ہو جاتی ہے۔ اس لیے اگر کوئی محتاج فقیر مسکین مال زکوٰۃ کسی اہل نصاب سے لے کر اپنی طرف سے کسی غنی یا ہاشمی وغیرہ کو دینے لگے تو کچھ ممنوع نہیں۔ بالجملہ صدقہ ہونے کی صفت کا وقت فقط عطاء اور قبض ہی ہے اور سب جانتے ہیں کہ یہ ایک آن کی بات ہے۔ سو اُس آن تک اس کا ”للفقراء“ ہونا کہیں نہیں گیا۔ بعد میں اگر فقراء وغیرہ اُس کو کسی کو ہبہ کر دیں یا بیچ ڈالیں تو وہ صدقہ ہی نہیں جو پھر بھی فقراء کا استحقاق باقی رہے۔

القصد یہ قضیہ بھی دوام ہی پر دلالت کرتا ہے اور اُس کے دائمہ ہونے سے ہمیں کیا انکار ہے، پر اتنا یاد رکھنا ضروری ہے کہ دوام کے یہ معنی ہیں کہ محمول وقت وجود موضوع حقیقی تک اس کے ساتھ مربوط رہے مگر موضوع حقیقی کا پہچانا ہر کسی کا کام نہیں۔ ان باتوں کے لیے حقائق شناس معانی بخ چاہیے جس کو خداوند عظیم اس قدر بصیرت عنایت فرمائے کہ مناط حکم اور مدار تباط موضوع و محمول اور سیاق کلام کو دریافت کر سکے۔ اُس کا یہ کام ہے۔ سو جملہ ”ما الاء اللہ“ میں موضوع حقیقی مصداق مانا ہے اور اس سے مراد خود اراضی فنی ہیں اور صفت افاء فقط تعین اور تفہیم اور رفع ابہام کے لیے ہے۔ اس لیے ”للہ“ وغیرہ ہونا جو مضمون خبر ہے اُس کی ذات کے ساتھ دائم رہے گا اور موافق اصطلاح اہل منطق یہ قضیہ دائمہ ہوگا۔

اور جملہ ”الما الصدقات“ وغیرہ میں موضوع حقیقی صفت تصدق ہے ذات اموال نہیں۔ وجہ اس کی ظاہر ہے کیونکہ یہ جملے اگرچہ خبر یہ ہیں اہل فہم کے نزدیک انشائیہ ہیں۔ مح نظر ان مقامات میں تصدق اور انفاق ہے اور موصوف تصدق اور انفاق (یعنی اموال کا لحاظ) فقط اس لیے ہے کہ یہ صفت

غیر اس موصوف کے تحقق نہیں ہو سکتی۔ سو اس جملہ میں دوام محمول تا دوام وصف تصدیق چاہیے اور موافق اصطلاح اہل منطق اس کو عرفیہ عامہ سمجھئے اور قضیہ ”ما اداء اللہ“ اگر چہ انشائیہ ہے پر اس قضیہ میں منت افاءۃً مستحکم نظر نہیں ورنہ جیسے جملہ ”الما الصدقات“ یا جملہ ”ما انفقتم“ کا ما حاصل مصلحوں اور ”انفقوا“ ہے اس جملہ کا خلاصہ ”الینوا“ ہوتا۔ اس تقریر کو سن کر اہل فہم کو تامل نہ رہے گا کہ فضل جناب سرور کائنات علیہ علی آلہ افضل المصلوات واکمل التجات میں مطابق آیت ہے۔

معصوم سے خطا سرزد ہونا محال نہیں

باقی رہا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا معصوم ہو کر ایسی غلطی کرنا سو اوّل تو اہل سنت کے نزدیک سوائے انبیاء کسی کی معصومیت مسلم ہی نہیں۔ دوسرے کسی مقدمہ خاص میں معصوم سے غلطی فہم ہونا اور غیر معصوم سے نہ ہونا کچھ محال نہیں۔ چنانچہ مضامین متعلقہ آیت محمد رسول اللہ کی تفسیر میں اس کی تحقیق گزر چکی ہے اور بیسیوں نظریوں اس کی کلام اللہ اور احادیث میں موجود ہیں۔ من جملہ اس کے کہنتی کے قضیہ میں حضرت داؤد علیہ السلام کا غلطی کھانا حالانکہ نبی ہو چکے تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا حق بات کا سمجھ جانا حالانکہ جب تک نہ نبی ہوئے تھے نہ موافق اصطلاح شیعہ امام تھے، اس دعویٰ کے لیے دلیل کافی ہے مگر شیعوں کو کلام اللہ یاد نہ ہوا یا معنی ”لَفَقَهُمْنَاهَا مُلْبِغَانِ“ کا فہم نہ ہو تو اہل سنت کا کیا قصور؟ اس جگہ سے ہر کوئی سمجھ گیا ہوگا کہ شیعوں کا اہل سنت پر یہ طعن کرنا کہ وہ ایسے اماموں کی تقلید اور اتباع کرتے ہیں جو انہیں کے اقرار موافق غلطی کر سکتے ہیں۔ ایسا ہی ہے جیسا اندھا آفتاب کو بے نور بتلائے اور جیسے اندھا آفتاب کو بے نور نہیں کہتا اپنی آنکھوں کو بے نور کہتا ہے، شیعہ بھی اہل سنت کا قصور نہیں بتلاتے اپنی عقل کے قصور کی گواہی دیتے ہیں۔

اموال فنی آپ کی ملک نہ تھے اس کی تیسری دلیل

اب تیسری دلیل بھی اس احتمال کے بطلان کی کہ اموال فنی ملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تھے اور یہ مصارف معلومہ کا مقرر کرنا ایسا ہی ہے جیسا زکوٰۃ کے لیے فقراء و مساکین وغیرہ کا مصرف بنا دینا، پھر دلیل بھی ایسی کچھ کہ احتمال مذکور تو باطل ہو ہی جائے یہ شبہ بھی مرتفع ہو جائے کہ ”ما اداء اللہ“ تو تقسیم اصل زمین کو مقتضی ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصل کی جائے آمدنی کو کیوں تقسیم کیا؟ صورت اس کی یہ ہے کہ زمین باغ کی آمدنی بھی اثمار اور کھیتی کی پیداوار ہے لیکن بسبب اس کے کہ پھل اور کھیتی اشجار اور زمین کے توابع اور لوازم میں سے ہیں تو پھل کے توڑنے سے پہلے مجموعہ

درخت اور پھل کو درخت اور کھیتی کانٹے سے اڈل کھیتی سمیت زمین کو زمین کہا کرتے ہیں، اس وجہ سے آمدنی بھی ”مالِ اللہ“ ہی میں داخل ہے لیکن جیسے کھیتی میں جو مجموعہ اناج اور بھس کا ہوتا ہے آدمی اور گائے بیل حسب لیاقت شریک ہیں۔ اناج آدمیوں کے لیے اور بھس گائے بیل کے لیے تو ایسے ہی اس شرکت خدا اور بندگان خدا میں بھی جو ”لِللّٰهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِلَّذِي الْقُرْبٰنِی الْخ“ میں مذکور ہے خدائے تعالیٰ اور بندگان خدائے تعالیٰ کو حسب لیاقت و قابلیت شریک سمجھنا چاہیے۔

مصارف مندرجہ آیت کی تفسیر واستحقاق کی باریک حکمت

لیکن خداوند کریم خورد و نوش سے غنی ہے اور بندے خورد و نوش اور نان و نفقہ کے محتاج۔ یہاں تک کہ اُن کے شریک کرنے کی وجہ بھی اُن کی احتیاج ہوئی ہے۔ چنانچہ لفظ فقراء اور مساکین میں اہل فہم کے لیے اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ اسی لیے کہ فقیر اور مسکین تو وہی ہوتا ہے جس کے یہاں قوت یعنی رزق نان نفقہ کی کوتاہی اور کمی ہو۔ چنانچہ زبان و اناج عربی اور واقفان اقوال علماء فقہ پر تخی نہ ہوگا بلکہ لفظ رسول بھی اگر غور سے دیکھئے تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی احتیاج اور فقر پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے اس لفظ سے بے تامل ہر کوئی یوں سمجھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ماہِ محتاج کے بہم پہنچانے کی فرصت نہ ملتی تھی کیونکہ جب آپ پیغام رسان خداوندی اور قاصد جناب باری ظہرے تو تا وقتیکہ آپ اس مشغلہ میں مشغول رہیں اور کار کی فرصت کہاں بلکہ مثل قاصدان پیغام رسانان دنیاوی کہ تا وقتیکہ پیغام پہنچا کر اپنے گھر پر نہیں پہنچ لیتے۔ اپنے کاروبار نہیں سنبھال سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تا وقتیکہ پیغام خداوندی سے فارغ نہ ہو لیں۔ اپنے کاروبار کی طرف متوجہ نہ ہو سکتے تھے مگر جب فارغ ہوئے تو وطن اصلی کو تشریف لے گئے۔ اس وطن کے کاروبار ہی نہ رہے جو بطور خود کچھ کھانے پینے کا فکر کرتے۔

مصارف فنی کی ترتیب لفظی کی حکیمانہ تشریح

غرض بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے سرو سامانی خود اس لفظ رسول ہی سے ظاہر ہے۔ اتنا فرق ہے کہ اور اصناف مندرجہ آیت کی بے سرو سامانی کسی وجہ دنیاوی کے باعث اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے سرو سامانی بہ سبب مشغولی کا خداوندی ہو۔ اسی لیے آپ کو مقدم رکھا۔ غرض ان الفاظ سے خود اہل فہم پر واضح ہے کہ خداوند کریم نے جو ان اصناف کو اموال فنی میں شریک کیا ہے تو بوجہ احتیاج اصناف مذکورہ شریک کیا ہے تو اس صورت میں شرکت اور تقسیم حسب لیاقت یوں ہو سکتی ہے کہ

مجموعہ اشجار و اثمار اور مجموعہ زمین اور پیداوار میں جو ہر جہت مجموعی عرف میں اور دیکھنے میں ایک شے واحد گنی جاتی ہے اور ایک نظر آتی ہے اور مجموعہ کو ”ما الاء اللہ“ کہہ سکتے ہیں، ملکیت جو ملزم غشی ہے خدا کے لیے رہا اور پیداوار جو رفع احتیاج کے لیے ہے بندوں کے واسطے تجویز کی جائے۔

اب دیکھئے کہ اس تقریر سے وہ احتمال بھی باطل ہو گیا کہ مال فنی مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو اور مصرف بطور مصرف زکوٰۃ ہو اور وہ شبہ بھی مرتفع ہو گیا کہ چاہیے تھا اصل زمین کا تقسیم کرنا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تو تقسیم نہ کیا اور آمدنی کو تقسیم فرمایا۔

اموال فنی کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک نہ ہونے کی چوتھی دلیل

اب چوتھی دلیل کے سننے کے لیے بھی تیار ہونا چاہیے تاکہ کثرت دلائل کے زور سے احتمال مذکور دل سے بالکل محو ہو جائے۔ جناب من خبر پر قاء کے داخل ہونے کے قرینہ سے اور نیز شہادت وجدان صاف ظاہر ہے کہ مبتداء یعنی ”ما الاء اللہ“ محض من معنی شرط ہے تو اس صورت میں ”للہ“ وغیرہ ہونے کا ترتب اور توقف افاء اور تسلیط پر ضروری ہے اور در صورت یہ کہ اراضی فنی کو مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہئے تو یہ ترتب اور توقف تو در کنار وجود خبر بھی اپنی ذات سے ضروری نہ ہوگا۔ گو بوجہ معصومیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان امور میں جن کے آپ مامور تھے، تصور ممکن نہ ہو، ہاں اگر مصرف کہئے تو پھر یہ ترتب اور توقف اتم من الخس ہے۔ چنانچہ توجہات ذکر اللہ سے جو مذکور ہو چکی ہیں آپ عیاں ہے۔

مع ہذا اگر مقصود شارع یہی ہوتا کہ اراضی فنی مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ”للہ“ اور ”للی القربی“ بایں فرض فرمایا ہے کہ خدا کے واسطے ذی القربی وغیرہ کو دینا چاہیے تو لاجرم ”للولل رسول وللہ وللی القربی الخ“ فرماتے۔ اس صورت میں گویا آیت صدق ”المعنی لی بطن الشاعر“ تو رہتی لیکن بلا سے یہ ترتب اور توقف تو جو مدلول قاء ہے درست ہو جاتا اور معنی گو کسی کی سمجھ میں نہ آتے فی حد ذاتہ تو صحیح ہو جاتے۔ فصاحت و بلاغت بلکہ باعتبار قواعد زبان وانی صحت عبارت بھی نہ سہی لیکن اتنی غلطی تو نہ ہوتی کہ عبارت برعکس معنی مقصود دلالت کرے۔

اموال فنی کے غیر مملوک نہ ہونے کی پانچویں دلیل

پانچویں وجہ احتمال مذکور کے بطلان کی یہ ہے کہ ضمیر ”تکونون دولہ“ بجانب ”ما الاء اللہ“ راجع ہے اور ”کیلا ہکون علہ تعین مصرف مذکور ہے۔ سو اس صورت میں یہ معنی ہوں گے

کہ یہ مصرف اس اندیشہ کے لیے مقرر کیا گیا ہے کہ مبادا اراضی فئی تحت تصرف اغنیاء آجائیں مگر اس اندیشہ سے جب ہی تک بچاؤ ہو سکا ہے کہ اراضی فئی کو مد و خرچ اصناف معلومہ کہا جائے ورنہ اگر مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا مملوک کس دیگر ہوں تو ایک نہ ایک روز یہ خرابی ہالہ نور و پیش آئے گی۔ اصناف مندرجہ آیت اگر خود اغنیاء نہیں تو خداوند بے نیاز کی بھی عادت یہ ہے کہ دولت و فقر کو فقط ایک ہی خاندان میں دائم و قائم نہیں رہنے دیتا۔ بسا اوقات اولاد اغنیاء فقیر اور پس ماندگان فقراء امیر ہو جاتے ہیں۔ سو بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پس از انتقال ذوی القربی وغیرہم اگر حسب مرسوم شیعہ اراضی فئی میں وراثت جاری ہوگی تو بیشک اس سلسلہ میں میراث میں بہت سے اغنیاء بھی نکلیں گے اور وہ خرابی جس کے بچاؤ کے لیے یہ مصرف مقرر کیا تھا بحال خود رہے گی۔

لوریوں کہنا کہ اغنیاء سے مراد فقط حکام یا اغنیائے لشکر ہی ہیں محض تعصب ہے۔ لفظ عام سے بے قرینہ معنی خاص مراد لے لینا عوام کا بھی کام نہیں۔ چہ جائیکہ علماء جو خواص اُمت ہیں، ہاں اگر قطع طمع اغنیاء لشکر افران فوج کے لیے یہ آیت نازل ہوئی ہو، یا حکام جاہلیت اس قسم کی اراضی کو خاص اپنے لیے رکھتے ہوں اور اس قانون نامعقول کے موقوف کرنے کے لیے یہ مصرف مقرر فرمایا ہو تو در صورت فرض وقوع امور مذکورہ پیش برین نیست کہ حکم عام کے لیے شان نزول خاص ہو۔ سو یہ بات کچھ اسی جگہ خاص نہیں۔ بیسیوں آیات اور سینکڑوں احادیث کی شان نزول خاص اور حکم عام ہے اور اس کا عموم بالعموم مسلم ہے۔ خاص کر کتب علم اصول میں بترتیب صحت و امکان خصوص شان اور عموم احکام مذکور ہے۔

اموال فئی کے غیر مملوکہ ہونے کی چھٹی دلیل

چھٹی وجہ احتمال مذکور کے بطلان کی یہ ہے کہ اراضی فئی کے لیے جن اشخاص اور اصناف کو مقرر فرمایا ہے تو اُن کو اُن کے اوصاف سے تعبیر فرمایا ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بصفہ رسول اس جگہ ذکر فرمایا اور یتامی اور مساکین اور ابن سبیل کو بوصف یتیم اور مسکینہ اور مسافرت یاد فرمایا اور ان کے حسب و نسب وغیرہ تشخصات اور تعینات کو ذکر نہ کیا اور پھر اس کے بعد ”للفقراء المهاجرین الخ“ اور ”والذین تبوءوا الدار الخ“ اور ”والذین جاء و امن بعلمهم الخ“ کو ”لذی القربی والیتامی والمساکین وابن السبیل“ سے بدل ہے ماقبل کا ضمیر کیا۔ اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان اوصاف کو اراضی فئی کے مصرف ہونے میں دخل اور اُن اراضی کا مصرف ہونا ان اوصاف پر موقوف ہے اور چونکہ زمین باغ ملک، مثل منافع اکل و شرب مثل روٹی پانی وغیرہ جن سے انتفاع ان کے ہلاک ہونے پر موقوف ہے نہیں ہیں بلکہ وقت انتفاع بدستور

بن نہ یم قائم رہتے ہیں تو ”دائمًا الی یوم القیمة“ اراضی فنی سے انتفاع انہیں اشخاص کو جائز ہے جو موصوف ہاوصاف مذکورہ ہوں ورنہ دوام و ثبوت جو مدلول جملہ اس یہ ہے باطل ہو جائے گا۔
مگر یہ بات جب ہی بن پڑتی ہے کہ اراضی کو بمعنی وقف کہا جائے اور مصارف مذکورہ میں اصل زمین کو تقسیم نہ کریں اور اصناف مندرجہ کو اس کا مالک نہ کر دیں ورنہ بالفعل نہیں تو بعد انتقال مالکان اول یا بعد بیع و شراء کے غیر مصرف میں اس کا مصرف ہونا لازم آئے گا اور لحاظ اوصاف ہی کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ محققین کے نزدیک اس زمانہ کے فیس اور فنی سے کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کے فیس اور فنی میں سے بھی سہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساقط ہو گیا۔ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصف رسالت مثل اوصاف مسکنات اور مسافرت وغیرہ کسی میں باقی نہیں رہا۔

باقی رہی زکوٰۃ اور صدقات واجبہ ان کے مصرف ہونے کے لیے بھی تحقیق اوصاف فقر و مسکنات وغیرہا جس کی طرف آیت ”انما الصدقات“ مشیر ہے، ضروری ہے مگر چونکہ وصف تصدق کو بجز آپ واحد قیام نہیں، چنانچہ ابھی مرقوم ہوا ہے تو وقت تصدق تحقیق اور وجود اوصاف معلومہ ضروری ہوا کیونکہ فقراء وغیرہم کو آیت ”انما الصدقات“ میں فقط اُن اموال کا مصرف مقرر کیا ہے جو موصوف بصدقہ ہوں۔ اس لیے بلفظ صدقات تعبیر فرمایا اور اگر قطع نظر اس وصف کے فقراء وغیرہم کو فیس مال کا مصرف مقرر فرماتے تو مثل ”انما المخرج من الاموال بنية الصدقة“ یا سوا اس کے اور کوئی ایسی عبارت جس سے مطلق مال کے لیے فقراء وغیرہم کا مصرف ہونا ثابت ہوتا بیان فرماتے۔ الحاصل آیت ”انما الصدقات“ میں اُساد کو دونوں طرف میں اوصاف ہی سے ارتباط ہے اور آیت ”ما افاء اللہ“ میں ایک طرف ذات اور دوسری طرف اوصاف ہیں، اس لیے زکوٰۃ میں دونوں اوصاف کو اور فنی میں فقط ایک جانب میں اوصاف کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

اموال فنی کے غیر مملوک ہونے کی ساتویں دلیل

ساتویں وجہ احتمال مذکور کے بطلان کی یہ ہے کہ مالک حقیقی تمام مخلوقات اور موجودات کا بالاتفاق اور بالبداہت مالک الملک خداوند کریم ہے اور باوجود اس کے پھر ہمارا تمہارا مالک ہونا ایک معنی مجازی ہیں جیسے کوئی شخص اپنے چند مکان چند آدمیوں کو مستعار یا کرایہ پر رہنے کو دے اور وہ چند اشخاص اپنے اپنے رہنے کے مکان کو محاورۃ اپنا گھر کہہ دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ سب جانتے ہیں۔ ایسے ہی ہمیں بھی مالک حقیقی نے ہماری اشیاء مقبوضہ کو انتفاع کے لیے دے رکھی ہیں اور ہم اُن کو اپنے محاورات میں اپنا کہنے لگے ہیں لیکن جیسے مکانات کا مسعر یا کرایہ دار ہونا عاریۃ لینے

اور کرایہ لینے پر منحصر اور موقوف ہے۔ فقط مالک مکان کی ملکیت کفایت نہیں کرتی بلکہ اگر عقد کرایہ اور عاریت ظہور میں نہ آئے تو پھر مالک اصلی ہی کی طرف آرہے گی۔ ایسے ہی ہمارے مالک ہونے کے لیے بھی اسباب تملیک ظاہری مثل بیع و شراء، ہبہ و وصیت وغیرہ ضروری ہوئے ورنہ تمام موجودات پھر خدا ہی کی طرف مملوک ہونے میں منسوب رہیں گے۔

مگر چونکہ اموال فئے مشار الیہا بقظہ "ما الاء اللہ" میں ان اسباب میں سے فقط غنیمت ہونے کا تو ہم ہو سکتا تھا اور اس کو جناب ہاری نے "لھما او جفعم" سے دفع کر دیا تو یہ اموال سوائے خدا وند کریم مالک الملک کے اور کسی کی طرف بطور ملکیت منسوب نہیں ہو سکتے۔ پھر اس صورت میں "للرسول ولذی القربی" کے معنی بجز بیان معرف اور کچھ نہیں ہو سکتے۔ سو یہی ہمارا مطلب تھا بالجلہ ان سات وجوہ سے اراضی فئے کا مد و خرچ بیچ اقسام معلومہ ہونا مثل مدلولات حواس ہر کس و نا کس پر واضح اور لائح ہو گیا اور باوجود مد و خرچ ہونے کے وجہ طلب کرنے (حضرت خیر النساء فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کی اول تو یہ ہے کہ جناب سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا معصوم نہیں اور معصوم بھی ہوں تو معصوم سے غلط فہمی محال نہیں۔

چنانچہ معلوم ہو چکا اور وجہ غلط فہمی کی یہاں ظاہر بھی ہے کیونکہ جناب سیدۃ النساء فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا نے ہمیشہ اراضی فئے پر قبض و تصرف حضرت خلاصہ موجودات سرور کائنات علیہ و علی آلہ افضل الصلوٰۃ واکمل التحیات والتسلیمات کا دیکھا تھا اور اس بات کی تحقیق کہ یہ از قسم غنیمت ہے یا از جنس فئی ہے۔ زنان خانہ نشین اور وہ بھی ایسی زاہدہ کہ سامان دنیا و مافیہا سے کچھ غرض نہ ہو، بہت دشوار ہے۔ خاص کر خیر اور قرئی خیر کی نسبت کہ فدک بھی انہیں میں سے ہے۔

کیونکہ بعض قرئی خیر عنوۃ یعنی جنگ و جدال اور بعض قرئی جیسے فدک صلحا مفتوح ہوئے ہیں۔ اس لیے بہ نسبت خاص خیر کے مابین علماء اختلاف بھی ہے کہ آیا خیر عنوۃ فتح ہوا ہے یا صلحا اراضی فئے کا مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہونا اہل انصاف پر روشن ہو گیا۔ اگرچہ اہل فہم کو پہلے بھی اس میں تاہل نہ تھا کیونکہ باوجود یقین معارف معلومہ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مملوک ہونے کی کوئی صورت بھی تھی تو یہی تھی کہ اُن اوصاف کا مقرر فرمانا ایسا ہو جیسا کہ زکوٰۃ اموال مملوکہ اغنیاء کے لیے فقراء وغیرہم کا مقرر کرنا۔ سو یہ ہاگ کوئی حد ذاتہ ممکن تھی لیکن قرینہ عطف "للرسول" اور "لذی القربی" اس بات کو مقتضی تھا کہ جیسے ذوی القربی وغیرہم بالاتفاق مالک اراضی فئے نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مالک نہیں۔

ذوی القربیٰ کو اگر فئے کا مالک مانیں تو دو خرابیاں موجود ہیں

اور اگر قطع نظر اتفاق اُمت کے ذوی القربیٰ وغیرہم کو مالک کہا جائے تو بہت سے بہت ہوگا تو اراضی فئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصنافِ باقیہ میں مشترک ہوں لیکن دو خرابیاں اور موجود ہیں۔ ایک تو شرکاء غیر محدود کا شریک ہونا کیونکہ ذوی القربیٰ وغیرہم کا کوئی حد و پائیاں نہیں۔ ہر روز کمی و بیشی رہتی ہے۔ خاص کر ”واللہین جازا من ہلہم“ نے تو دائرہ اہل مصرف کو اتنا فراخ کر دیا ہے کہ قیامت تک کے مؤمنین کو گھیر لیا ہے۔ دوسرے قبل عطاء مال غنیمت بلکہ دین بھی ملک میں نہیں آسکتا۔ اراضی فئے جو کسی طرح اس کے حصول میں اہل مصرف کی سعی و کوشش یا کسی کے فعل کو دخل نہیں۔ محض فضل خداوندی سے ہاتھ لگ گیا ہے کیونکہ قبل عطاء اور قبل قبض کسی کا مملوک ہو سکے۔

الحاصل اہل عقل پر بادی النظر میں اس عبارت سے اراضی فئے کا غیر مملوک ہونا عیاں تھا اور اب سب پر واضح ہو گیا بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہو گیا کہ جیسے اس آیت سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی ہے۔ امکان ملکیت بھی ثابت نہیں ہوتا بلکہ اُلٹا محال ہونا ثابت ہوتا ہے اور اسی لیے مجھ کو بھی اتنی تطویل کی ضرورت پڑی ورنہ عدم ثبوت ملکیت خود ظاہر تھا۔ البتہ بایں نظر کہ کم فہموں سے مقابلہ ہے۔ عدم ثبوت ملکیت میں گفتگو کرنی ضروری تھی۔

مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ سَے دعوائے وقف پر اشکال

مگر اتنی بات باقی رہی کہ لفظ ”اِفاء اللہ“ عام ہے اشیاء منقولہ و غیر منقولہ کو برابر شامل ہے۔ پس اگر ما اِفاء اللہ بوجہ مذکورہ وقف ہے تو لاجرم اسباب منقولہ بھی وقف ہوں گے۔ سو اس صورت میں دو خرابیاں لازم آئیں گی۔ اول تو یہ کہ خفیوں کے نزدیک اشیاء منقولہ کا وقف ہونا ہی صحیح نہیں۔ دوسرے یہ کہ اموال فئے میں سے بہ نسبت اموال منقولہ کے وقف ہونا کسی سے منقول اور مروی نہیں بلکہ اگر تعالٰی سلف و خلف پر نظر کیجئے تو عیاں ہے کہ من جملہ اموال فئے اسباب منقولہ میں تصرفات مالکانہ کرتے تھے۔ بیع و شراء وغیرہ آثار ملکیت جو وقف نہ ہونے پر دلیل کامل ہیں، برابر بے تکرار اور انکار مروج رہے ہیں۔ چنانچہ بنی الطمر کے ہتھیار وغیرہ اموال منقولہ جو ہاتھ آئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو تقسیم فرمادیے تھے اور صراحۃً نہ کنلئہ یوں نہ فرمایا کہ یہ اشیاء وقف ہیں۔ ان میں تصرفات مالکانہ مت کیجیو۔

اور یہ بھی نہ سہی کلام اللہ سے زیادہ تو کوئی حجت نہیں، کلام اللہ میں خود موجود ہے ”ما ملک

بسمک من الماء اللہ علیک“ مطلب یہ ہے کہ ”اے نبی ہم نے حلال کیس تیرے لیے وہ
 بدیہ جن کا تو مالک ہوا ہے اموال فئے میں سے“ اس آیت سے صریح ثابت ہے کہ فئے کے
 غلام باعدی مملوک ہو سکتے ہیں وقف نہ تھے۔ جب ایک چیز کا بھی اموال فئے میں سے مملوک ہونا
 ثابت ہوا تو ”لللہ“ وغیرہ الفاظ آیت ”ما الماء اللہ“ اور الفاظ سیاق و سباق آیت مذکورہ کے اور جن
 کے وسیلہ سے وقف ہونا راضی فئے کا ثابت کیا گیا ہے وہ معنی نہ ہوں گے جو وقف ہونے پر دلالت
 کریں اور نہ کلیتہً قضیہ ”ما الماء اللہ“ اس بات کو مقتضی ہے کہ تمام افراد ما الماء اللہ کا ایک حکم ہو۔
 خواہ اسباب منقولہ ہوں خواہ غیر منقولہ وقف ہوں تو دونوں ہوں، وقف نہ ہوں تب دونوں نہ ہوں۔

اشکال مذکور کا جواب

اس لیے ہمیں بھی اس خلیجان کو رفع کرنا ضرور پڑا۔ سوال انصاف کی خدمت میں یہ گزارش ہے کہ
 واقعی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اشیاء منقولہ وقف نہیں ہو سکتی لیکن خداوند کریم و عظیم و حکیم کچھ امام
 ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مقلد نہیں جو اس کے ذمہ اتباع رائے ابو حنیفہ ضروری ہو اور اگر اتفاقات سے کوئی
 بات بظاہر خلاف مذہب حنفی صادر ہو جائے تو اس کی جواب دہی اُس کے ذمہ پر لازم ہو۔ بیش برین
 نیست کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے خطا ہوئی ہو لیکن شیعہ ہی یہ فرمائیں کہ اہل سنت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ
 کو محصور ہی کب سمجھتے ہیں جو یہ خرابی اُن کے سر پڑے بلکہ اہل سنت کا یہ مقولہ ضرب المثل ہو گیا ہے۔
 ”المجہد یخطی و یصیب“ یعنی مجتہد خطا بھی کرتا ہے اور صحیح کہتا ہے۔ ہاں اتنی بات مسلم کہ مرتبہ
 اجتہاد کو یہ لازم ہے کہ اکثر صحیح کہا کرے۔ سو اس بات میں ان سے غلطی ہو گئی ہو تو کیا حرج ہے؟

ان کے صاحبین وغیرہ کی رائے تو آخر یہی ہے کہ اشیاء منقولہ بھی وقف ہو سکتی ہیں وہ بھی اہل
 سنت ہی کے پیشوا ہیں، شیعوں کے نہیں اور اگر شیعہ ان کو اپنا پیشوا بنالیں اور طوسی و رضی شریف مرتضیٰ و
 ابو القاسم محقق وغیرہم کا اتباع چھوڑ دیں تو زہد نصیب اُن کے۔ پھر کچھ ٹکرا نہیں۔ مع ہذا یہ آیت کچھ
 معارض اور مناقض رائے ابو حنیفہ رحمہ اللہ نہیں بلکہ موافق ہی ہو تو کچھ عجب نہیں۔ اگر اس معما کی شرح
 مطلوب ہے تو کان دھر کر سنئے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ انصاف مد نظر ہو اور میری ہچمدانی پر نظر نہ ہو، ماسبق
 اس آیت کا ”هو الذی اخراج اللین کفروا“ سے لے کر ”لیخزی الفاسقین“ تک اس بات پر
 دلالت کرتا ہے کہ ما الماء اللہ سے مراد فقط مکانات سکنی اور اراضی سحرائی ہیں تو اب اس صورت میں
 بجز اموال غیر منقولہ اراضی و باغات ما الماء اللہ سے مراد نہ ہوں گے اور باعتبار خصوص ماسبق کے لفظ
 ما کا ہا و جو موصوفاتی کے مخصوص ہو جانا ایسا شائع و ذائع ہے کہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ جانتے ہیں۔

المغال کافیہ خوان بھی سمجھتے ہیں کہ ”الاسم مادل علی معنی“ میں ماے مراد کلمہ ہے۔ اس لیے مولانا جامی شرح ملا میں کلمہ ما کی شرح میں کلمہ ہی لکھتے ہیں۔ القصد ما الاء اللہ علی العموم اموال منقولہ غیر منقولہ سب مراد نہیں فقط اموال غیر منقولہ مراد ہیں۔ چنانچہ جملہ ”مَنْ لَا يَكُونُ دَوْلَةً مَلِكِيًّا“ اس طرف فی الجملہ کھینچتا ہے۔ اس لیے کہ مد اول اور دولت کے تو یہ معنی ہیں کہ ایک شئی بحال خود باقی رہے اور ہاں ہمہ کسی کسی کے پاس منتقل ہوتی رہے۔ سو یہ بات بجز اموال غیر منقولہ اور کسی میں بطور کمال تصور نہیں۔ اقسام غذا اور اقسام لباس اور اقسام مرکب سب کے سب بسبب استعمال ختم ہو جاتے ہیں یا فنا ہونے لگتے ہیں۔ اگر چندے کوئی چیز قائم رہی تو کیا قائم رہی؟ یوں تو کچھ نہ کچھ سب اشیاء کو قیام ہے دوئی سالن بھی تھوڑی دیر تو ٹھہرے ہی رہتے ہیں خاص کر اس جگہ اتنے قیام سے کیا کام چلتا ہے۔ یہاں تو یہاں ”واللین جازا من بعلمهم“ قیامت تک کا حساب کتاب ہے۔ بہر حال ما الاء اللہ میں اموال غیر منقولہ داخل ہی نہیں جو اعتراض معترض واقع ہوا اور ہمیں فکر جواب دی ہو۔

وقف کا معنی کیا ہے اور وقف کے قابل کوئی چیزیں ہیں؟

ہاں اتنی بات البتہ قابل لحاظ ہے کہ ہم نے مانا اموال منقولہ ما الاء اللہ میں داخل ہی نہیں لیکن اموال منقولہ کا جو بطور فنی حاصل ہوتے ہیں کیا حکم ہے؟ مثل اموال غیر منقولہ وقف بمعنی مذکور سمجھنا چاہیے یا مثل غنیمت مملوک ہو سکتے ہیں؟ سو اپنے فہم نار میں یوں آتا ہے کہ وہ قابل ملک و عطاء ہیں۔ اگر اہل فہم بھی اسی جانب ہوں تو فہماور نہ ہمارا کیا نقصان ہے؟ ہم اس کے وقف ہونے کو اگر ثابت ہو جائے تو اپنی کمی ہوئی بات یعنی وقف نہ ہونے سے بھی زیادہ خوش ہو کر تسلیم کریں۔ اگر وہ بھی وقف ہو جائے تو کچھ اعتراض ہی باقی نہ رہے۔ خیر اب اپنے خیالات کو عرض کرتا ہوں بگوش ہوش و چشم انصاف غور سے سنئے اور ملاحظہ فرمائیے، وقف ایسی چیز ہونی چاہیے کہ بحال خود باقی رہے اور پھر کام آ سکے۔ چنانچہ وقف کے معنی بھی یہی ہیں کہ اصل محبوب اور موقوف رہے اور منافع مصارف وقف میں صرف کیے جائیں۔

اشیائے منقولہ میں سے کھل اور غذا وقف کے قابل نہیں

مع ہذا فنی کے وقف بمعنی مذکور ہونے میں اس تغایر ذات اور منافع کی خواہ خواہ ضرورت ہے کیونکہ للہ اور ”للمرسول ولدی القربی“ وغیرہم ہونا جب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ اصل اللہ تعالیٰ کے لیے رہے اور منافع اوروں کے لیے، چنانچہ مذکور ہو چکا۔ سو یہ بات وہاں ہو سکتی ہے جہاں وہ

بمعنیک ما الاء اللہ علیک "مطلب یہ ہے کہ" اے نبی ہم نے حلال کیس تیرے لیے وہ باندیوں جن کو تو مالک ہوا ہے اموال فئے میں سے "اس آیت سے صریح ثابت ہے کہ فئے کے غلام باندی مملوک ہو سکتے ہیں وقف نہ تھے۔ جب ایک چیز کا بھی اموال فئے میں سے مملوک ہونا ثابت ہوا تو "للفلہ" وغیرہ الفاظ آیت "ما الاء اللہ" اور الفاظ سیاق و سباق آیت مذکورہ کے اور جن کے وسیلہ سے وقف ہونا اراضی فئے کا ثابت کیا گیا ہے وہ معنی نہ ہوں گے جو وقف ہونے پر دلالت کریں اور نہ کھیتہ قضیہ "ما الاء اللہ" اس بات کو مقتضی ہے کہ تمام افراد ما الاء اللہ کا ایک حکم ہو۔ خواہ اسباب منقولہ ہوں خواہ غیر منقولہ وقف ہوں تو دونوں ہوں، وقف نہ ہوں تب دونوں نہ ہوں۔

اشکال مذکور کا جواب

اس لیے ہمیں بھی اس خطبان کو رفع کرنا ضرور پڑا۔ سوائے انصاف کی خدمت میں یہ گزارش ہے کہ واقعی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اشیاء منقولہ وقف نہیں ہو سکتی لیکن خداوند کریم و عظیم و حکیم کچھ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مقلد نہیں جو اس کے ذمہ اتباع رائے ابو حنیفہ ضروری ہو اور اگر اتفاقات سے کوئی بات بظاہر خلاف مذہب حنفی صادر ہو جائے تو اس کی جواب دہی اُس کے ذمہ پر لازم ہو۔ بیش برین نیست کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے خطا ہوئی ہو لیکن شیعہ ہی یہ فرمائیں کہ اہل سنت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو معصوم ہی کب سمجھتے ہیں جو یہ خرابی اُن کے سر پڑے بلکہ اہل سنت کا یہ مقولہ ضرب المثل ہو گیا ہے۔ "المجہد بخطی و یصیب" یعنی مجتہد خطا بھی کرتا ہے اور صحیح کہتا ہے۔ ہاں اتنی بات مسلم کہ مرتبہ اجتہاد کو یہ لازم ہے کہ اکثر صحیح کہا کرے۔ سو اس بات میں ان سے غلطی ہو گئی ہو تو کیا حرج ہے؟

ان کے صاحبین وغیرہ کی رائے تو آخر یہی ہے کہ اشیاء منقولہ بھی وقف ہو سکتی ہیں وہ بھی اہل سنت ہی کے پیشوا ہیں، شیعوں کے نہیں اور اگر شیعہ ان کو اپنا پیشوا بنالیں اور طوسی و رضی شریف مرتضیٰ و ابوالقاسم محقق وغیرہم کا اتباع چھوڑ دیں تو زہے نصیب اُن کے۔ پھر کچھ تکرار نہیں۔ مع ہذا یہ آیت کچھ محاضرات اور مناقض رائے ابو حنیفہ رحمہ اللہ نہیں بلکہ موافق ہی ہو تو کچھ عجب نہیں۔ اگر اس معما کی شرح مطلوب ہے تو کان دھر کر سنئے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ انصاف مد نظر ہو اور میری ہچمدانی پر نظر نہ ہو، ماسبق اس آیت کا "هو الذي اخرج اللين كفروا" سے لے کر "لنخزي الفاسقين" تک اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ما الاء اللہ سے مراد فقط مکانات سکنی اور اراضی صحرائی ہیں تو اب اس صورت میں بجز اموال غیر منقولہ اراضی و باغات ما الاء اللہ سے مراد نہ ہوں گے اور باعتبار خصوص ماسبق کے لفظ ما کا باوجود عموم ذاتی کے مخصوص ہو جانا ایسا شائع و ذائع ہے کہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ جانتے ہیں۔

اطفال کا یہ خوان بھی سمجھتے ہیں کہ ”الاسم مادل علی معنی“ میں ماے مراد کلمہ ہے۔ اس لیے مولانا جامی شرح ملا میں کلمہ ما کی شرح میں کلمہ ہی لکھتے ہیں۔ القصد ما الاء اللہ علی المحرم اموال منقولہ غیر منقولہ سب مراد نہیں فقط اموال غیر منقولہ مراد ہیں۔ چنانچہ جملہ ”مَنْ لَا يَكُونُ دَوْلَةً لَمْ يَكُنْ“ اسی طرف فی الجملہ کھینچتا ہے۔ اس لیے کہ بد اول اور دولت کے تو یہ معنی ہیں کہ ایک ہستی بحال خود باقی رہے اور بایں ہمہ کسی کسی کے پاس منتقل ہوتی رہے۔ سو یہ بات بجز اموال غیر منقولہ اور کسی میں بطور کمال متصور نہیں۔ اقسام غذا اور اقسام ملباس اور اقسام مرکب سب کے سب بسبب استعمال ختم ہو جاتے ہیں یا فنا ہونے لگتے ہیں۔ اگر چندے کوئی چیز قائم رہی تو کیا قائم رہی؟ یوں تو کچھ نہ کچھ سب اشیاء کو قیام ہے مدتی سالن بھی تھوڑی دیر تو ٹھہرے ہی رہتے ہیں خاص کر اس جگہ قیام سے کیا کام چلتا ہے۔ یہاں تو بیہادت ”واللین جاؤا من بعدہم“ قیامت تک کا حسب کتاب ہے۔ بہر حال ما الاء اللہ میں اموال غیر منقولہ داخل ہی نہیں جو اعتراض معترض واقع ہوا اور ہمیں فکر جواب دی ہو۔

وقف کا معنی کیا ہے اور وقف کے قابل کوئی چیزیں ہیں؟

ہاں اتنی بات البتہ قابل لحاظ ہے کہ ہم نے مانا اموال منقولہ ما الاء اللہ میں داخل ہی نہیں لیکن اموال منقولہ کا جو بطور فائے حاصل ہوتے ہیں کیا حکم ہے؟ مثل اموال غیر منقولہ وقف بمعنی مذکور سمجھنا چاہیے یا مثل غنیمت مملوک ہو سکتے ہیں؟ سوائے فہم نارسا میں یوں آتا ہے کہ وہ قابل ملک و عطاء ہیں۔ اگر اہل فہم بھی اسی جانب ہوں تو فہماور نہ ہمارا کیا نقصان ہے؟ ہم اس کے وقف ہونے کو اگر ثابت ہو جائے تو اپنی کمی ہوئی بات یعنی وقف نہ ہونے سے بھی زیادہ خوش ہو کر تسلیم کریں۔ اگر وہ بھی وقف ہو جائے تو کچھ اعتراض ہی باقی نہ رہے۔ خیر اب اپنے خیالات کو عرض کرتا ہوں بگوش ہوش و چشم انصاف غور سے سنئے اور ملاحظہ فرمائیے، وقف ایسی چیز ہونی چاہیے کہ بحال خود باقی رہے اور پھر کام آ سکے۔ چنانچہ وقف کے معنی بھی یہی ہیں کہ اصل محبوب اور موقوف رہے اور منافع مصارف وقف میں صرف کیے جائیں۔

اشیائے منقولہ میں سے پھل اور غذا وقف کے قابل نہیں

مع ہذا فائے وقف بمعنی مذکور ہونے میں اس تغایر ذات اور منافع کی خواہ مخواہ ضرورت ہے کیونکہ اللہ اور ”لِلرَّسُولِ وَلِلَّذِي الْقُرْبٰی“ وغیرہم ہونا جب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ اصل اللہ تعالیٰ کے لیے رہے اور منافع اوروں کے لیے، چنانچہ مذکور ہو چکا۔ سو یہ بات وہاں ہو سکتی ہے جہاں وہ

چیز اور ہوا اس کے منافع اور ورنہ خود منافع میں یہ قابلیت نہیں، سو اموال منقولہ میں سے اقسام غذا کا تو من جملہ منافع ہونا ظاہر ہی ہے کیونکہ منافع کے معنی اس جگہ فقط اتنے ہی ہیں کہ استعمال کامل کے بعد پھر قابل استعمال باقی نہ رہے بلکہ استعمال ہی میں فنا ہو جائے۔ سو اقسام غذا کا منافع ہونا تو ظاہر ہے ماسوا اس کے اور اسباب منقولہ مثل اقسام لباس و سواری وغیرہا اور ضروریات انسانی۔ کہ اگرچہ ایک وجہ سے مثل اشیاء غیر منقولہ خود اور ہیں اور ان کے منافع اور کیونکہ گھوڑا اور چیز ہے اور اس کی منفعت اور قائمہ یعنی سواری اور تخفیف مشقت سفر اور شے۔ علیٰ ہذا القیاس کپڑا اور شے ہے اور اس کا قائمہ یعنی پہننا اور گرمی سردی کی تکلیف سے بچنا اور زیب و زینت اور شے۔

لیکن غور کیجئے تو اس قدر فرق سے کوئی چیز اشیاء ضروریہ انسانی میں سے خالی نہیں۔ اقسام غذا میں بھی یہ بات موجود ہے کہ روٹی مثلاً اور شے ہے اور اس کے منافع یعنی کھانا اور مزہ آنا اور قوت کا پیدا ہونا اور شے۔ لیکن اس قدر فرق سے قابلیت و اقیقت پیدا نہیں ہوتی ورنہ جیسے زمین کا وقف ہونا مسلم الثبوت ہے، اتنا ج غلہ بھی وقف ہوا کرتے حالانکہ اس کے وقف ہونے کے عقل کے نزدیک کوئی مستحق نہیں۔ وقف ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اصل محبوس اور موقوف رہے اور منافع مصرف میں صرف ہوں اور یہاں اصل۔ منافع کے ساتھ ہی فنا ہوتی ہے۔ نقل مشہور ہے ”جیسی اصل ویسی نقل“ بایں ہمہ اگر غلہ بھی وقف ہونے کے قابل ہے تو اراضی وقف کا غلہ بلاشبہ وقف ہو۔ پھر نہ اہل مصرف کو اس کی بیع درست ہونہ بہ، نہ اس میں میراث جاری نہ وصیت۔ حالانکہ جہان میں اس کا کوئی منکر ہی نہیں تو معلوم ہوا کہ غلہ کو من جمیع الوجوہ منافع ہی مقرر رکھا ہے۔ سو منافع وقف اہل مصرف کے حق میں صدقہ ہوتے ہیں اور صدقہ جس کو کر دیا جائے اس کا مملوک ہو جاتا ہے تو اب اس کی بیع و شراء وغیرہ میں کچھ دشواری نہ ہوگی اور کسی کے نزدیک غلہ وقف بھی ہو سکے تو ہوا کرے۔ یہاں تو کلام اراضی فئے کے غلہ میں ہے جن کو ہم نے وقف خداوند کریم کہا ہے۔ سو اراضی فئے کا غلہ باتفاق وقف نہیں ہوتا اسی واسطے مملوک اہل مصرف ہو جاتا ہے۔

سواریاں اور کپڑے بھی وقف کے قابل نہیں

بالجملہ پیداوار زمین اور علیٰ ہذا القیاس اثمار و اشجار فئے کا وقف نہ ہونا تو ظاہر ہو گیا۔ باقی رہے انواع مراکب اور اقسام لباس وغیرہ ان میں بہ نسبت غذا کے کوئی فرق نکالے تو یہ نکالے کہ غذا استعمال کے ساتھ ہی فنا ہوتی ہے اسی لیے وقف نہیں ہو سکتی بخلاف سواری، لباس کے یہ چھنے پہننے وغیرہ سے فنا نہیں ہوتی لیکن بعد غور یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرق بعینہ ایسا ہے کہ روٹی کا ایک ٹکڑا توڑ

کرکھا لیجئے اور باقی کو چھوڑ دیجئے۔ سو ما حاصل اس کا یہ ہوا کہ بقدر استعمال فنا ہو گئی۔ سو کپڑے سواری وغیرہ میں بھی یہ بات موجود ہے کیونکہ گھوڑا وغیرہ جو جانور سواری میں رہتے ہیں۔ بہ نسبت ان جانوروں کے جو ان کے برابر کھائیں پر سواری میں نہ رہیں دُبلے اور کمزور ہو جاتے ہیں۔ اور اگر چندے بسبب امداد بدل مانتھل باقی بھی معلوم ہوں تو اوّل تو بدل مانتھل ہی ہوں کہ ہے کہ اصل باقی نہیں اور اگر ایسے مواقع میں اسی کو بقاءے اصل کہئے تو وہ بقاء کہاں؟ جو بے کسی استعمال کے ہو اور یہی دو چیزیں جانور کی (زور اور بدن) استعمال میں آتی ہیں جان استعمال میں نہیں آتی۔ چنانچہ ضعیفی میں جو قابل استعمال نہیں رہتا تو یہی دو باتیں گھٹ جاتی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس کپڑا بھی استعمال سے پٹا پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ بیدار مغزوں پر حقیقی نہ ہوگا اور اس کے تار کمزور ہو جاتے ہیں اور انہیں دو چیزوں پر مدار کار استعمال کا تھا۔ اسی واسطے رفتہ رفتہ بہت استعمال کے باعث قابل استعمال نہیں رہتا۔ سو یہاں بھی وہی حاصل نکلا کہ منافع بقدر استعمال فنا ہو گئے۔ غائب مافی الباب کہیں نقصان ایک طرف سے ہوا کہیں چاروں طرف سے کہیں شکل بنی رہی کہیں بگڑ گئی لیکن استعمال ہونے کا مضمون دونوں جا برابر ہے۔ باقی مشکل صورت کو لے کر کیا چائے۔ اس کو استعمال میں کچھ دخل ہی نہیں۔ عکس آئینہ میں شکل و صورت موجود ہے مگر چونکہ جسمیت اور زور و طاقت نہیں کوئی صورت استعمال کی نظر نہیں آتی۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا اشیاء منقولہ کو ناقابل وقف کہنے کی وجہ

بالجملہ جن چیزوں سے منافع کا تعلق ہے وہ چیزیں بقدر استعمال فنا ہو جاتی ہیں اور جو چیزیں بحال خود باقی ہیں ان سے منافع کو کچھ تعلق نہیں۔ یہ بات اگر ہے تو زمین یا سوائے اس کے اور اشیاء غیر منقولہ ہی میں ہے کہ استعمال میں منافع ہی فنا ہوں اور اصل باقی رہے استعمال کی وجہ سے اصل میں کچھ نقصان نہ آئے اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اشیاء منقولہ کو قابل وقف ہی نہ سمجھا اور صاحبین یا کسی اور نے اگر ملحوظ بقاءے صورت بعض اشیاء منقولہ ان کو قابل وقف سمجھا تو ان کی صورت کو اصل منافع اور بقاءے صورت کو بمنزلہ بقاءے اصل منافع سمجھ کر اس کے وقف ہونے کے قابل ہو گئے ہیں لیکن بعد اس تحقیق کے اہل حق سے توقع یوں ہے کہ اے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ہی کو ترجیح دیں۔

صاحبین کا اشیاء منقولہ کو قابل وقف کہنے کے وجوہ

ہاں اس سے قطع نظر کیجئے تو مذہب صاحبین بظاہر حق معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہاں خیال کا اوّل تو

منافع مرکب ولباس وغیرہ اشیاء ضروریہ دنیاوی عرف میں مرکب اور لباس ہی کی طرف منسوب ہوتے ہیں اور وہ تا وقتیکہ صورت اور جان باقی ہے قوت اور بدن کی طرف منسوب نہیں ہوتے جو یوں کہئے کہ استعمال میں فنا ہوتے جاتے ہیں۔

دوسرے منافع مرکب ولباس وغیرہ منافع کلیہ ہیں کہ اوقات مختلفہ میں اُن کے افراد ظہور میں آتے ہیں اور جیسے ہر فرد بشر انسان کامل ہے جزء انسان نہیں ایسے ہی منافع اشیاء مذکور بھی جو اوقات مختلفہ میں حاصل ہوتے ہیں منافع تامہ ہیں، اجزائے منافع نہیں اور ظاہر ہے کہ بعض افراد کے فنا ہو جانے سے نوع فنا نہیں ہوتی بلکہ جب تک ایک فرد بھی باقی ہے تو تمام نوع باقی ہے تو اس صورت میں معلوم ہوا کہ بعض اوقات کے انتفاع سے اصل منافع فنا نہیں ہوتے، پھر وقف کیوں نہ ہو سکے گا؟ کیونکہ بقائے منافع دلیل بقائے اصل ہے۔ بخلاف منافع اقسام غذا کے کہ وہ منافع جزئیہ ہیں جو نفع کہ ایک روٹی سے حاصل ہوتا ہے۔ آدمی سے اس کا آدھا حاصل ہوتا ہے پورا باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ ظاہر ہے۔ ہاں اگر اصل باقی رہتی تو منافع بھی بوجہ کمال باقی رہتے۔ خیر اگر مذہب ابوحنیفہ رحمہ اللہ حق ہے تو اموال منقولہ کا منجملہ اموال فنی وقف نہ ہونا تو دور کنار قابل وقف نہ ہونا ظاہر ہو گیا۔

صاحبین کی رائے بھی مقصود کے موافق ہے

اور اگر رائے صاحبین صحیح ہے تب بھی مطلب ہاتھ سے نہیں گیا وجہ اس کی یہ ہے کہ تمام ضروریات بشری میں سے احتیاج غذا منجملہ ضروریات اصلیہ ہے اور باقی اموال منقولہ جہاں ضروریات فرعیہ میں داخل ہیں، اگر غذا کی ضرورت نہ ہوتی تو نوکریوں کی تلاش کے لیے سواری کی ضرورت مثلاً نہ ہوتی تو معلوم ہوا کہ سواری کی ضرورت غذا کی ضرورت سے پیدا ہوتی ہے۔ پھر سواری کی ضرورت سے مثلاً گھاس دانہ کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جہاں تک یہ سلسلہ ضرورتوں کا چلے گا تو مابعد ما قبل کی فرع ہوگا اور حقیقت میں ضرورت اصلی ایک ضرورت غذا ہی نکلے گی اور باقی اشیاء کی احتیاج گو کہنے کو ان اشیاء کی احتیاج ہے لیکن حقیقت میں غذا کی احتیاج ہے تو اس صورت میں بایں خیال کہ وقف رفع ضرورت کے لیے ہوتا ہے اور حقیقت میں ضرورت اگر ہے تو ضرورت غذا ہی ہے تو مصرف وقف میں اس ضرورت کا ہونا ضروری ہوا۔

اور کسی اور وقف میں نہیں تو وقف فنی میں تو رفع احتیاج غذا ہی مقصود ہے۔ چنانچہ جتنا باری تعالیٰ عز اسمہ نے بھی لفظ رسول اور مساکین اور فقراء اور ابن السبیل میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس لیے کہ فقیر اور مسکین کے معنوں میں رزق کی کمی اور کوتاہی معتبر ہے بلکہ لفظ رسول یتامیٰ اور ابن

اسبیل بھی اسی طرف مشیر ہیں۔ چونکہ لفظ رسول تو اس بات کی طرف مشیر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہاں وجہ کہ رسول ہیں۔ یعنی خدا کے بھیجے ہوئے ہیں خدا کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اتنی فرصت ہی نہیں کہ حسب دلخواہ کمائیں اور فراغت سے بیٹھ کر کھائیں اور جب کمانے کی فرصت نہ ہونے کی یہ وجہ ہوئی کہ خدا کے کام میں لگے ہوئے ہیں تو لاجرم بمتھائے قدر شناسی خداوندی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نان و نفقہ بھی خدا ہی کے ذمہ ہونا چاہیے اس کی بہتر صورت اس سے کیا ہوگی کہ جو مال خاص خدا کا ہو اور بے منت غیر حاصل ہوا ہو، اس میں سے کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تجویز کیا جائے۔ یتیم اور ابن اسبیل کا مورد رحم ہونا بھی تو باعتبار اکثر کے بسبب انتظام اسباب رزق ہو جاتا ہے اور نہ کسی لفظ فقراء میں تو بیشک قوت کے نہ ہونے پر دلالت ہے۔ سودہ بوجہ ارتباط بدلیت سب کو شامل ہے اور اسی لیے سب ہی میں فقر کا ملحوظ رکھنا ضروری ہوا۔ خواہ ذوی القربی ہوں خواہ اقسام باقیہ۔ بالجللہ مصرف وقف میں احتیاج غذا کا ہونا ضروری ہوا۔

اشیائے منقولہ کا وقف فقراء و مساکین کو مفید ہی نہیں

سو اگر ان کو اموال منقولہ دیئے جائیں تو دو طرح سے رفع احتیاج مذکور میں کام آسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ بطور مذکور ان کو سلسلہ اسباب تحصیل غذا میں داخل کیا جائے۔ مثلاً سواری پر چڑھ کر نوکری وغیرہ کے لیے سفر کیا جائے تاکہ کچھ کما کر غذا بہم پہنچائے۔ یا مثلاً ہڈیا یا رکابی چمچ کھانے پکانے کے لیے رکھا جاوے تاکہ بایں وسیلہ کھائے پکائے۔ دوسرے یہ کہ اشیائے مذکورہ کو بیچ کر کھا جائے لیکن اگر اتفاق سے پیٹ کو ایسی لگی ہو کہ جان پر پنی ہوئی ہو تو اس صورت میں بیچ کی اجازت نہ دینی جیسا وقف میں ہوتا ہے، رفع احتیاج کے بدلے اور احتیاج کا پابند کر دینا اور آسائش کے بدلے جو رفع احتیاج اس کے لیے ہوتی ہے، دونا تکلیف میں ڈال دینا ہے کیونکہ اس سے زیادہ اور کیا تکلیف ہوگی کہ چیز پاس ہو اور پھر اس سے مستفیع نہ ہو سکے۔ شعر

خرابی دل پروانہ زیں ہتر چہ بود کہ شمع را بنما بعد سو حقن مدہند

اور اس قسم کی احتیاج کا ہونا فقراء و مساکین کے تو مفہوم میں داخل ہے۔ پر یتائی اور ایماء سبیل میں بھی کثیر الوقوع ہے اور چونکہ سبب اس قسم کی احتیاج کا فقراء اور مساکین اور یتائی اور ایماء سبیل کے حق میں بے سرو سامانی معلوم ہوتی ہے تو پھر اس کا ارتقا بجواس کے متصور نہیں کہ اور کچھ عطا کیا جائے تاکہ اگر غذا ہو تو خود اس سے ورنہ اس سے بیچ کر اپنا پیٹ پالیں۔ سو در صورت یہ کہ عطا میں ان کو یہ اختیار ہی نہ ہو تو ان کی طرف سے بھاڑ میں پڑے۔ ہاں اگر ان کے منافع مثل

پیداوار زمین و اثمار و اشجار اقسام غذا میں سے ہوتے تو پھر اُس کا بیچنا تو درکنار متولی وقف کو ان کا دینا ہی کیا ضروری ہوتا۔ بہر حال اموال منقولہ کا وقف ہونا فقراء اور مساکین وغیرہم کو مفید نہیں۔ یہ دوسری وجہ ہے جس سے مذہب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ موجب معلوم ہوتا ہے۔

بعض اشیائے غیر منقولہ جو حاجت برآری نہیں کرتیں مگر ان میں قابلیت ہے باقی رہے چاہے یا مکانات سوان کا وقف ہونا بھی بظاہر رافع احتیاج فقراء اور مساکین وغیرہم نہیں ہو سکتا لیکن ان میں اور اموال منقولہ میں دو فرق ہیں جن کے سبب ان کو اموال منقولہ پر قیاس نہیں کیا جاتا۔ ایک تو اموال منقولہ معدن رزق ہی نہیں جو مخرج قوت ہو سکیں۔ بخلاف مکانات کے کہ ان کی زمین بہر حال قابل پیداوار ہے اور چونکہ مدار وقتیت کا اسی قابلیت پر ہے، پیداوار کا ہونا کچھ ضرور نہیں ورنہ زمین وقف اگر مزدور ہو اور ایک سال یا چند سال کی سبب سے افتادہ رہے تو اس کی وقتیت باطل ہو جایا کرے، اس لیے مکانات وقف کی زمین بھی قابل وقف ہی رہے گی۔ حاصل یہ ہے کہ اگر غرض اصلی کسی شے کی وجہ خارجی کے باعث مسدود و مفقود ہو جائے تو جو حکم اس غرض کی وجہ سے اُس پر متفرع اور مترتب ہوا تھا وہ حکم موقوف نہ ہو جائے گا، ویرانوں کی مسجدوں میں گویا بالفصل نماز نہیں پڑھی جاتی۔ پر چونکہ قابلیت نماز بدستور باقی ہے تو حکم وقتیت بھی باقی ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ گو ضرورت غذا ضرورت اصلی ہے لیکن ضرورت مکان اور ضرورت آب بھی ضرورت اصلی ہے کسی اور ضرورت کی ضرورت سے ان کی ضرورت نہیں، چنانچہ ظاہر ہے اور پھر یہ دونوں بھی مثل غذا زمین سے حاصل ہوتے ہیں تو زمین کے وقف کرنے میں ان تینوں ہی کا لحاظ چاہیے۔ ان تینوں میں سے کوئی شے کبھی کبھ غذا ہی کی خصوصیت نہیں پر چونکہ پانی اول تو اکثر بے دام و درم کے میسر آتا ہے، دوسرے بیشتر پیاس غذا کے کھانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس وجہ سے گویا پانی کی ضرورت غذا ہی کی ضرورت پر موقوف ہوئی۔ غایت مانی الباب اور ضرورتیں من جملہ سلسلہ اسباب غذا ہوں اور یہ داخل مسببات غذا تیسرے اکثر غذاؤں کا قیام اور قوام بھی پانی ہی سے ہے تو اس وجہ سے پانی بھی بمنجملہ اسباب غذا اور مثل اور ضرورت فرعیہ کے فرع غذا ٹھہرا۔

تو پانی کی ضرورت کے ارتقاع کی طرف تو ضرورت نہ ہوئی اس لیے نہایت عا الاء اللہ میں ناس کے صلہ میں اس کی طرف کچھ اشارہ فرمایا مگر ضرورت مکانات من کل الوجہ ضرورت اصلی ہے اور پھر بجز مال کثیر کے اس کے ارتقاع اور اندفاع کی کچھ صورت نہ تھی۔ اس لیے اس کے رفع دفع کی ضرورت پڑی۔ سو میں جانتا ہوں لفظ ”اخروجوا من دہارہم“ میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے لیکن اموال

خود میں سے کسی میں یہ قابلیت نہیں کہ بالذات ان ضرورتوں کو رفع کر سکے البتہ ان ضروریات ۱۳۵
 کی تفصیل کے سامان ہیں، خواہ بطور سہیت کے جیسے ہنڈیا رکابی وغیرہ سے پکانا کھانا اور گھوڑے پر چڑھ
 کر زکری کے لیے جانا یا بطور بدلیت کے یعنی اسوال منقولہ کو بیچ کر روٹی مکان پانی بہم پہنچانا لیکن چونکہ
 ایسی ضرورت جس میں گھوڑے لباس وغیرہا کے بیچنے کی نوبت پہنچے۔ بہ نسبت اُس ضرورت کے کہ یہ
 اس کے حق میں مجملہ اسباب ہوں شدید ہمارے پھر ہائیں ہمالیہ معرف میں موجود نہ معرف ہی کیوں
 ہوتے تو اسوال منقولہ میں اس کی رعایت کرنی ضرور پڑی۔ یعنی مثل پیداوار زمین اسوال منقولہ میں بھی
 بعد عطاء کے اہل معرف کو اختیار ملے تاکہ بیچ کھوج کر رفع ضرورت کریں۔ بالجلد اسوال منقولہ مثل
 پیداوار کردہ بھی منقولات میں سے ہے ملک میں اہل معرف کے کر دینے چاہئیں۔

مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ كَلَفْظِي فَوَائِد

اب سب کو معلوم ہو گیا کہ آیت ”ما ملکت یمنک معا الاء اللہ علیک“ کچھ
 ہمارے معترضین بلکہ اُلٹی موید ہے کیونکہ بظاہر ”مِنْ جَوْ مَعًا“ میں ہے تعضیہ ہے۔ سو اس سورت
 میں ”ما ملکت یمنک“ سے دو باتیں معلوم ہو جائیں گی ایک تو یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم تمام اسوال فئے کے مالک نہ تھے۔ دوسرے جس قدر کے مالک ہوئے وہ بحر و مسلط ہو جانے
 کے مالک نہیں ہوئے تھے ورنہ بھی کے مالک ہوتے کیونکہ سب ملکیت اس صورت میں تسلط ہی
 ہوگا سو وہ سب ہی میں پایا جاتا ہے۔ تو اب لاجرم کسی اور سبب سے مالک ہوئے ہوں گے اور
 ظاہر بجز اس کے کہ بعد تقسیم آپ کے قبضہ میں آ گیا اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ چنانچہ لفظ
 ”یمنک“ خود قبضہ پر دلالت کرتا ہے ورنہ اگر قبض کی ضرورت نہ ہوتی لفظ ”ملکت“ بیضہ
 خطاب فرمادیتے لفظ ”یمنک“ کی کچھ حاجت نہ تھی۔

اموال فئے میں آنحضرت کے حصہ کی نوعیت

باقی کلام رہی اس میں کہ قبل قبض مالک تو نہ تھے، پر جیسے قرض خواہ مال دیون میں اور غائبین
 مال غنیمت میں مستحق ہوتے ہیں اور بوجہ اس استحقاق کے مدعی بن سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم بھی مال فئے میں مستحق تھے؟ یا مثل فقراء اور مساکین کہ ان کو مال اغنیاء مالکان زکوٰۃ میں
 اس قسم کا استحقاق نہیں ہوتا کہ مدعی ہو سکیں بلکہ قابل اعطاء اور معرف عطاء ہوتے ہیں۔ رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم بھی فقط مجملہ مصارف تھے۔ اس لیے اس کی تحقیق بقدر فہم نارسا گزارش ہے۔

جناب من استحقاق دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک استحقاق قوی اور اس کو ہم استحقاق فعلی اور استحقاق شخصی اور استحقاق حقیقی بھی کہتے ہیں۔ دوسرا استحقاق ضعیف اور اس کو ہم استحقاق انفعالی اور استحقاق لوی اور استحقاق مجازی بھی کہتے ہیں اور وجہ تسمیہ بیان معنی سے ان شاء اللہ ظاہر ہو جاوے گی۔ استحقاق قوی میں مستحق کی جانب کوئی امر و جودی ہونا چاہیے جو منشاء استحقاق اور مبداء دعویٰ بن سکے ورنہ مستحق حقیقت میں مستحق نہ ہوگا غیر مزاحم ہوگا۔

سویہ بات دین کی صورت میں تو ظاہر ہی ہے، غنیمت میں بھی مخفی نہیں کیونکہ جہاد امر و جودی ہے اور یہی ”لَمْ مَعْلُوم ہوتی ہے کہ مال غنیمت کی تحصیل کو بندوں کی طرف منسوب فرمایا اور یوں فرمایا ”وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ“ ورنہ حقیقت میں سب چیزیں خدا ہی کی دی ہوئی ہیں اور استحقاق ضعیف میں فقط مفلسی اور ناداری جو امر عدلی ہے کفایت کرتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ عدم مثبت وجود نہیں ہو سکتا۔ اس لیے حق جو امر و جودی ہے، ناداری سے جو امر عدلی ہے ثابت نہ ہوگا۔ اسی واسطے اگر کوئی کسی مفلس کو کچھ نہ دے تو یہ نسبت اُس مفلس کے ظالم نہ کرنا جائے گا اور نہ مفلس اس کی تائید و فریاد کر سکے گا۔ ہاں اگر حقوق واجبہ کسی مفلس کو بھی نہ دے تو عند اللہ گنہگار ہوگا کیونکہ مفلس کا حق نہیں تو خدا کا تو ہے۔ بالجملة ناداری اور مفلسی مثبت حق نہیں فقط موجب قابلیت ہے اور یہ قابلیت تمام نوع مفلسین میں برابر ہے تو جس کسی کو دے دے گا، کام چل جائے گا۔ اسی واسطے محققین کے نزدیک جملہ مصارف مندرجہ آیت ”انما الصدقات“ کا احاطہ اور استیعاب ضروری نہیں، یعنی یہ لازم نہیں کہ سب ہی اصناف کو دے کیوں کہ یہاں مدار کار امر عدلی پر ہے جو ناداری ہے اور وہ سب میں برابر ہے اور یہ مابعد آیت مسلم ہے کہ سب اشخاص اصناف مذکورہ کا دینا لازم نہیں۔

مصارف کے مقرر کرنے کی وجہ اہل مصارف کی ناداری ہے

سواگر بالفرض بوجہ مفلسی دینا ضروری ہوتا تو سب کو دینا ضروری ہوتا اور جب سب اشخاص کا دینا ضروری نہیں تو سب اصناف کا دینا بھی ضروری نہیں اور اس ناداری کی وجہ سے ان مصارف کا مقرر کرنا اکثر اصناف میں تو ظاہر ہی ہے، پر عالمین اور مؤلفہ القلوب میں ناداری کا ہونا ہی سرے سے ضروری نہیں۔ مدار استحقاق ہونا تو درکنار؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ عالمین کا دینا تو وہ فقراء مساکین وغیرہم ہی کا دینا ہے کیونکہ یہ نہ ہوں تو صدقات کی وصول ہوں؟ تو گویا یہ ان کے نوکر اور اجیر ہیں، ان کا دینا فقراء مساکین ہی کے کام میں خرچ کرنا ہے۔ گویا انہیں کیا دیا فقراء مساکین وغیرہم ہی کو دیا، باقی رہے مؤلفہ القلوب سوان کا دینا بھی موجب تکثیر صدقات تھا کیونکہ

زکوٰۃ خوشی خاطر سے تو کوئی کوئی دیتا ہے۔ البتہ عامل کو اگر سلطان وقت کی پشتی ہو تو وصول ہو سکتی ہے۔ سو فتح مکہ سے پہلے پہلے بسبب قلت اہل اسلام کے مددگاروں کی حاجت تھی اور وقت فتح مکہ کو بظاہر ایک وجہ سے جماعت کثیر ہو گئی تھی لیکن حقیقت کو دیکھئے تو قصہ بدستور تھا کیونکہ موکلۃ القلوب بظاہر مسلمان تھے جب تک ایمان دل میں خوب نہ جما تھا مگر چونکہ داد و دہش میں اثر ہے کہ دینے والے کی محبت لینے والے کے جی میں پیدا کر دیتی ہے تو اس تدبیر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جو بخ ایمان ہے اُن کے دل میں جمائی گئی۔

اور چونکہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان بکثرت ہو گئے۔ اس واسطے اب موکلۃ القلوب کا سہم ہی ساقط ہو گیا۔ الحاصل موکلۃ القلوب کا دینا بھی ایک وجہ سے فقراء مساکین وغیرہم ہی کا دینا تھا کیونکہ ان کا دینا اُن کے حق میں بمنزلہ تجارت تھا۔ اس واسطے جب اس تجارت میں کچھ نفع نہ رہا اس کو موقوف کر دیا۔ مع ہذا اس زمانہ کے فقراء اور مساکین اسلام کے فقر و مسکنت کی وجہ بھی کفار کی مخالفت ہوئی تھی۔ سو ان کو کچھ دے کر اپنا موافق دلی کر لینا گویا فقراء اور مساکین ہی کو دینا ہے کیونکہ داد و دہش سے فقراء کا فقر رفع ہو جاتا ہے۔ سو وہی بات یہاں بھی نکلی، ان وجوہ سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ ”الْمَوْلُفَّةُ“ کا لام عہد کے لیے ہو۔ الغرض استحقاق ضعیف میں مصرف کی جانب نظر امر عدی ہوتا ہے۔ اسی لیے ان کی طرف سے دعویٰ اور طلب گاری نہیں ہو سکتی۔ ہاں خدا کی طرف سے حکم جو امر و جودی ہے، منشاء استحقاق ہوتا ہے۔ اس لیے خدا کی طرف سے مطالبہ اور مواخذہ رہتا ہے اور زکوٰۃ کو حق خداوندی کہتے ہیں گو فقراء مساکین کی طرف بھی مجازاً منسوب کر دیں۔

جب یہ بات متحقق ہو چکی تو اب سنئے کہ اموال لئے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کسی ایسے امر و جودی کا ہونا تو جو منشاء استحقاق ہو سکے۔ ظاہر المطلاق ہے۔ قرض آپ کا کفار کی جانب نہ آتا تھا، وصیت کی کوئی صورت نہیں، ایک غنیمت ہونے کا احتمال تھا، سو اُس کو بھی جناب باری تعالیٰ نے ”مِمَّا اَوْجَفْتُمْ“ فرما کر رفع کر دیا تو اب بجز اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استحقاق از قسم استحقاق ضعیف ہو کوئی صورت بن نہیں پڑتی اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ خداوند کریم نے مال لئے کی تحصیل کو بندوں کی طرف منسوب نہیں فرمایا بلکہ لفظ افاۃ اللہ میں اپنی ہی طرف نسبت کیا اور اسی لیے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا سہم ساقط ہو جائے۔ چنانچہ مذہب اکثر اہل حق یہی ہے اور شیعہ جو سہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امام کے لئے تجویز کرتے ہیں تحکم محض ہے، آیت میں کوئی دلیل نہیں۔ سو جس صورت میں لفظ افاۃ اللہ سے یعنی

خداوند کریم کے اس مال کو کفار کے قبضہ سے نکال کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دینے سے حکمت و عہد نہ ہوئی۔ چنانچہ بد لالہ ”ما ملکک بمعنک“ مذکور ہو چکا اور پھر ادھر کوئی صورت استحقاق کی بھی نہیں تو بجز اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منجملہ مصارف مال فئے ہوں کیا کہئے۔

مِمَّا آفَاءَ اللَّهِ کے لغوی فوائد

بہر حال آیت ”ما ملکک بمعنک مما آفاء اللہ“ میں اگر آفاء فئے یعنی اصطلاحی سے مشتق ہو تو در صورت یہ کہ ”مِن مِمَّا“ میں تعظیم ہو، ہمارے مخالف نہیں بلکہ اور موید ہے اور اگر بخلاف ظاہر ”مِن“ کو بیانیہ کہئے تو پھر ماما میں موصولہ نہ ہوگا جو عموم پر دلالت کرے اور تمام فئے مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو بلکہ موصوفہ ہوگا ورنہ لازم آئے کہ مال فئے ”ما ملکک“ میں منحصر ہو اور سوا ”ما ملکک“ سے اور کچھ نہ ہو۔ الغرض اگر من بیانیہ ہو تب بھی ہمارے مخالف نہیں۔ غایت مافی الباب ہمارے لیے دلیل بھی نہ ہو۔ یہ سارا جھگڑا تو اس صورت میں ہے کہ آفاء فئے بمعنی اصطلاحی سے مشتق ہو اور در صورت یہ کہ آفاء بمعنی اعادت اور رد کے ہو اور حاصل یہ ہو کہ خداوند کریم نے اپنے مال کو کفار سے ہٹا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ڈال دیا۔ تو پھر متدل ملکیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس آیت میں کوئی دستاویز نہ ہوگی کیونکہ یہ معنی غنیمت اور فئے میں دونوں میں بن پڑتے ہیں۔

فئے کے معنی کی تعیین

اور حق دیکھئے تو یہی بات معلوم ہوتی ہے کیونکہ فشاء اور مبدا اس اصطلاح کا اگر ہے تو آیت سورہ حشر ”اعنی ما آفاء اللہ علی رسولہ“ ہے مگر سورہ احزاب جس میں آیت ”ما ملکک بمعنک مما آفاء اللہ“ ہے۔ سورہ حشر سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔ چنانچہ اتقان میں ابن خریس کی روایت جو در باب ترتیب نزول سورت ہائے قرآنی نقل کی ہے۔ اُس میں یہ ترتیب مصرح مذکور ہے۔ مع ہذا سورہ حشر میں بھی خود آفاء بمعنی اصطلاحی نہیں بلکہ معنی لغوی مراد ہیں کیونکہ شرط فئے بمعنی اصطلاحی کی یہ ہے کہ جنگ و جدال کی نوبت نہ آئے۔ سو یہ بات کہ بے قتل و قتال اور بے جنگ و جدال مال ہاتھ آ جائے۔ یہ تو ”لما او جفتم“ سے ماخوذ ہے۔ اگر آفاء کے مفہوم میں یہ بات داخل ہوتی تو ”لما او جفتم“ کی کیا حاجت تھی۔ پر جب یہ لفظ کثیر الاستعمال ہوا ہو تو اختصار کے لیے سارے جملہ ”ما آفاء اللہ علی رسولہ منهم لما او جفتم الخ“ کے معنی ایک لفظ فئے میں بھر لیے جیسے جہاد میں تمام ”جاہدوا باموالہم وانفسہم فی سبیل اللہ“

کے معنی داخل کر لیے ہیں۔ الغرض جب آیت سورہ حشر میں جو ماخذ اصطلاح مذکور ہے خود افاءۃ بمعنی لغوی ہو تو جو آیت اس سے پہلے نازل ہو چکی اُس میں افاء بمعنی اصطلاحی کیونکر ہوگا۔

اب بفضلہ تعالیٰ جملہ مراتب متعلقہ آیت ما افاء اللہ سے فراغت پائی، اور ہر فہمیدہ غیر فہمیدہ کے نزدیک یہ بات متحقق ہو گئی کہ فدک مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ تھا، نہ اس میں بہہ کی قابلیت اور نہ اس میں میراث جاری ہو سکے اور یہ بھی متیقن ہو گیا کہ روایت بہہ فدک جو شیعوں کے نزدیک در باب غصب فدک دلیل کامل ہے محض افتراء اور بہتان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تصور میں نہیں آ سکتا کہ مال غیر مملوک کو دیدہ و دانستہ کسی کو بطور بہہ حوالہ کر دیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فہم قرآن میں خطاء ناممکن تھی

کیونکہ اصلاح کیلئے وحی جاری تھی

ہاں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہ سمجھنے کا احتمال ہوتا تو یوں ممکن تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کلام اللہ اور کلام اللہ کے دقائق کو نہ سمجھیں تو پھر کون سمجھے؟ ہم جیسے پیچیدہ ان تو کلام اللہ کے اشارات سمجھ جائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ سمجھیں؟ سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر شیعوں کے نزدیک یہ بات ہو تو ہو؟ یا یوں ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رسول نہ ہوتے کوئی اُمتی ہوتے تو یوں بھی کہہ سکتے کہ اجتہاد تھا کچھ وحی تو تھی ہی نہیں جو غلطی نہ ہو سکے۔ یہاں تو یہ صورت کہ اگر اجتہاد بھی ہو تب بھی یہ امر ممکن نہیں کہ آپ غلطی کریں اور پھر متنبہ نہ ہوئے ہوں۔

اس صورت میں اگر بالفرض واقعہ یر بفرض محال نقل کفر کفر نباشد آپ کلام اللہ سے اس اشارہ کو کہ فدک جو مجملہ فئے ہے مملوک نہیں، نہ سمجھے ہوتے؟ اور اس وجہ سے براہ غلطی بہہ بھی کر دیتے تب لازم تھا کہ وحی ربانی سے اصلاح اور صحیح ہو جاتی اور فدک کو مسترد فرماتے۔ سو اگر شیعہ اتنی گنجائش پا کر کہ سینوں کے نزدیک ممکن ہے کہ نبی سے اجتہاد میں غلطی ہو جائے۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام سے باوجود نبوت حکم میں غلطی ہوئی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا باوجود نبی ہونے کے صحیح سمجھ جانا، چنانچہ سورہ انبیاء میں آیت ”داؤد و سلیمان اذ یحکمان فی الحوٹ النخ“ میں مذکور ہے اس بات پر شاہد بھی ہے۔ اپنے مذہب سے دست بردار ہو کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں یوں کہنے لگیں کہ فدک کا مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہونا عہدات کلام اللہ مسلم۔ لیکن ہمیں اس میں بھی شک نہیں کہ فدک کو بہہ بھی ضرور ہی کیا۔ بہت ہوتا یہ ہو کہ بوجہ غلطی اجتہاد کلام اللہ کا یہ اشارہ نہ سمجھا ہو۔

آیہ ما افاء اللہ، یوصیکم کی تخصیص ہے

سواس کا جواب اول تو یہ ہے کہ اتنی دور جانے اور اس قدر تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس سے کل ترکیب میں بتائے دیتا ہوں جس میں مذہب کو بھی آنچ نہ آئے اور بات کی بات بنی رہے۔ یعنی مناسب یوں ہے کہ یہ بات (نعوذ باللہ) خدای کے ذمہ لگائیے اور اس بات میں بھی بدستور دیگر اغلاط خداوندی (نعوذ باللہ منها) بدا کے قائل ہو جائیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لوٹ سے بچالیجئے کیونکہ یہ بزرگی تو اسلاف شیعہ نے خدای کے لیے تجویز کر رکھی ہے اور بایں ہمہ کچھ حاصل بھی نہیں۔ سینوں کے نزدیک اگر نبی کی نسبت غلط فہمی کا امکان ہے اور ان کے نزدیک کیا وہ بھی خدای کی کہیں ہیں تو وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ وحی سے اُس کی اصلاح ضروری ہے۔

بہر حال فدک کے ہبہ ہونے کی کوئی صورت نہیں جو روایت ہبہ کو ماننے اور اس وجہ سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو مالک جانے۔ غرض ہبہ کا باطل ہونا روشن ہو گیا اور کیونکر روشن نہ ہو ہبہ کے لیے ملک واہب مقدم ہے۔ سو یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہ نسبت اراضی فئے جس میں سے فدک بھی ہے مالک نہ ہونا ثابت ہو گیا اور علیٰ ہذا القیاس فدک میں میراث کا جاری ہو سکتا نہ ہو سکتا بھی بخوبی واضح ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ اگر آیت ”یوصیکم اللہ“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور غیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برابر شامل ہے اور خطاب عام ہے، خاص اُمت ہی کو نہیں۔ تب بھی بہ نسبت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کوئی حرف عائد نہیں ہو سکتا کیونکہ آیت ”ما افاء اللہ“ منجملہ متروکہ نبوی بہ نسبت فدک وغیرہ اموال فئے کے تخصیص ہے۔ چنانچہ واضح ہو گیا۔

یوصیکم اللہ فدک کو شامل ہی نہیں

بلکہ غور سے دیکھئے تو تخصیص کے کہنے کی بھی کچھ حاجت نہیں۔ تخصیص ہو تو یہ معنی ہوں کہ آیت ”یوصیکم اللہ“ سے بہ نسبت فدک بھی یہی حکم لگتا تھا لیکن مثل استثناء آیت مذکور یا کسی تخصیص نے فدک وغیرہ کا استثناء کر دیا ہے، سو یہ بات یہاں کوسوں پاس کو نہیں پہنچتی کیوں کہ آیت ”یوصیکم اللہ“ اگر متروکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شامل بھی ہوگی تو اُس متروکہ کو شامل ہوگی جو مملوک نبوی بھی ہو کیونکہ میراث تو اشیائے مملوک مورث میں جاری ہوتی ہے۔ فدک جب وقف ہوا تو مملوک ہی نہیں تو عموم آیت ”یوصیکم اللہ“ میں داخل کیونکر ہو۔ اگر یہ آیت نہ ہوتی تو البتہ در صورت تسلیم عموم خطاب اس کی ضرورت پڑتی کہ حدیث ”مَاتَرَ کُنْہَا صَلَّیَ اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ“ کے لیے بحمد اللہ اس کی ضرورت ہی نہ ہوئی۔

يُؤْتِيكُمُ اللَّهُ کی جیسے بہت سی احادیث تخصّص ہیں، ایسی ہی ما تر کناہ ہے لیکن تاہم نکثیر سواد جوہ رفع مخالفت آیت مذکورہ و حدیث مسطور کے لیے ماسوا اس تقریر کے جو دربارہ تخصّص گزر چکی ہے، اس قدر اور مرقوم ہے کہ آیت ”يُؤْتِيكُمُ اللَّهُ“ میں کچھ بھی تخصّص نہیں ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں میراث جاری نہیں ہوتی بلکہ باتفاق فریقین اور بہت سی تخصّص ہوئی ہیں۔ چنانچہ کافر وارث نہیں ہوتا، غلام وارث نہیں ہوتا، قاتل مورث وارث نہیں۔ ہاں ہمہ ان تخصّصات پر کلام اللہ کا کوئی لفظ آیت مذکور سے متصل ہو یا منفصل دلالت نہیں کرتا۔ بجز اس کے نہیں کہہ سکتے کہ احادیث تخصّص ہوئی ہوں۔ پھر اسی حدیث ”مَا تَرَ كُنْهَ“ ضَلْفَةَ نے کیا قصور کیا ہے کہ تخصّص نہ ہو سکی۔ اگر یہ حدیث آیت مذکور کے ہاں معنی مخالف کہتے ہو کہ تخصّص ہے تو جو حدیثیں اور تخصّصوں پر دلالت کرتی ہیں۔ بد بجا اولیٰ مخالف ہوں گی کیونکہ نہ کوئی لفظ اس آیت میں اُن کے موید ہے جیسا کہ قرینہ غیبت یومی جو خصوص خطاب کم پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ مذکور ہوا مضمون حدیث ”مَا تَرَ كُنْهَ“ کے موید ہے اور نہ کوئی آیت اور ہی آیت اُن احادیث کے مساعد ملتی ہے۔ جیسا کہ آیت ”مَا آفَاءَ اللَّهُ“ حدیث مذکور کے مساعد ہے۔

الحاصل اگر آیت ما افاء اللہ سے بھی قطع نظر کیجئے اور حدیث مذکور کو بین خطاب پھر مفسر مراد حدیث رکھئے تب بھی بیش برین نیست کہ حدیث مذکور آیت مسطور کے تخصّص ہوگی مخالفت کجا؟ اور اگر تخصّص بھی مخالفت کہلاتی ہے تو ایسی مخالفت شیعہ سنی سب کے نزدیک درست ہے، تکرار کی کیا بات ہے۔

بعض آیات اور روایات شیعہ میں کلی تضاد

ہاں مخالفت اسے کہتے ہیں کہ میت کے ہاں باپ کے ہوتے اس کی اولاد کی اولاد کو میراث نہ دی جائے جیسے کہ شیعہ کہتے بھی ہیں اور کرتے بھی ہیں حالانکہ اولاد کی اولاد بلاشبہ اولاد ہی میں داخل ہے اور خود جناب باری تعالیٰ ہی فرماتے ہیں: ”يُؤْتِيكُمُ اللَّهُ فِيْ اَوْلَادِكُمْ لِلَّذِيْ كَرِهَ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثٰى“ یعنی اولاد کو میراث دلانے کے باب میں خود جناب باری تعالیٰ وصیت فرماتے ہیں۔ پھر جب اولاد کی اولاد بھی اولاد ہی ہوئی تو ان کی وراثت آپ ثابت ہو گئی اور اگر اولاد والا اولاد کی اولاد ہونے میں بھی حضرات شیعہ کو سند ہی کی ضرورت ہے اور بے سند اور بے دلیل ایسے مضامین نہیں سمجھ سکتے تو لیجئے سند بھی موجود ہے۔ کلام اللہ میں اولاد کی اولاد ہی کو آیت مہملہ یعنی ”نَدْعُ اِبْنَاءَنَا وَ اِبْنَاءَكُمْ“ میں ابناء فرمایا اس لیے کہ باتفاق فریقین ابناء نام سے حضرات حسنین وغیرہ مراد ہیں

۱۰۔ تہذیب و رسوم صاحبزادے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ تھے، بیٹی کے بیٹے تھے۔

دوسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کی اور دتھی ان کو خداوند کریم بار بار بنی اسرائیل کہتا ہے۔ حالانکہ بنی اسرائیل کے معنی بھینہ اولاد یعقوب علیہ السلام ہے۔ اس لیے کہ بنی اولاد اور اسرائیل سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں اور سب جانتے ہیں کہ اُس زمانہ کے بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے تو تھے ہی نہیں اولاد کی اولاد تھے وہ بھی کئی پشتوں بعد۔ علیٰ ہذا القیاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے آدمیوں کو خداوند کریم اس آیت میں ”يَا بَنِي آدَمَ لَا يَفْتِنُكُمُ الشَّيْطَانُ“ اور نیز آیات میں بنی آدم فرماتا ہے حالانکہ حضرت کا ان میں سے کوئی بھی بیٹا نہ تھا، اگر تھے بھی تو کہیں اڑسنگ کے پڑسنگ جا کر اولاد کی اولاد ہوتے تھے۔

دوسرے مخالفت اسے کہتے ہیں کہ بیوی کو زمین اور زمین کی قیمت سے میراث نہیں دیتے اور علیٰ ہذا القیاس برادران اور مشیرگان مادری کو مقتول کی دیت میں سے میراث نہیں دیتے اور دین تو قاتل کو مقتول کے ترکہ اور دیت میں سے میراث دیں۔ بشرطیکہ خطا سے یا شبہ خطا سے قتل کیا ہو حالانکہ نصوص قرآنی زوجہ اور بہنوں اور بھائیوں کی سب کی توریت میں عام ہے۔ زمین کی اور اس کی قیمت اور دیت کی کچھ تخصیص نہیں اور اسی طرح جملہ ”القاتل لا یورث“ بھی جس سے قاتل کا محروم ہونا ثابت ہوتا ہے عام ہے۔ عہد اور خطا کی تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔

بائیں ہمہ اور بھی سب میت کے بڑے فرزند کو شمشیر اور معصوم اور انگوٹھی اور پوشاک (میت کی) بدون عوض دلاتے ہیں اور اس باب میں شیعہ بعض اپنے آئمہ سے بھی روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے باپ کے ترکہ میں ان اشیاء میں سے اور وارثوں کو حصہ نہیں دیا۔ بلا عوض سب کا سب آپ ہی رکھا اور پھر اس روایت کا راوی سوائے شیعہ اور کوئی نہیں۔ حالانکہ یہ روایت سراسر مخالف قرآن ہے اگر عذر عصمت آئمہ ہے اور یوں کہئے کہ امام معصوم ہوتا ہے اور معصوم سے ظلم و ستم اور خطا نہیں ہوتی جو کچھ انہوں نے کیا صحیح ہی کیا ہوگا، ہم نہ سمجھیں تو کیا ہوا؟ تو اوّل تو اہل سنت کسی کو سوا مانیام معصوم ہی نہیں سمجھتے جو ان کے سامنے یہ عذر چل سکے۔

قول قابل اتباع ہے اور فعل میں خصوصیت کے احتمال ہیں

اور سلنا کہ فعل معصوم میں خطا نہیں ہو سکتی لیکن بالاتفاق قول معصوم اتباع اور اقتداء میں فعل معصوم سے مقدم ہے کیونکہ افعال میں تو یہ بھی احتمال ہے کہ خاص اس کے لیے ہو آخر میسوں

احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھے۔ مجملہ ان کے دربارہ نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں چار کی قید نہ ہونی معلوم ہی ہو چکی، صوم وصال کا آپ کے لیے جائز ہونا اوروں کے لیے نہ ہونا سب کو معلوم۔ علیٰ ہذا القیاس اور بہت سے امور ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ مخصوص تھے اور کچھ کچھ ان کا مذکور بھی ہو چکا اور قول میں یہ احتمال نہیں ہوتا، اگر اس میں کسی وجہ سے کوئی تخصیص بھی ہوتی ہے تو کسی ایک آدھ ہی کی ہوتی ہے۔

بہر حال جب قول بعض آئمہ کہ وہ اگر بالفرض معصوم بھی ہیں تو کہیں اتنے ہیں؟ جتنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قابل اقتداء و اتباع ہیں۔ چنانچہ شیعوں کے نزدیک علی العموم یہ حکم جاری ہے۔ ہر کس و ناکس کو یہ مقام حاصل ہے کہ مصحف و انگشتی وغیرہ ترکہ پداری میں سے بدون عوض لے لے تو قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یعنی "لَا نُورِثُ مَا تَرَكْنَا" بدرجہ اولیٰ لائق اتباع ہوا اور جب ان امور کو بھی لحاظ کیجئے کہ آئمہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر نہیں اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی اور آج کل کے شیعہ جو روایت مذکور پر عمل کرتے ہیں انہیں سننا تو کہاں نصیب ان کی زیارت بھی میسر نہیں آئی۔

حدیث لا نورث مفسر و مبین آیت ہے اور روایت شیعہ مخالف

مع ہذا حدیث "لَا نُورِثُ مَا تَرَكْنَا" ایک وجہ سے مبین خطاب بھی ہو سکتی ہے اس کا تخصیص ہونا ایسا ظاہر نہیں کہ اس کے سوا احتمال ہی نہ ہو بلکہ قرین عقل بعد غور کے مفسر اور مبین ہوتا ہی ہے بخلاف روایت شیعہ کے کہ وہ تخصیص کیا مخالف ہے کیونکہ تخصیص کے لیے کوئی وجہ تو چاہیے۔ یہاں بجز دھینگا دھنگی کے اور کچھ نہیں۔ غرض ان امور کے لحاظ سے روایت شیعہ روایت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاسک بھی نہیں ہو سکتی۔ مع ہذا ہم پوچھتے ہیں کہ سند آئمہ دربارہ تخصیص کیا ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فعل و قول ہے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قول سے یہ تخصیص کی تھی کہ فدک نہ دیا تو کچھ چنگیز خان اور قانون انگریزی کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ ہاں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی جانب البتہ اتنا قصور ہے کہ انہوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کوئی راوی بیچ میں نہ تھا۔

آئمہ نے روایت فدک اگر بلا علاقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

بیان کی ہے تو دو خرابیاں لازم آئیں

اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں کچھ علاقہ نہیں تو دو خرابیاں لازم آئیں گی

اَوَّلُ تو مصحوم ہو کر کلام اللہ کے مخالف کیا مصحوم کے تو معنی تو یہی ہیں کہ احکام خداوندی کے خلاف اس سے نہ ہو سکے، دوسرے اس پر بھی اکتفاء نہ کیا امت کے لیے بھی یہی حکم مخالف رہا اور یہ دونوں خرابیاں پہلی شق پر بھی برابر وارد ہیں کیونکہ کلام اس صورت پر ہے کہ تخصیص کو مخالف کہتے۔ سو اس صورت میں مخالفت کہیں نہیں گئی۔ اس میں کوئی کیوں نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں یا کوئی اور، کلام اللہ کے مخالف تو کسی کی بات کیوں نہ ہو قابلِ شنوائی نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اور تخصیصات مسطورہ کو جو بحوالہ مذہب شیعہ مرقوم ہوئی ہیں اور واقع میں تخصیصات نہیں مخالفت ہیں، چنانچہ ظاہر ہے۔ ایک طرف دھریئے اور حدیث ابو بکر کو ایک طرف رکھئے اور بوجہ عقل اور عقل آیت ”يُؤْصِيكُمُ اللَّهُ“ سے اس کی جمیدگی اور مخالفت شیعہ کی منافرت کو ملحوظ کر کے دونوں کو تولتے اور پھر بولتے کہ کس طرف پلڑا جھٹکتا ہے؟

الحاصل ہر برخن سے شیعوں کی سخن منہی اور ہر قدم پر ان بزرگواروں کی عقل و عقل سے مناسبت معلوم ہوتی جاتی ہے۔ پر ہر بات پر گرفت کرنے میں بھی تھکا جاتا ہوں اور نیز شرم آتی ہے کہ ان بے حیا اس کو الزام دے کر کہاں تک شرمائے۔ اس لیے باقی امور کا جواب لکھنے سے جی رکتا ہے اور یوں خیال آتا ہے کہ جب اس فرقہ کی خوش فہمی ہر ہر سطر پر معلوم ہو گئی تو اہل انصاف اسی سے سمجھ جائیں گے کہ اور بھی ایسے ہی گل کھلائے ہوں گے لیکن یقین سے اطمینان کا رتبہ زیادہ ہوتا ہے۔ گواہی تقریروں سے جو مرقوم ہو چکیں، مولوی عمار علی صاحب کے خط معلوم کے امور باقیہ کا غلط ہونا بھی متیقن اور تحقیق ہو گیا لیکن شائقین کو یہ تردد ہوگا کہ دیکھئے ان کے غلط ہونے کے کیا وجوہ ہوں؟ اس لیے باوجود قلت فرصت اور کثرت ضروریات اور بھی حرکت کرنی پڑی۔ اس لیے بقدر مناسب دربارہ مخالفت حدیث ”لَا نُؤِثُّ مَا تَرَكْنَاهُ صَلَافَةً“ اور آیت ”وَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا يٰوَيْسَى وَيُوْثُّ مِنْ اِلٰ يَنْعُوْبُ“ اور آیت ”وَوَدِدْتُ سُلَيْمٰنَ ذَاوُدَ“ کا اپنے مافی الضمیر کو قلم کے نیچے کھینچتا ہوں۔

اَوَّلِ قائل لحاظ یہ بات ہے کہ جب آیت ”يُؤْصِيكُمُ اللَّهُ“ میں خطاب مخصوص امت کے لیے ہوا تو اس حدیث ہی کی اہل سنت کو کچھ ضرورت نہ رہی اور کسی کے مال میں میراث جاری ہو کہ نہ ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مال میں تو وراثت جاری ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حکم میں داخل ہی نہیں۔ ہاں جب آیت ما افاء اللہ سے فدک کا غیر مملوک ہونا ثابت ہو گیا تو جھگڑا ہی تمام ہو گیا۔ اب اگر کوئی کہیں سے خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ترکہ میں میراث کا جاری ہونا ثابت بھی کرے تب بھی فدک میں تو میراث جاری ہو ہی نہیں سکتی۔

حدیث معاشر الانبیاء اگر غلط بھی ہو تو بھی فدک ہاتھ نہیں آتا

القسمہ اگر بوجہ مخالفت ظاہری جو حدیث مذکور اور آیات باقیہ میں ظاہر بنوں کو معلوم ہوئی ہے۔ حدیث مذکور اگر غلط بھی ہو جائے تب بھی کچھ حرج نہیں۔ اول تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بإشارہ آیت ”يُؤْصِيكُمُ اللَّهُ“ ہی اس آیت سے مشتق ہیں۔ پھر اگر انبیاء کے ترکہ میں میراث جاری ہوئی بھی تو ہوا کرے۔ کلام تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں ہے عاقبت مافی الباب حدیث مذکور غلط ہو لیکن اس کے غلط ہونے سے فدک نہیں مل سکتا۔ ہاں آیت ”يُؤْصِيكُمُ اللَّهُ“ اگر غلط ہو جائے تو البتہ شیعوں کا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔

دوسرے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں بھی میراث جاری ہو؟ تب جس چیز میں تنازع ہے یعنی فدک میں شہادت آیت ما الاء اللہ میراث جاری نہیں ہو سکتی۔ اب اگر مخالفت مابین حدیث و آیات کے ثابت بھی ہو گئی تو حدیث ہی غلط ہو جاوے، پر شیعوں کا مطلب تو ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں اگر آیت ما الاء اللہ پر شیعہ خط لاکھینچ کر ایمان پر خط کھینچ جائیں تو کیوں نہیں؟ بہر حال بغرض اثبات برأت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یعنی بایں غرض کہ فدک کا نہ دینا موافق حکم نبوی تھا، ہمیں اس میں اس کی ضرورت نہیں کہ حدیث مذکور اور آیات مذکورہ میں موافقت ثابت کریں اور مخالفت جو بظاہر نظر آتی ہے اس کو باطل کر کے حدیث مذکور ثابت کریں۔ اس باب میں اشارہ ”يُؤْصِيكُمُ اللَّهُ“ اور دلالت ”ما الاء اللہ“ کافی ہے۔

فصل..... وراثت انبیاء پر بحث کہ وہ مالی ہے یا علمی؟

اور مالی مراد لینے پر خرابیاں

پر بغرض اثبات صدق صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس باب میں بھی گفتگو کرنی ضروری ہوئی اس لیے نظر بر تقدیم و تاخر آیات اول در باب مخالفت حدیث اور آیت ”وَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ الْخَيْرَ“ میں گفتگو چھیڑتا ہوں۔ پر شرط یہ ہے کہ بغور سنئے اگر وراثت سے اس آیت میں وراثت مالی مراد ہے اور اس وجہ سے حدیث کو اس آیت کے مخالف کہتے ہیں تو دو حال سے خالی نہیں۔ آل یعقوب سے یا تو خود ذات بابرکات حضرت یعقوب علیہ السلام مجاز امراد ہو۔ چنانچہ مآورات عرب میں اکثر پایا جاتا ہے کہ آل فلاں بولتے ہیں اور اس سے خود دعویٰ شخص مراد ہوتا ہے یا حقیقی معنی مقصود ہوں۔ یعنی آل یعقوب سے اولاد یعقوب مراد ہو۔ سو اول صورت میں تو لازم آئے گا کہ تادم دعاء مذکور مال حضرت

یعقوب علیہ السلام جن کے انتقال کو 2 ہزار برس سے زیادہ ہو چکے تھے بجسہ غیر منقسم رکھا ہوا ہوا اور آگے حضرت زکریا علیہ السلام کو یہ یقین ہوا کہ میری وفات سے پہلے بھی تقسیم ہو لیا تھا۔

یابعد اس دُعاء کے قتل وفات حضرت زکریا علیہ السلام کے تقسیم ہو جاتا تو پھر جملہ "تہوٹ من ال یعقوب" کے زیادہ کرانے کی کیا حاجت تھی؟ لفظ "تہوٹ من ال یعقوب" بھی کافی تھا کیونکہ اس صورت میں وہ مال حضرت زکریا علیہ السلام کا ہو چکا۔ اب حضرت یعقوب علیہ السلام کا نہ عرفا رہا نہ شرعا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام وارث ہوں تو ہر طرح سے حضرت زکریا علیہ السلام ہی کے وارث کہلائیں گے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے وارث نہ کہلائیں گے۔ اس صورت میں لاجرم جملہ "تہوٹ من ال یعقوب" غلط ہو جائے گا اور پھر لغو جدار ہے گا کیونکہ حضرت زکریا علیہ السلام کی نسبت تو وراثت پر دلالت "تہوٹ من ال یعقوب" میں موجود تھی۔ "تہوٹ من ال یعقوب" کی کیا ضرورت تھی؟

بہر حال اس صورت میں اس وجہ سے یوں کہنا پڑے گا کہ دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزرا اور بایں ہمہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا مال غیر منقسم ہی رہا۔ سو ایسی بات دیوانوں کے سننے کی ہے، عاقلوں کے کانوں میں تو ایسی نامعقول باتوں کی سمائی نہیں۔ کون کہہ دے گا کہ دو ہزار سال سے زیادہ ایک شخص خاص کا مال باوجود اس کثرت اولاد کے کہ شاید کسی کی نہ ہوئی ہو غیر منقسم رکھا رہا ہو، اور اگر آل یعقوب سے معنی حقیقی مقصود ہوں اور اولاد یعقوب مراد ہو تو یہ معنی ہوں کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام تمام بنی اسرائیل کے وارث ہوں جو تعداد میں لکھو کھا سے متجاوز ہوں گے۔ اور پھر بایں ہمہ حضرت یحییٰ علیہ السلام تمام اہیاء و اموات سے ایسا رشتہ قرابت رکھتے ہوں جو موجب وراثت ہو سکے۔

مع ہذا یہ بھی ضرور ہو کہ اس زمانہ کے بنی اسرائیل میں جو جو زندہ ہوں وہ لاجرم حضرت یحییٰ علیہ السلام کے سامنے مر ہی جائیں تاکہ وارث جو حضرت زکریا علیہ السلام ہیں اور "تہوٹ من ال یعقوب" اس پر دلالت کرتا ہے ظہور میں آئے۔ سو یہ بات پہلی بات سے بھی کچھ آگے بڑھی ہوئی ہے۔ بجز اس کے کہ ان عبارات کے ایسے معنی لینے کو زبردستی اور بے ہودہ کہئے اور کیا کہئے؟ عالم و عاقل کے تو تصور میں یہ بات نہیں آ سکتی کہ ایسے امور وجود میں آئیں اور پھر کوئی نادان ہی ایسی نامعقول تمنائیں کرے۔ چہ جائیکہ حضرت زکریا علیہ السلام انبیاء کی تیزی ذہن اور سلامت عقل سب جانتے ہیں اور پھر بایں ہمہ کیا زبیا تھا کہ جناب باری تعالیٰ ایسی چہ پوز باتوں کو اپنے ایسے کلام پاک میں نقل فرماتا کہ جس کی بلاغت و منانت کا شہرہ آسمان سے زمین تک پہنچا۔

غایت مانی الباب کوئی بات کو بتائے تو یوں بتائے کہ "من کل واحد من ال یعقوب ۲" اگر

فرماتے تو یہ اعتراض ہو سکتا اور فقط ”من ال یعقوب“ سے تو سب بنی اسرائیل کے مال کی وراثت لازم نہیں آتی مگر اہل انصاف سمجھتے ہیں کہ اگر یہ معنی ہوں کہ بنی اسرائیل میں سے ہر فرد بشر کی وراثت مراد لینا ضروری نہیں۔ ایک دو کی وراثت بھی کافی ہے تو اتنی بات تو یونہی میں موجود تھی۔ اس قدر عبارت بڑھانے سے کیا حاصل ہوا؟ مع ہذا ایسے مواقع میں حکم محاورہ تمام افراد ہی مراد ہوتے ہیں۔

القصة شیعوں کا اس آیت کو وراثت پانے پر محمول کر کے بوجہ مخالفت حدیث ”ما ترکناہ صدقہ“ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور پیر واپی حضرت صدیق پر طعن کرنا بعینہ ایسا قصہ ہے۔ جیسے نکلے ناک والوں پر نہیں جس فرقہ کے علماء کی فہم و فراست اور خوش فہمی اس درجہ کو ہو تو جاہلوں کو تو کچھ نہ پوچھئے۔ ان کی عقل سے تو چٹک بھینس ہی بڑی ہوگی۔ مع ہذا حضرت زکریا علیہ السلام نے مقام دُعاء میں دو لفظ فرمائے ہیں۔ ایک تو ”وَلِیًّا“ دوسرے ”یَہُیوٰنِی“ اگر ولی سے فرزند مطلوب ہے تب ”یہوٰنِی“ بیکار اور لغو گفتار ہے بیٹا آپ وارث ہوا کرتا ہے۔ ایسا کون سا فرزند ہوتا ہے جو قابلیت وراثت نہ رکھتا ہو اور اگر ”یہوٰنِی“ کی قید سے یہ غرض ہو کہ ایسے اوصاف اس میں پیدا نہ ہوں جو مانع وراثت ہوں۔ مثلاً کافر نہ ہو، یا میرا قاتل نہ ہو کیونکہ کافر اور قاتل میت کے وارث نہیں ہوتے تب بھی اس کی کچھ حاجت نہ تھی اس لیے کہ ”وَأَجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا“ کے موجود ہے۔ اس کے بھی معنی ہیں کہ ولی بھی دے تو ایسا دے جو تیری مرضی کے موافق ہو۔

باقی رہا یہ احتمال کہ ”یہوٰنِی“ کی قید اس لیے بڑھائی کہ مبادا فرزند تو عطا ہو لیکن سامنے ہی مر جائے تو یہ احتمال اسی کو روا ہے جو نفوذ باللہ خداوند عظیم کو فہم نہ سمجھے۔ اسی دُعاء میں یہ الفاظ موجود ہیں ”إِنِّی خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَرَآئِی“ جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ مجھے اپنے بعد کا اندیشہ ہے اس اندیشہ کے سبب ولی طلب کرتا ہوں۔ سواب اس دُعاء میں یہ بات صاف موجود ہے کہ ولی ملے تو ایسا ملے جو بعد تک زندہ رہے۔ مع ہذا لفظ ولی تو اُسے ہی کہیں گے جو ولی عہد اور خلیفہ ہو۔ اس مضمون کو حضرت زکریا علیہ السلام کے بعد تک زندہ رہنا آپ لازم ہے۔

اور ان سب خرابیوں سے قطع نظر کیجئے۔ وراثت مالی کے نہ ہونے کی ایک بھی وجہ بہت ہے کہ اس صورت میں حضرت زکریا علیہ السلام کے منصب نبوت کو بٹا لگتا ہے۔ مال کا اتنا خیال کہ جیتے جی تو تھا ہی۔ مرنے کے بعد کا بھی ابھی سے بندوبست ہے اور وہ بھی اس قدر کہ خدا سے بھی کچھ شرم نہیں۔ یہاں تک کہ خود جناب ہاری ہی سے یہ التجا ہے کہ اس کے برتنے کے لیے فرزند عنایت کر۔ پر لے درجہ کے دُنیا داروں اور محبان دُنیا کا کام ہے نہ کہ انبیاء کا اور ان میں

سے بھی حضرت زکریا علیہ السلام کا جو آزادگی اور وارستگی میں مشہور تھے۔ استغفر اللہ شیعہ بھی کس قدر بیہودہ ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ انبیاء کو بھی نہیں چھوڑتے۔ انبیاء کی یہ لوگ کیا قدر جانیں؟ ان کی ہمت بلند کے سامنے تو تمام متاع دُنیا میٹنی کے برابر ہے۔ پھر ان میں سے حضرت زکریا علیہ السلام جیسے بے تعلق، وہ ایک قدرِ قلیل متاع دُنیا کے لیے کیا اس قدر بندوبست کرتے؟ اور وہ بھی اتنا کچھ کہ خدا تک نوبت پہنچی اور وہ بھی اس اہتمام سے کہ اوّل تمام مراتب اپنے استحقاق کے جس سے خواہ مخواہ دُعا قبول ہی کرنی پڑے، بیان کیے جائیں۔

کیونکہ بعد تمہید مطلب ہے تو یہ ہے ”انی خفت الموالی“ جس سے اپنی کمال بے قراری اور بے تابی اور ضرورتِ فرزند ثابت ہو جائے تاکہ کچھ توقف نہ ہو۔ سبحان اللہ نبی نہ ہوئے دُنیا دار ہوئے۔ اتنی دور کی تو انہیں بھی نہیں سوچتی جن کی رگ و پے میں محبت دُنیا رہی ہوئی ہے اور شب و روز اسی دھیان گیان میں رہتے ہیں۔ علاوہ بریں اگر حضرت زکریا علیہ السلام کو یہ اندیشہ تھا کہ ان کے بنی اعمام ان کے مال کو اُن کے بعد بیچا اور بے موقع صرف نہ کریں تو اوّل تو یہ اندیشہ ہی بیجا کیونکہ نقل مشہور ہے آپ ہوئے جگ پرلوں مرے کے بعد کوئی سیاہ کرے یا سفید مردہ کو کیا اندیشہ؟ بعد مردن کوئی مواخذہ کی صورت ہی نہیں اور اس پر خدا سے عرض کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس اندیشہ کی تدبیر اور تدبیر بھی وہ عمدہ کہ در صورت قبولیت دُعا وہ بات ہرگز نہیں۔ خود ان کے ہاتھ میں موجود تھی، یعنی اپنے ہاتھ سے تمام اموال خدا کی راہ میں لٹا جاتے جو اس خوف سے بھی نجات ہو جاتی اور ذریعہ مزید ترقی درجات آخرت بھی میسر آتا۔ فرزند اگر نیک بھی ہو اور اس نے مال کو خدا کی راہ میں صرف بھی کیا تو مُردہ کیا؟ وہ مال اب فرزند کا ہو گیا ثواب دینے دلائے گا اس کو اختیار ہوگا۔

باقی رہی یہ بات کہ ایک دفعہ مال کے لٹا دینے میں یہ اندیشہ تھا کہ اگر بعد اتفاق حیات طویل باقی نکلی تو پھر اپنا گزارا مشکل ہے۔ سو اس کی یہ صورت ہے کہ اگر ایسی ہی بے صبری اور اس بات کی پابندی تھی اور باوجود نبوت تو کل دُشوار تھا تو انبیاء کو ان کی موت کی اطلاع ہو جاتی ہے۔ وقت اطلاع موت سب دے دلا جاتے اور وارثان بد وضع کئے لیے کوڑی نہ چھوڑتے۔ القصد نظر بد و جو مذکورہ ”وَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ“ سے وراثت مالی مراد نہیں ہو سکتی۔

وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ مِثْلَ وِرَاثَةِ مَالِي مَرَادُ نَحْنِ

علیٰ ہذا القیاس آیت ”وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ“ میں بھی بحکم قرآن عقلیہ ارادۂ وراثت مالی ممنوع ہے مگر شاید شیعوں کو یہ عذر ہو کہ یہاں عقل ہی ندارد ہے تو البتہ عذر معقول۔ خیر اگر شیعہ

انصاف کریں تو اس قدر اور معروض ہے کہ باتفاق مؤرخین اور اجماع اہل تواتر حضرت داؤد علیہ السلام کے انیس بیٹے تھے۔ ایک حضرت سلیمان علیہ السلام اور اٹھارہ دوسرے۔ پس اگر وارث ہوتے تو سب ہی ہوتے حالانکہ بطور خصوصیت جناب باری تعالیٰ کا یوں فرمانا کہ حضرت داؤد کے حضرت سلیمان علیہم السلام وارث ہوئے، اس بات کو مقتضی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث فقط حضرت سلیمان علیہ السلام ہی تھے اور بھائیوں کی شرکت نہ تھی اور نیز یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے کہ سب بیٹے باپ کے مال کے وارث ہوا کرتے ہیں۔ پھر اس بات کے بیان کرنے سے کیا حاصل نکلا جو جناب باری تعالیٰ نے اس قصہ کو یا فرمایا۔ ایسی لغوی بیہودہ باتیں خداوند متین کے کلام میں نہیں ہو سکتیں۔ علاوہ بریں ایسی بات کے بیان کرنے میں جس میں تمام عالم نیک و بد شریک ہوں کیا بزرگی نکلی جو خداوند کریم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے فضائل و مناقب میں اس کو درج فرمایا اور مقام تعریف میں چنانچہ سیاق و سباق سے ظاہر ہے ذکر کیا۔ القصہ بوجہ مذکورہ یہاں بھی وراثت مالی مراد نہیں ہو سکتی۔ جب بدلائل واضح اس سے اطمینان ہوا کہ ہرچہ با و ابا و وراثت مالی تو مراد نہیں تو یہ تردد ہوا کہ پھر اور کون سی وراثت مراد ہوگی؟ اس بات کے اطمینان کے لیے اول تو حضرات آئمہ کی طرف رجوع کیا، ادھر سے یہ جواب ملا ”إِنَّ سُلَيْمَانَ وَرِثَ دَاوُدَ وَإِنَّ مُخَمَّنًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرِثَ سُلَيْمَانَ“ یعنی بیشک حضرت سلیمان حضرت داؤد علیہم السلام کے وارث ہوئے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلیمان علیہ السلام کے وارث ہوئے۔

وراثت سے مراد علم دین (بروایت آئمہ شیعہ)

چنانچہ یہ روایت حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے امام المجد ثین شیعہ حضرت کلینی نے اپنی کتاب میں نقل کی ہے۔ سنیوں کی کتابوں میں ایسی ویسی باتیں ہوتیں تو شیعوں کے لیے گنجائش انکار بھی تھی۔ بہر حال اس روایت سے عیاں ہے کہ آیت ”وورث سليمان“ میں تو وراثت علمی و وراثت منصب نبوت مراد ہے۔ وراثت مالی مراد نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت سلیمان علیہ السلام سے کیا قرابت تھی؟ کہ اس کے وسیلہ سے جو مال حضرت سلیمان کو حضرت داؤد علیہم السلام کے ترکہ میں سے ملا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میراث میں ملا۔ مع ہذا مال ملا تو کب ملا؟ بجز اس کے کچھ نہیں کہ ایسی میراث جو حضرت داؤد سے حضرت سلیمان علیہم السلام کو پہنچی اور حضرت سلیمان علیہ السلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی۔ بجز میراث نبوت اور میراث علم کے اور کچھ نہیں۔

سیاق و سباق آیت سے بھی وراثت علمی ظاہر ہے

علاوہ ازیں خود کلام ربانی میں کلام سابق اور کلام لاحق دونوں اسی بات پر دلالت کرتے ہیں کہ جملہ ورث سے میراث علمی مراد ہے میراث مالی مراد نہیں۔ چنانچہ حافظان عربی داں پر پوشیدہ نہیں۔ بایں ہمہ بعدہ بھی ماقبل مابعد دونوں کو لکھ کر اطمینان کیے دیتا ہے۔ کلام سابق تو یہ ہے ”وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا وَقَالَا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي فَضَّلَنَا عَلَى كَثِيرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِينَ“ جس کے جملہ ورث سلیمان علیہ السلام سے مل کر یہ معنی ہوئے ”کہ بیشک دیا ہم نے داؤد اور سلیمان علیہم السلام کو ایک علم اور کہا اُن دونوں نے شکر اُس اللہ کا جس نے فضیلت دی ہم کو اپنے بہت بندوں ایمان والوں پر اور وارث ہوئے سلیمان داؤد کے“ اور کلام لاحق یہ ہے ”وَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عَلِمْنَا مَنَطِقَ الطَّيْرِ الْخ“ اور مجموعہ کے مل کر یہ معنی ہوئے ”کہ وارث ہوئے سلیمان داؤد علیہم السلام کے اور بولے وہ لوگو! ہم کو سکھائی ہے یعنی خدا نے گفتگو پر بندوں کی فقط۔“

اب دیکھئے کہ جب جملہ ”ورث“ جملہ ”وَلَقَدْ آتَيْنَا“ پر معطوف ہو اور جملہ ”وَقَالَ وَرِث“ پر معطوف ہو اور پھر ان دونوں تینوں معطوف اور معطوف علیہ کے ایک دوسرے پر معطوف ہونے کو لحاظ کریں تو در صورت یہ کہ جملہ ”وَقَالَ جملہ ورث“ پر معطوف ہو تو اس ارتباط سے اب یہ بات نکلتی ہے کہ ”وَرِث“ میں وراثت علمی مراد ہے ورنہ بے علاقہ دو جملوں میں عطف کے کیا معنی؟ جس نے مختصر معانی اور مطول کی بحث فصل و وصل کو دیکھا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ اگر وراثت سے وراثت علمی مراد نہ ہو بلکہ مالی ہو تو پھر عطف کے جواز کی کوئی صورت نہیں۔ چہ جائیکہ موجب فصاحت و بلاغت ہو اور ظاہر بھی تو ہے اس صورت میں ان دونوں تینوں جملوں میں عطف کا ہونا عینہ ایسا ہے جیسا زاغ کے ساتھ طوطی کو ایک قفس میں بند کر دیجئے۔

اور جملہ ورث جو مابین اپنے ماقبل اور مابعد کے داخل ہے اس کی یہ صورت ہوگی جیسے کہا کرتے ہیں بیاہ میں بیچ کا لیکھا۔ ایسی غیر مربوط کلام دیوانوں کی ہوتی ہے۔ خداوند تعالیٰ شانہ کی شانِ رفیع سے یہ بات محال ہے کہ ایسی ناموزوں گفتگو کرے۔ ہاں اگر ایسے مواقع میں محاورات عرب میں لفظ وراثت نہ بولا کرتے تو البتہ فی الجملہ جائے تا مل تھی۔ خیر شیعوں کو شاید خبر نہ ہو، پر حافظان کلام ربانی کو معلوم ہے کہ محاورات ساکنان عرب تو درکنار خود کلام ربانی میں جوار باب فصاحت و بلاغت کے نزدیک عربی زبان میں کوئی کتاب یا کوئی عبارت اُس کے ہم سنگ تو کیا پاسنگ بھی نہیں ہو سکتی۔ بہت مواقع میں وراثت سے وراثت علمی مراد ہے۔ یہاں تک کہ وراثت مالی کا احتمال بھی نہیں ہو سکتا۔

کلام اللہ میں وراثت کو صرف علم کیلئے کثرت سے استعمال کیا ہے

ایک جا فرماتے ہیں ”ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا“ جس کا یہ مطلب ہے ”کہ پھر ہم نے وارث کیا کتاب کا اپنے بندوں میں سے اُن لوگوں کو جن کو چھانت لیا۔“ دوسری جا ارشاد ہے ”فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ ط“ اس سے بھی دعی وراثت کتاب یعنی علم کتاب مراد ہے مگر شاید خوش فہمان شیعہ کو یہاں یہ احتمال ہو کہ کتاب بھی تو مال ہے اور شاید وراثت مال ہی یہاں بھی مراد ہو تو گو اس احتمال کے دفع کے لیے کاغذ کے سیاہ کرنے میں اپنی ہنسی کا اندیشہ ہے۔ مگر بلحاظ قد رفہم شیعہ ناچار کچھ اشارہ ضروری ہوا۔

اس لیے معروض ہے کہ اول آیت میں تو بعد ”عِبَادِنَا“ کے ”لِمَنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ الْخ“ ہے اور دوسری آیت میں بعد کتاب کے ”يَاخُلُودُونَ غَرَضٌ هَذَا الْآخِرُ“ ہے۔ سو تفرج ”لِمَنْهُمْ“ سے تو یوں ظاہر ہے کہ عطاء کتاب کے بعد باعتبار عمل کے اُن کے تین حال ہو گئے، کوئی ظالم رہا، کوئی مقصد، کوئی سابق۔ سو عمل علم پر متفرع ہو سکے ہے نہ کہ اور اراق اور جلد کتاب پر اور ”يَاخُلُودُونَ“ کا یہ مطلب ہے کہ ان کو کتاب کی مٹی دنیا ہی کمانے لگے۔ یعنی رشوت لے کر امراء کی مرضی کے موافق مسئلے غلط بتانے لگے۔ چنانچہ قرینہ ”أَلَمْ يُوْخَلْ عَلَيْهِمْ مِنْ أَثْقَالِ الْكِتَابِ أَنْ لَا يَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ ط“ اس بات پر شاہد ہے اور ظاہر ہے کہ رشوت لے کر غلط مسائل بتانے بے علم کے نہیں ہو سکتے۔ بہر حال اکثر مواقع میں لفظ وراثت سے وراثت علمی مراد ہے۔ سو اس استبعاد کی بھی گنجائش نہیں کہ میراث کو علم سے کیا علاقہ؟

کلام اللہ میں وراثت بمعنی قائم مقام

ہاں شاید کسی عربی خواں عمامہ بندی کے جی میں یہ کھٹکے کہ وراثت علمی وراثت مجازی ہے اور وراثت مالی وراثت حقیقی۔ پس وراثت کے معنی حقیقی چھوڑ کر بے ضرورت معنی مجازی لینے درست نہیں۔ البتہ اگر ضرورت ہوتی تو مضائقہ بھی نہ تھا۔ اس لیے کہ گزارش یہ ہے کہ معنی معروف وراثت کے معنی حقیقی ہونا اور علم میں مجازاً مستعمل ہونا ہی اول تو مسلم نہیں، علم میں بھی مثل مالی وراثت! اپنے معنی حقیقی پر ہی رہتی ہے۔ الغرض وراثت کے معنی حقیقی دونوں کو عام ہے اور بظاہر اس کے معنی قائم مقام ہونے کے قریب قریب ہیں بلکہ اگر بمعنی حاوی اور مسلط ہو جانے کے کہے تو اور بھی انسب اور اولیٰ ہے۔ چنانچہ ظاہر ہو جائے گا، پر بہسب کثرت استعمال کے عرف فقہاء میں

معنی معروف میں خاص ہو گیا ہے ورنہ حقیقت وراثت کا اطلاق وراثت علم اور وراثت منصب دونوں پر ویسا ہی صحیح اور درست ہے جیسا کہ وراثت مالی پر۔

اور دلیل اس بات کی (کہ معنی خاص یعنی وراثت مال میں یہ لفظ معروف ہو گیا ہے اور اصلی معنی قریب قریب قائم مقام ہونے یا حاوی اور مسلط ہو جانے کے ہیں۔ عام ہے کہ بطور معروف ہو یا بطور دیگر) یہ ہے کہ بعض ایسے موقع میں کلام اللہ میں یہ لفظ مستعمل ہوا ہے کہ نہ وہاں وراثت علمی ہو سکے کیونکہ جو چیز میراث میں ملتی ہے وہ مال ہے اور نہ میراث بطور معروف ہو سکے اس لیے کہ جن سے میراث پہنچی ان سے رشتہ داری تو کیا قرابت دینی بھی نہ تھی بلکہ یہ مسلمان تو وہ کافر جن سے میراث بطور معروف پہنچی بھی نہ پہنچے ہاں اگر بمعنی قائم مقام ہونے اور نیابت منصب کے کہا جائے تو البتہ معنی بن جائیں۔

دیکھئے فرماتے ہیں ”وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا“ جس کے معنی یہ ہیں ”اور وارث کیا ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور تھے مشرق اور مغرب میں، اس زمین کا جس میں ہم نے برکت رکھی۔ فقط“ اب سنئے اس قصہ میں جن کو زمین دلائی وہ بنی اسرائیل تھے اور جن سے دلائی وہ فرعون اور قوم فرعون تھی۔ ان میں قرابت نسبی تو کیا رشتہ داری اسلام و ایمان بھی نہ تھی بلکہ یہ مسلمان تھے تو وہ کافر۔ اگر بالفرض آپس میں ایسی رشتہ داری بھی ہوتی، تب ظاہر یہ ہے کہ اس شریعت میں بھی مسلمانوں کو کافروں کی میراث نہ پہنچتی ہوگی۔ بجز اس کے کہ میراث سے مراد قائم مقام ہونا اور وراثت منصب مراد ہو اور کوئی صورت نہیں۔ سو اس صورت میں نہ وراثت علمی ہے جو معنی مجازی کہئے اور یوں کہئے کہ معنی حقیقی وراثت مالی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وراثت میں جو چیز ملی وہ زمین ہے جو اصل مال ہے اور نہ یوں کہے بنے ہے کہ وراثت بمعنی معروف ہے۔

علیٰ ہذا القیاس ”إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ط وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ“ میں بھی جس کے یہ معنی ہیں ”کہ بیشک زمین اللہ کی ہے وارث کر دے ہے جسے چاہے اپنے بندوں میں سے اور آخر بھلا ڈرنے والوں ہی کا ہے۔“ وہی وراثت بمعنی قائم مقام ہونے کے ہے۔

وارث بمعنی حاوی و مسلط

الغرض ان مواقع میں تو وراثت ظاہر میں بمعنی قائم مقام ہونے کے ہے اور غور سے دیکھئے تو حاوی ہو جانا اور مسلط ہو جانا مراد ہے۔ کیونکہ آیت ”وَبَلَدِكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ط“ میں جس کے یہ معنی ہیں ”کہ یہ وہ جنت ہے جو میراث دیں گے، ہم اپنے

بندوں میں سے اس کو جو پرہیزگار ہوگا۔ فقط۔“ بجز حاوی اور مسلط ہو جانے کے اور معنی مراد نہیں ہو سکتے کیونکہ یہاں قائم مقام ہونے کی بھی گنجائش نہیں۔ اس لیے کہ جنت پہلے ہی اور کے قبضہ میں کب تھی جو پرہیزگاروں کو ان کے قائم مقام کیا؟ اور جنت کو ان سے سمجھ لیا۔

اور مجازاً میراث حضرت آدم علیہ السلام کہنے تو قطع نظر اس کے کہ جب تک حقیقی معنی بن سکیں مجازی کیوں لیجئے؟ اس کا کیا جواب ہوگا کہ حضرت آدم علیہ السلام تو خود جنت میں موجود ہوں گے۔ سو باپ کے ہوتے اولاد کے وارث ہونے کے کیا معنی؟ بہر حال ایسے معنی عام جو تمام مواقع میں برابر صحیح ہو جائیں یہی معنی معلوم ہوتے ہیں کہ وراثت سے حاوی ہو جانا اور مسلط ہو جانا مراد ہو اور جب ایک معنی عام حقیقی بن سکیں جو سب مواقع میں صحیح ہو جائیں تو ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اس کے قائل ہوں کہ بعض مواقع میں معنی حقیقی کہنے اور بعض مواقع میں معنی مجازی؟ کیونکہ جیسا بے ضرورت معنی حقیقی چھوڑ کر معنی مجازی مراد لینے درست نہیں۔ ایسا ہی بے ضرورت اس کا قائل ہونا کب درست ہے کہ ایک جا معنی حقیقی لیں اور ایک جا معنی مجازی؟

ہاں اگر معنی عام کے حقیقی ہونے کی کوئی صورت نہ ہو تو یوں بھی ہوتا۔ مع هذا قانون میراث لا رب قدیم سے قانون شریعت ہے کیونکہ ہر نبی کی شریعت میں کچھ کچھ اس کے قواعد ہیں۔ اگر یہ بات بدھ دُنیا میں سے ہوتی تو یہ بات نہ ہوتی۔ لہذا اس صورت میں میراث مالی معنی شرعی ہوئے اور وضع لغت اصطلاح شریعت سے ہر قرن میں مقدم سمجھی جاتی ہے۔ خواہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہو، خواہ کسی اور نبی کا اور ظاہر ہے کہ اصطلاحات اقوام معنی حقیقی میں سے نہیں ہوتیں بلکہ اقسام متحولات میں سے ہوتی ہیں تو لا جرم معنی حقیقی اور ہی ہوں گے۔ سو اگر وہی ہوں جو میں نے عرض کے تو فہم اور نہ جو کچھ ہوں وہی اسکی، ہمارا تو اتنا مطلب ہے کہ وراثت بمعنی معروف معنی حقیقی نہیں بمعنی اصطلاحی ہے۔

اب سنئے کہ باوجود اصطلاح کے پھر اصطلاح بھی ایسی غالب نہیں کہ معنی حقیقی پر ترجیح ہو کیونکہ کلام اللہ میں اکثر مواقع میں معنی اصطلاحی کا احتمال ہی نہیں ہو سکتا، بہت ہی کم ایسے مواقع ہیں کہ بظاہر وہاں معنی اصطلاحی کا احتمال ہو اور تلاش کیجئے تو بجز ان آیتوں کے جو تمسک شیعہ ہیں اور کوئی آیت نہ نظر آئے یہ ظاہر ہے کہ ان آیتوں میں بھی احتمال ہی احتمال ہے اور پھر احتمال بھی ایسا کہ غور سے دیکھتے تو وہ احتمال ہی محال ہے۔ چنانچہ بخوبی واضح ہو چکا، پھر کون سی ضرورت ہے کہ معنی حقیقی کو چھوڑ کر معنی منقول رو لیجئے؟ ہاں اگر خدا تعالیٰ کی خدا اصطلاح مقرر کی ہوئی ہو تو مثل صومہ صلوٰۃ معنی اصلی مراد ہی نہ ہو کر تے تو ایک بات بھی تھی اس تقریر اخیر سے متحقق ہو گیا کہ وراثت علمی وراثت بمعنی معروف دونوں معنی مجازی ہیں معنی غیر حقیقی ہے۔

وراثت علمی اگر معنی مجازی ہی ہو تو مجاز متعارف ہے

اور سلمنا کہ وراثت بمعنی معروف وراثت حقیقی ہے اور وراثت علمی وراثت مجازی لیکن مجاز متعارف اور مجاز مشہور ہے۔ خصوصاً استعمالات قرآن میں یہاں تک کہ حقیقت اور معنی حقیقی کی برابری کرتا ہے۔ چنانچہ دو آیتیں اس بات کی شاہد مذکور بھی ہو چکی ہیں ایک تو "ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ النَّحْ" دوسری "فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَذَا الْأَدْنَى" اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں وراثت علمی پر بے تکلف دلالت کرتی ہیں۔ کچھ تامل اور توقف کی نوبت نہیں پیش آتی اور یہی مجاز متعارف کے معنی ہیں کہ ایسا مجاز حقیقت سے کم نہیں ہوتا جو یوں کہا جائے کہ بے ضرورت معنی مجازی مراد لینے درست نہیں اور ان سب سے قطع نظر کیجئے تب بھی بات ہاتھ سے کہیں نہیں گئی۔ اس لیے کہ اس میں تو کسی کو کلام نہیں باوجود قرائن کے معنی مجازی کے مراد لینے میں کچھ دشواری نہیں بلکہ وقت قرائن والا معنی حقیقی کا چھوڑ دینا اور معنی مجازی کا مراد لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ نہیں تو پھر معنی مجازی کے استعمال کی کوئی صورت نہ ہو۔

سواؤل تو حدیث کلینی سے بڑھ کر اور کون سی دلیل معنی حقیقی کے چھوڑنے اور معنی مجازی کے مراد لینے کی ہوگی۔ علاوہ بریں اور بھی قرائن عقلیہ اور نقلیہ مذکور ہوئے، پھر اب بھی اگر معنی مجازی ضروری نہ ہوں تو پھر کب ہوں گے؟

کلینی کی ایک روایت جس میں وراثت علمی کی صراحت ہے

اور بایں ہمہ اور ایک ایسی دلیل ہے جس سے وراثت مالی کا آیت "وَرِثَ" میں بلکہ آیت "وَهَبْ لِيْ النَّحْ" میں بھی مراد نہ ہونا اور وراثت علمی کا دونوں آیتوں میں مراد ہونا بتقریح ثابت ہو جائے اور شیعوں کو بھی اس کے انکار میں مجال دم زدن نہ ہو۔ ہمارے پاس موجود ہے اُنی سوائے آیت مذکور کے۔ ایک دوسری روایت کلینی ہی کی جس کو شیعوں کو بھی برسرِ چشم ہی رکھنا پڑے اور در باب مطلب مذکور روایت سابق سے زیادہ کافی ودانی ہے۔ اپنے پیش نظر ہے بغرض دندان شکنی شیعہ اس روایت کو زیب اور اراق کرتا ہوں۔

روى مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَى الرَّاظِي فِي الْكَافِي عَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ جَعْفَرُ ابْنِ مُحَمَّدٍ الصَّادِقِ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَنَّهُ قَالَ إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ وَذَلِكَ أَنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُورَثُوا وَلَئِنْ نُسَخَتْ لَمْ يَرِثُوا بِرْهَمًا وَلَا دِينَارًا وَإِنَّمَا أَوْرَثُوا الْأَخَادِيثَ مِنْ

اَخَذْنَاهُمْ لَمَنْ اَخَذَ بِنَسِيءٍ مِنْهَا فَلَقَدْ اَخَذَ بِنَحْيِ زَالٍ

مطلب یہ ہے کہ ”محمد بن یعقوب رازی اپنی علامہ کلینی کافی میں ابو الحسنی کے واسطے سے امام جعفر صادق سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ بیشک علماء انبیاء کے وارث ہیں اور یا اس سبب سے کہ انبیاء نے میراث میں نہیں چھوڑا اور ایک نسخہ میں یوں ہے کہ میراث میں نہیں پایا کوئی درہم اور نہ کوئی دینار، انہوں نے جو میراث میں چھوڑا ہے تو چند ہائیں ہی اپنی باتوں میں سے چھوڑ آئے ہیں، سو جس نے کچھ باتوں میں سے لیا تو اس نے بڑا ہی کامل حصہ لیا۔ فقط“

اس روایت سے بقرع معلوم ہو گیا کہ انبیاء کے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا ان کے علم کے البتہ علماء وارث ہوتے ہیں۔ سو عینہ یہی مطلب اس حدیث کا ہے جو اہل سنت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ اگر اس روایت کو مولوی عمار علی صاحب اور دیگر علماء شیعہ جھوٹ بتاتے ہیں تو یہ روایت بدرجہ اولیٰ جھوٹی ہے مگر بایں لحاظ کہ وہ روایت صدیق ہے تو یہ روایت صادق ہے اور جھوٹوں کو بچوں کی بات کب پسند آتی ہے؟ اس روایت کو بھی جھوٹا بتانے لگیں تو کیا عجب؟ بہت ہوگا تو یہ ہوگا کہ حضرت امام جعفر صادق سے بھی برگشتہ ہو جائیں اور کلینی کو بھی تمرا کر کے ان کے کردار کو پہنچائیں لیکن اس بات میں ان کو جب مشکل ہو کہ دین سے غرض ہو، اگر دین سے غرض ہوتی تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی سے کیوں بگاڑتے؟ بہر حال وہ تسلیم کریں یا نہ کریں حضرت امام ہمام امام جعفر صادق کا قول ہمارے نزدیک صادق ہے اور ان کی بات ہمارے سر آنکھوں پر۔

الحاصل بشہادت کلمہ ”اِنَّمَا“ جو باقرار شیعہ بھی مفید صر ہے۔ چنانچہ آیت ”اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ“ سے بزم خود اسی بھروسے لڑتے ہیں۔ یہ بات ثابت ہو گئی کہ انبیاء نے سوائے علم اور احادیث کے کوئی چیز میراث نہیں چھوڑی تو اس صورت میں لاجرم دونوں آیتوں میں میراث علمی ہی مراد ہوگی۔ باقی اس بات کا شیعوں کو اختیار ہے کہ اسے معنی حقیقی کہہ کر تعبیر کریں یا سستی مجازی اس کا نام رکھیں۔ اگر معنی حقیقی کہیں تو فیہا اور نہ مجاز کہیں اور مجاز بھی مجاز متعارف تب بھی انہیں مرحبا اور اگر ہماری ضد میں مجاز غیر مشہور وغیر متعارف کے قائل ہوں تب بھی کچھ اندیشہ نہیں چشمہ ماوشح دل ماشاد۔ اس لیے کہ ہاوجود اس قدر ہجوم قرآن صارفہ کے جو در باب مراد نہ ہونے وراثت علمی کے مذکور ہوئے اور باوصف اس قدر کثرت وجوہ ارادہ وراثت علمی کے جو مسطور ہوئیں۔ اگر وراثت علمی مراد ہو تو گو وہ وراثت مجازی ہی سہی تب بھی عین حق و صواب ہے۔

بلکہ اگر بالعکس ہو تو خطا فاحش اور غلط ہے اور قواعد دلالت کی رو سے غیر جائز۔ بہر حال آیت

”وَوَرِّثْ“ میں جیسے بقرائن و دلائل سابقہ وراثت مالی کا مراد نہ ہونا ثابت اور متحقق ہو گیا تھا، ویسے ہی اب بوجہ و دلائل مذکورہ یہ بھی متحقق ہو گیا کہ وراثت علمی مراد ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جیسے قرائن و دلائل مسطورہ بالا سے یہ متیقن ہو گیا تھا کہ آیت ”وَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا يَرْثُنِي وَيُورِثْ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ ط“ میں وراثت مالی مراد نہیں۔ اب بشہادت روایت ثانی کلینی یہ تو ثابت ہوا ہے، اس کے ساتھ یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وراثت علمی مراد ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے اور بعد ادا شہادت اس روایت کے اس کی حاجت نہ رہی کہ کچھ قرائن اس بات کے بھی ذکر کیے جاویں کہ یہ آیت ”وَهَبْ لِي“ میں بھی بدستور آیت ”وَوَرِّثْ“ وراثت علمی ہی مراد ہے کیونکہ روایت مذکور سے بڑھ کر شیعوں کے حق میں اور کون سی دلیل دیمان ممکن ہوگی؟ اس روایت کے ذکر کرنے میں شیعوں کی وہی مثل ہو گئی جیسے کہا کرتے ہیں۔ انہیں کی جوتی انہیں کا سر۔

سورہ مریم میں حضرت زکریا علیہ السلام صرف خلیفہ نیک چاہتے تھے مگر بنظر مزید تحقیق و خوشنودی اہل سنت و پشیمانی شیعہ کچھ قدرے قلیل اور بھی چھیڑ چھاڑ سکی، اس لیے عرض ہے اگر لفظ ولی اور جملہ ”وَزَّيْنِيْ بِحُفَّتِ الْمَوَالِي مِنْ وَزَّيْنِيْ وَكَانَتْ اَمْرًا نِيْ غَابِرًا ط“ کو جو آیت ”فَهَبْ لِيْ مِنْ لَدُنْكَ الْخ“ سے متصل ہی پہلے واقع ہے بنظر غور دیکھا جائے تو عیاں ہو جائے کہ مقصود حضرت زکریا علیہ علیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام فقط طلب کاری جانشین اور خواستگاری خلیفہ نیک آئین تھی۔ اس دُعا کے وقت جس کا سورہ مریم میں قصہ مذکور ہے۔ تمنائے عطائے فرزند نہ تھی گو کسی اور وقت میں یہ بھی دُعا مانگی ہو۔ اس لیے کہ لفظ ”وَلِي“ باتفاق اہل لغت بمعنی فرزند ہرگز نہیں آتا۔ البتہ بمعنی ولی عہد اور جانشین آتا ہے اور اس پر لفظ ”مَوَالِي مِنْ وَزَّيْنِي“ کا قرینہ خود اسی پر دلالت کرتا ہے۔ کہ گو لفظ ولی مثل لفظ مولیٰ بمعنی متحد آتا ہو لیکن یہاں بھی معنی مراد نہیں کیونکہ ”مَوَالِي“ کے ساتھ لفظ ”مِنْ وَزَّيْنِي“ جو لگا ہوا ہے وہ بے اس کے کہ موالی سے معنی مذکور ہی مراد ہوں، صحیح نہیں ہو سکتا، اطمینان کے لیے ترجمہ مرقوم ہے۔

”اعنی اپنے بنی اہمام اور اقربا سے اندیشہ ہے یعنی یہ ڈر ہے کہ وہ لوگ منصف خلافت نبوت کے لائق نہیں، اگر وہ لوگ میرے جانشین ہوئے تو ان سے حمایت احکام خداوندی تو معلوم۔ الٰئی تبدیل اور تحریف کا کھکا ہے اور اپنی اولاد ہونے کی توقع نہیں جو یہی اُمید ہو کہ شاید کوئی فرزند لائق فائق پیدا ہو جائے کیونکہ میری عورت بانجھ ہے۔ اس لیے یہ عرض ہے کہ مجھے ایک ایسا جانشین عنایت فرما جو میرا بھی وارث ہو اور آل یعقوب کا بھی وارث ہو اور اس کو اپنی مرضی کے موافق کر دے۔ فقط“

ظاہر ہے کہ سیاق میں موالی کے معنی بجز قاعمان مقام اور خلفاء کے اور کچھ نہیں ہو سکتے تو اہل حرم الی بھی جو اسی مادہ سے مشتق ہے بمعنی ولی عہد اور جانشین ہی ہوگا اور اگر بفرض محال ولی بمعنی فرزند بھی ہو تو موالی بھی بمعنی فرزند ان ہی ہوگا اور ظاہر ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے اوّل تو کوئی فرزند تھا ہی نہیں۔ دوسرے اگر تھا بھی تو پھر تمنائے فرزند کس لیے تھی۔ وراثت کے قابل سب ہی فرزند ہوتے ہیں نیک ہوں یا بد۔

باقی رہا مضمون پسندیدہ الہی ہونے کا۔ اگر بالفرض بفرض محال کوئی فرزند بد اطوار ہی تھا؟ اور اسی لیے دوسرے فرزند نیک کی طلبگاری تھی تو اسی کے حق میں یہ دُعا کیوں نہ فرمائی؟ اور موالی کہہ لیے جو دُعا نہ فرمائی تو یہ وجہ ہے کہ تمام برادری بلکہ تمام کنبہ کے ساتھ آدمی کو ایسی محبت نہیں ہوتی جو اُن کے لیے خواہ مخواہ دُعا ایسے تہہ دل سے نکلے۔ یہ معاملہ اگر ہوتا ہے تو اپنی ہی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے کہ اگر اُس کو بد اطوار دیکھے تو خواہ مخواہ جی تڑپ جائے اور اصلاح کی دُعا بے اختیار دل سے نکلے لیکن شیعوں کو بھی اتنا تو یقیناً معلوم ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی استدعا کے وقت تک کوئی فرزند نہ تھا نیک و بد تو معلوم ہوا کہ موالی سے وہی لوگ مراد ہیں کہ بظاہر اُن کے جانشین ہونے کا دھیان تھا کیونکہ یہ جملہ بظاہر غیر ہی کی طلبگاری کی علت ہے کیونکہ حاصل معنی بظاہر یہ ہیں کہ میرے تو فرزند ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کوئی جانشین ہی سہی اور جب جانشین کوئی غیر ہو تو پھر وراثت مندرجہ آیت بجز وراثت علمی اور وراثت منہی کے صحیح نہ ہوگی۔

اور یہ بھی نہ سہی جب ولی بمعنی جانشین ہوا تو وراثت سے وراثت علمی ہی مراد ہوگی وہ اپنا ہوا یا بیگانہ اور یہ دُعا کچھ مستبعد نہیں کیونکہ جیسے عبادِ دنیا اور اہل دنیا فرزند اور خلفِ شدید کے طلبگار ہوتے ہیں ایسے ہی اربابِ علم و فضل اور مرشدان صاحب کمال کو خلیفہ راشد اور جانشینِ کامل کی تمنا ہوا کرتی ہے بلکہ ایسے لوگوں سے تمنائے فرزند البتہ مستبعد ہے اور یہ جو بعضے اور مواقع میں حضرت زکریا علیہ السلام سے دُعا میں بجائے ولی لفظ ”خُرَیْطَہ“ جو باتفاق بمعنی اولاد ہے کلام اللہ میں منقول ہے تو اس سے یہ لازم نہیں کہ سورۃ مریم میں بھی اس دُعا سے اولاد ہی مطلوب ہو۔ اس لیے کہ مکرر یہ دُعا کا اتفاق ہوا۔

سورۃ مریم میں جس دُعا کا ذکر ہے اس دُعا کے وقت تک بسبب اس کے کہ اولاد کی طرف سے مایوس تھے، جانشین ہی کی تمنا ہو، مگر کچھ تو اس سبب سے کہ مایوس کو اسی چیز کی تمنا ہوتی ہے جس کی طرف سے مایوس ہو۔ نہیں تو مایوس ہی کیوں ہو، خداوند کریم ارحم الراحمین قاضی الحاجات مجیب الدعوات نے بوجہ خاطر داری حضرت زکریا علیہ السلام ساری تمنا پوری کر دی۔ کچھ اس وجہ سے مد نظر

رحمت و قدرت خداوندی عطائے فرزند ہوا ہو کہ اس دُعا کے بعد قبل قبولیت جب حضرت مریم علیہا السلام کو دیکھا ہو کہ بے موسم میوے خداوند کریم اُن کو پہنچاتا ہے تو ان کو بھی اُمید ہوئی ہو کہ مجھے بھی بے موسم فرزند عنایت ہو جائے تو ایسے رحم الراحمین قدر کی رحمت اور قدرت سے کیا بعید ہے؟ اس لیے اس وقت خاص فرزند ہی کی دُعا کی ہو اور خداوند مجیب الدعوات نے قبول فرمائی ہو۔ بہر حال مکرر دُعا کا اتفاق ہوا ہو۔ اول (بسبب نہ ہونے سامان تولد کے) فقط جانشین ہی کی دُعا کی ہو۔ بعد میں یوں سمجھ کر کہ سامان کی خدا کو ضرورت نہیں اس بات کی دُعا کی ہو کہ جانشین بھی ملے تو فرزند ہی ملے۔

لیکن جس آیت میں کلام ہے اُس آیت میں ہم تسلیم نہیں کرتے کہ دُعا فرزند ہی اس میں مقصود ہے اور بایں ہمہ جس جگہ لفظ ذریت ہے وہاں بھی اگر اولاد معنوی یعنی خلیفہ راشد اور مرید کامل اور شاگرد رشید مراد ہو تو کیا قباحت ہے؟ آخر شاگردوں اور مریدوں کو فرزند بول ہی دیا کرتے ہیں اور فرزند ناخلف کو کہا کرتے ہیں کہ یہ ہمارا بیٹا نہیں بلکہ خود خداوند کریم نے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کو بوجہ ناخلفی یوں کہا کہ یہ تمہارا بیٹا نہیں اور وجہ ایسی بیان فرمائی یعنی بد اطوار ہونا جس سے یوں معلوم ہو جائے کہ جو نیک اطوار ہیں سو وہ سب بمنزلہ برادر اور فرزند ہیں بلکہ سورہ ہود میں جو حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ مذکور ہے تو اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ سب معجبان نوح علیہ السلام کو اہل نوح فرمایا جس سے ایک دفعہ تو یوں سمجھ میں آئی کہ حضرت نوح علیہ السلام کے کنبہ کے لوگ مراد ہیں۔ اس لیے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو یہ حکم ہوا تھا کہ جب طوفان کی آمد ہو تو تم کشتی میں سب قسم کے جانوروں میں سے ایک ایک جوڑا چلے جاؤ اور اپنے اہل کو چلے جاؤ۔

اب ظاہر ہے کہ جانوروں کے اور اہل و عیال کے چلے جانے کو تو فرمایا اور سوا ان کے اور مسلمانوں کے چلے جانے کو نہ فرمایا اور یہ سب جانتے ہیں کہ خداوند کریم سے من جملہ محالات ہے کہ جانوروں کے بچاؤ کی تدبیر تو کی جائے اور مسلمانوں کے بچاؤ کا سامان نہ کیا جائے۔ اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ سب مسلمانوں کو اہل و عیال نوح علیہ السلام ہی میں شمار کر لیا ہے۔ القصہ جب قبیح اور مرید داخل اہل و عیال ہوئے اور فرزند ناخلف اہل و عیال سے خارج ہوئے تو ہونے کے ذریت سے مرید اور قبیح ہی مراد ہو۔ چنانچہ عربیت کے محاورات میں اپنے زمرہ کے لوگوں کو آل اور ذریت کہہ دیا کرتے ہیں مگر انصاف یوں ہی ہے کہ سورہ آل عمران میں جو دُعا ذکر کیا علیہ السلام میں لفظ ”ذُرِّیَّة“ واقع ہے تو وہاں اولاد ہی مراد ہے پر اُس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سورہ مریم میں بھی لفظ دلی سے اولاد ہی مراد ہو۔ ہاں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ سوائے ایک ہار کے اس ہاب

میں حضرت زکریا علیہ السلام نے دُعا ہی نہیں کی تو البتہ ٹھکانے کی بات ہے۔

پرمخارۃ الفاظ یعنی یہاں اور الفاظ کا ہونا اور وہاں اور اس بات پر شاہد ہے کہ چند بار دُعا کا اتفاق ہوا۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ ولی کو فرزند پر معمول کیجئے۔ البتہ اگر بچہ فرزند کے مراد لینے کے معنی صحیح نہ ہو سکیں تو ایک بات بھی ہے لیکن یہاں تو معاملہ بالعکس ہے۔ فرزند کے مراد لینے میں سخت معنی زائل ہو جائے تو عجب نہیں۔ چنانچہ مرقوم ہو چکا کہ جملہ ”کانت افراہی غافراً ط ۳“ طرف مشیر ہے اور اگر یوں کہتے کہ اس سیاق سے حضرت زکریا علیہ السلام کی یہ غرض تھی کہ وجہ دُعا معلوم ہو جائے اور اس بات کی باز پرس کا اندیشہ نہ رہے کہ اولاد موجب قنہ ہے۔ اس جلالت قدر پر کیا مناسب تھا کہ ایسی تمنائے نازیبا کو زبان پر لائے۔ دوم جملہ ”کانت امرتی عافراً“ سے شل جملہ ”وَاضْغَلَّ الرَّاسُ خَيْطاً ط“ جو اپنے بڑھاپے پر بھی دلالت کرتا ہے، اپنا بجز اور بے سر و سامانی ثابت ہو جائے تاکہ باعث جوش رحمت اور موجب حرکت قدرت ہو، نہ یہ کہ بوجہ بے سر و سامانی قطع اُمید مقصود ہے تو قطع نظر اس کے کہ ہم نے جو معنی بیان کیے ان معنی سے عمدہ نہیں تو کم تو کسی طرح نہیں اور ہم کو ”لانسلم“ کہنے کی اس سبب سے بھر بھی گنجائش ہے۔ اس سے تو بات ہاری ہی نہیں کہ ولی بمعنی فرزند تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر چاہاں کا مصداق فرزند ہی کیوں نہ ہو۔

غرض بہر حال یہ لفظ بمعنی ولی عہد اور جانشین ہے اور جب بمعنی ولی عہد اور جانشین ہوا تو وراثت سے وہی وراثت مقصود ہوگی جو ولی عہد اور جانشین کو سزاوار ہے تاکہ قطع ولی کے اختیار کرنے کا بھی فائدہ معلوم ہو اور وہ ظاہر ہے کہ یہی وراثت منصب و وراثت علم ہے نہ وراثت مالی بطور معروف۔ جیسے بدلائل و قرائن مرقوم بالا آیت ”لَهَبَ لِي الْبَخْ“ میں وراثت مالی کا مراد نہ ہونا معلوم ہو چکا تھا۔ اب شہادت روایت کلینی و قرائن مذکورہ یہ بھی تحقق ہو گیا کہ وراثت علمی اور وراثت منصب ہی مقصود ہے اور وہ خطبان جو دربارہ مخالف ہر دو آیت مشار الیہا و حدیث ”ما ترکناہ صدقۃ“ ظاہر بیان حدیث و کلام اللہ کے دل میں کلکتا تھا بخ و بنیاد سے اُکڑ گیا اور بہر نفع اطمینان کامل ہو گیا کہ حدیث مذکور کسی آیت کے مخالف ہی نہیں جو اس وجہ سے اُس کو غلط کہا جائے اور دشمنان صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بات بنے۔ گو در صورت غلط ہونے حدیث مذکور کے بھی شیعوں کا اہل سنت پر کچھ دباؤ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بحوالہ اشارہ آیت ”یوصیکم اللہ“ اور ہدایت آیت ”ما لاء اللہ“ مرقوم ہو چکا بلکہ اُلئے شیعوں کو اپنے دن نظر آئے کہ اس حدیث کے مصداق ان کی حدیثیں بھی نکلیں۔

حدیث لا نُؤَدِّثُ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کیلئے متواتر سے بھی بڑھ کر تھی

اور نیز اب اس کی کسی طرح حاجت نہیں کہ جیسے اس حدیث کا مخالف نہ ہونا ثابت ہو گیا۔ ویسے ہی (قطع نظر مخالف ہونے کے) فی حد ذاته اس کا صحیح ہونا بھی صحیح ہو جائے۔ مگر بنظر اثبات و اظہار صدق صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کچھ اس بات میں بھی رقم طرازی ضروری ہے اس لیے اول تو یہ معروض ہے کہ اس جگہ یہ عذر ہی بیجا ہے کہ اس حدیث کا راوی ایک ہی شخص ہے کیونکہ یہ بات تو وہاں دیکھی جاتی ہے کہ جہاں خود نہ سنا ہو اور در صورت یہ کہ کوئی شخص اپنے کانوں سے کوئی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن لے تو اس کے لیے وہ ایک اپنا سننا لاکھوں کی خبر دینے سے زیادہ ہوگا کیونکہ راویوں کی کثرت کی جو روایات میں ضرورت ہوتی ہے تو اس لیے ہوتی ہے کہ جھوٹ ہونے کا وہم جاتا رہے اور جب اپنے کانوں سے سن لیا تو پھر جھوٹ کا احتمال ہی نہیں رہتا جو اس کے دفع دفع کی ضرورت ہو۔

بلکہ لاکھوں کے بیان سے گویقین حاصل ہو جائے۔ پر ایسی تسلی اور اس قدر اطمینان نہیں ہوتا جس قدر دیکھنے سے ہوتا ہے۔ کلکتہ، دلی، لندن، مکہ مدینہ کے ہونے میں گو ہمیں اس وجہ سے شبہ نہیں کہ ہزاروں لاکھوں بیان کرتے ہیں لیکن دیکھنے میں جو بات ہے وہ سننے میں نہیں۔ اس لیے مثل مشہور ہے کہ..... ع..... شنیدہ کے بود مانند دیدہ

جب دیکھنے کی چیزوں میں یہ حال ہے کہ اوروں کا کہا اگرچہ لکھو لکھا کیوں نہ ہوں۔ اپنے دیکھنے کے برابر نہیں تو سننے کی باتوں میں بھی سہی سمجھنا چاہیے کہ اوروں کی خبر اور روایت اگرچہ لکھو لکھا کیوں نہ ہوں۔ اپنے کان کے سننے کے برابر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اظہار من القس ہے، پھر جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے کان سے ایک حکم سن چکے ہوں تو ان پر یہ اعتراض کرنا کہ جس روایت پر انہوں نے عمل کیا بجز ان کے اس کا اور کوئی راوی نہیں۔ علماء شیعہ کی کمال سلامت عقل اور خوبی فہم پر دلالت کرتا ہے۔ اتنی بات تو ہر ادنیٰ اعلیٰ جانتا ہے کہ حدیث نبوی اُس شخص کے حق میں جس نے بلا واسطہ اپنے آپ سنی ہو یقین بلکہ عین یقین ہے۔ اُس کو اس حدیث پر عمل کرنا واجب ہے کسی دوسرے سے سنے یا نہ سنے۔

روایت کے درجات ان کیلئے ہیں جنہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع و روایت حاصل نہیں

اس لیے اجماع اُصولیین شیعہ و سنی اس بات پر ہے کہ خبر کا متواتر اور غیر متواتر اور واحد اور

مشہور وغیرہ ہونا بہ نسبت انہیں لوگوں کے ہے جنہوں نے نبی کو نہ دیکھا نہ اپنے آپ ان کی بات سنی بلکہ ادوروں کے واسطے سے ان کی باتیں سنیں نہ کہ ان کے حق میں جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چشم خود دیکھا اور بگوشت خود ان کے کلام سنے۔ ایسے لوگوں کے حق میں جنہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بات اپنے کانوں سن لی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات حدیث متواتر سے بڑھ کر ہے۔ سو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے سننے کے موافق آپؐ مل کیا تھا کسی دوسرے کی گردن پر تو چھری نہیں رکھی۔ غرض یہ اعتراض تو بہر حال بے جا۔ ہاں بجا اعتقادی کی وجہ سے ان کی بات کا اعتبار نہ کرو تو یہ دوسری بات ہے۔ اس کو اس اعتراض سے کیا علاقہ۔

روایت لا نورث کے راوی دس بارہ صحابی ہیں

مع هذا يحكم "كَلِمُوا النَّاسَ عَلَى قُلُوبِ غُفُولِهِمْ" ہم بھی اُسی راہ چلتے ہیں جس راہ شیعوں چلیں۔ اگر راویوں کی کثرت ہی سے حدیث صحیح ہوتی ہے، اپنے سننے سے نہیں ہوتی تو سننے جیسے روایات کے غلط ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ اس کے راوی کذاب و مغتری ہوں۔ دوسرے یہ کہ اس کے معنی مخالف عقل یا معارض نقل صحیح ہوں۔ ایسے ہی صحت روایات کی بھی دو ہی صورتیں سمجھنی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے راوی صادق ثقہ و عدا ہوں۔ دوسرے یہ کہ قرآن یا احادیث صحیحہ کے معنیوں کی سدید ہوں اور عقل اس کے مدلول کے مساعد ہو۔ علیٰ ہذا القیاس جیسے راویوں کی قلت اور روایات صحیحہ کی مخالفت سے بقدر مخالفت اعتبار کی بھی قلت ہوتی ہے۔ چنانچہ سب جاننے ہیں ایسے ہی کثرت رواۃ و ناقلان اخبار اور موافقت اخبار و روایات صحیحہ سے بقدر موافقت اعتبار کو بھی ترقی اور زیادتی ہوتی ہے اس لیے دونوں قسم کے وجوہ صحت اور دونوں قسم کے وجوہ اعتبار کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

راویوں کی کثرت کا تو یہ حال ہے کہ ایک ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی اس کے راوی نہیں کوئی دس بارہ راوی ہیں اور وہ بھی ایسے ایسے کہ ان کے ثانی آسمان و زمین نے بھی کتر دیکھے سنے ہوں گے اور یہ جو علماء شیعہ فرماتے ہیں اور مولوی عمار علی صاحب بھی اُسے ہی گاتے ہیں کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو فدک سے فقط ایسی روایت کو سنا کہ جواب بتلایا کہ اس کا راوی ایک آدمی کے سوا یعنی اپنے آپ کے اور کوئی نہ تھا۔ دروغ محض اور سراسر بہتان ہے۔ اس لیے کہ اہل سنت کی کتابوں میں یہ حدیث بروایت زبیر بن العوام و حذیفہ بن الیمان و ابو درداء و ابو ہریرہ و عباس و علی و عثمان و عبدالرحمن بن عوف، و سعد بن ابی وقاص و عائشہ ام المؤمنین و عمر بن الخطاب و ابو بکر صدیق رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین صحیح و ثابت ہوئی ہے۔

اہل شیعہ کے نزدیک حضرت علی اور حذیفہ کا اعتبار لازمی ہے

اگر حضرت عائشہ اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا اس باب میں شیعوں کو اعتبار نہ تھا تو حضرت علی اور حضرت حذیفہ وغیرہم رضی اللہ عنہما نے کیا تقصیر کی ہے؟ جو ان کا بھی اعتبار جاتا رہا مگر شیعوں کے نزدیک اس سے زیادہ اور کیا خطا ہوگی کہ حق کہہ گزرے اور وہ بھی ایسے مقدمہ میں کہ جس میں کہنے سے مدعیان محبت شیعہ سراپا عداوت کی بات پھسکی پڑی ہے مگر بنظر خیر خواہی شیعہ ہاتھ آیت ”کَلَامُ هَؤُلَاءِ“ علماء شیعہ کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ سینوں کی بد فہمی کے لیے اپنی ناک اپنے ہاتھ سے کیوں کاٹتے ہو۔ یہ بھی خبر ہے کہ مصوم کے قول کے نہ ماننے سے شیعہ بھی شیعہ نہیں رہتا بزم خود کا فر ہو جاتا ہے۔ در صورت یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اس روایت میں نام آگیا، پھر تو جی چاہے یا نہ چاہے ماننا ہی چاہیے۔

علیٰ ہذا القیاس حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی بات سمجھئے کیونکہ اگر وہ مصوم نہ تھے تو درہاب روایت مصوم ہی تھے۔ اس لیے کہ ملا عبد اللہ شہیدی نے اظہار الحق میں انہیں حضرت حذیفہ کے حق میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بیان فرمائی ہے ”مَا خَدَّكُمْ بِهِ خَدِيقَةُ فَصْلٍ قُوْهُ“ یعنی جو کچھ حذیفہ تم سے کہا کرے اُسے سچ ہی سمجھو اور سچ ہی کہو۔

بخاری شریف میں حدیث لا نورث بروایت حضرت امیر

اور اگر کسی کو یہ تامل ہو کہ اور ہوں تو ہوں حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے راوی نہ ہوں گے تو اپنی تصدیق کے لیے اصح الکتاب الملت من سنت سے وہ حدیث ناظرین کے پیش نظر کرتا ہوں جس سے بالخصوص حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بہ نسبت اس حدیث کے راوی ہونا ثابت ہو جائے۔

اخرج البخاری عن مالک بن اوس بن الحدثان النصری ان عمر بن الخطاب قال بمحض من الصحابة فيهم علي والعباس وعثمان وعبد الرحمن بن عوف وزهير بن العوام وسعد بن ابی وقاص اتشدكم بالله الیٰی باذیه تقوم السماء والارض تعلمون ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لا نورث ما تركناه صدقة قالوا اللهم نعم ثم اقبل على علي والعباس فقال اتشدكم كما بالله هل تعلمان ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ذلك قالوا اللهم نعم.

”حاصل یہ ہے کہ امام بخاری نے مالک بن اوس بن الحدثان النصری کے واسطے سے روایت

کیا ہے کہ تحقیق حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے صحابہ کے مجمع میں جس میں حضرت علی اور حضرت عباس اور حضرت عثمان اور عبدالرحمن بن عوف اور حضرت زبیر بن العوام اور حضرت سعد بن ابی وقاص بھی تھے یوں فرمایا کہ میں تمہیں اس خدا کی قسم دیتا ہوں اور اس خدا کو یاد دلا کر پوچھتا ہوں جس کے حکم سے آسمان و زمین قائم ہیں، کیا تم اس بات کو جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ارشاد فرمایا تھا کہ ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا، جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدق ہے، اُن سب نے کہا ہم خدا کے روبرو کہتے ہیں کہ ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے، پھر حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہم کی طرف متوجہ ہوئے اور یہ کہا کہ میں تم دونوں کو خدا کی قسم دیتا ہوں اور خدا کو یاد دلا کر پوچھتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی ہے؟ اُن دونوں صاحبوں نے فرمایا کہ ہم خدا کے روبرو کہتے ہیں کہ ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے۔ فقط“

القصة اس روایت سے صاف معلوم ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور وہ بھی یوں نہیں تقسم روایت کیا ہے۔ سو اگر اس روایت کی تسلیم میں یہ عذر تھا کہ اس حدیث کے ایک ہی راوی ہیں خود ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور جس حدیث کا کل ایک ہی راوی ہو اور اس پر کلام اللہ کی بھی مخالفت ہو تو اس پر عمل کرنا ہرگز درست نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کلام اللہ کو چھوڑ کر ایک اپنی ہی روایت پر عمل کیا تو قطع نظر اس کے کہ جہاں علماء شیعہ مخالفت سمجھتے ہیں وہاں مخالفت نہیں موافقت ہے۔ فقط اپنی سمجھ کا قصور ہے۔ چنانچہ ظاہر ہو چکا اور پھر قطع نظر اس سے کہ یہ ایک کی روایت اور زیادہ کی روایت کا فرق وہاں ہے جہاں اس روایت کو مروی عنہ سے اپنے کانوں سے نہ سنا ہو اور در صورت یہ کہ اپنے کانوں سے سن لیا ہو، تو گو یہ سننے والا ایک ہی ہو پر لاکھوں کے بیان سے زیادہ ہے۔

بفضلہ تعالیٰ یہ عذر بھی مرتفع ہو گیا کیونکہ اس روایت کے اس قدر راوی ہیں کہ کثر روایات کے اس قدر راوی ہوں گے اور پھر ان میں بھی اکثر وہ لوگ جو مبشر الجہیز ہیں اور پھر ان میں سے بھی ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ تو ایسے ہیں کہ اُن اکیلوں کی روایت لاکھوں کے برابر ہے، خصوصاً شیعوں کے نزدیک کہ اُن کے نزدیک اُن کی روایت کا غلط ہونا محال ہے۔ چہ جائیکہ موکد بالقسم ہو۔

بہر حال شیعوں کے طور پر تو اس روایت کی صحت اور اس روایت کا اعتبار کلام اللہ کی صحت اور اعتبار سے کم نہیں، پھر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کب ہو سکے ہے کہ ایسی روایت پر عمل نہ کریں؟

اور اس کا اعتبار نہ کریں اور اہل سنت کے طور پر خود ظاہر ہی ہے کہ اس کے سب راوی بڑے بڑے جلیل القدر صحابی ہیں۔ ایک کا کہنا بھی ہزاروں کے کہنے کے برابر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ روایت بھی اس درجہ کی صحیح اور معتبر ہے کہ قطعیت میں کلام اللہ کی برابری کرتی ہے۔

کیونکہ یہ جماعت کی جماعت جس کا مذکور ہوا قطع نظر اس کے کہ ایک جماعت کثیر ہے۔ ان میں ایک ایک ایسا ہے کہ اس کا کہا مفید یقین اور خبر متواتر کی برابری کرتا ہے۔ چہ جائیکہ جس کے مجموعہ کو لحاظ کیجئے۔ القصہ بوجہ کثرت رواد و صدق و دیانت راویان تو صحت و اعتبار حدیث ”ما ترکناہ صدقہ“ کا یہ حال ہے کہ اول تو اس روایت کے اس قدر راوی ہیں کہ کثر روایات کے اس قدر راوی ہوں گے اور پھر وہ بھی ایسے ایسے جلیل القدر صحابی اور اگر بوجہ موافقت آیات و احادیث دیکھئے تو آیات کا تو یہ حال ہے کہ خود آیت ”یوصیکم اللہ“ ہی جس کی مخالفت کے بھروسے علما ہائے شیعہ بہت کودتے تھے۔ اس کے موافق ہے مخالف نہیں۔ چنانچہ اس طرح سے مرقوم ہو چکا کہ ناظرین کو ان شاء اللہ شبہ نہ رہے گا۔

احادیث و آیات میں کوئی مخالف نہیں بے عقلی سے کہیں وہم ہو جاتا ہے اور اگر کسی کو اس پر بھی مخالفت معلوم ہوگی تو ایسے عقل کے اندھوں سے یہ ڈر ہے کہ جن احادیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر زکوٰۃ اور صدقات کا حرام ہونا ثابت ہوتا ہے ان احادیث کو بدرجہ اولیٰ آیت ”انما الصدقات للفقراء والمساکین“ کے مخالف سمجھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس بات کا طعن کرنے لگیں کہ (نعوذ باللہ) خلاف کلام اللہ عمل کیا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فخر و قافہ مشہور و معروف ہے اور تنہا یہ دُعا کرنا کہ الہی مجھ کو جیتے جی اور مرتے دم تک مسکین ہی رکھ اور قیامت کو زمرۃ مساکین ہی میں اُٹھائیو۔ سب کو معلوم ہے اور جب آپ فقیر و مسکین بلکہ فخر الفقراء و المساکین ہوئے تو آپ کو زکوٰۃ و صدقات کا لینا بدرجہ اولیٰ درست ہوا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آیت ”انما الصدقات“ میں کوئی اشارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تخصیص کا نہیں پایا جاتا، بخلاف آیت ”یوصیکم اللہ“ کے کہ اس میں خطاب کا اُمت کے ساتھ مخصوص ہونا جو بقرینہ غیبت صیغہ یوصی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ مرقوم ہو چکا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم سے مخصوص ہونے پر شاہد کامل ہے۔

اور جب باتفاق فریقین وہ احادیث جو زکوٰۃ و صدقات کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حرام ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ آیت ”انما الصدقات“ کی مخالف نہ ہوئیں بلکہ موافق ہوئیں تو

حدیث ”ما ترکناہ صدقۃ“ بدرجہ اولیٰ موافق ہوگی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم میراث سے مخصوص ہونا سیاق سورۃ ائمنی شروع سورت سے تو معلوم ہوتا ہی تھا، چنانچہ مرقوم ہو چکا ہے۔ خود آیت ”یوصیکم اللہ“ سے بھی مفہوم و معلوم ہوتا ہے۔ بخلاف آیت ”انما الصدقات“ کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُس کے حکم سے مخصوص ہونا اگر معلوم ہو تو جھگڑ ”ومنہم من یلمزک فی الصدقات سے جو انما الصدقات“ سے بفاصلہ چند آیت مقدم ہے معلوم ہو کیونکہ ما حاصل اس کا یہ ہے ”کہ بعض منافقین میں سے وہ لوگ ہیں کہ اے پیغمبر تجھ پر زکوٰۃ بانٹنے میں طعن کرتے ہیں، اگر انہیں بھی مل جائے تو راضی ہو جائیں اور نہ ملے تو غصہ میں بھر جائیں۔“ سو اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب تقسیم زکوٰۃ تھا۔ پھر جو ”انما الصدقات“ فرمایا تو معلوم ہوا کہ یہ حق فقراء و مساکین ہے۔ منافقین کے باپ کا اس میں اجارہ نہیں۔

القصہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب تقسیم اور فقراء اور مساکین کے مصرف ہونے اور منافقین کے مستحق نہ ہونے کو لحاظ کیا جائے تو یوں سمجھ میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حکم سے خارج ہیں اور یہ ایسی بات ہے کہ کوئی شخص کسی مسکین کو کچھ دے کر یوں کہے کہ اس کو مساکین پر تقسیم کر دینا اغنیاء کو نہ دینا تو گو وہ مسکین بھی جس کو وکیل تقسیم کیا ہے مسکین ہے لیکن بحکم شہادت فہم عرف وہ شخص اس حکم سے خارج ہے اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ آیت ”واعلموا انما غنمتم من شیء“ میں اور آیت ما الاء اللہ میں ”للمرسل شمول کہنے کی ضرورت ہوئی۔ القصہ آیت ”انما الصدقات“ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص ہونا نقطہ ایک آیت ”ومنہم من یلمزک فی الصدقات“ سے جو جملہ متفصل اور قرینہ خارجی ہے بدقت اور جھگڑ سمجھ میں آتا ہے اور آیت ”یوصیکم اللہ“ سے آپ کا مخصوص ہونا بے تکلف قرینہ داخلی خارجی دونوں سے سمجھ میں آتا ہے۔

تو اگر وہ احادیث جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر زکوٰۃ کا حرام ہونا ثابت ہوتا ہے آیت ”انما الصدقات“ کے مخالف نہیں موافق ہیں تو حدیث ”ما ترکناہ صدقۃ“ آیت ”یوصیکم اللہ“ سے زیادہ تر موافق ہوگی۔ علیٰ ہذا القیاس آیت ”وورث سلیمان داؤد“ اور آیت ”لہب لی من لدنک“ سے بھی حدیث ”لا نورث ما ترکناہ صدقۃ“ مخالف نہیں موافق ہے کیوں کہ ان آیات میں میراث علمی اور میراث منہی مراد ہے، میراث مالی مراد نہیں۔ چنانچہ بدلائل واضح واضح ہو گیا اور حدیث ”ما ترکناہ صدقۃ“ میں میراث مالی مراد ہے میراث

ملی مراد نہیں۔ ہاتی رعی احادیث سے موافقت۔ اس کا حال یہ ہے کہ اہل ملت کے نزدیک ہے حدیث "ما تر کناہ صلیۃ" اس درجہ کو صحیح ہے کہ اس کی صحت کے دریاہت کرنے کے لیے کسی اور حدیث صحیح کی موافقت کی ضرورت نہیں بلکہ اور حدیثوں کے صحت کی میزان اور معیار اس کو کہنے تو زیبا ہے۔ ہاں ہم یہی حدیث کئی طریقوں سے یعنی سندوں سے مروی ہے اور وہ سب کی سب صحیح ہیں اور یہی معنی ہیں احادیث صحیحہ کے موافق ہونے کے۔

کیونکہ حدیث کی صحت باعتبار سند صحت کے ہوتی ہے اور حدیث کا تعدد باعتبار تعدد سند کے ہوتا ہے۔ اگر متن یعنی ایک عبارت کئی سندوں سے مروی ہو تو اس حدیث کو پھر ایک حدیث نہیں کہتے ہیں۔ اُس کی تعداد بمقدار تعدد اسانید ہوگی اور جب وہ ایک حدیث نہ ہوگی بلکہ متعدد ہوں تو بایں وجہ کہ متن ایک ہے ایک دوسرے کے موافق ہوگی اور چونکہ حدیث "ما تر کناہ صلیۃ" یہی حال ہے بلکہ بعض بعض الفاظ متن میں بھی فرق ہے گو معنی باہم موافق ہی ہوں تو چونکہ ان کو ایسی چند حدیثیں کہیں گے کہ ایک دوسرے کے موافق ہیں اور پھر جب سب سندیں صحیح ہوں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث احادیث صحیحہ اہل ملت کے موافق ہے۔

روایات شیعہ سے لائورٹ کی تائید

مگر اس سے کام نہیں چلتا کیونکہ اس کی صحت میں اگر شک ہو تو شیعوں کو ہو۔ اس لیے لازم یوں ہے کہ احادیث صحیحہ اور روایات مجبرہ شیعہ اس کی صحت پر شاہد لائیے۔ لہذا معروض خدمت علمائے شیعہ بلکہ عوام و خواص امامیہ یہ عرض ہے کہ فرقہ امامیہ اثنا عشریہ کے نزدیک کتاب کافی کلینی سے بڑھ کر کتب احادیث میں کوئی کتاب مجبر نہیں۔ سو وہ علامہ کلینی ہی کی روایت تھی جو بروایت ابو الحسن علی امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا یہ قول منقول ہوا ہے:

إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ وَفِيكَ إِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَدِّتُوا وَلَئِنْ نُسَخِبَتْ لَمْ يَرَوْا بِوَحْمَا وَلَا بِنَارًا وَأَتَمَّا أَوْدُوا أَخَابِيَتُ مِنْ أَخَابِيَتِهِمْ فَمَنْ أَخَذَ بِشَيْءٍ مِنْهَا فَقَدْ أَخَذَ بِحَبْطٍ وَفَلَرُ۔ اور چونکہ ترجمہ اس کا مرقوم ہو چکا ہے تو مکرر ترجمہ کے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ پر اتنا لکھنا ضروری ہے کہ اس روایت میں جسے روایت صدیق کے کوئی بات کم نہیں بلکہ اتنی بات زیادہ ہے کہ اس روایت میں حضرت امام ہمام امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے بنظر بدگمانی شیعہ اس کی وجہ بھی بیان فرمادی ہے کہ انبیاء کے علم کے توارث ہوتے ہیں اور ان کے مال کا کوئی وارث نہیں۔ سو در صورت یہ کہ نسخہ "لَمْ يَرَوْا" صحیح ہو تب تو مطلب ظاہر ہے کیونکہ حاصل یہ ہوگا کہ انبیاء

کے جو فقہ علماء ہی وارث ہیں کوئی ان کے اموال حر و مکہ کا وارث نہیں ہوتا تو وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بھی تو کسی سے کچھ دہم و دینار میراث میں نہیں لیا اور اگر لے لیں "لَمْ يَخْذُوا مِنْهُ مَالًا" یہ ہو گا کہ علماء کے وارث الانبیاء ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء نے دہم و دینار کچھ چھوڑا ہی نہیں تھا اس میں میراث جاری ہو۔ انہوں نے فقط احادیث میراث میں چھوڑی ہیں۔ باقی ربانہ و غیرہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک میں ہی نہ تھا جو یوں کہنے کہ مذکورہ چھوڑ کر آپ اس جہان سے تشریف لے گئے۔ چنانچہ شہادت آیت ما الاء اللہ المتولیٰ مدون ہو چکا ہے۔

وصال کے وقت کوئی چیز آپ کی ملکیت نہ تھی

اور سوائے اُس کے اور اشیاء مثل لباس مرکب مکان کے، سونے کا آپ کے پاس خطہ حجر بائے ازواج مطہرات تھے۔ سو بگو اسی کلام اللہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ملک ازواج ہو چکے تھے اس لیے کہ خداوند کریم یوں ارشاد فرماتا ہے "وَقَوْلُنِ لِّیْ یٰۤاٰیُّوْکُنْ" یعنی اے پیغمبر کی بی بی اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور یوں نہیں فرمایا "وَقَوْلُنِ لِّیْ یٰۤاٰیُّوْکُنْ" یعنی نبی کے گھروں میں ٹھہری رہو تو معلوم ہوا کہ وہ حجرے ازواج کے ہو چکے تھے۔ یہ وہ ملک ازواج ہوئے ہوں یا اور کسی وجہ سے اور یہ احتمال کہ سکونت کے گھر کو تمام عالم رہنے والوں کا گھر کہا کرتے ہیں۔ اگرچہ مالک اس کا کوئی اور ہو۔ ادھر کرایہ کے مکان کو بھی اپنا کہا کرتے ہیں قطع نظر اس کے کہ یہ مجاز ہو اور بے ضرورت مجازی معنی مراد لینے کی اجازت نہیں اور پھر اس سے قطع نظر کیجئے کہ خدا کو کیا ضرورت ہوئی کہ "فی بیوت النبی" سے فرمایا؟ اور یہ فرمایا جو شیعوں کے لیے اور موجب دشواری بے لگام کی بات غلط ہو جائے گی ہم کو تو ان معنی کی اپنے طوع پر ضرورت نہیں کیونکہ تاحین حیات ملک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے تو تکلم حدیث لا نورث الخ وہ صدق ہو گئے۔ پھر ازواج کے تصرف میں ایسے تھے جیسے آدمی مذکور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے صرف میں آتی تھی ہم کو تو ان معنی کے کہنے میں فقط تصدیق حدیث حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نظر ہے۔

سو اگر آیت "وَقَوْلُنِ لِّیْ یٰۤاٰیُّوْکُنْ" کے وہ معنی نہیں جو ہم نے عرض کیے تو شیعوں ہی کو دشواری ہے، ہمیں کیا غرض؟ مکانات بھی وقت و قات آپ کے نہ تھے۔ ہاں البتہ لباس اور مرکب کے باب میں کھلا باقی رہا مگر قوت ایمان کی بات تو یوں ہے کہ حضرت امام کے اس حصر کو کہ انبیاء نے بجز احادیث کے میراث میں کچھ چھوڑا ہی نہیں، صحیح سمجھ کر ہرگز حامل نہ ہوئے ہوں سمجھئے کہ گو بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشیاء مذکورہ کو دنیا میں چھوڑا لیکن شاید کسی کو اپنے

جیتے جی رہے گئے ہوں اور پھر جوان کے پاس موجود تھیں تو بوجہ عاریت ہوں۔

قصہ اپنی سمجھ میں نہ آنے کے باعث حضرت امام کی بات کی تکذیب نہ کیجئے، ہاں اپنی سمجھ اور عقل کی تعلیل کیجئے لیکن اطمینان قلب مؤمنین کے لیے یہ اشارہ مرقوم ہے کہ ”لَمْ يُوَدُّوا“ کے یہ معنی نہیں کہ آپ دُنیا میں کچھ چھوڑ ہی کر نہیں گئے بلکہ مطلب یہ ہے کہ میراث میں نہیں چھوڑ گئے۔ سو اس صورت میں بجز اس کے نہیں بن پڑتی کہ یہ روایت جس کے راوی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، یعنی حدیث ”لَا نُوَدُّ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةً“ صحیح ہو اور حضرت امام نے بوجہ واقعیت اس وصیت کو حصر کر کے یہ فرمادیا ہو کہ انبیاء نے بجز احادیث کے میراث میں کچھ نہیں چھوڑا۔ بہر حال روایت حضرت امام ہمام امام جعفر صادق روایت حضرت صدیق اکبر سے اس بات میں کہ انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا کچھ کم نہیں بلکہ بہر سبب زیادہ ہے۔ اول تو آپ نے بطور حصر یوں فرمادیا کہ انبیاء نے بجز احادیث میراث کے لیے کچھ چھوڑا ہی نہیں۔

صادق اور صدیق کی روایت کا فرق

حدیث ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ میں یہ بات نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ حضرت امام کے حصر سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ اول تو یہ کہ یا تو انبیاء علیہم السلام نے کچھ چھوڑا ہی نہیں یا چھوڑا ہے تو وہ میراث کے قابل نہیں۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے میراث میں احادیث کو چھوڑا ہے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی روایت سے فقط اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اموال متروکہ انبیاء قابل میراث نہیں۔ مع ہذا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس دعوے کے ساتھ کہ متروکہ انبیاء قابل میراث نہیں کوئی دلیل نہیں اور حضرت امام نے اس کی دلیل بھی فرمادی ہے اور اپنے دعویٰ کو موجبہ کر دیا۔ سو سینوں کی طرف سے تو آپ کو اطمینان ہی تھا۔ اس وجہ کا طرہ جو ساتھ لگایا تو اسی وجہ سے لگایا ہوگا کہ حضرات شیعہ کی طرف سے آپ کی خاطر جمع نہ تھی، ان کے نفاق نے عیاں تھا کہ میری بات سیدھی انگلیوں حضرات شیعہ ماننے والے معلوم نہیں ہوتے اس لیے اپنے دعوے کو موجبہ کر کے بیان فرمادیا تھا۔

لیکن آفرین ہے شیعوں کو کہ حضرت امام کی بات کے نہ ماننے سے گواہان ہی خاک میں رُل گیا مگر کیا امکان جو لہجوں سے باز آجائیں، اپنی وہی مرفی کی ایک ٹانگ گائے جاتے ہیں۔ خیر خداوند کریم ہی ان کو سمجھے کہ نہ یہ پیر کے نہ فقیر کے، نہ اصحاب کے، نہ اماموں کے..... ہاں جملہ جائے شرم ہے کہ جن کی آڑ میں یہ اصحاب کرام رضی اللہ عنہم پر طعن کرتے تھے۔ وہ خود ہم صغیر اصحاب ہیں۔ یہ وہی مثل ہے کہ ”مدھی ست اور گواہ چست“ دوائے بر حال شیعہ کہ اصحاب کو برا کہہ کے تو نور

ایمان ہی کھویا تھا۔ پر آنکہ کی بات نہ ماننے سے ایمان ہی کھودیا کیونکہ بزم شیعہ منکر قول آنکہ کا کافر ہے۔ خصوصاً جب کہ ایسی معتبر کتابوں کے واسطے سے معلوم ہو جائے جن کا نام کافی کلینی، القمہ حدیث ”ما تر کناہ“ بشہادت حدیث کلینی مذکور جو صحیح ہے۔

کلینی کی دوسری موید حدیث

مع ہذا ایک اور حدیث کلینی ہی اس کے موید ہے۔ چنانچہ وہ بھی مرقوم ہو چکی لیکن نظر احتیاط اسے بھی کر رکھے دیتا ہوں۔ ”رَوَى الْكَلْبِيُّ عَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ إِنَّ سُلَيْمَانَ وَدِثَ فَلَوْدَ وَ أَنْ مُخْتَلًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَدِثَ سُلَيْمَانَ“ ترجمہ اس کا مرقوم ہو چکا، اس لیے یہاں اسی قدر مرقوم ہونا مناسب ہے کہ اس سے اتنی بات معلوم ہوئی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی میراث، میراث علم ہے، باقی رہا دلائل عقلیہ اور قرآن عقلیہ سے حدیث مذکور کا صحیح ہونا۔ سو اس کا بیان بھی اوپر ہو چکا ہے مگر بطور یاد دہانی فقط اشارتاً یہ بات مرقوم ہے کہ اول تو انبیاء اپنی قبور میں زندہ موجود ہیں اور زندہ کے مال میں میراث جاری نہیں ہوتی۔ ہاں اگر وہ اشیاء ان کے کارآمد مند ہیں اور اس لیے وہ ان اشیاء کو کسی موقع میں صرف کرنے کو کہیں تو ان کے خدام کو لازم ہے کہ ان اشیاء کو اسی طرف صرف کریں۔ سو در صورت یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو با اتفاق حیات النبی ہیں، گوشہ قبر میں زندہ موجود ہیں۔

اور پھر دلائل بھی اس پر شاہد ہوں۔ چنانچہ اوراق سابقہ میں مذکور ہوئے تو میراث تو آپ کے متروکہ میں جاری نہ ہوگی لیکن آپ کے خلیفہ کے ذمہ جو بمنزلہ کارکن نبوی ہے کیونکہ خلیفہ اُسے ہی کہتے ہیں، یہ بات لازم ہوگی کہ در باب اموال نبوی جو یائے اشارات نبوی رہے، سو چونکہ اشارہ نبوی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جو خلیفہ راشد تھے۔ اس باب میں بایں طور معلوم ہوا کہ ”ما تر کناہ صدقہ“ ہے تو ان کے ذمہ اُس کی تعمیل لازم پڑی اور کوئی ناقدر شناس باوجود دلائل مسطورہ سابقہ حیات نبوی کو نہ مانے تو ان کے لیے دوسری ہدایت عقلی موجود ہے۔ اگر ہدایت پر آنا ان کو منظور ہو، وہ یہ ہے کہ انبیاء خدا کے سامنے اپنے آپ کو مالک ہی نہیں سمجھتے۔ پھر وہ کیونکر نہ کہیں کہ ہمارے متروکہ میں میراث جاری نہیں ہوتی کیوں کہ وہ ہماری ملک ہی نہیں خدا کی ملک ہے، ہمارے پاس فقط مستعار تھا۔ جب ہم ہی نہ رہے تو عاریت کہاں رہی؟ اب لازم یوں ہے کہ جیسے یہ خدا کا مال ہے، خدا ہی کی راہ میں صرف ہونا چاہیے۔

مگر چونکہ یہ بات سابق میں مشروحاً بیان ہو چکی ہے تو یہاں اس قدر بھی بہت ہے۔ علاوہ ازیں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مذکور نہ دینا بوجہ ظلم و عناد ہو یا بوجہ حقانیت مگر چونکہ حضرت

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بھی اس میں سے کچھ نہیں دیا اور علیٰ ہذا القیاس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں اپنی بیٹی حفصہ رضی اللہ عنہا کو بھی نہیں دیا حالانکہ موافق قانون میراث یہ دونوں بیہیاں بھی وارث تھیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سے تھیں، بلکہ ان سب میں معزز اور ممتاز تو معلوم ہوا کہ یہ نہ دنیا محض باتباع امر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھا بوجہ عناد و ظلم و فساد نہ تھا ورنہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی پر ظلم کرتے تو کرتے اپنی بیٹیوں پر نہ کرتے۔

تارک الدنیا اور زاہد، غاصب نہیں ہو سکتا

مع ہذا جو لوگ غضب کرنے والے ہوتے ہیں وہ لوگ بندہ ہواؤ ہوس ہوتے ہیں تارک الدنیا اور زاہد نہیں ہوتے جو لوگوں کے اموال چھین تو لیں پر بوجہ زہد و تقویٰ و ترک دنیا اپنی خواہشات نفسانی کو مار کر بیٹھ رہیں اور اسے ہاتھ نہ لگائیں، پھر جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فدک کو نہ چھوڑا اور اسے ہاتھ نہ لگایا، نہ اپنے خرچ میں لائے، نہ اولاد کو نہ اہل و عیال کو دیا تو کیا وجہ پیش آئی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فدک کا نہ دینا فقط اسی وجہ سے تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے باب میں ایک حکم ناطق بن چکے تھے اور ان سب کو جانے دیجئے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نسبت تو شاید خبیعان فریب باز بنکلم المرء یقیس علی نفسہ فریب کا بھی احتمال کریں؟

ترکہ نبوی میں تمام اہل بیت کا عمل

حضرات آئمہ اور اہل بیت کی طرف تو یہ گمان نہ ہوگا۔ سوان کا حال سنئے کہ حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ سے لے کر آخر تک سب اس بات میں شریک ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ترک جب ان کے ہاتھوں پڑا تو حضرت عباس اور ان کی اولاد کو اس میں دخل نہ دیا، ان سب کو نکال باہر کیا اور ازواج مطہرات کا بھی حصہ نہ دیا حالانکہ نصف ترکہ کے یہ دونوں فریق مالک ہوتے تھے۔ پس اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں میراث جاری ہوتی تھی تو بزرگان اہل بیت کیوں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی راہ ہوئے؟ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اگر مرکب ظلم شنیع اور جور قبیح ہوئے تھے تو چند ان مستبعد نہ تھا لیکن ان بزرگواروں کو جو شیعوں کے نزدیک معصوم اور اہل سنت کے نزدیک محفوظ ہیں، کیا بلا پیش آئی کہ سب کے سب ظلم عظیم کے روادار ہوئے۔

اس لیے کہ باجماع اہل سیر و تواریخ و ہاتفاق علماء حدیث ثابت اور محقق ہے کہ متروک آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم خیر اور فدک وغیرہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے قبضہ میں تھا لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انجام کار حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا قبضہ اٹھا دیا، فقہاء انہیں کا قبضہ رہا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے قبضہ میں رہا، ان کے بعد حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے قبضہ میں رہا۔ بعد ازاں حضرت امام زین العابدین اور حضرت حسن بن حسن کے تحت تصرف رہا۔ دونوں اسے لیتے دیتے رہے، ان کے بعد حضرت زید بن حسن برادر حسن بن حسن کا اس پر تصرف ہو گیا، اس کے بعد مردان کے بنجوں میں پڑ گیا، پھر ہمارے مردانوں کے قبضہ میں رہا۔ یہاں تک کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی بادشاہت کی نوبت آئی چونکہ وہ خلیفہ عادل اور بادشاہ انصاف پرور تھے، انہوں نے کہا جو چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو مانگنے پر بھی نہ دی ہو، میرا اس میں کیوں کر حق ہو سکے اس لیے انہوں (یعنی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ) نے پھر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی کو اس کا متولی کر دیا۔

پس آئمہ معصومین اور بزرگان اہل بیت کے عمل درآمد سے عیاں ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں میراث جاری نہیں ہوتی بلکہ وہ وقف ہوتا ہے اس لیے اولاد آئمہ معصومین نے ان لوگوں کو داخل نہ دیا جو بقانون میراث وارث تھے اور بالیقین تحقق ہو گیا کہ حدیث صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یعنی "لَا نُورِثُ مَا تَرَكَهُ صَلَافٌ" بلا غبار صحیح و درست ہے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو متروکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ دیا ایسا ہے جیسا کہ آئمہ اہل بیت نے ازواج مطہرات اور عم بزرگوار اور بنی عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیا بلکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی جانب دلائل حق پرستی زیادہ تر ہیں کیونکہ آئمہ اہل بیت کی نسبت انواع مطہرات اور بنی عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ دینے میں ظاہر بیان کم فہم کو مثل خوارج یہ بھی شبہ ہو سکتا ہے کہ نفع کی چیز دیکھ کر نہ دیا کیونکہ فدک وغیرہ کو وقف تھا لیکن خرچ اہل بیت مقدم تھا۔ مع ہذا طعن و تفتیح کا بظاہر چنداں اندیشہ نہ تھا کیونکہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے وارثوں کے کچھ غیر نہ تھے، ایسی جگہ چیز کے پھنس جانے اور خرچ ہو جانے کو یونہی کہا کرتے ہیں کہ گھی کہاں گیا کھجڑی میں۔

لیکن ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی جانب نفع کا تو یہ حال ہے کہ قاعدہ کی رو سے ایک حبہ کی توقع نہ تھی کیونکہ نہ وارث ہو سکتے تھے من جملہ مصارف مندرجہ آیت "مَالَاءُ اللّٰهُ" تھے کیوں کہ آپ کچھ مسکین فقیر نہ تھے اور پھر ظاہر میں بھی باتفاق فریقین ایک حبہ تک کا غلبہ اس میں نہیں کیا۔ آئندہ سوائے مردمان لہمیدہ اور عاقلان بنجیدہ کے کسی سے کلمہ خیر کی توقع نہ تھی، بلکہ انا عقل کے

دشمنوں سے یہ اندیشہ تھا کہ یوں کہیں گے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ہوئے ہی یہ آنکھیں بدل لیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا بھی لحاظ نہ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ دبا بیٹھے۔ چنانچہ بلا کم و کاست یہی ظہور میں آیا۔ غرض کہ کسی طرح کی منفعت کی امید تھی۔ اگر تھی تو تمام عمر کی سوختگی کی امید تھی۔

القصد گو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی وارثان نبوی کو متروکہ نبوی بیچہ قبیل ایمان نبوی نہیں دیا اور آئمہ اہل بیت نے بھی بیچہ مذکور متروکہ نبوی، وارثان نبوی کو نہیں دیا لیکن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نہ دینا ایک مجاہدہ عظیم تھا اور آئمہ اہل بیت کا نہ دینا فقط نہ دینا ہی تھا۔ خصوصاً جب کہ ہزار مندی و اخلاص و محبت صدیق اکبر اور حقوق اہل بیت خصوصاً حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو لحاظ کیجئے اور پھر اس پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ایک دفعہ بمقتضائے بشریت ناخوش ہو جانے کو دیکھئے تو رموز شناسان طریقہ پر واضح ہو جائے گا کہ ایسے وقت میں پابند حکم نبوی رہنا ایسے ہی کال الایمان، مستقیم العقل، ہر اپا اجاع نبوی کا کام ہے جیسے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، لیکن شیعوں کی عقل کی آنکھ پھوٹ گئی ہے، حق و باطل کی تمیز کیونکر کریں گے مگر اس میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کیا قصور؟

گر نہ بیند بروز شہرہ چشم چشمہ آفتاب را چہ گناہ

جیسے اندھے کو اندھیرا تو اندھیرا نور بھی اندھیرا ہی نظر آتا ہے، ایسے ہی شیعوں کو بسبب عداوت کے اندھے ہو جانے کے باعث خوبیاں بھی برائیاں ہی نظر آتی ہیں۔

چشم بد اندیش کہ برکنہ باد عیب نماید ہنرش در نظر

الحاصل بقرائن عقلیہ واضح دلالت ہو گیا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا نہ دینا فقط بیجا اجاع امر نبوی تھا اور یہ حدیث معنی ”لَا تُؤَدُّ مَا تَرَكَهُ صَدَقَةٌ“ صحیح بلاغبار ہے۔ سوائے اجاع نبوی اور پیروی حدیث مذکور کی قسم کا احتمال ان کی جانب نہیں ہو سکتا اور ساتھ بجمہت کثرت روایات اور صدق و دیانت جملہ راویان و بجوم قرائن عقلیہ اس حدیث کا اعتبار اور اس کی صحت معلوم ہو چکی تھی تو اب کسی کو دربارہ صحت حدیث مذکور کسی وجہ سے مجال دم زدن باقی نہ رہی۔ اگر کسی کو کچھ حوصلہ ہو تو بسم اللہ، اور یہ بھی تحقیق ہو گیا کہ مولوی عمار علی صاحب کا درباب صحت حدیث مذکور یوں رقم فرمانا کہ:

”اول تو یہ روایت خلاف قرآن ہے۔ دوسرے یہ کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وارثوں میں سے نہ بیٹی سے نہ بیٹی سے نہ کہا کہ میرا مال صدقہ ہے تم کو نہیں پہنچتا تم دعویٰ نہ کرنا اور جو خدا کا حکم ان کے واسطے تھا، اس کو ان سے چھپا رکھا اور ایک اجنبی شخص سے کس کو کسی طرح کا

پل پیغمبر خدا کی وراثت میں نہ تھا، اس کے کان میں کہہ دیا اور کسی دوسرے صحابی سے بھی نہ کہا۔
ایک سخن ابلہ فریب یا گنگوئے ابلہا نہ ہے کیوں کہ جسے وہ خلاف قرآن کہتے ہیں وہ حقیقت
میں موافق قرآن ہے۔ چنانچہ مفصل معلوم ہو چکا پر سمجھ نہ ہو کسی کا کیا قصور؟
مصرع:..... سخن شناس نہ دلبر اخطا انتخابت

اور جہاں وہ یوں کہتے ہیں "کسی دوسرے صحابی سے بھی نہ کہا" وہاں دس بارہ سے تو روایت
موجود ہے، من جملہ رواۃ حضرت علی اور حضرت عباس اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی
ہیں اور خدا جانے اور کتنوں نے سنا ہوگا؟ کہ ان کو روایت کا اتفاق ہی نہ ہوا لیکن مولوی صاحب کو
خبر نہ ہو تو یہ ہمارا ذمہ نہیں کہ انہیں خبر کیوں نہ ہوئی، وہ یونہی بے خبری میں پڑے ہیں یا دیکھ و دانستہ
فریب کرتے ہیں۔ باقی رہا یہ کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وارثوں میں سے کسی سے نہ کہا،
اگر بسبب بے خبری کے لکھا ہے تب تو قابل تنبیہ ہے کہ کسی چیز کی اگر کسی کو خبر نہ ہو تو اس سے یہ
لازم نہیں آتا کہ وہ چیز واقع میں نہ ہو کرے، مولوی صاحب کو موجودات اور واقعات میں سے
کس کس کی خبر ہے۔ خصوصاً موجودات عالم غیب اور واقعات قرون گزشتہ کی ہرگز کچھ اطلاع نہیں،
پر اس وجہ سے کہ وہ معلوم نہیں، غیر واقع نہیں کہلائی جاتیں۔

ہاں مولوی صاحب کے ذہن و ذکاوت سے البتہ امید ہے کہ دم "لَا وَجُودَ إِلَّا مَا خُفِّلَتْ"
بہر انہیں اور نشہ کی ترنگ میں یہ ترانہ زیب زبان و نقش و قرطاس ہوا ہے تو اس کا جواب دکان سے
فروشان پر ملے گا، ہاں اگر حضرت عباس اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا وارث نہ ہوتے تو
یوں بھی کہنا جائز تھا کہ اپنے وارثوں میں سے کسی سے نہ کہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہر چہ وارث
نہ تھے لیکن اول تو وارثوں سے زیادہ مقرب تھے، دوسرے وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے جو
وارث تھیں، وارث تھے یعنی ان کے خبر گیران اور ان کی طرف سے لینے دینے والے ہی تھے۔ سو
بہ نسبت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے سنانے کے ان کا سنا دینا اور ان کا کہنا زیادہ تر مفید تھا،
علاوہ بریں اس قسم کے مضمون جو موت کی خبر دیں اقربا کے حق میں موجب رنج ہوتے ہیں۔ خصوصاً
بہی کہ اس کو بہ نسبت فرزند اور اکثر اور اقربا کے والدین کے ساتھ زیادہ محبت ہوتی ہے، تو اگر
جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم موافق رائے ناقص مولوی عمار علی صاحب حضرت فاطمہ زہرا
رضی اللہ عنہا سے یہ مضمون فرماتے کہ تمہارے لیے حکم خداوندی یوں ہے کہ میری وفات کے بعد
میرے ترکہ میں سے کچھ نہ لینا تو کچھ فائدہ تو ہرگز نہ تھا۔

اس لیے کہ جو کچھ ان کے کہنے سے کام چلتا۔ اس سے زیادہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کہنے سے کام چلتا نظر آتا تھا اور ان سے کہہ دی جاتے تھے مگر چونکہ یہ مضمون عظیم خبر وحشت اثر و طاقت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تھا تو ملت موجب آرزو کی خاطر سہارک حضرت زہرا رضی اللہ عنہا ہوتا۔ سو ایسا کون سا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا آرزو کرنا تو اب تھا یا جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے دشمن تھے کہ بے ہودہ اور بے سبب ان کو سب سے پہلے رنج و غم میں ڈال دیتے۔ آپ خود جانتے تھے کہ اگر بالفرض واقعہ بر میری وفات کے بعد حضرت زہرا رضی اللہ عنہا ہے اطلاع حضرت علی رضی اللہ عنہ ابوبکر صدیق سے، جو آپ کے نزدیک بالکلین علیہ ہولے والے تھے، طالب میراث ہوں گی۔ اول تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دین میں ایسے سبب نہیں کہ کسی کے پاس لحاظ سے حق ہات زہان نہ لائیں اور پھر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا ایسی ناحق پرست نہیں کہ باوجود زہان صدیق صادق سے حدیث نبوی سن لینے کے ہٹ دھرمی کریں اور طلب میراث سے ہار نہ آئیں۔

اور اگر بمقتضائے بشری (جیسے حضرت موسیٰ حضرت ہارون علیہم السلام پر ہے خطا بوجہ غلط فہمی معرض ہوئے تھے اور ان کو قصور وار سمجھا تھا) مقدمہ میراث میں حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر کچھ اعتراض ہوگا؟ اور ان کا یہ مدد رک میں لے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے "لَا تُؤْذِثْ مَا نَزَّ طُغْنَاهُ صَدَقَتْ" بوجہ غلط فہمی جو مرتبہ بشریت کو لادم ہے اور انہما بھی اس سے چھوٹے ہوئے نہیں، پایہ افتہار سے ساقط ہوگا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ موجود ہیں وہ اس حدیث کو سنا دیں گے۔ القصہ مولوی صاحب کا یہ گانا کہ "کسی سے اپنے وارثوں میں سے نہ کہا" سراسر دروغ و بہتان ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ کو یہ حدیث نہ بتائی کیونکہ وہ بزم شیعہ علم غیب جانتی تھیں

اور یہ جو اپنے نزدیک اس نہ کہنے کو خدا کے حکم کا چھپانا سمجھتے ہیں اس کو بجز اس کے کہ دیوانوں کی بکواس کہنے اور کیا کہنے؟ اول تو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے بظاہر چھپانے کی کوئی صورت ہی نہیں، اس لیے کہ وہ آمنہ اہل بیت سے کسی ہات میں کم نہیں، جب آئمہ کو علم ماکان و علم مایکون ہو تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بدرجہ اولیٰ ہوگا کیونکہ ان کا رتبہ اکثر آئمہ سے زیادہ ہے کم نہیں بلکہ یوں کہنے تو دیکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہنے کی حاجت ہی نہ

ایسی، لیکن تو اس سے کہتے ہو کہ معلوم نہ ہو سکے اور اگر ماکان و مایکون میں سے احکام کو مستثنیٰ رکھنے یا حضرت طاہرہ دہرا رضی اللہ عنہا کو دربار کا علم آخرہ سے کم کہنے تو اسے چھپانا نہیں کہتے کہ ایک گروہ میں سے دو چار کو قتل دیا اور ہاتھوں کو نہ قتلایا، سب جانتے ہیں کہ جب بات دو چار کے کانوں میں پڑتی ہے۔ پھر چھپی نہیں رہتی، نقل مشہور ہے۔

ع:..... یہاں کے مانند آں را ازے کز دسازند محفل حا

خاص کر علم دین کی باتیں کیونکہ درباب درس و تدریس و تبلیغ علم و احکام جو کچھ لغائل اور تاکیدیں مقلول ہیں، سب کو معلوم ہیں۔ پھر کیا امکان جو ایسی بات چھپی رہے؟ آخر جو احکام خداوندی نازل ہوتے تھے۔ سرور کائنات علیہ افضل الصلوٰۃ و علی آلہ کون سے خانہ بخانہ ہر ہر فرد بشر کے کان میں کہتے پھرتے تھے؟ یہی ہوتا تھا کہ ایک دو سے آپ نے کہا۔ انہوں نے اوروں سے، اسی طرح آگے پیچھے سب کو خبر ہو جاتی تھی اور اب تک یونہی بتدریج اعضاء کو خبر ہوتی جاتی ہے۔

ہاں اگر آپ سب کو کہہ دیجئے کہ دیکھو خبردار اور کسی کو اطلاع نہ ہو تو الہت یوں کہہ سکتے کہ حکم خداوندی چھپا رکھا۔ طاہرہ بریں مظل کی جو بات تھی وہ آپ کر گزرے، یعنی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے جو کارکن خلافت تھے، یہ بات و افکار لرمادی اور ظاہر ہے کہ دیکھا لہذا دونوں ہی کا کام ہے، دینے والے کا بھی اور لینے والے کا بھی۔ اگر ان میں سے ایک بھی اپنے کام سے ہٹ بیٹھے تو دوسرے سے کیا ہو سکتا ہے، دینے والا اگر دے نہیں تو لینے والا کیوں کر لے اور لینے والا اگر لے نہیں تو دینے والا کس طرح دے۔ پھر لینے دینے والوں میں سے اگر ایک کو بھی روک دے تو جس چیز کا دستور رکھنا منظور ہو وہ دستور ہے گی۔ سولقا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دینے سے روک دینے میں مطلب حاصل تھا، اس لیے حضرت طاہرہ رضی اللہ عنہا سے کہنے کی کچھ ضرورت نہ ہوئی۔

صرف صدیق رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کرنے کی حکمتیں

باقی رہی یہ بات کہ مطلب یوں بھی حاصل ہو سکتا تھا کہ حضرت طاہرہ دہرا رضی اللہ عنہا ہی کو یہ حدیث سنا دیجئے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے یہ بات نہ فرماتے بلکہ حصول مقصود اس صورت میں بوجہ امن ہوتا کیونکہ اتنا جھڑا ہی (جواب ہوا) نہ ہوتا ۱۲ اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی حصول مقصود کی ایک یہ بھی صورت تھی لیکن اس صورت میں جواب ظہور میں آئی یہ مصلحتیں ایسی ساتھ لگی ہوئی تھیں کہ در صورت مرقومہ ہرگز نہ تھیں۔

پہلی حکمت

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ازل تو ایسی صیغہوں کے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے لڑنے میں صحت خلافت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ نہ نظر لھانا کہ حاضرین محلل سمجھ جائیں کہ یہ وصیتیں جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کی جاتی ہیں تو انہیں اپنا جائیں کرنا اپنے مد نظر ہے۔ کسی مصلحت سے بے غرض نہیں لڑتے تو کیا ہوا اور یہ کچھ بڑا ہی اشارہ نہیں، ایسے ایسے بلکہ اس سے بڑھ کر اور بہت سے اشارے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام بلکہ خود کلام ربانی میں پائے جاتے ہیں۔

اور اس سے مولوی عمار علی صاحب کے اس سخن نامعقول کا بھی جواب نکل آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اجنبی شخص سے کہا ہے کہ اس کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت میں کچھ دخل نہ تھا۔ یہ فرمایا کہ ”لا نودث ما توکھا صدقہ“ اور حاصل جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معصوم تھا کہ میرے بعد سررشتہ اختیار صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس لیے جو امور ضرور یہ خلافت قابل وصیت ہیں، وہ انہیں سے کہنے چاہئیں تاکہ اس کے موافق کار بند ہو کر اعداد خلافت کو ہم رنگ نبوت کر دیں، دوسرے ایسی صورت میں فقط لینے والے کو منع کرنے میں یہ بھی اندیشہ ہے کہ مبادا طمع نفسانی حکم خداوندی کو چھپالے، گو بوجہ محفوظیت یا معصومیت حضرت زہرا رضی اللہ عنہا سے اس موقع خاص میں یہ ڈرنہ ہو مگر قواعد کلیہ شرعیہ میں خاص خاص امور کا اعتبار نہیں ہوتا، اسی واسطے اگر کسی قضیہ میں کوئی دلی کامل کہ اس کی ولایت اور صدق و دیانت پر تمام عالم متفق ہو، تنہا ثبوت دعوائے مدعی کی گواہی دے تو گو یہ یقین کامل ہے کہ یہ شخص جھوٹ نہیں بولتا ہرگز قبول نہ ہوگی۔

اور اگر ایسے دو آدمی کہ بظاہر ہمراہی عدالت رکھتے ہوں۔ گو قاضی کے نزدیک بھی وہ دونوں مل کر صدق میں اس ایک کے برابر نہ ہوں، بلا تا مل مقبول ہوگی۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ قواعد کلیہ شرعیہ کو ہاں وجہ کہ جو ان قواعد کے لحاظ سے مقصود ہے کسی خاص موقع میں ان کے لحاظ نہ کرنے میں وہ مقصود بوجہ احسن اور بدرجہ اتم حاصل ہوتا ہے نہیں چھوڑ سکتے۔ الحاصل گو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو حدیث مذکور کے سنادینے میں بزم شیعہ مقصود اصلی بہ نسبت اس کے زیادہ تر اچھی طرح سے حاصل ہو جاتا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے فقط کہہ دیا لیکن قاعدہ کلیہ یہی ہے کہ ایسے موقع میں دینے والے کو رد کا جائز نہ لینے والے کو اور ہاں ہم یہ کہنا ہی غلط ہے کہ اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو یہ حدیث سنا دیتے تو جھگڑا نہ ہوتا اور مقصود بوجہ احسن حاصل ہو جاتا کیونکہ اذل تو

جھڑے کا ہونا ہی مسلم نہیں۔ چنانچہ ان شاء اللہ معلوم ہو جائے گا، یہ فقط شیعوں کی شرارت ہے کہ انسانہائے بے اصل کو کوچہ و بازار میں گاتے پھرتے ہیں۔ حاشا دکلا جو یوں ہوا ہو۔

دوسری حکمت

دوسرے اگر کسی قسم کی فی الجملہ انبیاء میں شکر رنجی دو چار روز کے لیے ہو بھی گئی تو اسے جھڑا نہیں کہتے۔ ایسے امور میں ہو ہی جاتی ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام کا قصہ کس کس نے نہیں سنا۔ مع ہذا جو رنج کہ قریب ہی مبدل بصلح ہو جائے۔ اس کے ہونے کا کچھ اعتبار نہیں، اس کو عرف میں ”کَانَ لَمْ يَكُنْ“ سمجھتے ہیں، ایسے رنجوں کا اگر کھٹکا بھی ہوتا ہے تو پیش بندی نہیں کیا کرتے۔ سو ہاں لحاظ کو نہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ایسے ناقد رشٹاس ہیں کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے سامنے عذر معذرت نہ کریں گے، نہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا ایسی کج طبع ہیں کہ ہرگز سیدھی ہی نہ ہوں گی۔ اس کا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لحاظ نہ کیا ہو مگر الحمد للہ کہ اسی طرح ظہور میں آیا۔ چنانچہ روایت عجاج السالکین جو ان شاء اللہ اب قریب ہی مذکور ہوتی ہے۔ اس بات پر شاہد ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عذر کیے اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے قبول فرمائے اور بدل و جان ان سے پھر بھولہ شیر و شکر مل گئیں۔

تیسری حکمت

تیسرے یوں کہتا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہہ دیجئے تو جھڑا نہ ہوتا۔ جب زیبا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب بھی ہوتے۔ بیسیوں آیات اس بات کی گواہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ تمام موجودات میں سے کسی کو علم غیب نہیں، ”كُلُّ لَوْ كُنْتُ أَغْلَمُ الْغَيْبِ لَا مَسْخُورَثَ مِنَ الْخَبِيرِ۔ قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ“ اول آیت سے بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عالم الغیب نہ ہونا اور دوسری سے بالعموم ملائکہ اور انبیاء اور جن و بشر کا عالم الغیب نہ ہونا ثابت ہے جسے شک ہو ترجمہ کے کلام اللہ بہت موجود نہیں بنویں سپاہیہ کے نصف و ٹکٹ کے مابین اور بیسیوں سپاہیہ کے قول رکوع میں آیت مذکورہ کو تلاش کر کے اپنی تسلی کرے۔

اور ظاہر ہے کہ اس طرح کے امور کا دھیان گمان بھی بسا اوقات نہیں آیا کرتا جو یوں کہئے کہ عقل سے معلوم کر کے پیش بندی کرنی تھی۔ ہاں جو نسی مصلحتیں بیان کیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ کروں گا، وہ البتہ لحاظ عقلی کے قابل ہیں۔ چنانچہ مائل سمجھتے ہیں اور جولا عقل نہ سمجھیں تو کیا کیجئے۔

چوتھی حکمت

چوتھی مصلحت یہ ہے کہ جب یوں سمجھ کر کہ جتنا دونوں کے کہنے سے کام چلتا ہے اتنا ہی ایک کے بھی، ایک ہی کے سنا دینے کی تجویز ٹھہری تو پھر مناسب یوں ہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کو روکے کیونکہ فضل عطا انہیں سے ظہور میں آتا۔ باقی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا لینے والی تھیں اور ظاہر ہے کہ دنیا لینے کی فرع ہے اور دنیا اصل ہے اور اصل کے اکھاڑ دینے میں جو کچھ قطع و قع فساد ہوتا ہے، وہ فرع اور شاخ کے قطع کرنے میں نہیں ہوتا۔

الحاصل جس فساد کی پیش بندی کے لیے اس حدیث کا سنا دینا نہ نظر تھا اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے کہنے میں تو اس کی بیخ و بنیاد کا اکھاڑ دینا تھا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے کہہ دینے میں گویا شاخ کو قطع کر دیا یا یوں کہئے کہ پھل نہ لگا، سوائے اس کے اگر حسب گفتار سر اپانا معقول شیعہ کوئی اور فساد بیچ میں اتفاق سے کھڑا ہوتا نظر آئے تو اس کی مداخلت کے لیے اس کی مداخلت کو نہیں چھوڑا جاتا۔ یعنی اس بات کا لحاظ مقدم ہے کہ مملوکہ نبوی دست بردوار ثانی نہ ہو جائے۔ اس میں بلا سے کسی قسم کا تازع ہی کیوں نہ پیش آجائے۔

بہر حال قطع نظر اس کے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے کہنے میں سر دست آزار خاطر مبارک حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نظر آتا تھا اور مطلب ان کے نہ کہنے میں بھی حاصل ہو سکتا تھا۔ اتنا ہی اصلی بھی یہی تھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نہ کہئے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی کے گوش گزار کر دیجئے کیونکہ جب وہ خلیفہ ہوئے تو پھر سر رشته اختیار انہیں کے ہاتھ ہوگا۔ جب وہ متر و کنوی وراثوں کو نندیں گے تو حضرت فاطمہ یا اور کسی وارث کے پاس آپ نہ جائے گا جو وہ اس کو اپنا مملوک سمجھ کر تصرف ناجائز کر بیٹھیں اور اس وجہ سے ان کو اطلاع کرنے کی ضرورت ہوتی۔

باقی رہی فقط طلب گاری تو اس میں تا وقتیکہ اس بات کی اطلاع نہ ہو کہ ہمارا حق نہیں کچھ گناہ نہیں جو اس پیش بندی کی ضرورت ہو۔ مع ہذا حضرت عباس اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کہہ دینا کفایت کرتا تھا۔ اس لیے کہ اگر میراث تقسیم ہوتی تو یہ دونوں صاحب بھی کچھ کم نصف کے مالک ہوتے۔ سو اگر میراث تقسیم ہوتی تو سب ہی کو برابر تقسیم ہوتی۔ پس لا جرم ان کو بھی اطلاع ہوتی۔ سو اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو پہلے سے معلوم نہ ہوتا اور نہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خبر ہوتی، تب بھی ان دونوں کا سننا کافی تھا۔ وقت ضرورت بیشک حال معلوم ہو جاتا اور ان سب کو جانے دو، نہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ذکر کرو اور نہ حضرت عائشہ اور حضرت

عہدِ رضی اللہ عنہما کے معلوم ہونے کا کچھ لحاظ کرو، فقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمادیا میں
 ی تھا، جیسا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے فرمادیا کیونکہ ان کی طرف سے کارکن اور خبر
 گیران جب تک وہی تھے، دونوں صاحبزادے جب تک صلیبِ مسیح ہی تھے۔

خبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اول تو میراث کا لینا کچھ کھیا میں کو پھوڑنا نہیں ہے جو
 چپ چپاتے ہو جائے۔ پھر وہ بھی اس قدر عقلی کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے میراث لینے کی حضرت
 علی رضی اللہ عنہ کو بھی خبر نہ ہو بلکہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے اگر بالفرض کچھ لیا بھی جائے گا تو کس طرح
 کرنے والی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہوں گی۔ پر لینے والے اور قبضہ کرنے والے حضرت علی
 رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی ہوں گے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی
 بہ نسبت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے کوئی غیر نہ تھے۔ ایک بجائے والدہ دوسرا بجائے والد اور
 ظاہر ہے کہ ایسی قراتوں میں بیشتر اتفاق ملاقات رہتا ہے اور اس سبب سے ایک دوسرے کو اس کے نقص
 نقصان کی اگر کچھ اطلاع ہوتی ہے تو اطلاع کر دیتا ہے۔ خصوصاً اس دینی کے نفع و نقصان کی باتیں پھر وہ
 بھی ایسے لوگوں سے جو دنیا کو طلاق دیئے بیٹھے ہوں، ایسے مواقع میں تو اگر بمقتضائے بشری کوئی رنج
 بھی فی مابین واقع ہو جاتا ہے۔ تب بھی اس کے نفع و نقصان کی اطلاع کر دیا کرتے ہیں۔

کیونکہ ایسے مواقع اگر کچھ رنج بھی ہو جاتا ہے تو بوجہ محبت ہوتا ہے بوجہ عداوت بغض نہیں ہوتا جو
 دوسرے کے نقصان کا روادار ہو۔ چونکہ رنج کے دو طرح کے ہونے کی تحقیق آیت ”محمد رسول
 اللہ والذین معہ اشداء“ کے ذیل میں گزر چکی۔ اس لیے فقہ اسی پر اکتفا کر کے معروض کرتا ہوں
 کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے سنا دینے میں بھی یہ نظر آتا تھا کہ
 لاجرم ان کے وسیلہ سے فاطمہ رضی اللہ عنہا اور نیز وارثوں کو یعنی ازواجِ باقیہ کو اطلاع ہو جائے
 گی۔ شروع میں نہیں تو وقت طلب یا وقت قبض و تصرف تو ضرور ہی یہ بات معلوم ہو جائے گی کیونکہ
 ایسی باتیں کچھ راز کی تو ہیں ہی نہیں جو کسی کو اطلاع نہ ہو۔ الحاصل اسے چھپانا نہیں کہتے کہ دس بارہ
 بلکہ شاید زیادہ کے سامنے ایک بات فرمادیں اور وہ بات بھی اس قسم کی کہ اس کی قہیل اگر ہو سکے تو
 جب تک طشت از بام افتادہ کا قصہ نہ ہو تب تک نہ ہو سکے۔ منجملہ اسرار کے نہیں جو چھپائی جائے۔
 خاص کر حضرت علی اور حضرت عباس اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما سے کہ دو تو ان میں سے
 وارث ہیں اور ایک وارث کے وارث۔ یعنی ان کے خبر گیران پھر یوں کہنا کہ حکمِ خدا کو جو بہ نسبت
 وارثانِ نبوی تھا، پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے وارثوں سے چھپا رکھا، جھک مارنا ہے کہ نہیں۔

حسب روایت شیعہ خدا کا حکم چھپانے کی ایک مثال

بہن چھپ رکھا ہے کہتے ہیں کہ حضرت امام زین العابدین نے حسب روایات کاذبہ شیعہ فرزند ارجمند خویش حضرت زید شہید سے حکم امامت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ نے چھپا رکھا اور پھر حیف یہ ہے کہ حکم بھی ایسا کہ جیسا اس کے نہ ماننے سے کفر عائد ہوتا ہے، ویسا ہی اس کے نہ جاننے سے آدمی کافر رہتا ہے۔ چنانچہ بدستور حدیث ”مَنْ لَمْ يَعْرِفْ اِمَامَ زَمَانِهِ فَقَدْ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً“ شیعوں کا یہی عقیدہ ہے اس لیے کہ اس کے معنی شیعوں کے طور پر یہی ہو سکتے ہیں کہ جو امام وقت کو (دوازدہ آئمہ میں سے) نہ جانے، یعنی اس کی امامت کی اسے خبر نہ ہو تو وہ جاہلیت کا سامرا مرے گا۔ یعنی جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے سے پہلے پہلے اکثر جریرہ عرب کے لوگ بسبب جاہلیت کے عقائد باطلہ اس جہان سے لے گئے اور اس سبب سے جہنم رسید ہوئے۔ ایسے ہی امامت مہدوت سے جو جاہل رہے گا، وہ بھی اسی شمار قطار میں داخل ہوگا۔ الحاصل حضرت امام زین العابدین نے حضرت زید شہید سے ایسا مسئلہ جو رکن دین و ایمان تھا چھپا رکھا تھا، سو چھپانا اسے کہتے ہیں نہ کہ اس کو کہ ہر ہر وارث کے کان میں ”لا نُورِثُ مَا تَرَكَاهُ صَلَاحًا“ کہا اور اگر سند مطلوب ہے تو بھیجے کلینی کی روایت موجود ہے۔ کسی ایسے دعوے بازاری کی نہیں۔

رَوَى الْكَلْبِيُّ عَنْ اِبَانٍ قَالَ اَخْبَرَنِي الْاَحْوَلُ اِنْ زَيْدُ بْنُ عَلِيٍّ بَعَثَ اِلَيْهِ وَهُوَ مُخْتَبٍ قَالَ فَتَيَّتُهُ فَقَالَ يَا اَبَا جَعْفَرٍ مَا تَقُولُ اِنْ طَرَفَكَ طَارِقٌ مِنَّا اَتَخْرُجُ مَعَهُ قَالَ فَقُلْتُ لَهُ اِنْ كَانَ هُوَ اَبَاكَ اَوْ اَخَاكَ خَرَجْتُ مَعَهُ فَقَالَ لِي اُرِيدُ اَنْ اَخْرُجَ فَاَجَاهِدُ هَؤُلَاءِ الْقَوْمَ فَاَخْرَجَ مَعِيَ فَقُلْتُ لَا اَعْمَلُ جَعَلْتُ لِمَاكَ فَقَالَ اَتَرْغَبُ بِتَنَفِيكَ عَنْ نَفْسِي فَقُلْتُ اِنَّمَا هِيَ نَفْسٌ وَاحِدَةٌ فَاِنْ كَانَ لِلّٰهِ فِي الْاَرْضِ حُبَّةٌ طَ قَالُمْتُ خَلِّفْ عَنْكَ وَالْخُرُجُ مَعَكَ سَوَاءٌ فَقَالَ يَا اَبَا جَعْفَرٍ كُنْتُ اَجْلِسُ مَعَ اَبِي فِي الْخَوَانِ فَيُلْقِمُنِي الْبُضْعَةَ السَّيْنَةَ وَيَتَرَدُّ لِي اللَّقْمَةُ حَتَّى تَبْرُدَ حَقَقَةً عَلَيَّ وَلَمْ يَشْفُقْ عَلَيَّ خَرُ النَّارِ اِذَا اَخْبَرَكَ وَلَمْ يُخْبِرْنِي قَالَ فَقُلْتُ خَافَ عَلَيْكَ اَنْ لَا تُقْبَلَ فَدَخَلَ النَّارَ وَاَخْبَرَنِي فَاِنْ قُبِلْتُ نَجُوتُ وَاِنْ لَمْ اَقْبَلْ لَمْ يَتَّحِلْ اَنْ اَدْخُلَ النَّارَ۔

”حاصل روایت یہ ہے کہ علامہ کلینی ابان سے یوں روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ احوال نے مجھ سے یوں نقل کیا کہ حضرت زید بن امام زین العابدین نے جس وقت کہ وہ مخفی تھے، کسی کو میرے پاس بلائے کو بھیجا تو انہوں نے کہا، اے ابوجعفر (یہ لقب ہے احوال کا) تیری اس

میں کیا رائے ہے؟ اگر ہماری طرف سے اچانک کوئی بلا آنے والا خیرے پاس آئے۔ (یعنی ہم اپنی مدد کے لیے تجھے بلوائیں) تو اس کے ساتھ ہمارے بلوائے سے ہو بھی لے گا کہ نہیں۔ اہل نے کہا میں نے حضرت سے یوں عرض کیا کہ بلوائے والے تمہارے باپ یا تمہارے بھائی (یعنی امام محمد باقر) ہوتے تو مضائقہ نہ تھا، میں بھی ساتھ ہو لیتا، انہوں نے پھر فرمایا، میرا ارادہ یوں ہے کہ میں لکھوں اور ان لوگوں سے یعنی مردانوں سے جہاد کروں، سو تو بھی میرے ساتھ چل، میں نے عرض کی کہ میں آپ کے قربان جاؤں، مجھ سے ہرگز یہ کام نہ ہوگا۔ انہوں نے فرمایا کہ کیا تو اپنے آپ کو ہم سے علیحدہ ہو کر بچاتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں اور تم تو ایک ہی ہیں، پر در صورت یہ کہ روئے زمین پر کوئی خدا کی طرف سے حجت یعنی امام موجود ہو تو تمہارے ساتھ سے رہ جانے والا اور تمہارے ساتھ جانے والا دونوں برابر ہیں۔ یعنی امام کے ہوتے ہوئے تمہارے ساتھ جہاد میں جانے کا کچھ فائدہ نہیں، انہوں نے کہا کہ اے ابو جعفر میں اپنے باپ کے ساتھ خوان پر بیٹھا کرتا تھا وہ مجھے چھانٹ چھانٹ کر گوشت کی موٹی موٹی بوٹیاں دیتے تھے اور میرے لیے قلعے ٹھنڈے کرتے تھے، یہاں تک کہ خوب ٹھنڈا کھانے کے قابل ہو جائے، یہ سب قصہ محبت کے سبب سے تھا۔ سو بڑے تعجب اور کمال حیف کی بات ہے کہ یہاں کی آگ کا تو شفقت کرنے میں لحاظ کیا اور دوزخ کی آگ سے بچانے میں انہیں مجھ پر کچھ محبت نہ آئی جو تجھے امام محمد باقر کی امامت کی خبر کر دی اور مجھے بالکل خبر نہ کی، احوال کہتا ہے میں نے کہا تم سے یہ خوف ہوا کہ مہدائتم نہ مانو اور اس سبب سے دوزخ میں جاؤ اور مجھے یوں سمجھ کر خبر کر دی کہ اگر میں نے قبول کیا تو فیہا نجات پائی، نہیں تو ان کی بلا سے دوزخ میں جاؤں گا تو میں جاؤں گا۔ اٹھی

ہر چند اس روایت سے بہت سے مضمون مفید طلب الملحت برآمد ہوتے ہیں لیکن اول تو اس مقام میں ان سب کا ذکر کرنا بے موقع ہے۔ دوسرے فرصت اتنی کہاں اس لیے فقط اتنی گزارش ہے کہ اس روایت سے، تصریح معلوم ہوا کہ حضرت امام زین العابدین نے دیدہ و دانستہ اپنے فرزند ارجمند زید شہید سے امامت حضرت امام محمد باقر کو چھپالیا حالانکہ اس کا جاننا مجملہ ارکان ایمان تھا۔ چنانچہ اس روایت سے بھی ظاہر ہے، اب اہل انصاف سے یہ عرض ہے کہ فدک کو جو مجملہ متاع دنیوی تھا امامت امام وقت کے برابر رکھئے جس کا جاننا مجملہ ارکان ایمان ہے اور پھر حضرت امام زین العابدین کے دیدہ و دانستہ چھپالینے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دس بارہ آدمیوں کے سامنے بغرض تبلیغ کہہ دینے کے مقابل کیجئے اور پھر اس کا لحاظ کیجئے کہ بایں ہمہ حضرت امام زین العابدین نے جو حضرت امام محمد

باقرضی اللہ عنہ کی امامت کی حضرت زید شہید کو اطلاع نہ کی تو اس میں کیا نقصان نکلا؟

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے یا کسی اور وارث سے حدیث ”لَا نُؤَدُّ مَا نُرْكَاهُ صَدَقَہُ“ نہ کہا اور بزعم شیعہ فقط صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی سے کہا تو کیا ضرر پیش آیا؟ ظاہر ہے کہ یہ نسبت امامت امام محمد باقر حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے لب کشا نہ ہونے میں انجام یہ نکلا کہ نعوذ باللہ لعل کفر کفر نباشد، حضرت زید شہید بوجہ جہل رکن ایمان اگنی امامت امام وقت چنانچہ روایت مسطور سے ظاہر ہے، مستوجب دوام عذاب اور داخل زمرہ کفار ہوئے۔ اگر بذات خود امام زین العابدین فرزند ارجمند سے یہ بات فرمادیتے تو اُمید قوی تھی کہ حضرت زید تسلیم ہی کر لیتے۔ استنباء دروغ حول دروغ گو جو فی الحال رہزن ایمان ہوا۔ اس صورت میں بیچ میں سے اٹھ جانا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقط ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی سے حدیث مذکور کو کہا تو کچھ خرابی نہ نکلی کیونکہ جو کچھ مقصود تھا، وہ حاصل ہی ہو گیا ترک نبوی صدقہ ہی رہا۔ بہر حال اس میں میراث جاری نہ ہونے پائی بلکہ اگر بالفرض والحدیر سرور کائنات علیہ علی آلہ افضل المصلوات واکمل التحیات اس حدیث کو بوجہ فراموشی مثلاً کسی سے نہ فرماتے، نہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے نہ کسی اور سے، تب بھی بیش بریں نیست کہ نادانگی میں دار ثمان نبوی ترک نبوی کو جو فی الحقیقت وقف تھا، خورد برد فرماتے۔ سو ہم علماء شیعہ ہی سے استغنا کرتے ہیں کہ اگر کوئی نادانگی میں مال وقف کو اپنا مال سمجھ کر کھالے تو اس کے ذمہ کیا گناہ؟ بہر حال حضرت امام زین العابدین کے حکم خداوندی کے چھپا لینے سے جو کچھ نقصان نکلا، اس کو ایک طرف رکھئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نہ کہنے سے جو مطلب کے حصول میں کچھ خرچ نہ ہوا (اور در صورت اخفاء کلی جو کسی طرح کا وارثوں کا نقصان دینی یا دُنوی نہ تھا) اس کو دوسری طرف دھریئے، قصہ ادھر کے تمام لوازم کو ادھر کے تمام لوازم سے تولئے اور پھر بولئے کہ کس طرف پلہ جھکتا ہے؟ اور اخفاء حکم کس طرف ہے اور کس طرف نہیں؟

بہر حال ہر کس و نا کس پر ان تقریروں سے واضح ہو گیا کہ کسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اخفاء حکم نہیں ہوا اور بزعم شیعہ قطعاً اور یقیناً حضرت امام زین العابدین نے اخفاء حکم خداوندی کیا لیکن آفرین ہے مولوی عمار علی صاحب کی فہم و فراست پر کہ اسے تو اخفاء سمجھتے ہیں اور اسے نہیں سمجھتے، بار خدا یا انہیں کس نے کہا تھا کہ تم بھی دین مذہب کی باتوں میں دخل دیجو۔ اتنی عقل و فہم پر اہل سنت سے اُلجھتے ہیں، کوئی مولوی صاحب سے پوچھے، آپ

نے کیوں اہل سنت سے دست و گریباں ہونے کا ارادہ کیا؟ شعر:

اُچھنے کو بلا ہیں آپ تو کچھ خیر ہے صاحب لگایا ہاتھ کس نے آپ کی زلف پریشاں کو
 علماء اہل سنت تو درکنار عوام اہل سنت بھی ہنزلہ دلا دران مالی نظر میدان مناظرہ میں ایسی سمجھ
 والوں کو ہنزلہ زنان بے ہتھیار سمجھ کر کچھ معترض نہیں ہوا کرتے ہیں۔ ہاں در صورت یہ کہ گریبان
 کیر ہی ہو جائیں۔ تب ضرورت و ناچار ہی ان کے ہاتھ پاؤں کی خبر لیتے ہیں۔

اس لیے اس مہجد ان نے بھی جو کچھ کیا سو کیا، بہر حال معاف کیجئے گا لیکن سچ تو یوں ہے آپ
 کو بری تو لگے گی، جیسی آپ کی ہاتھیں ہیں ایسے خن ہائے بے معنی سے تو گود شتر بے مہار ہی بہتر
 ہے، وہ اگر اتفاق سے ناک تک پہنچ بھی جائے تو بیش بریں نیست ناک ہی جلے گی۔ دل تو کسی
 مائل کا نہ جلے گا، پر آپ کے حرف بے معنی اور خن نامعتول میں طرفہ ستم یہ ہیں کہ بحکم مصرع
 ”جواب جاہلاں باشد خوشی“ حقیقت میں قابل جواب تو ہوتے نہیں جو جواب دیا جائے۔ البتہ
 خاموش ہو کر حتی جلا نا پڑتا ہے، پر اس مہجد ان نے جب یہ جانا کہ جاہلوں کے جواب میں عالم البتہ
 نہیں بولا کرتے، مجھے اس مہجد انی پر کیا ہوا جو خاموش ہو کر بیٹھ رہوں، مع ذہاب سر پر آئی۔

دو چیز تیرہ عقل است دم فرد مستن بوقت گفتن و گفتن بوقت خاموشی
 اس لیے اس قدر اوراق کو سیاہ کیا اور آگے اور کرنے پڑے۔

سومنصفان بے روی و ریا اور بھی سنیں کہ بعد ازیں مولوی عمار علی صاحب کچھ ایسا رقم فرماتے
 ہیں جس سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا مکرر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر میراث
 کا طلب کرنا اور ان کا فدک کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نام لکھ دینا اور پھر اتفاق سے حضرت
 عمر رضی اللہ عنہ کا آ جانا اور ان کا اس کا فدک کو پھاڑ ڈالنا لکھا ہے۔ سو اس کا جواب بحکم مثل مشہور ع:
 دروغ نما جزا باشد دروغی..... موافق نقل ہندی ”گوہ کی دار دوست“

یوں چاہیے تھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ایک بار بھی میراث کی طلب کے لیے صدیق اکبر رضی
 اللہ عنہ تک نہیں گئیں، چہ جائیکہ دوبارہ مطالبہ کی نوبت آئی ہو اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان
 کے نام جاگیر کا کاغذ لکھ دیا ہو اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے پھاڑ ڈالا ہو، وہ شروع سے لب کشای
 نہیں ہوئی تھیں مگر چونکہ محوٹ پھر محوٹ ہے، ابتداء ہو یا دروغ کی جزا میں، مع ذہاد و اندک کریم جھوٹوں
 کو سیکڑوں طرح شرماتا ہے۔ چنانچہ ابھی ان شاء اللہ تعالیٰ معلوم ہوا جاتا ہے، سچ ہی بولنا مناسب اور
 انب نظر آیا، اس لیے گزارش یہ ہے، یاد رہے کہ یہ شخص دروغ بے فروغ ہے، طومار بند یوں سے

بچوں کو جھوٹا نہیں کرتے، اہلسنت کا قول محکم اسکی پوج باتوں سے خلل پذیر نہیں ہو سکتا۔
باقی یہ حوالہ دینا کہ سبط بن جوزی نے اس روایت کو اپنی سیرت میں تحریر کیا اور واقدی
محدث اہلسنت نے اور برہان الدین طبری شافعی نے اپنی سیر میں لکھا ہے، محض ایک سخن ابلہ فریب
ہے، سادہ لوحان اہلسنت کے گمراہ کرنے کے لیے (بحکم اتباع پیشوایان خویش) مولوی صاحب
بھی یہ چال چلتے ہیں چونکہ در باب صحیح روایات مفید مطلب شیعہ ایک بحث طویل مرقوم ہو چکی
ہے اور اس کے مکرر بیان کرنے میں بجز درد سر تازہ کچھ سود نہیں، اس لیے مکلف ناظرین ہوں کہ
چند اوراق پلٹ کر اس باب میں اپنی تسلی کر لیں۔

سیدہ رضی اللہ عنہا کے سمجھانے پر فدک صدیق رضی اللہ عنہ نے واپس کر دیا تھا
پراتا اشارہ یہاں بھی کیے دیتا ہوں کہ اوّل بڑی دلیل اس بات کی کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا
مکرر گئیں اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فدک کا جاگیر نامہ ان کے نام لکھ دیا اور حضرت عمر
رضی اللہ عنہ نے پھاڑ ڈالا، سراسر دروغ اور بہتان بے اصل ہے۔ چنانچہ شیخ ابن مطہر علی منہج الکرامت
میں یوں رقم فرماتے ہیں: ”لَمَّا وَعَظَتْ فَاطِمَةُ أَبَا بَكْرٍ فِي ذَلِكَ كَتَبَ لَهَا كِتَابًا وَرَفَعَهَا
عَلَيْهَا“ یعنی ”حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جب ابو بکر رضی اللہ عنہ کو فدک کے مقدمہ میں وعظ و پند
کیا تو ابو بکر نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نام اسے لکھ دیا اور فدک کو ان کے حوالے کر دیا۔ اچھی“
مطہر ظاہر ہے کہ شیخ مطہر دشمنی صدیق اکبر میں مولوی صاحب کے بھی افسر ہیں اور یا ر عمار کی عداوت میں
ان سے بھی اوّل ہیں، مولوی صاحب نے بھی اگر یہ باتیں سیکھی ہیں تو انہیں بزرگوں کے بہکانے سے
سیکھی ہیں، اگر کچھ بھی اس کی اصل ہوتی، وہ سیر کی سن کر دیتے اور سوئی کا بھالا بنا دیتے۔

آخر اتنا بھی تو اسی غرض سے لکھا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ (بوجہ دغا بازی) فدک کو دانا چاہتے
تھے۔ پر وعظ و پند کے باعث آخر کار ہاتھ سے چھوڑا، اگر اپنی بات میں سچے ہوتے اور حدیث ”لَا
نُؤِثُ مَا تَرَكَاهُ صَلَافًا“ صحیح ہوتی غلط نہ ہوتی تو وعظ سے متاثر ہونے کے کیا معنی تھے؟ اَلْمَاوِی
حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو نصیحت کرتے۔ سوا گر پھاڑ ڈالنے کا قصہ کچھ بھی اصل رکھتا تو وہ کیا کیا زبان
درازیان نہ کرتے بلکہ شیخ ابن مطہر علی نے تو اہل سنت کے لیے بہت تخفیف تصدیق کر دی۔ یہاں تک
کہ اہل انصاف کے نزدیک تو شیعوں کو لازم یوں ہے کہ مثل خز بن یزید ریاحی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ
کے بھی بدل و جان معتقد ہو جائیں کیونکہ ”التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ“ خیر الحمد للہ کہ شیعوں
کی ہی روایات سے دروغ (مولوی عمار علی صاحب) ثابت ہو گیا۔ ”وَكَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ“

بہر حال جو باتیں مولوی صاحب نے تراشی ہیں، مولوی صاحب کے بڑوں کو بھی نہ سوجھی تھیں۔ یہ تازہ الہام اب مولوی صاحب کو ہوا ہے، مع ہذا اقدی محدثین کے نزدیک من جملہ وضامین ہے یعنی اس زمرہ میں معدود ہے جو جھوٹی حدیثیں بنا کر بیان کرتے ہیں اور ابن جوزی کا حوالہ اس بات میں ہماری سر آنکھوں پر کیونکہ انہوں نے دھوکہ بازوں کے فریب سے بچانے کے لیے امت محمدی کے لیے ایک کتاب خاص اسی فن میں تصنیف کی ہے کہ فلائی فلائی حدیث موضوع ہے تاکہ کوئی دھوکہ نہ کھائے، سو ان کی اس کتاب سے نقل کرنے میں اہل سنت کی بات کا اور پختہ کرنا ہے اور اگر بالفرض ایسے استدلال بھی مفید مطلب ہوا کریں اور اس پر نظر نہ ہو کہ خود مصنف کتاب اس بات کی نسبت جو اس کے حوالے سے بیان کی جاتی ہے کیا کہتا ہے؟ تو کل کو لکھ ان بے دین کی اس بات کا شیعہ کیا جواب دیں گے؟ کلام اللہ میں ”إِنَّ اللَّهَ فَخِيرٌ“ موجود ہے، یعنی خدا محتاج ہے تو مظلوم ہوا کہ خدا محتاج ہے۔

اور اگر یوں کہتے کہ خدا نے یہود کے اس قول کو بطور رد و تکذیب درج کلام اللہ کیا ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے تو یہی جواب سبط بن جوزی کی اس روایت کے درج کرنے کا مظلوم ہوتا ہے۔ بہر حال اس دعا بازی کا کیا ٹھکانا ہے کہ عوام اہل سنت کے سامنے یا تو ان کتابوں کا نام لیتے ہیں جو غیر مقبول اور پایہ اعتبار سے ساقط ہیں یا بوجہ شرارت و چالاکی ایسی کتابوں کا حوالہ دے جاتے ہیں کہ گودہ کتابیں معبر ہیں۔ پر اس روایت کو جس کا حوالہ دیتے ہیں، اس کتاب میں بنظر دفع شر دعا بازان لکھ کر موضوع لکھ دیا ہے یہ فرقہ محام کو دھوکہ دینے کے لیے انہیں روایات کو پیش نظر کر دیتے ہیں اور اکثر موقع میں اس سے بڑھ کر یہ کرتے ہیں کہ ایک بات اپنے جی سے تراش کر کسی کتاب غیر مشہور کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اوّل تو یہ کتابیں کہاں؟ پھر اتنی دوسری کس کو ضرورت؟ بہر حال مولوی صاحب کا یہ ارشاد کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا مکرر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس طلب میراث کے لیے گئیں، شاید بایں غرض ہو کہ مکرر رہ کر جانے میں اور غلط صحیح غل شور مچانے میں کچھ تو ہاتھ پلے پڑ جائے گا۔ پھر مولوی صاحب کی ایک اور بیہودہ گفتار سنئے۔ مولوی صاحب کچھ ایسا رقم فرماتے ہیں:

”کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ ابو بکر کو اس بات میں سچا جانتے تھے کہ جو خبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا تر کہ سب صدقہ ہے تو پھر علی رضی اللہ عنہ اور عباس رضی اللہ عنہ نے خلیفہ ثانی کی خلافت میں عمر رضی اللہ عنہ سے جا کر کیوں دھوئی کیا؟ چنانچہ عمر رضی اللہ عنہ نے علی اور عباس رضی اللہ عنہما کو کہا کہ تم دونوں ابو بکر کو کاذب اور خائن اور غادر اور آثم جانتے تھے اور مجھے بھی تم دونوں کا ذب اور

خائن اور عا در اور آثم جانتے ہو اور میں وہ ہی کروں گا جو کہ ابو بکر کرتا تھا، یہ روایت صحیح مسلم میں لکھی ہوئی ہے اور مسند احمد بن حنبل میں لکھا ہے کہ عثمان کی خلافت میں عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی دعویٰ کیا تھا۔ پس اگر ابو بکر ان کے نزدیک سچا ہوتا تو ان کے زمانہ میں دعویٰ ہرگز نہ کرتے، معلوم ہوا کہ ابو بکر اس روایت میں بالکل جھوٹا تھا، ازراہ عداوت روایت بنا کر فاطمہ کا حق غصب کیا اور عمر خود علی اور عباس رضی اللہ عنہما سے اقرار کرتا ہے کہ تم ابو بکر رضی اللہ عنہ کو کاذب اور خائن جانتے تھے اور مجھے بھی تم کاذب اور خائن جانتے ہو۔ پس جس وقت کہ علی رضی اللہ عنہ نے ان کو کاذب اور خائن جانا تو بیشک ہم بھی کاذب اور خائن ان کو جانیں گے۔ یہی مطلب غصب سے تھا۔“

یہاں تک مولوی صاحب کی خرافات لا یعنی ہوئی۔ اس میں کوئی ایک دو لفظ کا فرق ہوگا، پر معنی میں تفاوت نہیں، اب ہماری بھی سنئے کہ اس عبارت سے مولوی صاحب کے دو مطلب ہیں، ایک تو یہ کہ اگر حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما وغیرہم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سچا جانتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دعویٰ نہ کرتے اور علی ہذا القیاس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں دعویٰ نہ کرتے، دوسرا یہ ہے کہ جب باقر اور حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کاذب، آثم، غادر، خائن جانا صحیح ہوا تو ہم بھی باتجاء مرتضوی ابو بکر رضی اللہ عنہ کو کاذب آثم غادر خائن سمجھیں گے۔

مسلم شریف کے حوالہ کی حقیقت

سواؤل اعتراض کا تو جواب یہ ہے کہ یہ مولوی صاحب کی ایک نئی دغا بازی ہے، عوام کے بہکانے کے لیے ایسی ابلہ فریباں کرتے ہیں، پر حقیقت میں اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں، جو لوگ اصل روایات صحیح مسلم کو دیکھیں گے، وہ جان جائیں گے کہ قصہ دگرگوں ہے۔ یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جس محفل میں یہ نوبت آئی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یوں کہا کہ تم ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کاذب آثم خائن سمجھتے تھے، اس محفل میں بہ نسبت تولیت تکرار تھا، نہ بہ نسبت وراثت۔ چنانچہ اس حدیث سے بھی جس کا مضمون کچھ کچھ مولوی صاحب نے درج رقمہ کیا اور بروایت مالک بن انس مروی ہے اور نیز صحیح مسلم ہی کی اور حدیثوں سے یہ بات عیاں ہے لیکن مولوی صاحب نے یا تو بوجہ بلاوت و غباوت نہ سمجھا ہو اور یا باتجاء پیشوایان قدیم دوسروں کے مطلب کی بات ہضم کر کے جس قدر دھوکا دے سکیں، زریب قرطاس کیا ہے۔

ہر چند جی یوں چاہتا تھا کہ احادیث مشار الیہا کو ہٹا دیا جائے لیکن احادیث مشہار الیہا کے ہٹا دینا

لکھنے میں قصہ بہت دور پہنچتا ہے۔ خصوصاً حدیث مالک بن ادس مذکور کہ وہ ایک بہت ہی طویل و عریض ہے اور بایں ہمہ اکثر مواقع شرح طلب اور ادھر فرصت قلیل، اس میں سب میں سے مختصر سا قصہ استنباط کر کے اور دو چار جملے بکسہا لکھ کر متردوں کا اطمینان کیے دیتا ہوں۔ حدیث عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جو اس حدیث سے کچھ آگے صحیح مسلم میں موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں من جملہ رسد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم فقط اس زمین کا جو مدینہ کے رقبہ میں اور قرب وجوار میں تھی۔ حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو متولی کر دیا تھا۔ خیبر اور فدک کو اپنی تولیت میں رکھا تھا۔ اس حدیث سے جس کا مولوی صاحب نے ذکر فرمایا، یوں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خدا کا واسطہ دے کر حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما سے یہ عہد لے لیا تھا کہ اس میں وہی کام کچھ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔

مگر حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا مذکور سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا قبضہ اٹھا دیا تھا۔ چنانچہ حدیث مذکور کے یہ الفاظ اس پر شاہد ہیں: ”فَلَمَّا صَلَّاهُ بِالْمَدِينَةِ فَلَمَّحَهَا عُمَرُ إِلَى عَلِيٍّ وَعَبَّاسٍ فَلَمَّحَتْهُمَا عَلَيْهِمَا عَلِيٌّ“ جس کا یہ حاصل ہے ”کہ مدینہ میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقہ تھا اس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے کر دیا، سو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو آباد کیا اور اپنا قبضہ کر لیا۔“

یہ بات ذہن نشین ہو چکی تو اب سنئے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اس تمام زمین پر جو دونوں کی تفویض اور سپردگی میں تھی، قابض ہو گئے تو آپس میں دونوں صاحبوں میں جھگڑا پڑا، اس کے رفع داد کے لیے یہ صورت پیش آئی کہ یہ دونوں صاحب خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمن بن عوف اور حضرت زبیر بن العوام اور سعد بن ابی وقاص کو بھی کچھ پہلے ان کے پاس بھیجا تا کہ وہ بھی کچھ سہارا لگائیں اور خلیفہ سے کہہ سن کر کچھ کچھ صلح کرادیں، اسی آنے کو مولوی صاحب دعویٰ میراث کے لیے آنا سمجھتے ہیں، اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو یوں کہنا کہ تم ابو بکر کو کاذب وغیرہ سمجھتے تھے، اسی دفعہ میں پیش آیا ہے۔ چنانچہ ناظران حدیث مذکور پر پوشیدہ نہ رہے گا۔

الحاصل جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس یہ چھیوں صاحب تشریف لائے اور یہ مذکور ہوا تو اوّل تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان چھیوں صاحبوں کو قسم دے کر یہ پوچھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے ”لا نورث ما ترکناہ صدقۃ“ اور ان سب

صاحبوں نے اقرار کیا کہ بے شک فرمایا ہے، بعد ازاں بہت سی گفتگو کے بعد یہ فرمایا:

ثُمَّ جِئْتَنِي أَنْتَ وَهَذَا وَأَنْتُمْ جَمِيعٌ وَأَمْرُكُمْ وَأَجَلٌ لَقُلْتُمْ إِذْ لَقَّيْنَا إِلَيْنَا لَقُلْتُ
إِنْ شِئْتُمْ دَلَعْتُهَا إِلَيْكُمْ عَلَى إِنْ عَلَيْكُمْ عَلَيْهَا اللَّهُ أَنْ تَعْمَلُوا فِيهَا بِالْإِذْنِ كَانَ يَعْمَلُ
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَخَذْتُمَا بِذَلِكَ قَالَ أَكْذَابُكَ؟ قَالَا نَعَمْ
قَالَ ثُمَّ جِئْتُمَانِي لِأَقْضِيَ بَيْنَكُمْ وَلَا وَاللَّهِ لَا أَقْضِي بَيْنَكُمْ بِغَيْرِ ذَلِكَ حَتَّى تَقُومَ
السَّاعَةُ فَإِنْ عَجَزْتُمَا عَنْهَا فَرُدَّاهَا إِلَيَّ.

”اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی طرف متوجہ ہو کر یہ فرمایا کہ پھر تم اور یہ دونوں میرے پاس آئے اور تم دونوں باہم متفق تھے اور تم دونوں کی بات ایک تھی، سو تم دونوں نے مجھ سے کہا کہ یہ ترکہ ہمارے حوالہ کر دو، میں نے کہا تمہیں منظور ہو تو اس شرط پر دیتا ہوں کہ خدا سے عہد کر لو کہ اس میں وہی کیجیو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔ سو تم دونوں نے ترکہ مذکور کو اس شرط پر لیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا یوں ہی بات ہے؟ ان دونوں صاحبوں نے کہا، اسی طرح ہے، بعد ازاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں سے کہا، اب پھر تم دونوں میرے پاس آئے ہو کہ میں تمہارا فیصلہ کر دوں، یعنی زمین کو بانٹ کر تم دونوں کو جدا جدا متولی کر دوں، یوں نہیں کہ اللہ کی قسم اس کے سوا قیامت تک میں کچھ اور حکم نہ دوں گا، اگر تم سے تولیت کا سرانجام نہ ہو سکے تو لاؤ مجھے ہٹا دو۔“

یہاں تک حاصل مطلب تھا۔ اب غور فرمائیے کہ مولوی صاحب کے فہم کا قصور ہے یا کسی اور کا؟ اگر شرح سننا منظور ہے تو سنئے کہ اگر حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما سے طالب میراث ہوئے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طلب کے موافق ترکہ نبوی کو ان کے حوالے کر دیا تو اس کی کیا وجہ ہوئی کہ باوجود معصوم ہونے کے حضرت علی نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا بھی حصہ دے دیا۔ شیعوں کو یہ اعتقاد ہوگا کہ حضرت علی (نحوذ باللہ) ”لقل کفر کفر نباشد“ ایسے دعا باز ہیں کہ اپنا دیکھیں تھے نہ پرایا جوں گیا سو ہضم کر لیا، یا شاید معصوم ہونے کے شیعوں کے نزدیک بھی معنی ہوں کہ کتنا ہی ظلم و ستم کر بیٹھیں ان کو سب مباح اور معاف ہے۔

امام کا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو بے دخل کر دینا عدم وراثت پر کھلی دلیل ہے انصاف سے دیکھئے تو معتقدان مرتضوی کے لیے یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قبضہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے اٹھا دینا اس بات کے لیے گواہ عادل ہے کہ اس ترکہ میں کسی کو میراث نہیں پہنچتی

فی اور وہ ترک وقف تھا۔ سو در صورت وقف ہونے کے اگر متولی ہوں اور ایک دوسرے کا قبضہ اٹھا دوں اس پر کچھ ظلم نہیں بلکہ بسا اوقات قرین مصلحت یہی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ زمین و باغ جب ہم کسی ایک طور پر نہیں ہوتے تب تک تردد کامل نہیں ہو سکتا، یعنی ایسی صورت میں اکثر زمین اتادہ پڑی رہتی ہے۔ سو اتادہ پڑے رہنے میں بجز اس کے اور کیا خوبی ہے کہ مساکین وغیرہ اہل معرف کا حق مارا گیا۔ بظاہر یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی رائے در باب تردد کچھ مخالف ہوئی ہو، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ ازل تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی رائے پر رہے تو نقصان اہل معرف ہے۔

مثلاً جس مزارع کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ دینا چاہتے ہوں، وہ بہ نسبت اس مزارع کے جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ دینا چاہتے ہوں، کم محصول اپنے ذمہ رکھتا ہو، یا نادہندہ، یا دعا باز ہو، وہم اس مخالف رائے میں بندوبست معلوم، اس لیے بطور خود اس ترکہ کو (برخلاف رائے حضرت عباس رضی اللہ عنہ) کسی کے حوالے کر دیا ہو اور یہ بات حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو گراں گزری ہو، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس بات کے خواستگار ہوئے ہوں کہ آدھوں آدھ بانٹ کر دونوں کو جدا جدا زمین کا متولی کر دیں۔ مع ہذا جو عبارت عربی میں مرقوم ہوئی ہے وہ خود اسی بات پر شاہد ہے کہ یہ جھگڑا فقط تولیت کا تھا اس لیے کہ اول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس بات پر عہدہ لے کر دینا کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے وہی بھیجیو، خود اسی کی دلیل ہے کہ حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو متولی کر کے دیا تھا ورنہ اس شرط کے کیا معنی؟ اگر میراث میں دیا تھا تو میراث تو وارثوں کی ملک ہوتی ہے اور مالک کو اپنی چیز کا اختیار ہوتا ہے ورنہ ہر شخص سے بہ نسبت اہل مملوکہ کے یہی عہد لیا جالیا کرتا۔

دوئم پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یوں فرمانا کہ قیامت تک اس کے خلاف حکم نہ دوں گا، خود اسی بات کو ثابت کرتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ترکہ نبوی بطور تولیت حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے کر رکھا تھا، بطور میراث نہ دیا تھا ورنہ مقصود حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما فقط تقسیم کر دینا تھا۔ سو اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کیا نقصان تھا کہ ایک شے مشترکہ کو فی مابین دو مالکوں کے تقسیم کر دیں؟ اگر بخل کرتے تو دینے ہی میں کرتے، جب دے چکے پھر تقسیم میں کیا مشکل تھی۔ ہاں در صورت تولیت یہ اندیشہ تھا کہ ایک بیٹی اور ایک چچا کا میراث میں آدھوں آدھ کا سا جھا ہوتا ہے، سو اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے وکیل تھے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہ آدھوں آدھ بانٹ کر جدا جدا متولی کر دیجئے تو مبادا

رفتہ رفتہ اگلے قرونوں میں اس تقسیم کو دیکھ کر دیکھنے پرستے والے یوں سمجھ جائیں کہ نصف حضرت
فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد کا مملوک ہے اور نصف حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد کا مملوک ہے۔

حضرت علی و عباس رضی اللہ عنہما نے بقسم حدیث صدیق رضی اللہ عنہ کی تصدیق کی

علاوہ بریں حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کا قسم کھا کر اس بات کا اقرار کرنا کہ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیشک یوں ارشاد فرمایا ہے کہ "لَا نُؤَدِّثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةً" اور پھر
میراث کا طلب کرنا شیعوں ہی کی سمجھ میں آئے تو آئے اور ان سب سے بدھ کر یہ ہے کہ مولوی
صاحب پہلے یوں رقم فرما چکے ہیں کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے (بہ نسبت) فذک کے
معانی کا کاغذ لکھ دیا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھاڑ ڈالا، پر جب حضرت عمر ابو بکر رضی اللہ عنہما
کی خلافت میں یوں ہوں تو اپنی خلافت میں تو بدرجہ اولیٰ حاوی ہونے چاہئیں۔ پھر حضرت علی اور
حضرت عباس رضی اللہ عنہما نادان تھے؟ نعوذ باللہ کہ باوجود اس قصہ کے معلوم ہونے کے مفت
خفیہ اور رسوا بننے کے لیے ایسی لغو حرکت اور نامعقول بات کرتے؟ اس سے تو یوں معلوم ہوتا
ہے کہ اگر بالفرض بفرض محال یہ بات وقوع میں آئی بھی ہے؟ تو اول بار ہی حضرت علی اور حضرت
عباس رضی اللہ عنہما کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آنا جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ترکہ
نبوی ان کے حوالے کیا تھا، محض طلب گاری تولیت کے لیے ہو، طلب گاری میراث کے لیے نہ ہو۔

کیونکہ جب یہ بات آنکھوں دیکھ چکے ہوں کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا جو جگر گوشہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، ایک شخص نے لحاظ نہ کیا، دوسروں کا لکھا لکھایا کاغذ پھاڑ ڈالا ہو،
وہ ہمارا کیا لحاظ کریں گے؟ اور وہ بھی اپنی حکومت میں ہم تو دوسرے ہی درجہ میں ہیں، خیر یہ بات
تو غلط ہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کاغذ لکھ دیا ہو اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھاڑ ڈالا،
پر اتنی بات صحیح ہے کہ اول بار کا حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا آنا بھی محض طلب
گاری تولیت کے لیے تھا۔ چنانچہ لفظ "ادفعها الینا" سے یہ بات خود ظاہر ہے جو لوگ مذاق سخن
شناس رکھتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں، باقی رہی یہ بات کہ طلب تولیت میں ان دونوں صاحبوں کو کیا
فائدہ تھا جو ظلمان اپنے سردھرتا تجویز کیا تو اس کا جواب یہ ہے۔ واللہ اعلم بحقیقت الحال کہ وقف
نبوی میں منجملہ مصارف حق اقربائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقدم ہے۔ اس سے بچے تو اور
کہیں صرف کیا جائے، خاص کرنے میں تو اشارہ خداوندی بھی موجود ہے، چنانچہ اس لیے ذی
القرنیٰ کو اوروں سے مقدم ذکر فرمایا اور حدیثوں سے بھی اس قسم کے مضمون نکلتے ہیں۔

مگر خلیفہ کو اول تو تمام خلافت کا انتظام درپیش ہے۔ فقط اوقاف ہی کا انتظام ان کے ذمہ نہیں جو ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو کر تردد کامل کرائیں، مع ہذا جن کو کچھ اوقاف سے توقع ہو جس قدر ان کے جی کو لگی ہوئی ہوگی، وہ دوسرے کے دل کو کاہے کو لگی ہوئی ہوگی؟ اس لیے حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما خواستگار تولیت ہوئے ہوں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی لحاظ وجوہ مذکورہ اور نیز یوں سمجھ کر کہ جو حال بنی ہاشم کے فلاں محتاج ہے فلاں نہیں، فلاں کو اس قدر حاجت ہے فلاں کو اس قدر، حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو معلوم ہوگا۔ وہ مجھے کاہے کو معلوم ہوگا اور یہ اندیشہ باقی ہی نہیں رہا کہ کوئی اس دینے کو میراث کا دینا سمجھے کیونکہ ”لا نورث ما ترکناہ صدقۃ“ کا گمر گمر غل پڑ گیا۔ یہ بات قبول فرمائی ہو اور بایں ہمہ نظر احتیاط تقسیم نہ فرمایا تاکہ مبادا رفتہ رفتہ بہت زمانوں کے بعد کوئی جاہل یوں نہ سمجھ جائے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو مالک سمجھا تھا، جب تقسیم کر دیا۔

مگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بطور تولیت بھی کسی کو دینا گوارا نہ کیا کیونکہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طلب میراث کا تازہ قصہ تھا، اس قصہ سے سب کے کان بڑھے۔ اس وقت اگر بطور تولیت ہی دیتے، ہر کوئی اس دینے کو بطور میراث ہی سمجھتا۔ ”لا نورث ما ترکناہ صدقۃ“ اگر سنا بھی ہوتا تب کسے دھیان آتا؟

خائن و غادر مبالغۂ استعمال ہوئے جیسا کہ محاورہ ہے

اور یہی وجہ فی الجملہ موجب گرانی خاطر حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما معلوم ہوتی ہے جس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصہ کے باعث بایں القاطع تعبیر فرماتے ہیں کہ تم ابوبکر کو کاذب آثم غادر خائن سمجھتے تھے کیونکہ تمام جہان کا دستور ہے اور نیز کلام اللہ اور احادیث سے بھی یہ بات نکلتی ہے کہ اگر کسی سے کسی موقع میں معاملہ قلبی کے برخلاف کوئی بات ظہور میں آتی ہے تو بطور مبالغہ اس کے ساتھ معاملہ قلبی کی بھی نفی کر دیا کرتے ہیں۔ مثلاً فی مابین اقربا و احباب اگر کسی سے کسی قسم کی بے اعتنائی اور بے پروائی کسی وجہ خارجی کے باعث ظاہر ہوتی ہے تو مبالغۂ کہہ دیا کرتے ہیں۔ یہ ہمارے قریب یا دوست کیوں ہوئے تھے یا یہ ہم کو اپنا قریب اور دوست ہی نہیں سمجھتے۔

سو قربت اور رشتہ داری نسبی کا حال تو ظاہر ہے کہ وہ تو کسی طرح زائل ہو ہی نہیں سکتے۔ چہ جائیکہ بے اعتنائی اور بے پروائی سے اور دوستی کا حال بھی تو ظاہر ہے کیونکہ بے اعتنائی اور بے پروائی کی جو احباب کو شکایت ہوتی ہے تو بوجہ ثبوت محبت اور بقائے اُلفت ہوتی ہے ورنہ اجنبیوں

سے کون شکایت کرتے ہیں۔ علی ہذا فقیر حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی جانب سے جو ان کے کھینچنے اور اُڑانے کا حکم حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے (جس کا ابھی بیان تھا) ظہور کرتا ہے تو یہ اُڑانے کا حکم اور یہ کھینچنے جو بڑے بڑے ائمہ اہل بیت قہریں اور اعتبار دہن کے تحت تھا جو ان دونوں کو رہنمائی کے طور پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاں مل گیا تھا کیونکہ اس سے نظر عوام میں بے اعتباری نہ پڑتی تھی۔ اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس اعتبار کو جو ان کے دل میں مرکوز تھا، نفی کر کے مبالغہ میں ان کی طرف بے اعتباری کو منسوب کیا اور دلیل اس بات کی کہ یہ کلمہ مبالغہ نہ فرمایا تھا یہی حقیقت مد نظر نہ تھا۔ خود ظاہر ہے کیونکہ حدیث ”لا نورث ما ترکہ صلفہ“ کے خود مقرر تھے، نیک قویوں ہی کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے متروکہ نبوی زبردستی سے دبا رکھا تھا اور ان کے عقیدہ کے موافق وہ عاقر، خائن، کاذب، آثم تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غصہ مبالغہ کی دلیل ہے

مع ہذا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قرینہ غضب خود اس کے ارادہ کے لیے صحیح ہے لیکن اگر قرینہ بے مولوی عمر علی صاحب کے فہم پر اور جن سے انہوں نے ایسی تعلیم پائی، ان کے فہم پر کہ ان کی بات کو جو تمام عالم میں مروج ہو، اس زمانہ میں بھی کہ پیشوا شیعہ ہو گزرے نہیں سمجھتے، کوئی ان کا مدلل بہت سے بہت توجیہ کرے تو یہ کرے کہ مولوی صاحب سمجھتے تو ہیں لیکن ابلیس لعین کی روح کو خوش کرنے کے لیے دیدہ و دانستہ فریب سے تحریف مہلکی کرتے ہیں یہ سب نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا تو انہیں یاد رہا کہ تم حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کاذب، آثم، عاقر، خائن سمجھتے تھے اور یہ یاد نہ رہا کہ انہوں نے اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا تھا ”وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُ لَصَادِقٌ بَلَدٌ رَّحِمَةً تَلْبِغُ الْحَقَّ“ یعنی اللہ خوب جانتا ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا کہ ہے، نیک اطوار، ہدایت پر، حق کے تابع تھے۔ الحاصل مولوی صاحب کی کم فہمی یا فریب بازی ہے جو ایسی بیہودہ باتیں فرماتے ہیں کہ کہیں کاسر کہیں کا پاؤں ورنہ بھستی نہ کور عرف میں ایسے کلاموں کا مروج ہونا دلوگ بھی جلتے ہیں جن کو عقل نہیں، چہ جائیکہ اہل عقل۔

مبالغہ کلام اللہ میں بطور محاورہ

اور اگر اس پر بھی اس قسم کے محاورات کی صحیح کے لیے کلام ربانی ہی کی سند مطلوب ہو تو اپنی پڑی کو ہم اس سے بھی درگزر نہیں کرتے۔ اس لیے یہ آیت ”خَشِيَ إِذَا مَسَّئَسَ الرُّسُلَ وَظَنُّوا

اِنَّهُمْ قَدْ كَلَبُواْ خَافًا هُمْ نَضْرُوْنَا“ جو سورۃ یوسف کے رکوع آخر میں موجود ہے، گوش گزار ہے۔ اس کے بظاہر یہ معنی ہیں ”یہاں تک کہ جب رسولوں کو نا اُمیدی ہونے لگی اور وہ یوں خیال کرنے لگے کہ ان سے جو کچھ امداد کے باب میں خدا کی طرف سے وعدہ و وعید تھے، سب جھوٹ تھے، ہماری مدد ان کے لیے آچکنی۔ فقط“ مگر سب اہل اسلام جانتے ہیں کہ انبیاء کی شان سے بہت بعید ہے کہ خدا سے نا اُمید ہوں اور کیوں کر نا اُمید ہوں۔ اس صورت میں اس رکوع سے پہلے رکوع میں یہ جملہ بھی موجود ہے ”اِنَّهُ لَا يَنْفُسُ مِنْ رُّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ“ جس کا یہ مطلب ہے ”پیشک نا اُمید نہیں، اللہ کے فیض سے مکر وہی لوگ جو کافر ہیں“ پھر کسی مسلمان کے خیال میں آ سکتا ہے کہ رسول اور نا اُمید ہو جائیں؟ سو اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صدق روایات کے بھروسے باتجاء مرتضوی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو مولوی صاحب کاذب خائن وغیرہ سمجھتے ہیں تو خدا وعدہ کریم تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ ہی سچے ہیں، خدا کے فرمانے کی تصدیق کر کے رسولوں کو خدا کی امداد سے نا اُمید سمجھ کر حسب ایماء آیت ”اِنَّهُ لَا يَنْفُسُ الْخ“ (نعوذ باللہ) کافر سمجھنے لگیں۔

علیٰ ہذا القیاس رسولوں کی نسبت جو اسی آیت میں یہ مذکور ہے کہ ذُاعاًءِ خداوندی میں ان کو خیال دروغ ہوا تو اس میں بھی لازم ہے کہ مولوی صاحب رسولوں کی اتباع میں کمر چست باندھیں۔ سوا ذل تو اکثر محاورات کلام اللہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ خیال باطل جو کسی وجہ سے جی میں جم جایا کرتا ہے اور اس کا یقین ہو جاتا ہے، اس کو ظن کہا کرتے ہیں، چنانچہ سورہ جاثیہ میں کفار کے اس عقیدہ کی نسبت کہ مرنے کے بعد پھر کوئی اٹھایا نہ جائے گا اور لوگوں کا مارنے والا زمانہ ہے۔ یوں ارشاد ہے کہ ”اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ“ یعنی وہ بوخوبی انگلوں کی باتیں کرتے ہیں۔ الغرض کفار کو اپنے اس عقیدہ میں شک نہ تھا مگر چونکہ ایک خیال غلط تھا، جناب باری نے اس کو بلفظ ظن تعبیر فرمایا، ایسے ہی اس مضمون میں سورہ انشعاب میں ”اِنَّهُ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يُّخَوِّدَ“ مغرمایا۔ سو اس محاورہ کے موافق اگر ”ظَنُّوْا اِنَّهُمْ قَدْ كَلَبُوْا“ کے معنی لیجئے۔ تب تو مولوی صاحب کو لازم ہے کہ نعوذ باللہ بزم خود باتجاء پیغمبران برگزیدہ خداوند کریم کے وعدوں کو بالیقین سمجھیں اور اگر موافق مشہور عن کے معنی گمان غالب یا شک سمجھتے، تب مناسب یوں ہے کہ رسولوں کو تو یوں سمجھیں کہ ان کو خدا کے کہے کا یقین نہ تھا اور اس وجہ سے نعوذ باللہ انہیں کافر سمجھیں اور اپنے آپ ان کا اتباع کر کے دین و ایمان کو برباد کریں۔

اور اگر یوں تاویل کیجئے کہ رسولوں کو جو ظن دروغ تھا بہ نسبت خداوند صادق القول نہ تھا بلکہ نصرت کے دیر ہونے سے یوں سمجھے کہ اگر وعدہ ہائے نصرت وعدہ ہائے خداوندی ہوتے تو لا جرم ان

وعدوں کا ظہور ہو لیتا اتنی دیر نہ لگتی، ہونہ ہو یہ وسوسہ شیطانی تھے، وعدہ ہائے خداوندی نہ تھے، تو اس صورت میں اوّل تو ہمیں کچھ نقصان نہیں، جو کچھ بہ نسبت یاس مرقوم ہو چکا وہی کافی ہے، دوسرے ہم کہتے ہیں کہ اس صورت میں یہ لازم آئے گا کہ انبیاء کو وحی پر اطمینان نہ ہو، نعوذ باللہ، سو یہ تو ہم جانتے ہیں، شیعہ بھی تسلیم نہ کریں کیونکہ جب انہیں ہی یقین نہیں تو پھر کس کو ہو گا؟ پھر چاہیے کہ ایمان ایک معنی بے مصداق ہو جائے کیونکہ ایمان کو یقین لازم ہے، پھر اگر اپنے اطمینان کے لیے معنی اس طرح کریں گے کہ ان کو بمقتضائے بشریت بے اختیار یہ خطرات دل میں گزرتے تھے۔ اس کو خداوند کریم نے بلفظ ظن (خواہ وہ اپنے معنی میں ہو یا بمعنی یقین) مبالغہ تعبیر کر دیا ہے تو یہ وہی بات ہے جو ہم نے پہلے بیان کی ہے۔ سو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات کو بھی ایسا ہی سمجھئے۔

مگر ہاں اگر یوں کہئے کہ نعوذ باللہ خدا کی طرف بوجہ بد اکذب کا احتمال ہو سکتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف یہ احتمال نہیں تو البتہ ہم کو مشکل ہے مگر اس کے لیے بد اکذب کے ابطال کی تقریر کی طرف مراجعت ضروری ہے۔ بہر حال انبیاء کی نسبت خداوند کریم کا یہ فرمانا کہ وہ مایوس ہو گئے یا ان کو خدا کی نسبت یا وحی کی نسبت احتمال دروغ ہوا۔ بجز اس کے صحیح نہیں ہو سکتا کہ موقع تعریض و عتاب میں مبالغہ فرما دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عبرت ہو اور آپ ایسے خیالات میں نہ پڑ جائیں یا کسی اور وجہ سے مبالغہ فرما دیا ہے سو ایسے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول مذکور کو بھی سمجھئے۔ بہر حال یہ آیت ہمارے مطلب کے لیے ثبوت کامل ہے اور اسی قسم کی اور بہت سی نظائریں اہل فہم کلام اللہ سے نکال سکتے ہیں کہ اگر معنی ظاہری مراد لیجئے اور قرآن صارفہ کا کچھ خیال نہ کیجئے تو دین ایمان کی خیر نہیں، سو اگر مولوی صاحب کو کچھ ایمان کا درد ہے تو پھر خواہ مخواہ معنی ظاہری پر جو بے لحاظ قرآن خارجیہ کے متبادر الی الفہم ہیں کچھ لحاظ نہ کریں بلکہ معنی مقصود ربانی پر نظر رکھیں۔

یعنی آیت ”حتی اذا اسبس الرسل“ کے یہ معنی لیں کہ انبیاء کے تہہ دل میں تو یقین ہی تھا کہ وعدہ ہائے الہی صادق ہیں، ایک نہ ایک روز بیشک امداد الہی آنے والی ہے۔ غرض دل سے کوئی صورت انقطاع امید اور ظن دروغ کی نہ تھی، پر جیسے بمقتضائے بشریت ہمارے تمہارے دل میں خداوند اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت خیالات فاسد اوپر کے دل میں آ جاتے ہیں اور اس سے اعتقاد قلبی میں کچھ فرق نہیں آتا، ایسے ہی انبیاء کے دل میں بھی بمقتضائے بشریت، بہ نسبت وعدہ ہائے الہی خیالات فاسد بے اختیار گزر جاتے تھے اور خدا نخواستہ اطمینان قلبی میں کچھ فتور نہ تھا، جو یوں کہئے کہ وہ واقعی نا امید ہو گئے تھے اور یقین ہو گیا تھا کہ وعدہ ہائے الہی محض دروغ تھے یا ان

کے صدق کا یقین نہ رہا تھا مگر چونکہ اس قسم کے خیالات کی وجہ سے (گو تہ دل میں نہ ہوں، اور بے اختیار ہی آتے ہوں) ظاہر نظر میں یوں ہی کہتے ہیں کہ دل میں اعتقاد ہی نہیں، یہ بات بعد تامل ہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ فقط اوپر کے خیالات ہیں۔

تو خداوند کریم نے بھی برعایت ظاہر بطور مبالغہ حعارف ان خیالات کو بلفظ ظن اور بے قراری اور جہابی بشری کو (جس کے لوازم میں سے یہ خیالات ہیں) بلفظ یاس تعبیر فرمایا لیکن اسی طرح اگر حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی نسبت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمانے کو کہ تم صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اور مجھ کو کاذب خائن وغیرہ سمجھتے ہو، حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی کشیدگی اور شکایت دلی پر (جو بمقتضائے بشریت برخلاف اعتقاد اور محبت قلبی کے جو تہ دل میں جمی ہوئی تھی، اوپر کے دل میں گزرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی) محمول کریں تو اس سے زیادہ اور تو کچھ گناہ نہ ہوگا کہ کلام اللہ کی ایک روش اختیار کی اور یہ بات تو حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے منہ سے نکالی بھی نہ تھی، احتمال ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی غلط سمجھ گئے ہوں کہ دونوں صاحب کچھ اس قسم کا خیال تہ دل میں یا اوپر کے دل میں رکھتے ہیں۔

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہی الفاظ حضرت علی رضی اللہ

عنہ کے لیے کہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی نسبت کہے

ہم تو اس کے یہی معنی سمجھتے ہیں جو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بالموافقہ مجمع عام میں اسی جلسہ میں بعینہ یہی الفاظ کہے ہیں۔ چنانچہ اسی حدیث میں جس کے حوالہ سے مولوی صاحب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو یوں کہنا کہ تم صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کاذب اور خائن وغیرہ سمجھتے ہو ثابت کرتے ہیں، موجود ہے مگر اس کو کاہے کو نقل کرتے، یہ تو صدیق اکبر ہی سے ضد ہے۔ بہر حال سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ حق بات یہی ہے جو میں نے عرض کی ورنہ حاشا وکلا جو حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے دل میں ذرہ برابر صدیق کی طرف سے بدگمانی ہو مگر افسوس یہ ہے کہ مولوی صاحب اپنی تیرہ درونی کے باعث (حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اگر بلحاظ ظاہر یوں فرمادیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دل میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سے کچھ فرق ہے) تو بے تحقیق اعتبار کر لیں اور حضرت خود اپنی زبان مبارک قسمیں کھا کھا کر ایسے کمالات جو ملک بھگ مرتبہ نبوت کے ہیں، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تعریف میں بیان فرمائیں

اور علیٰ ہذا القیاس اور آنکہ نے چنانچہ سابقاً بحوالہ کتب معتبرہ شیعہ مفصلاً مرقوم ہو چکا ہے۔ لیکن اس پر بھی کیا امکان جو مولوی صاحب کے اور سوا ان کے اور شیعوں کے دل میں کفر ٹولے۔ سبحان اللہ! کیا سمجھ ہے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی جھوکیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی معجز ہو جائیں اور تعریف ہو تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی کہے جائیں، کوئی نہیں سنتا، کسی نے سچ کہا سبکل فسیء یؤجع الیٰی اذلیہ ہم تو نہیں کہہ سکتے۔ پر شیعوں کے طور پر مولوی صاحب کی وہی مثل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سینکڑوں معجزوں پر بھی بنی اسرائیل سیدھے نہ ہوئے اور سامری کے ایک طلسم پر دین ایمان کھو بیٹھے۔ اس تقریر کے بعد مولوی صاحب کو اپنے اس چرپوز اعتراض کی قلعی کل گئی ہو گئی اور اگر بایں ہمہ بوجہ بلا دت نہ سمجھیں اور یہ دل نشین رہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو کہا وہ واقعی تھا، نہ اس میں کچھ غلطی ہے نہ اس کے سوائے ظاہری معنوں کے اور کوئی معنی۔

تو میری عرض یہ ہے کہ بیش بریں نیست حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے دل میں بھی بات ایک دفعہ کو جم گئی ہو کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے خیانت کی اور جھوٹ بول دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”لا نودث ما توکناہ صدقہ“ فرمایا ہے لیکن مولوی صاحب فرمائیں تو سہی کہ اتنی بات سے ان کے کیا ہاتھ لگا؟ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام کے دست و گریبان ہونے کا قصہ مشہور و معروف ہے، اس کا سبب بجز اس کے اور بھی کچھ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بایں وجہ کہ ان کی یہ خلقی بات تھی کہ خلاف شریعت اور مخالف حکم الہی دیکھا نہیں اور ان کے تن بدن میں آگ لگی نہیں، ذرہ برابر اگر کہیں خدا کی نافرمانی نظر پڑ جاتی تھی تو پھر تھامے نہیں تھمتے تھے، طور سے لوٹ کر جب پھمڑے کی پوجا پاٹ دیکھی تو ایک دفعہ ہی یوں سمجھ گئے کہ بنی اسرائیل نے کیا تو کیا، حضرت ہارون علیہ السلام بھی ان کے شریک حال ہو گئے یا انہوں نے بنی اسرائیل کو نندہ کا جو یہ فساد پھیل گیا۔ بہر حال ان کو شریک حال سمجھایا یوں سمجھا کہ انہوں نے کسی کو روکا نہیں لیکن اس سمجھنے میں اول تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کچھ شک نہیں رہا تھا، نہیں تو نوبت یہاں تک نہ آتی کہ ان کے سر کے بال اور ڈاڑھی پکڑ کر اپنی طرف کو کھینچتے، فقط شک اور تردد میں اتنی پیش قدمی تو کم عقل بھی نہیں کرتے۔ چہ جائیکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جن کا کمال عقل بالیقین معلوم ہے۔

حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما خطا بدگمان ہوئے

دوسرے یہ بھی سب جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غلط فہمی تھی جو یوں سمجھے۔ حضرت ہارون علیہ السلام اول تو نبی معصوم تھے ایسے امور میں شریک ہونا یا منع نہ کرنا، ان سے من جملہ

محالات ہے، دوسرے اگر معصوم نہ ہوتے تب واقع میں ان سے کچھ خطانہ ہوئی تھی، بے تحقیق فظ ظاہر حال کی وجہ سے یہ سمجھ کر کہ حضرت ہارون علیہ السلام سے درباب نبی من المنکر تقصیر ہوئی یا خود ان کے شریک حال ہو گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے آپ سے باہر نکل گئے ورنہ حضرت ہارون علیہ السلام بہر طور بے خطا تھے، شریک حال ہونا تو کجا؟ منع اور زبردستی میں انہوں نے اپنی طرف سے کوتاہی ہی نہیں کی تھی، تقدیر سے بات راست نہ آئی۔

اب دیکھئے کہ جب ایک معصوم دوسرے معصوم سے اتنے بدگمن ہو جاتے ہوں کہ نوبت ہشت مشمت کی پہنچی تو حضرت علی رضی اللہ عنہا کرنی الجملہ کچھ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف سے بدگمان ہو جائیں تو کیا حرج ہے؟ اور اہل سنت کو اس کی تسلیم میں کیا دشواری ہے، شاہو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کے نزدیک معصوم! جو ان کے کذب و خیانت کے منسوب ہونے میں کسی رکن ایمان کا تھامنا مشکل پڑ جائے، نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے اعتقاد میں معصوم کان کی طرف غلط فہمی کی نسبت کرتے کچھ جی ڈرے اور پھر بایں ہمہ نوزیہ بھی تحقیق نہیں کہ ہالینین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جی میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سے کچھ گمان فاسد ہو فقط حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عندیہ کے موافق وہ بھی مبالغہ ایک بات کہہ دی ہے ورنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بہ نسبت حدیث لا نورث ما ترکہ صلاۃ اقرار کرنا اور پھر حد سے بڑھ کر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تعریفیں کرنا۔ چنانچہ سلفا مرقوم ہو چکا ہے خود اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ دل مرتضوی لبریز حسن اعتقاد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تھا۔

اس پر بھی اگر مولوی صاحب (بزم خود) باتباع حضرت شیر خدا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کاذب و خائن و عا در و آثم سمجھتے ہیں، تو بہ نسبت حضرت ہارون علیہ السلام تو دو قدم آگے بڑھ کر ان کے عصیان اور شراکت شرک کا چھاتی ٹھوک کر اقرار کریں گے کیونکہ اول تو حضرت موسیٰ علیہ السلام معصوم اور بزم شیعہ معصوم غلط فہمی سے بھی معصوم ورنہ اہل سنت پر یہ طعن کیوں ہوتا کہ ان کے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ غلطی کھا سکتے ہیں۔ دوسرے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بہ نسبت حضرت ہارون علیہ السلام ہالینین خطا دار سمجھنا ہالینین معصوم ہے تو اس صورت میں کوئی صورت مولوی صاحب کو اس عقیدہ میں کمی کرنے کی نہیں۔

امام کی اتباع میں شیعہ اگر صدیق رضی اللہ عنہ کو برا کہیں تو حضرت

عباس رضی اللہ عنہ کے اتباع میں امام کو بھی کہیں

ادھر حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے بھی بزرگ ہیں دین کے نہیں، نسب ہی کے سہی،

تھوڑا بہت کچھ ان کا بھی اتباع چاہیے بہت نہیں، تھوڑا ہی سہی۔ مع ہذا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت محبت تھی۔ چنانچہ بحوالہ قاضی نور اللہ شوستری مرقوم ہوا ہے تو ان کی بات باون قولہ پاؤرتی کی نہیں تو کچھ تو اعتبار رکھتی ہوگی، سو جس سند سے مولوی صاحب کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کاذب سمجھنا کچھ معلوم ہوا ہے۔ اسی روایت میں حضرت عباس کا حضرت علی مرتضیٰ کو بیحد اسی طرح برا کہنا، اس سے بھی پہلے مذکور ہے۔ بلکہ شاید حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی انہیں کی بات سے سمجھا ہو کہ ایسے معاملات میں اتنے رنج میں ایک دوسرے کو کاذب وغیرہ سمجھتے ہیں۔ اسی قیاس پر انہوں نے کہہ دیا کہ تم صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ایسا سمجھتے ہو۔ سو بحکم محبوبیت و خیر صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی اعتناء چاہیے۔ اگر عذر بے اعتقادی ہے تو بہت نہیں تھوڑا ہی سہی، واہ کیا دین و کیا آئین ہے؟ جس مذہب کے ایسے دلائل ہیں وہ خود مذہب کیا ہوگا؟

ع۔۔۔۔۔ قیاس کن زنگستان من بہار مرا

اب ایک بات شرح طلب باقی رہی مگر اس کے بیان میں متردد ہوں۔ بایں خیال کہ وہ بات شاید کسی کے خیال میں آجائے تو یہ اندیشہ ہے کہ مبادا کسی متردد کو تردد پیدا ہو یا کسی متعصب کو جائے انگشت نہاد نلے اور جب یہ بھی خیال آتا ہے کہ کبھی یوں بھی ہو جاتا ہے کہ روٹی نہ کھائیے تو بھوکے مرے اور کھائیے تو ہیضہ میں جان سے گزریے، ڈرتا ہوں کہ شاید کم فہم نہ سمجھیں اور بیٹھے بھلائے گمراہ ہوں، میں اگر نہ لکھوں تو شاید خبر بھی نہ ہو لیکن بایں خیال کہ روٹی کو خداوند کریم نے نفع ہی کے لیے بنایا ہے نقصان ہو جائے تو اتفاقی ہے۔ اس لیے ہیضہ کے اندیشہ سے کوئی کھانا نہیں چھوڑ دیتا، میرا کلام تو کیا چیز ہے۔ خود کلام ربانی میں کلام ربانی کی نسبت یوں فرماتے ہیں: ”يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ط“ گمراہ کرنا اول ہے ہدایت اس کے بعد۔ پھر جب خداوند کریم نے اپنی بات کو کسی سے نہ چھپایا ہو، میں اپنے جی کی بات کیوں چھپاؤں۔

جیسے کلام ربانی اصل ہدایت کے لیے ہے، یوں کوئی اپنی کج فہمی سے بے راہ ہو تو ہو، ایسے ہی وہ باتیں جو کلام اللہ و حدیث سے مستعد ہوتی ہیں۔ اصل میں وہ ہدایت ہی کے لیے ہیں، یوں کوئی بات کے مغز کو نہ سمجھے اور بہک جائے تو اپنا سر کھائے، بہر حال لکھنا ہی مناسب سمجھ کر لکھتا ہوں۔

ترکہ نبوی کے میراث ہونے پر استدلال اور اس کے جوابات

حدیث مالک بن انس مذکور میں جس کے بعض مضامین مولوی صاحب نے رقیمہ کریمہ میں

..نا فرمائے ہیں اور اس کو ردایہ کج مسلم کہا ہے۔ یہاں مرقوم ہے کہ حضرت مر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو اسی جلسہ میں جس میں یہ دونوں صاحب جگہ تھے جوئے آئے تھے۔ بغرض الزام یوں بھی فرمایا تھا۔

[illegible]

”حاصل مطلب یہ ہے کہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور انہوں نے کہا کہ اب میں ہوں ساری باتوں کا ولی اور سونے تو تم دونوں آئے، تم تو اپنے بیٹے کی میراث مانگتے تھے اور یہ اپنی بیوی کی طرف سے ان کے باپ کی میراث مانگتے تھے، اس پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ارشاد فرمایا ہے ”لا نودث ما نرکھاہ صدقۃ موتیٰ نے انہیں کا ذب، آثم غادر خائن سمجھا۔“

اس سے دو باتیں اہل سنت کے قول کے خلاف معلوم ہوئیں، ایک تو یہ کہ حدیث "لا نودث ما
لو كناه صدقة" کو اہل سنت یوں کہتے ہیں کہ اس کے راوی حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ
عنہما بھی ہیں اور اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں خبر بھی نہ تھی ورنہ اہل سنت کے اعتقاد کے موافق
حضرت علی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی طرف بھی یہ گمان نہیں ہو سکتا
کہ باوجود یہ کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن لیا ہو کہ "لا نودث ما لو كناه صدقة" پھر
طلبگار میراث ہوں، دوسرے یہ بات ہے کہ لفظ "ميراث" اور لفظ "ميراث" اور نیز
مدین اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ جواب دینا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا کہ "لا نودث ما
لو كناه صدقة" صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ دونوں طالب میراث ہوئے، پھر جب
ان دونوں صاحبوں کو حدیث مذکور کی خبر ہی نہ ہوئی تو اب یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کا صدیق
اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کاذب وغیرہ سمجھنا اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے ان کی میراث نہ دی۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اس نہ دینے ہی کی تفریع میں یہ جان فرمایا ہے "لما ابعثناہ کاذہا الخ". سو اس صورت میں یہ توجہ ہی غلط ہوگئی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ہاں وجہ کچھ کشیدگی تھی کہ وہ ان کی تولیت تک کے روادار نہ ہوئے اور

اس کشیدگی ہی کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کاذب سمجھتے تھے اور بایں ہمہ جب میراث کے نہ دینے کی وجہ سے ان دونوں صاحبوں نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کاذب خائن وغیرہ سمجھا تو اب بجز اس کے سمجھ میں نہیں آتا، نہ دل سے کاذب وغیرہ سمجھا ہو کیونکہ کسی کی میراث کا نہ دینے والا بالیقین خائن ہے۔ البتہ اگر اس حدیث میں یوں مذکور ہوتا کہ ان دونوں صاحبوں نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بھی تولیت ہی مانگی۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مانگی تھی پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تولیت سے بوجہ مذکورہ یا بوجہ دیگر انکار کیا تو یوں بھی کہنے کی گنجائش تھی کہ تولیت کے نہ دینے میں کچھ ستم نہیں، تولیت کسی کا حق نہیں، خلیفہ کو اختیار ہے، جسے چاہے اپنی سمجھ کے موافق متولی کرے۔

جواب اول

اب ان دونوں اعتراضوں کا جواب بگوش ہوش سنئے۔ اول تو اگر ہم فرض کریں کہ حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے تولیت ہی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے طلب کی تھی، تب ان الفاظ سے کچھ اس کے مخالف ان شاء اللہ تعالیٰ نہ نکلے گا اور یہی الفاظ جو حدیث میں مذکور ہیں طلب تولیت پر محمول ہو جائیں گے، گو ظاہر میں طلب میراث ہی پر دلالت کریں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ سابق میں معنی میراث کی تحقیق میں گزر چکا ہے کہ میراث کے معنی حقیقی بھی قائم مقام ہوتا ہے، پر اصطلاح فقہاء میں میراث بمعنی مشہور میں مخصوص ہو گیا ہے۔

دوسرا جواب

اور اگر معنی حقیقی نہیں تب اس میں تو کلام ہی نہیں کہ مجاز متعارف ہے۔ چنانچہ محاورات قرآنی میں بہت مواقع میں اسی معنی میں مستعمل ہے۔

إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ. وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضَفُونَ
مَشَارِقِ الْأَرْضِ وَمَغَارِبِهَا الْبَنَىٰ بَرَكْنَا فِيهَا. نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا
اور سو ان کے اور بھی آیات میں یہی معنی مراد ہیں۔ اول دو آیتوں کا ترجمہ تو گزر ہی چکا ہے اور تیسری آیت کا حاصل یہ ہے ”کہ خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے ہم زمین کے وارث ہوں گے اور جو زمین پر رہنے والے ہیں ان کے بھی“ اور ظاہر ہے کہ بمعنی مشہور خداوند کریم کسی کا وارث نہیں۔
الحاصل ان آیات میں میراث سے میراث بمعنی قائم ہونے کے مراد ہے۔ سو تولیت میں بھی یہی

جیسے مثل مشہور ہے ”زمین کی کہیں تو آسمان کی سنیں“ اس لیے ہمیں اور بھی تکلیف اٹھانی پڑی۔ خیر
ع: برسرِ فرزندِ آدم ہر چہ آید بگذرد

اس تحریر کے مشغلہ کی کلفت بھی آخر ان شاء اللہ ایک روز رفع ہونے والی ہے۔ سوچشم انصاف
اور بگوش ہوش دیکھئے اور سنئے کہ یہ جواب سوال مذکور کے کس طرح مطابق آتا ہے۔

جناب من جواب دو طرح کے ہوتے ہیں ایک مطاعی، دوسرا التزامی، مطاعی کے معنی تو یہ سمجھئے کہ
اس کلام کے معنی مطاعی عین جواب ہو اور جواب التزامی کے ہماری اصطلاح میں یہ معنی ہیں کہ اس
کے معنی مطاعی کو اقرار یا انکار لازم ہو۔ اس جواب کو در صورت یہ کہ حضرت علی اور حضرت عباس رضی
اللہ عنہما کی طرف سے طلب میراث بمعنی معروف ظہور میں آتی۔ بمنزلہ جواب مطاعی سمجھنا چاہیے۔ گو
حقیقت میں التزامی ہے کیونکہ ان الفاظ میں سے کسی کے معنی مطاعی یہ نہیں کہ میں دوں گا یا نہ دوں گا،
مگر چونکہ اس جواب سے انکار ایسا ہی ظاہر ہے جیسے یوں کہہ دیتے ہیں کہ میں نہیں دیتا اس لیے اس
جواب کو بمنزلہ جواب مطاعی سمجھئے اور در صورت یہ کہ حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما طالب
توالت ہوئے ہوں تب اس جواب کو جواب التزامی سمجھئے۔ اس لیے کہ اس صورت میں اس کے یہ معنی
ہوں گے کہ تمہارے متولی کر دینے میں یہ اندیشہ ہے۔ مبادا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے طلب
میراث کے قرینے سے خلائق کے یہ ذہن نشین نہ ہو جائے کہ تمہیں جو دیا ہے تو بطور میراث دیا ہے۔

اور پھر رفتہ رفتہ یہ بات منقول ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ تمہارے ہمارے بعد اس میں تصرفات
مالکانہ ہونے لگیں اور آگے جو پیدا ہونے والے ہیں اس کو میراث سمجھ کر بانٹ بونٹ برابر کریں
حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا ہے ”لا نورث ما ترکناہ صدقہ“ ہر چند بعد اس
تقریر کے اس ایک جواب کے دو مختلف سوالوں پر مطابق آنے میں کسی بلید ہی کو تاثر رہے تو رہے
مگر بنظر احتیاط و مزید توضیح ایک مثال مرقوم ہے، اگر کوئی بادشاہ کسی امیر کی جاگیر اس کے انتقال
کے بعد ضبط کر کے کسی افسر کو یوں حکم دے کہ تم بطور خود لوگوں کو نوکر چاکر رکھ کر اس کا انتظام کر لو تو
اگر اس امیر کی اولاد جس کی جاگیر ضبط ہوتی ہے۔ کسی وجہ سے یوں سمجھتے ہوں کہ یہ جاگیر دوام کے
لیے تھی اور اس افسر کے اچانک نظم و نسق کو دیکھ کر اس سے یوں کہیں کہ یہ جاگیر ادو تو ہماری ہے تم
اسے کیوں دباتے ہو، لازم یوں ہے کہ اسے ہمارے حوالہ کر دو تو اس کا یہ جواب کہ بادشاہ نے اس
جاگیر کو ضبط کر لیا ہے تمہیں نہیں مل سکتی، جیسا صحیح ہے، ویسا ہی اس صورت میں بھی صحیح ہے کہ اس
امیر کی اولاد اپنی جاگیر کے ضبط ہونے سے مطلع ہوں، پر بغیر ورت طلب معیشت اس افسر سے اس

ہے کے منجھو سر کہ نہ آڑ کسی نہ کسی کا اس کے انکسار کے ہے فوڑ رکھ گئے اُس سر سے ہی ماحور
رک رکھ کر آؤ سر کا تحقیق بھی رکھتے ہیں۔ سیر طانی کی عزا ہیں۔

کُتر سر سورے میں اور اس سورے میں اختلاف ہو گا کہ کس سرے میں فوج ہو کہ کھل
اون ہے اور دوسری سورے میں بعض مقام سے جواب اترنا کہے جانے ہیں اور حاصل جواب یہ
ہے کہ یہ جو نید ہو ضبط ہو چکی ہے۔ اگر تم کو ذکر بھی رکھا جائے، اب پورا جڑ ہے کہ کوئی فہم نہ ہو
کے کان میں کچھ جائزے اور ہوشیہ کے دل میں پوچھل پٹھ جائے کہ افسر نے سیر نہ ہوں سے
بکھر ریش کر کے جائید ہو کو بدستور رہنے دیا ہے، پھر نہ چھاری غیر نہ میری غیر۔

حضرت علی و عباس رضی اللہ عنہما نے بھول سے مطالبہ کیا پھر بھولنا عیب نہیں

دوسرا جواب حضرات شیعہ اپنے حسبِ دلخواہ لیں یعنی یہی سہی کہ حضرت علی اور حضرت عباس
رضی اللہ تعالیٰ عنہما طالب میراث ہی ہوئے تھے لیکن ہاں جو اس بات کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم سے سن چکے تھے کہ "لا نودث ما توکھا صلیہ سیر اس طلب کی وجہ یہ ہوئی ہو کہ آدمی
تھے، بھول گئے، جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا، جب یاد آیا، سو اس بھول جانے میں
حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں کچھ فرق نہیں آتا، بڑے بڑے رسول بھولے ہوئے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کی بھول

حضرت آدم علیہ السلام کی شان میں خداوند کریم فرماتے ہیں "وَلَقَدْ غٰهٰنَا اٰنٰی اَقَمَ مِنْ قُلُوبِیْ
فَیْسٰی" یعنی ہم نے حضرت آدم علیہ السلام کو پہلے سے قید تاکید سب کچھ کر دی تھی، پھر بھی بھول گئے،
جب حضرت آدم خیر ذیشان ہو کر خود خدا کی قید و تاکید کو بھول جائیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ تو امام
ہی تھے، وہ بھی پھر حضرت آدم علیہ السلام ہی کی اولاد ہیں اور بحکم "اَلْوَلَدُ بِرَءِیَ لَآبِیْہِ" ان کے نسیان
کے وارث، وہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک عام بات کو بھول جائیں جس میں کسی قسم کی تاکید
اور تنقید نہیں، نہ علی العموم نہ بالخصوص حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تو فرمائیے کیا قاحت ہے؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھول

علیٰ ہذا القیاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حسبِ ہدایت خداوندی حضرت خضر علیہ السلام کے پاس
جانا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام سے بغرض تعلیم علم ملازمت کی درخواست کرنا
اور حضرت خضر علیہ السلام کا ہاں تاکید تمام یوں کہنا کہ تم سے میرے ساتھ نہ رہا جائے گا، یعنی میری باتیں

تمہارے خیال میں نہ آئیں گی، تم خواہ مخواہ اعتراض کیے جاؤ گے، پھر ہماری تمہاری کیسے بنے گی۔
 پھر ان سب کے بعد حضرت خضر علیہ السلام کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عہد لینا کہ اگر میری
 ہر اسی مد نظر ہے تو جب تک میں نہ بتاؤں، تم کسی بات کو نہ پوچھو، یہ سارا قصہ سورۃ کہف میں
 سولہویں سی پارہ کے شروع سے کچھ پہلے مذکور ہے، اس اعتقاد پر کہ خدا کے بھیجے ہوئے گئے اور اس
 اہتمام پر کہ سرور دراز قطع کیا اور پھر کیا کیا انکار اور اقرار ہوئے، حضرت خضر علیہ السلام کی جلالت
 قدر اور ان کی باتوں کا معقول ہونا یک لخت دل سے نکل گیا اور اس پر اپنا عہد بھی بھول گئے۔

چنانچہ حضرت خضر علیہ السلام کو مع حضرت موسیٰ علیہ السلام جب ایک گھاٹ کے ملاحوں نے
 بوجہ اعتقاد بے لیے دیئے سوار کر لیا اور انہوں نے بیچ میں جا کر اس کشتی کا تختہ توڑ ڈالا تو حضرت
 موسیٰ علیہ السلام سے نہ رہا گیا اور یہ کہہ اٹھے: ”اٰخَرُ قَتْنَهَا لِيُغْرِقَ اَهْلُهَا لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِمْرًا“
 یعنی اے خضر کیا تم نے اس کشتی کو اس لیے توڑ دیا کہ بیٹھنے والوں کو ڈبو دو، تم نے بھی عجیب کام کیا کہ
 کشتی والوں کے احسان کے بدلے یہ نقصان کیا۔ اس کے جواب میں جب حضرت خضر علیہ السلام
 نے یوں فرمایا ”اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا“ یعنی میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم
 سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ عذر کیا ”لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا
 نَسِيتُ“ یعنی ”میں بھول گیا تھا تم مواخذہ نہ کرو۔“

الحاصل اس اہتمام اور اس تعید پر اتنی جلدی حضرت موسیٰ علیہ السلام بھول گئے ہوں تو پھر
 حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اتنی دیر کے بعد بھول جانا کچھ بات ہی نہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام
 رسول اولو العزم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نہ رسول نہ نبی نہ اولو العزم..... نہ غیر اولو العزم، بایں ہمہ
 کوئی اہتمام اور پیش بندی نہ تھی۔ فقط اتفاقاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بات چلتی چال سن
 لی، وہ بھی اس طور پر کہ علی العموم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی۔ کچھ حضرت علی رضی
 اللہ عنہ کے سنانے کی اس میں تخصیص نہ تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بالخصوص یہ بات پیش آئی
 کہ خدا کے بھیجے ہوئے گئے اور آگے جو کچھ گزرا سو گزرا۔

سید الخلق صلی اللہ علیہ وسلم کی بھول

اور اگر نا انصافان شیعہ حضرت موسیٰ اور حضرت آدم علیہم السلام کے لسان پر نہ شرمائیں تو خود
 سرور کائنات علیہ وعلی آلہ الصلوٰات والتسلیمات کو جناب باری تعالیٰ یوں ارشاد فرماتے ہیں
 ”وَ اذْكُرْ رَبَّكَ اِذَا نَسِيتُ“ یعنی یاد کر اپنے رب کو جب بھول جایا کرے، اس سے صاف

کے صدق کا یقین نہ رہا تھا مگر چونکہ اس قسم کے خیالات کی وجہ سے (گو تہ دل میں نہ ہوں، اور بے اختیار ہی آتے ہوں) ظاہر نظر میں یوں ہی کہتے ہیں کہ دل میں اعتقاد ہی نہیں، یہ بات بعد تامل ہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ فقط اوپر کے خیالات ہیں۔

تو خداوند کریم نے بھی برعایت ظاہر بطور مبالغہ متعارف ان خیالات کو بلفظ ظن اور بے قراری اور چٹابی بشری کو (جس کے لوازم میں سے یہ خیالات ہیں) بلفظ یاس تعبیر فرمایا لیکن اسی طرح اگر حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی نسبت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمانے کو کہ تم صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اور مجھ کو کاذب خائن وغیرہ سمجھتے ہو، حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی کشیدگی اور شکایت دلی پر (جو بمقتضائے بشریت برخلاف اعتقاد اور محبت قلبی کے جو تہ دل میں جمی ہوئی تھی، اوپر کے دل میں گزرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی) محمول کریں تو اس سے زیادہ اور تو کچھ گناہ نہ ہوگا کہ کلام اللہ کی ایک روش اختیار کی اور یہ بات تو حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے منہ سے نکالی بھی نہ تھی، احتمال ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی غلط سمجھ گئے ہوں کہ دونوں صاحب کچھ اس قسم کا خیال تہ دل میں یا اوپر کے دل میں رکھتے ہیں۔

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہی الفاظ حضرت علی رضی اللہ

عنہ کے لیے کہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی نسبت کہے

ہم تو اس کے بھی معنی سمجھتے ہیں جو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بالمواجہہ مجمع عام میں اسی جلسہ میں بحینہ یہی الفاظ کہے ہیں۔ چنانچہ اسی حدیث میں جس کے حوالہ سے مولوی صاحب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو یوں کہنا کہ تم صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کاذب اور خائن وغیرہ سمجھتے ہو ثابت کرتے ہیں، موجود ہے مگر اس کو کاہے کو نقل کرتے، یہ تو صدیق اکبر ہی سے ضد ہے۔ بہر حال سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ حق بات یہی ہے جو میں نے عرض کی اور نہ حاشاؤ کلا جو حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے دل میں ذرہ برابر صدیق کی طرف سے بدگمانی ہو مگر افسوس یہ ہے کہ مولوی صاحب اپنی تیرہ درونی کے باعث (حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اگر لحاظ ظاہر یوں فرمادیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دل میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سے کچھ فرق ہے) تو بے تحقیق اعتبار کر لیں اور حضرت خود اپنی زبان مبارک قسمیں کھا کھا کر ایسے کمالات جو ملک بھگ مرتبہ نبوت کے ہیں، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تعریف میں بیان فرمائیں

آر سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ترجیح ہو، اس لیے انہوں نے بطور حبیہ و حکایت ان کے حق پر تکیہ اور اس لیے نبیوں نے نظر انصاف سکوت فرمادیا، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

اس تقریر کے بعد سید ہیں بے کہ جن کو خداوند کریم نے محض سیم صاف نمائی ہے اگر کسی بہانہ کی محبت سے بدوا بھی ہیں تو رو پر آجا میں اور جو نہا میں تو اپنا سر کھائیں۔ "مَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَلَا فَلَاحَ لَهُ" سب الحمد کہ جمع ائمہ متعہ صریح صحیح مسلم کے بیان سے فراغت پائی ملازم ہیں ہے کہ بقدر فراغت خط مولوی صاحب کا بھی جو بندگان شکن جو مولوی عبد علی صاحب احمد نذر دگر پیشوایان شیعہ کے تحت کیا تو زے سنی عدیوں شامل تفسیر ان کے صفحہ قرطاس لہ قلم و خط کو ہاتھ سے دے دیتے اس لیے تمناں میں ہے کہ ان کے مولوی عبد علی صاحب میں رقم فرماتے ہیں:

"میں صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ جس وقت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فدک کے دینے سے انکار کیا، قاطع زہر ارضی اللہ عنہا اس پر غضبناک ہوئی اور تمام عمر پھر کبھی اس سے کلام نہ کیا اور صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ قاطع زہر ارضی اللہ عنہا نے وقت مرنے کے وصیت کی کہ ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما میرے جنازہ پر نہ آنے پائیں ساجی"

یہ خط کی آخری عبارت ہے اور یہاں مولوی صاحب کی ترکی تمام ہولی کرا مل فہم پر پوشیدہ نہ رہے گا کہ بعد ثبوت مضامین مطبوعہ بالا خصوصاً اشارہ آیت "یُوصِيكُمُ اللَّهُ" (دربارہ مستحی ہونے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم میراث سے) اور صراحت آیت ما الاء اللہ (دربارہ وقف ہونے فدک وغیرہ اموال فائے کے) صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر (بوجہ نہ دینے فدک کے حضرت قاطع زہر ارضی اللہ عنہا کو) کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا، ہاں اٹکا بطور حضرت شیعہ خوارج و نو اصب کو گنجائش لب کشائی ہے کہ حضرت قاطع زہر ارضی اللہ عنہا باوجود معصوم ہونے کے۔ چنانچہ عقیدہ شیعہ یہی ہے، فدک وغیرہ اموال وقف میں سے کس لیے طلب گار میراث ہوں؟ اور پھر وہ بھی اس قدر کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایک حق بات کہہ دی تو اٹکا خد کے مارے ملتا جلتا مل ملاقات سب ترک کر دی، مگر چونکہ سانچ کو آج نہیں، سچی بات ہر طرح در رہتی ہے، اہلسنت کو اس مقدمہ میں کچھ دشواری نہیں، جیسے وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اس مقدمہ میں بے قصور سمجھتے ہیں۔ حضرت قاطع زہر ارضی اللہ عنہا جگر گوشہ سید الوردی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کسی طرح مورد اعتراض نہیں سمجھتے اور بایں ہمہ کوئی قاعدہ ان کے دین و مذہب کا متعوض نہیں ہوتا، اول تو عیاں را چہ بیان۔

قرآن فہمی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام امتی محتاج ہیں

دوسرے ہات کچھ دور نہیں، کان درست کیجئے اور سنئے۔ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہر چند سیدۃ النساء بلکسان کے خاکپاء سرساکا برادر لیا، ان کے غلامان غلام مورد افحال کبریا، ان کی محبت جو محبت کے طور پر ہو، باعث نجات اشقیاء۔ ان کا اعتقاد جماعتی کی طرح ہو باعث ترقی درجات اعلیٰ۔ لیکن پھر بھی امتی تھیں، نئی نہ تھیں، فہم قرآن مجید میں کچھ نہ کچھ حاجت تفسیر نبوی رکھتی تھیں کیونکہ فقط زبان مانی اور قوت فہم دقائق معانی سے اس جگہ کام نہیں چلتا۔ تفصیل اجمال کلام ربانی اور شرح اشکال آیات فرقانی، بجز مورد وحی آسمانی اُمّی سرور دو جہاں پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم آلہ وازد وعباد المل پیتہ و احبابہ وسلم کے تصور نہیں۔ چنانچہ خود خداوند کریم فرماتا ہے ”اَوْسَلْنَا لَكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ط“ یعنی ”بیجا ہم نے تم میں رسول تمہیں میں سے جو پڑھتا ہے تم پر ہماری آیات اور سنوارتا ہے تم کو اور تعلیم کرتا ہے تم کو قرآن اور حق بات۔ فقط“

اب غور فرمائیے کہ ”يَتْلُو عَلَيْكُمْ“ کہ جس کے یہ معنی ہیں کہ پڑھتا ہے تم پر ہماری آیتیں۔ تعلیم الفاظ قرآنی پر دلالت کرتا ہے اور ”يُزَكِّيْكُمْ“ جس کے یہ معنی ہیں کہ سنوارتا ہے اور پاک صاف کرتا ہے، تزکیہ باطن کی طرف مشیر ہے۔ بعد میں جو ”يُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ“ فرمایا تو قطع نظر اس کے کہ تعلیم عرف عرب میں معانی ہی سے متعلق ہے بعد ”يَتْلُو عَلَيْكُمْ“ کے یہ فرمانا اس بات پر دلیل کامل ہے کہ یہ تعلیم معانی کی تعلیم ہے، پھر جب ”يُعَلِّمُكُمُ“ میں خطاب تمام امت کی جانب ہو، خاص کر مسلمانان ملک عرب کی طرف جو صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مشرف باسلام ہو چکے تھے۔ چنانچہ لفظ ”منکم“ سے عیاں ہے تو معلوم ہوا کہ اور سب علم معانی قرآن میں محتاج سرور دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور نیز یہ بھی متحقق ہو گیا کہ تعلیم معانی قرآن کی قابلیت بھی ہر کسی میں نہیں جب تک تزکیہ نام نہ ہو، تب تک تعلیم معانی قرآنی بے موقع ہے۔ اسی واسطے ”يُعَلِّمُكُمُ“ کے بعد ”يُزَكِّيْكُمْ“ فرمایا اور شواہد اس دلیل کے قرآن میں بہت ہیں، حافظان علم پر مخفی نہ رہے گا۔ من جملہ ان کے ایک جگہ شان قرآن میں ”وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ“ فرماتے ہیں یعنی اتاری ہم نے تجھ پر کتاب جس میں ہر چیز کی تفصیل اور بیان ہے۔

وَمَا أَوْثِقُكُمْ سِرُّهُ سِرُّهُ دَعَا لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَسْتَقْبَلِ

اور ایک جگہ علاوہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اوروں کو فرماتے ہیں ”وَمَا أَوْثِقُكُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا

فَلْيَدْرُءُ، یعنی ”نہیں دیئے گئے تم علم سے مگر تھوڑا“ اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے مستثنیٰ ہونے کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ لفظ ”قُلُّ الرُّوح“ جو اس سے پہلے ہے اس بات پر شاہد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمنزلہ قاصد اس خطاب اور اس فرمان کے پہنچانے والے ہیں، داخل زمرہ مخاطبین نہیں اور بایں ہمہ ہم یہ کب کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی قرآن کے دقائق کو خدا کے برابر سمجھتے ہیں لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اوروں سے سب سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ القصہ ناظرین فہمیدہ کو کلام اللہ میں سے اس قسم کے بہت سے مضامین ملیں گے جن سے دعویٰ احقر کی تصدیق ہو اور اگر کوئی بسبب کجی طبیعت کے ان کے موید ہونے میں کسی وجہ سے تکرار کرے تو کرے، بدستادیز آیت ”أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا الْخ“ جو کچھ بندہ ہچکچاہٹ سے عرض کیا ہے وہ کسی کے باپ سے رد نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی فہم قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محتاج تھیں

خیر بہر حال حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا در باب فہم معانی قرآنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی محتاج ہونا کلام اللہ سے ثابت ہونہ ہو، پر اہل سنت کے نزدیک تو یہ بات لاریب مسلم ہے اور اس کے مخالف کسی دلیل عقلی یا نقلی سے آج تک کوئی بات ان کو ثبوت کے ساتھ نہیں پہنچی اور کیونکر پہنچے؟ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا در بارہ فہم قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محتاج ہونا اظہر من الشمس ہے، محتاج دلیل نہیں، اس کے خلاف کا غلط ہونا بھی ہر کسی کے نزدیک روشن، پھر اگر کسی آیت کے فہم میں بسبب اس کے کہ اس کی تفسیر زبان گوہر ریز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنی ہو۔ فی الجملہ غلطی ہو جائے اور اس کے کسی اشارہ مخفی کو نہ سمجھیں تو اہل انصاف فرمائیں کہ اس میں کیا محال ہے؟

علیٰ ہذا القیاس اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بلکہ آج کل کوئی شخص اہل فہم میں سے اس اشارہ مخفی کو جو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے رہ گیا ہو، بہ تنبیہ (نسبت و تفسیر نبوی) سمجھ جائے تو کیا قباحت ہے؟ نہ اس بات سے کچھ کسر شان حضرت زہرا رضی اللہ عنہا لازم آتی ہے اور نہ اس وجہ سے دوسروں کو ان پر فوقیت ہو سکتی ہے۔

اگر کسی ایک بات کے جاننے سے کسی کو فضیلت ہو تو

حضرت خضر حضرت موسیٰ علیہم السلام سے افضل ہوتے

اگر ایک بات کے سمجھ لینے سے سمجھنے والوں کو نہ سمجھنے والوں پر فوقیت ہو کرتی تو حضرت خضر کو

حضرت موسیٰ علیہم السلام پر فوقیت ہوتی کیونکہ کشتی کے توڑنے اور لڑکے کے قتل کرنے کی وجہ
 وجود یہ کہ یہ سب حضرت خضر علیہ السلام نے ہمارے خداوندی کیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ
 سمجھے اور حضرت خضر علیہ السلام ان سب کی وجوہ جانتے تھے، چنانچہ واقفان کلام ربانی جانتے ہیں
 مالاںکہ مذہب صحیح یہی ہے کہ حضرت خضر نبی نہ تھے اور اگر تھے بھی تو ہابعام امت حضرت موسیٰ
 علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام سے افضل ہیں۔

ادھر حضرت داؤد علیہ السلام کا کھیتی کے مقدمہ میں غلطی کھانا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا حکم
 خداوندی کا سمجھ جانا معروف و مشہور ہے اور قرآن میں مذکور حالانکہ جس وقت یہ قصہ پیش آیا، اس
 وقت حضرت داؤد علیہ السلام پیغمبر وقت تھے اور پیغمبر بھی کیسے اولوالعزم، اور حضرت سلیمان علیہ
 السلام جب تک نہ نبی ہوئے تھے اور نہ امام تھے اور بایں ہمہ صغیر السن، کیونکہ وقت وفات حضرت
 داؤد علیہ السلام حضرت سلیمان علیہ السلام کی عمر کل بارہ برس کی تھی جب یہ قصہ پیش آیا۔ جب تو اور
 بھی چھوٹی عمر ہوگی، پھر جب حضرت داؤد علیہ السلام (حالانکہ نبی وقت اور رسول اولوالعزم تھے)
 ایک مسئلہ میں غلطی کریں اور ایک لڑکا نو عمر بات صحیح کہہ دے۔

تو اسی طرح حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اگر ایک اشارہ بے تعلیم نہ سمجھیں وہ بھی آیت
 ”یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَبِرُوْا عَلٰی مَا لَآئَیْکُمْ مِنَ الرَّسُوْلِ عَلٰی حَقِّهِ“ کا اشارہ، جو من جملہ آیات قرآن مجید ہے جس کا ہم کامل تجوید و تعلیم سرور عالم صلی
 اللہ علیہ وسلم ممکن نہیں۔ چنانچہ معلوم ہو چکا اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بلکہ آج کل کے پڑھنے
 لکھنے والے جو کسی طرح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بلکہ ان کے خاکپا ملو ان کے سگھ کے برابر نہیں
 ہو سکتے، بوجہ تعلیم نبوی سمجھ جائیں تو کچھ حرج نہیں، علیٰ ہذا القیاس ممکن ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ
 عنہا کو اول فدک کا فتنے ہونا نہ معلوم ہو کیونکہ ایسے قصے اکثر مجاہدین اور عائشیں کو معلوم ہوتے ہیں اور
 بایں ہمہ آیت ما افاء اللہ سے بھی اراضی فتنے کا غیر ملوک ہونا باطل ہی لگتا ہے۔ چنانچہ ناظرین وجوہ
 مسطورہ بالا پر (جو دربارہ تحقیق غیر ملوک ہونے اراضی فتنے لکھے گئے ہیں) پوشیدہ نہ رہے گا۔

اور اس نہ سمجھنے اور اس بے علمی کے باعث بعد وفات سرور کائنات علیہ علی آلہ افضل الصلوٰت و
 اکمل التحیات حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے طالب میراث ہوئیں کیونکہ جب تک اشارہ وجوہ
 اراضی فتنے یوحی اور اشارات مذکورہ پر اور علیٰ ہذا القیاس وجوہ غیر ملوک ہونے اراضی فتنے پر جو آیت
 ما افاء اللہ کے پس و پیش سے مستبعد ہیں، نظر نہ ہو تب تک ظاہر آیت ”یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَبِرُوْا عَلٰی مَا لَآئَیْکُمْ مِنَ الرَّسُوْلِ عَلٰی حَقِّهِ“ اسی طرف ہے کہ
 پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم بھی حکم میراث میں شریک امت ہیں۔

سیدہ رضی اللہ عنہا نے سماع حدیث کے بعد ندامت کے سبب بات چیت زندگی
مگر جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حدیث وغیرہ صلی اللہ علیہ وسلم سنادی ہو، تب اس طلب
گاری سے ایک گونہ ندامت اور رنج حاصل ہوا ہو کیونکہ انبیاء اور مرسلین اور صدیقین اور کاملین کو
لازم ہے کہ اگر کوئی بے اعتدالی ان سے ظہور میں آئے تو بعد اطلاع اس پر ندامت ہوا کرے۔
چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کا گیسوں کے کھالینے پر نادم ہونا اور علی ہذا القیاس حضرت نوح علیہ
السلام کا دعائے نجات فرزند سے نادم اور پشیمان ہونا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قتل قبلی سے
شرمندہ ہونا خود قرآن میں موجود ہے۔

اور اس ندامت کے باعث حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے سبب و ضبط میں فرق آ گیا ہو اور ملتا
جتنابہ طور سابق نہ ہا ہونہ یہ کہ طے پر بھی کلام سلام کی نوبت نہ آتی ہو کیونکہ اس طرح کی حدیث
تمن جن سے بنیاد حرام ہے۔ چہ جائیکہ تمام عمر؟ وہ بھی ایسے مسلمانوں میں، بہر حال ترک کلام میں جو
بعض روایات میں ہے، اہلسنت کے نزدیک حضرت طاہرہ رضی اللہ عنہا کی طرف کچھ حرف نہیں۔

سماع حدیث کے بعد سیدہ کو کلام کی حاجت ہی نہ رہی

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یہ ہے کہ اس کلام نہ کرنے سے یہ مراد ہے کہ جب حدیث ۳۴ نوٹ سن لی تو پھر
فدک کے مقدم میں کچھ جان و تہہ انہیں کی اللہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے چھوڑ دینے سے یہ مراد ہے
کہ چپکے ہو کر اپنے گھر میں بیٹھ جیں اور حدیث مذکورہ سن لینے کے بعد پھر ان کا بیچا نہیں لیا اور کیمر
سے آ کر بیٹھتے حضرت طاہرہ رضی اللہ عنہا اور بنیادوں میں کیا فرق رہا۔ مگر حضرت صدیق اکبر رضی
اللہ تعالیٰ عنہ سے خالص محبت و اعتقاد و نیاز و مندی و اقتیاس اس نہ ملنے کا قصہ پر محمول کر کے حضرت طاہرہ
رضی اللہ عنہا کے ذریعہ پر حاضر ہوئے ہوں اور علی ہذا القیاس اور لوگ بھی اسے قصہ ہی سمجھتے ہوں اور
اس لیے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو سفارش کے لیے امداد بھیجا ہو اور
حضرت طاہرہ رضی اللہ عنہا نے تسکین صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کیلئے اظہار و ضاہر خوشی کر دیا ہو۔

وَجَدْتُ كَلْفَظَ كِي

باقی کسی کمال میں یہ ظہان رہے کہ روایات میں تخریج مذکور ہے کہ حضرت طاہرہ رضی اللہ عنہا
نہ تھا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے قصہ ہو گئیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو روایات صحیحہ
روایات مسلم و بخاری میں "فَوَجَدْتُ لَهَا طَعْنَ" واقع ہے اور "وَجَدْتُ" جیسا بمعنی "غضبنت"

سیدہ رضی اللہ عنہا نے سماع حدیث کے بعد ندامت کے سبب بات چیت بند کی مگر جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حدیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سنادی ہو، تب اس طلب گاری سے ایک گونہ ندامت اور رنج حاصل ہوا ہو کیونکہ انبیاء اور مرسلین اور صدیقین اور کاملین کو لازم ہے کہ اگر کوئی بے اعتدالی ان سے ظہور میں آئے تو بعد اطلاق اس پر ندامت ہوا کرے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کا گیسوں کے کھالینے پر نادم ہونا اور علی ہذا القیاس حضرت نوح علیہ السلام کا دعائے نجات فرزند سے نادم اور پشیمان ہونا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قتل قبلی سے شرمندہ ہونا خود قرآن میں موجود ہے۔

اور اس ندامت کے باعث حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ربط و ضبط میں فرق آ گیا ہو اور ملتا جلتا بدستور سابق نہ رہا ہو، نہ یہ کہ ملے پر بھی کلام و سلام کی نوبت نہ آتی ہو کیونکہ اس طرح کی متارکت تمن دن سے زیادہ حرام ہے۔ چہ جائیکہ تمام عمر؟ وہ بھی ایسے مسلمانوں میں، بہر حال ترک کلام میں جو بعض روایات میں ہے، اہلسنت کے نزدیک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف کچھ حرف نہیں۔

سماع حدیث کے بعد سیدہ کو کلام کی حاجت ہی نہ رہی

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کلام نہ کرنے سے یہ مراد ہے کہ جب حدیث ”لا نودث من لی تو پھر فذک کے مقدمہ میں کچھ چون و چرا نہیں کی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے چھوڑ دینے سے یہ مراد ہے کہ چپکے ہو کر اپنے گھر میں بیٹھ رہیں اور حدیث مذکورہ سن لینے کے بعد پھر ان کا پیچھا نہیں لیا اور کیونکر لیں؟ اگر ایسا ہو تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور دنیا داروں میں کیا فرق رہا۔ مگر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بخاضے محبت و اعتقاد و نیاز مندی و انقیاد اس نہ ملنے کو غصہ پر محمول کر کے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے در دولت پر حاضر ہوئے ہوں اور علی ہذا القیاس اور لوگ بھی اسے غصہ ہی سمجھتے ہوں اور اس لیے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو سفارش کے لیے اندر بھیجا ہو اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے تسکین صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کیلئے اظہار رضا اور خوشی کر دیا ہو۔

وَجَدَتْ لَفْظَ كِي

باقی کسی کے دل میں یہ غلبان رہے کہ روایات میں بتقریح مذکور ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے غصہ ہو گئیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو روایات صحیحہ مثل روایات مسلم و بخاری میں ”فَوَجَدَتْ لَفْظَةً“ واقع ہے اور ”وَجَدَتْ جَبِيصًا بِمَعْنَى ”غَضَبَتْ“

ہے جو غصہ پر دلالت کرتا ہے ویسا ہی بمعنی "وَجَدْتُ" بھی ہے جو وزن و غم پر دلالت کرے۔ چنانچہ قاموس وغیرہ کتب لغت نایاب نہیں جسے تامل ہو دیکھ لے، پھر کون سی ضرورت ہے کہ "وَجَدْتُ" بمعنی "غَضَبْتُ" ہی لیجئے اور خواہی خواہی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا غصہ ثابت کیجئے۔

وَجَدْتُ کے صلہ پر بحث

اور اگر کوئی وہی یوں تکرار کرے کہ ہم نے مانا "وَجَدْتُ" دونوں معنوں میں مستعمل ہوتا ہے لیکن اس کے بعد اگر کلمہ علی ہوتا ہے تو غصہ ہی کے معنی ہوتے ہیں، ہاں اگر اس کے صلہ میں حرف با واقع ہو تو پھر معنی حزن کی گنجائش ہے مگر اس مقام میں بعد "وَجَدْتُ" صحیح مسلم میں فقط علی ابی بکر ہی واقع ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "وَجَدْتُ" بمعنی غَضَبْتُ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے عندیہ کے موافق دوسرے کے کلام کے معنی سمجھتا ہے۔ اسی واسطے روایت بالمعنی، اول تو ہر کسی کی مقبول نہیں اور مقبول بھی ہو تو ہم پایہ روایت باللفظ نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ حقیقت الامر کچھ اور ہو اور راوی کچھ اور سمجھ گیا ہو۔

آخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا اور اپنے معاملات میں اگر آدمی تامل کرے تو اکثر ایسے قصے پیش آتے ہیں۔ سو ممکن ہے کہ کہنہ والے نے فقط "وَجَدْتُ" فاطمہ کہا ہو اور سننے والے نے بایں خیال کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی کبیدگی کو جو حقیقت بوجہ عداوت تھی، بوجہ غضب سمجھ رہا تھا، "وَجَدْتُ" کو بمعنی غَضَبْتُ محمول کر کے روایت کے وقت روایت بالمعنی کی ہو اور اپنی سمجھ کے موافق فقط علی ابی بکر بھی زیادہ کر دیا ہو۔ بہر حال جب تک احتمالات صحیح پیدا ہو سکیں تب تک اہل عقل کو لازم یہی ہے کہ اہل کمال کی طرف سے بدگمان نہ ہوا کریں۔

اہل کمال کے کلام کا وہ محمل تلاش کیا جائے جس سے حسن ظن قائم رہے جناب ہاری تعالیٰ نے جو حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہم السلام کا سورہ کہف میں بیان کیا ہے جس میں حضرت خضر علیہ السلام کا ان ملاحوں کی کشتی کا توڑنا جنہوں نے ان کے ساتھ احسان کیا تھا اور بے لیے دیئے ان کو پارا تار دیا اور بے گناہ صغیر اسن لڑکے کو قتل کر دیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ان دونوں پر اعتراض کرنا مذکور ہے۔ اس کے بیان کرنے میں ایک یہ بھی حکمت ہے کہ مردمان کو تباہ بین کو اگر بزرگان دین کا کوئی امر خلاف عقل یا نقل نظر آئے تو اپنی نظر کا تصور سمجھیں اور ان کی نسبت گمان فاسد نہ کریں۔

علیٰ ہذا القیاس وغیر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے "ظَنُّوا الْمُؤْمِنِينَ خِيَرًا" فرمایا ہے تو اس سے بھی غرض یہی ہے کہ اگر تمہاری نظر میں کسی مؤمن کا کوئی کام خلاف شرع نظر آئے تو گو ظاہر میں روک ٹوک کرو تا کہ اگر واقع میں برا ہو تو اس کا اسناد ہو جائے پر دل سے بدگمان نہ ہو، اپنی طرف سے نیک ہی گمان کرتے رہو، نہ یہ کہ اچھے کاموں کو اچھا سمجھو کیونکہ اچھے کاموں کو ہر کوئی خود بخود اچھا سمجھتا ہے، حکم کی کیا حاجت تھی؟ اس تقریر سے اگر کسی کے جی میں یہ روگ بھی ہوگا کہ ان احتمالات سے کیا کام چلتا ہے۔ ظاہر میں جو کچھ سمجھ میں آوے، ہم تو جانیں وہی بات ٹھیک ہوگی تو ان شاء اللہ مرتفع ہو جائے گا۔ بہر حال گو یہ احتمال بہت سے نظر آتے ہیں مگر عقل سلیم ہو تو پایہ تحقیق سے کم نہیں کیونکہ مناسب حال حضرت فاطمہ اور حضرت صدیق اکبر یہی ہے۔ مع ہذا منصب دعوائے منکران صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف ہے اور ظاہر ہے کہ دلیل مدعی جب ہی مفید مطلوب ہوتی ہے کہ کوئی احتمال خلاف مطلوب نہ بن سکے ورنہ مدعا علیہ کی فقط ایک لائسلم میں شیخ چلی کا گھر بنا بنا ڈھ جائے گا۔ سو اگر دشمنان صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو یہ منظور ہے کہ لفظ وجہت اور قصہ مندرجہ روایات سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا غصہ ہونا ثابت کریں تو اول ان احتمالات کو باطل کریں۔ جب اس طریق سے اپنی عاقبت خراب کرنے کا ارادہ کریں۔

سیدہ رضی اللہ عنہا صدیق رضی اللہ عنہ سے بوجہ غلطی آزر وہ ہوئیں

اور ہم نے مانا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اس مقدمہ میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے آزر وہ خاطر ہی ہوئیں لیکن اس سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قصور وار ہونا کہاں سے ثابت ہوا۔ نہایت سے نہایت ثابت ہو تو یہ ہو کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا بوجہ غلطی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو قصور وار سمجھ کر ان پر غضبناک ہوئی ہوں۔ سو ایسا بسا اوقات انبیاء و مرسلین کو بھی باہم پیش آتا ہے۔ حالانکہ وہ بالیقین معصوم ہیں، چہ جائیکہ صدیق؟ حضرت ہارون علیہ السلام کا چھڑے کو پوجنے کے مقدمہ میں بے قصور ہونا کلام اللہ سے ثابت ہے اور پھر بایں ہمہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ان پر غصہ ہونا یہاں تک کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی داڑھی اور سر کے بال کھینچنے تک کی نوبت آئی، خود کلام اللہ ہی میں موجود ہے۔ سو جیسا حضرت ہارون علیہ السلام تو یوں بے قصور کہ وہ بے قصور تھے ہی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یوں کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے عندیہ میں بے جا غصہ نہیں ہوئے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حضرت ہارون علیہ السلام پر ناراض ہوئے

بلکہ ہاں نظر کہ ان کا بڑے بھائی پر غصہ ہونے کا کوئی منصب نہ تھا، اگر خدا واسطے کی بات نہ ہوتی تو

حضرت ہارون علیہ السلام ان کا خون بھی کر دیتے تو منہ مارتے۔ چہ جائیکہ یوں دست و گریباں ہونے کی نوبت آئی، پر مسلمان کو یقین ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس غیظ و غضب میں اجر عظیم ملے۔ اب لازم یوں ہے کہ اسی طرح حضرت فاطمہ سیدۃ النساء اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہما کی ہاہم رنجش اور چپقلش کو سمجھئے اور دونوں کو اس مقدمہ میں بے تصور اور دونوں کو ماجر سمجھئے اور ہم نے اسی دن کے لیے اس کی تحقیق آیت محمد رسول اللہ الخ کے ذیل میں بخوبی کی ہے، اگر کسی کو زیادہ تر تسکین مد نظر ہو تو پلٹ کر دیکھ لے۔

بالفرض اگر صدیق ہی کی غلطی تھی تو توبہ کر لی (کتب شیعہ)

اور اس سے بھی درگزر کیجئے، ہم کہتے ہیں، شیعہ ہی سچ فرماتے ہیں، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی قصور وار تھے لیکن جب انہوں نے توبہ کر لی تو پھر کیا گناہ باقی رہ گیا؟ جو شیعوں کی زبان نہیں تھمتی۔ مشہور ہے ”الْكَاتِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ“ ہاں توبہ کرنے کا ثبوت اگر مد نظر ہو تو یہ بات معقول، لیکن ہم سند بھی ایسی رکھتے ہیں جسے شیعہ سلنا سلنا کہتے کہتے تھک جائیں اور برسرِ چشم رکھتے رکھتے مر جائیں۔ شیخ ابن مطہر علی منہج انکرامت میں یوں ارشاد فرماتے ہیں ”لَعَنَّا وَغَضَّطْنَا فَاِطْمَءَا بَا بِكَرٍ فِيْ هٰذَاكَ كَتَبَ لَهَا بِكَتَابًا وَرَدَّهَا عَلَيْهَا“ یعنی ”جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو فدک کے مقدمہ میں دعت و پند کیا تو انہوں نے فدک کو ان کے نام لکھ کر فدک کو ان کے حوالے کر دیا۔“

یہ روایت ہر چند، چند بار گزر چکی ہے لیکن بحکم نقل مشہور ”هُوَ الْجِسْمُ مَا تَوَرَّكَ يَتَضَوُّع“ یعنی ”مشک کو جتنا گھسو، یا جتنی بار لگاؤ زیادہ ہی زیادہ خوشبودے گا“ بار بار اس روایت کے نقل کرنے کو جی چاہتا ہے، یہ بھی ایک حضرت فاطمہ زہرا سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا کی کرامت ہے کہ حق نے تہمت رنج ناحق سے شیعوں ہی کے منہ سے ان کو بری کر دیا۔ ادھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی نیک نیتی کو ماننا چاہیے کہ کیسے طوفان سے ان کو بچالیا اور شیعوں ہی کے منہ سے ان کے سب اعتراضوں کا جواب دلوا دیا۔ اب کسی شیعہ مذہب کا یہ منہ نہیں کہ بہ نسبت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بوجہ غضب فدک اہلسنت سے ناٹشی ہو۔ اس روایت نے شیعوں کے سب دعوؤں کو ڈھس مٹ کر دیا، ہبہ کا ہوا میراث کا، وصیت کا یا کسی اور وجہ کا، بہر حال خداوند ذوالجلال نے شان ”وَكَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ“ دکھا دی۔

اور اگر بالفرض بغرض محال یہ روایت شیعوں کی ایسی معتبر کتابوں میں نہ ہوتی، تب دوسری دستاویز حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بری الذمہ ہونے کی موجود ہے۔

مجاہد الساکین میں جو عمدہ کتب فرقہ امامیہ ہے اور نیز اور کتابوں میں یہ روایت موجود ہے اور اسی کے لکھنے کا وعدہ بہت دور سے ہم کرتے چلے آتے ہیں، سو آج بفضلہ تعالیٰ اس کا وقت آ پہنچا۔
 ”کُلُّ أَمْرٍ مُّزْهُونٌ بِوَقْتِهِ“ خیر یہ روایت قابل مطالعہ ہے۔

إِنْ أَبَا بَكْرٍ لَّمَّا رَأَىٰ أَنْ فَاطِمَةَ الْقُبُصِ عَنْهُ وَهَجَرَتْهُ وَلَمْ تَتَكَلَّمْ بَعْدَ ذَلِكَ لِيْهِ أَمْرٌ بِذَلِكَ كَثُرَ ذَلِكَ عَنْهُ فَلَا زَادَ اسْتِرْضَاءُ مَا فَاتَاهَا فَقَالَ لَهَا صَدَقْتَ يَا ابْنَتَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيَمَّا ادْعَوْتِ وَلِكِنِّي رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْطِيهَا فَيُعْطِي الْفُقَرَاءَ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ بَعْدَ أَنْ يُوتِيَ مِنْهَا قُوتَكُمْ وَالصَّائِعِينَ بِهَا فَقَالَتْ أَفْعَلُ فِيهَا كَمَا كَانَ أَبِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْعَلُ فِيهَا فَقَالَ ذَلِكَ اللَّهُ عَلَىٰ أَنْ أَفْعَلَ مَا كَانَ يَفْعَلُ أَبُوكَ فَقَالَتْ وَاللَّهِ لَتَفْعَلَنَّ فَقَالَ وَاللَّهِ لَا أَفْعَلَنَّ ذَلِكَ فَقَالَتْ اللَّهُمَّ اشْهَدْ فَرَضَيْتَ بِذَلِكَ وَأَخَذْتَ الْعَهْدَ وَكَانَ أَبُو بَكْرٍ يُعْطِيهِمْ مِنْهَا قُوتَهُمْ وَيُقْسِمُ الْبَاقِي فَيُعْطِي الْفُقَرَاءَ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ.

”حاصل اس روایت کا یہ ہے کہ جب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ان سے کشیدہ خاطر ہو کر گئیں اور ان کو چھوڑ بیٹھیں اور پھر فدک کے مقابلہ میں کچھ گفتگو نہ کی تو یہ بات انہیں دُشوار معلوم ہوئی، سو ان کے راضی کرنے کا ارادہ کیا۔ ان کے پاس حاضر ہو کر یہ عرض کیا کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی، تم اپنے دعوے میں سچی ہو، تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہہ کر دیا ہو گا مگر میں کیا کروں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے یوں دیکھا ہے کہ اس کی آمدنی کو تقسیم کر دیا کرتے تھے اور تمہارے کھانے پینے کا خرچ اور محصلوں کی مزدوری دے کر جو کچھ بچتا تھا، فقیروں مسکینوں کو دیا کرتے تھے، اس پر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اچھا تم بھی وہی کیے جاؤ جس طرح میرے والد بزرگوار سید الابراہیم محمد مختار صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے، انہوں نے کہا کہ اس بات پر تم مجھ سے قسم لے لو، میں وہی کرتا ہوں گا جو تمہارے والد بزرگوار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔ اس پر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے قسم سے پوچھا، کیا تم سچ ہی اس طرح کرو گے؟ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے قسم کھا کر عرض کی، میں یہی کروں گا، جواب ٹھہرا ہے۔ اس پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے یوں کہا کہ الہی تو گواہ رہیو۔ سو اس بات پر راضی ہو گئیں اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے عہد لے لیا۔ سو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ انہیں اس میں سے ان کے کھانے پینے کا خرچ دے کر باقی کو فقراء اور مساکین اور مسافروں کو تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اچھی“

بلسلسہ برأت صدیق رضی اللہ عنہ روایت کے چند فائدے

اس روایت سے چند فائدے ہوئے ایک تو یہ کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو دعویٰ بہہ میں جھوٹا نہیں سمجھا، پر یوں سمجھ کر کہ بہہ بے قبض موجب ملک نہیں ہوتا۔ چنانچہ مطلق علیہ شیعہ دسی ہے اور اس کی تحقیق ساہتا گزر چکی ہے، دینے سے عذر کیا۔ سواگر بالفرض والتقدیر روایت بہہ صحیح بھی ہو جائے تو شیعوں کا یہ تاسف کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو جھوٹا سمجھا۔ چنانچہ حضرت مولوی صاحب نے بھی اس بات کو نامہ اکی میرٹا در علی میں لکھ کر اپنا نامہ سیاہ کیا ہے۔ محض بچا اور بے موقع ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فدک کی آمدنی میں سے ایک جہ تک نہیں جھوا بلکہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے خرچ سے جو کچھ بچا، فقراء وغیرہم کو دے دلا دیا۔

سو معلوم ہوا کہ فدک کے نہ دینے میں کوئی غرض دنیاوی نہ تھی، ہونہ ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں جھک کچھ سن لیا تھا، جو باوجود اس بے غرضی اور اس بے طمعی کے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو نہ دیا۔ ان دونوں فائدوں سے نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت ام ایمن اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی گواہی کا قصہ شیعوں کا ڈھکوسلا بتایا ہوا ہے کیونکہ گواہوں کا مطالبہ تو جب ہی ہوتا ہے کہ مدعی کی طرف دروغ کا احتمال ہو۔ ہاں اگر اپنے آپ خورد برد کرنا نہ نظر ہوتا تو یوں بھی کہنے کی گنجائش تھی کہ یہ فقط ٹال ٹلاؤ تھی مگر بد گمانوں کو اب بھی شاید یہ گمان ہو کہ اول نہ دینا ہی مد نظر ہوگا، اور اس وقت گواہ بھی طلب کیے ہوں، انجام کار خدائے تعالیٰ یا اندیشہ ملامت خلق سے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے پاس آ کر اپنی بات کے بتانے کے لیے یہ حیلہ برپا کیا ہو۔ سو اس کا جواب اول تو یہی ہے کہ:

ع:..... بد گمان وہم کی دار نہیں لقمان کے پاس

دوسرے ہم نے تسلیم کیا یونہی تھا لیکن غصب فدک اگر برا تھا تو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی ناخوشی کی وجہ سے برا تھا۔ جب وہ راضی ہو گئیں تو شیعوں کو رنج کیوں ہے؟ مگر اس صورت میں بوجہ مخالفت حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کچھ انہیں پر وبال پڑے تو پڑے، حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو تو خدا نے بچا ہی لیا۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ فدک تاحین حیات سرور کائنات علیہ علی آلہ افضل المصلوات واکمل التحیات ہی کے قبضہ و تصرف میں رہا۔ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا قابض اور دخل ہوئی تھیں ورنہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اس بات کے جواب میں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں دیکھا ہے کہ تمہیں تمہارا خرچ اور مصلوں کی مصلی دے کر فقراء وغیرہم کو بانٹ

دیا کرتے تھے، یوں نہ فرماتیں کہ اچھایوں ہی کیا کرو بلکہ اپنا قبضہ جتا تیں جہاں سو، وہاں سوائے۔ جب ہبہ کا دعویٰ کیا حالانکہ یہ ایک فخل ہات ہے، ہر کوئی اسے نہیں جان سکتا تو قبضہ تو مکمل ہات ہے، اس کے دعویٰ میں کیا دشواری ہے، ہبہ کے دو تین ہی گواہ تھے، اس کے تو ہزاروں نکل آتے۔ چوتھا یہ کہ صدیق اکبرؓ سے یہی چاہتے تھے کہ فدک سیدۃ النساءؓ ہی کے پاس چلا جائے اور ان کی خاطر مبارک پر کسی طرح میل نہ آئے ورنہ ان کو ان کے ناخوش ہونے میں کیا دشواری تھی؟ اور ان کے خوش کرنے کی کیا ضرورت ہوتی؟ اور یہ پہلے آیت محمد رسول اللہ کے ذیل میں ثابت ہو چکا ہے کہ طالب رضا بجز محبت اور کوئی نہیں ہوتا اور اگر کوئی یوں خیال کرے کہ یہ سارا تملق اور ظاہر داری فقط بدنامی کے لیے تھا تو اول تو لفظ ”کبر ذالک علیہ لاراد استرضاء ہا“ جس کے یہ معنی ہوئے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ناخوش ہو جانا انہیں بھاری پڑا اور ان کے راضی کرنے کا ارادہ کیا۔ خود اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ واقعی ابو بکر کو یہ بات بہت شاق تھی اور اسی واسطے ان کے راضی کرنے کی فکر میں تھے۔

دوسرے اگر بدنامی کا اندیشہ تھا تو مخالفین سے تھا، موافقین تو بہر حال ان کی طرف سے مطمئن ہی ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ اول تو فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مملوک نہ تھا پھر ترکہ نبوی میں میراث نہیں چلتی۔ مگر مخالفین نے اب کون سی کمی کی؟ جو راضی کر کے ان کی زبان بند کرنا چاہتے تھے۔ سو اس سے بہتر تو یہی تھا کہ جب اپنے آپ لیماہ نظر نہیں تو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے حوالے کر دیتے، اس عقل و نادانی پر کہ موافق مخالف ہندو، مسلمان، یہود و نصاریٰ سب قائل ہیں۔ ایسی حرکت ان سے تصور میں نہیں آتی۔ شیعوں جیسے کم عقل ہوں تو مضائقہ بھی نہ تھا بلکہ عقل سلیم اس روایت کو دیکھ کر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے صدق و دیانت پر شاہد ہے اور بالیقین ان کو اس مقدمہ میں بری الذمہ سمجھ کر ان کی طرف سے معتذر ہے کہ در صورت صحت روایت ہبہ فدک بلکہ بہر صورت جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فدک دینے میں آمادگی کی حالانکہ حضرت سیدۃ النساء کا یہ منصب نہ تھا کہ کسی طرف ان کا گوشہ خاطر مائل ہو اور پھر اس کے موافق نہ ہو تو یہ وجہ نہیں ہوئی کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ان کی رضا کی کچھ پروا ہی نہ تھی ورنہ اس کے کیا معنی تھے کہ دنیا دار صاحب اختیار ہو کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ناخوشی سے کچھ دشواری ہو؟ یا ان کا رنجیدہ ہو جانا، ان پر شاق ہو؟ بلکہ تہ دل سے ان کی رضا کے خواہاں تھے، پھر بایں ہمہ جو فدک نہ دیا حالانکہ اپنے لیے بھی نہ رکھا تو بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ کسی حکم خداوندی کی پابندی اور تابعداری پیغمبر صلی

اللہ علیہ وسلم کی ناچاری تھی اور مصلحت ہائے دینی و دنیوی کی رعایت تھی۔

سوپابندی خداوندی کا تو یہ حال ہے کہ آیت ”یو صبکم اللہ“ اور آیت ما الاء اللہ خود اسی بات پر دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ معلوم ہو چکا اور اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی ہے کہ خدا کی اطاعت کی جائے۔ سو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”لا نورث ما ترکنا صدقہ“ فرمایا ہو اور زیادہ اس کی تصدیق کی وجہ یہ ہے کہ اس کے صدق اور اس کے موافق روایتیں شیعوں کی معجز کتابوں سے نقل بھی ہوئی ہیں اور مصلحتوں کی یہ صورت ہے کہ اول تو احکام خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سراپا حکمت اور مصلحت ہی ہوتے ہیں۔ ماسوا اس کے اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پاس خاطر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا فدک ان کے حوالہ کر دیتے اور در صورت صحت روایات یہہ فدک اس بات کی رعایت نہ کرتے کہ ہنوز دعویٰ ہے، کوئی دستاویز کامل نہیں کیونکہ حضرت علی اور حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہما بلکہ ان کے ساتھ حسین رضوان اللہ علیہما جمعین کی بھی گواہی موافق قانون خداوندی قابل اعتبار نہیں۔

تو اول تو عام و خاص کے دل میں یہ بات نہ نشین ہو جاتی کہ خلیفہ سب مستحقوں کو برابر نہیں سمجھتے۔ رواداروں کو بے ثبوت بھی کامیاب کر دیتا ہے اور سوا ان کے اوروں سے قرار واقعی سمجھتیں طلب کرتا ہے اور واقعی یہ بات شیوہ انصاف سے بہت بعید ہے۔ مع ہذا باعث تغیر خلافت اور درہمی امور خلافت جو موجب ہے انتظامی دین ہے، ہو جاتا اور پھر یہ آگ ہرگز بجھائے نہ بجھتی، اور اگر بالفرض استحکام خلافت میں کچھ فرق نہ تھا تو یہ وبال کس کی گردن پر رہتا کہ قیامت تک حکام اسلام بھی شیوہ برتتے اور ان کے لیے یہ حجت اور دستاویز ہو جاتی کہ خلیفہ راشد نے جب ایسا کیا تو ہم بھی ایسا کریں گے، رواداروں کو منہ مانگے موتی دیں گے، غیروں کی سنیں گے۔

دوسرے اس صورت میں لازم آتا کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث کے مصداق ہو جائیں ”الْعَاقِلَةُ لِي صَلَاحِهِ كَالْغُلَبِ يُوْذِي قِيَتَهُ“ یعنی ”کسی چیز کو کسی کو اللہ دے کر پھر اس سے لوٹانے والا ایسا ہے جیسا کتاتے کر کے پھر چاٹ لیوے“ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہوں ”لا نورث ما ترکنا صدقہ“ تو جو جو چیزیں وقت وفات آپ کے ملک میں تھیں، سب صدقہ ہو گئیں اور یہ بات باتفاق فریقین ثابت ہے کہ یہ بے قبض موجب ملک نہیں ہوتا اور اب اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ تمام وفات فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبض و تصرف میں رہا تو اگر یہہ بھی کیا۔ تب بھی قبضہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا نہ ہونے پایا تھا۔ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ بغیر ہاتھ ہبہ باتفاق فریقین موجب ملک سیدۃ النساء نہ ہوا بلکہ ہمیشہ دم وفات تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک میں رہا تو بیشک یہ بھی صدقہ ہو گیا۔

سور صورت یہ کہ دعوائے ہبہ کے قبول نہ ہونے کے بعد بزعم شیعہ دعویٰ میراث کیا ہوتا جیسے ہبہ کی صورت میں صدیق بغرض پاس خاطر سیدۃ النساء ہجہ مذکور نہ دے سکے، میراث کی صورت میں اس ہجہ سے نہ دے سکے کیونکہ وارث کی ملک نائب ملک مورث ہوتی ہے۔ جب یہ متحقق ہوتا تو پہلے متحقق ہو۔ سو یہ جی ہو سکتا ہے کہ جو چیز بقول ”لا نورث ما ترکناہ صدقہ“ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے صدقہ ہو چکی ہے اور ملک سے نکل گئی تھی۔ پھر ملک نبوی میں آئے ورنہ جو چیز خارج از ملک مورث ہو۔ اس میں میراث کا جاری ہونا محال ہے، سو ایسی حرکت لغو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے کب ہو سکتی تھی؟ جس سے ایسا حرف بیچار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف عائد ہو۔ مع ہذا ”لا نورث اور صدقہ“ ہونا جب صحیح ہو کہ قابل ملک وارث نہ رہے، پھر بھی اگر ملک وارث اس میں جاری ہو تو اجتماع تینین لازم لائے۔

علاوہ باریں ”لا نورث ما ترکناہ صدقہ“ سے یوں ثابت ہوتا ہے کہ رضائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہے کہ وارثوں کو نہ دیا جائے اور رضاء حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اس طرف تھی کہ ان کو دیا جائے، ناچار ہو کر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے رضائے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مقدم سمجھ کر اقول تو ان کے فرمانے کے موافق عمل کیا اور پھر بایں ہمہ جس طرح سے بن پڑا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو بھی راضی کیا۔ چنانچہ اس حدیث میں مصرح ہے، سو یہ کمال انقیاد اور اطاعت صدیق اکبر پر دلالت کرتا ہے کہ بایں ہمہ رضائے سیدۃ النساء کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا اور نہ رضائے نبوی کو۔ در صورت یہ کہ موافق رضائے نبوی کرنا ان کی ناخوشی کا باعث ہوا ہو تو عقلاً اور نقلاً ان کے ذمہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا راضی کرنا لازم نہ تھا، چنانچہ ظاہر ہے۔

تیسری مصلحت دنیوی اس میں یہ تھی کہ اگر آپ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو کچھ بھی حوالہ کرتے تو پھر حضرت عباس اور ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہم اجمعین جدا جدا ہر کوئی اپنی جاگیر کے گاؤں مانگتا۔ سواؤل تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا لغوی جاتا کیونکہ متروکہ نبوی اس قدر نہ تھا جو اس بات کو وفا کرے کہ ہر کسی کو اس قدر دیجئے۔ دوسرے پھر خلافت ہی کیا ہوئی کہ جو بیت المال کو اس طرح لٹا دیا اور مستحق غیر مستحق کو نہ دیکھا۔ پانچواں فائدہ حدیث حجاج الساکین سے یہ ثابت ہوا کہ گو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ایک بار ناخوش ہو گئی تھیں، پر حضرت صدیق اکبر

رضی اللہ عنہ نے عذر مقول کیے اور اسی سبب حضرت فاطمہ زہرا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے راضی ہو گئیں اور خاتمہ بالخیر ہوا اور اسی فائدہ کی غرض سے آج تک اس حدیث کو رکھ چھوڑا تھا اور ظاہر ہے کہ جب رنج مبدل بخوشی ہو جائے تو پھر اس رنج کا زبان پر لانا اہل فہم کے نزدیک ناجایا ہے۔
خیر الحمد للہ کہ امامیوں ہی کی روایت سے حضرت سیدۃ النساء کا صدیق اکبر سے راضی ہو جانا ثابت ہو گیا اور پھر روایت بھی کیسی؟ معتبر کتابوں کی اور وہ بھی ایک کتاب کی روایت نہیں بلکہ سوائے حجاج السالکین کے اور کتابوں میں بھی مروی ہے۔

روایات اہل سنت میں سیدہ کی خوشنودی کا بیان موجود ہے

باقی رہیں روایات اہل سنت، سودارج المصنوعہ اور کتاب الوفاء بہمتی اور شروع مشکوٰۃ میں یہ بات موجود ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا ناخوش ہو جانا جو بظاہر کبیدگی ظاہر سے معلوم ہوتا تھا، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر شاق ہوا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے در دولت پر حاضر ہوئے اور حضرت علی سے سفارش کرائی، یہاں تک کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا ان سے خوشنود ہو گئیں بلکہ شیخ عبدالحق نے شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ اس قصہ کے بعد صدیق اکبر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے گھر گئے اور دھوپ میں دروازہ پر کھڑے رہے اور عذر معذرت کی اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہا ان سے خوش ہو گئیں اور ریاض المحضہ میں یہ قصہ بہ تفصیل مذکور ہے اور فصل الخطاب میں بروایت بہمتی قصہ سے یہ قصہ مروی ہے۔

اور ابن سحان نے کتاب الموافقت میں اوزاعی سے روایت کی ہے انہوں نے کہا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ گرمی کے دن حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے در دولت پر حاضر ہوئے اور یہ عرض کی کہ میں یہاں سے کبھی نہ ٹلوں گا، جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی مجھ سے راضی نہ ہو جائیں۔ پس حضرت علی رضی اللہ عنہ امداد تشریف لے گئے اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو قسم دی کہ تم راضی ہی ہو جاؤ، سو وہ راضی ہو گئیں۔ علیٰ ہذا القیاس شیعوں میں سے زیدیوں کی روایتیں بھی بحینہ اہل سنت کی روایات کے مطابق اور موافق ہیں۔

ان روایات کے ملاحظہ سے اہل انصاف کو تاہل نہ رہے گا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دل میں عداوت خاندان نبوی ذرہ برابر نہ تھی بلکہ ان کی محبت اور اعتقاد و ان کی تعظیم و تکریم میں ایسے فتنے تھے کہ باوجود عروج خلافت اور شوکت سلطنت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے سامنے اپنے آپ کو مثل غلامان غلام اور کمترین خدام سمجھتے تھے۔ سو یہ بات بجز اس کے تصور نہیں کہ مرتبہ کمال

صدق و صفا کو پہنچے ہوئے تھے ورنہ اگر دنیا داری کی ہوتی تو ایسے امور ان سے ہرگز ظہور میں نہ آتے، ان کی بلا کو غرض پڑی تھی کہ اس شان و شوکت پر اتنی منتیں سمجھیں کرتے؟ بلکہ خود سیدۃ النساء کا ان سے روٹھ جانا اس بات پر دلیل کامل ہے کہ حضرت سیدۃ النساء کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر کمال ہی بھروسہ تھا، ورنہ کس کے تصور میں آ سکتا ہے کہ کوئی فقیر بادشاہان جبار کے سامنے ایسی باتیں کرے اور وہ بادشاہان کو ایسی ایسی منتوں سے منائے۔

جنازہ میں شرکت سے روکنے کا افسانہ

اور بالبداهت اس سے یہ واضح ہو گیا کہ اگر بالفرض والتقدیر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے مرتے دم اس بات کی وصیت بھی کی ہو کہ میرے جنازہ پر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نہ آنے پائیں تو بہ سبب کمال حیا اور پردہ داری کو یہ وصیت کی ہوگی اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو روکنے کی تخصیص اس وجہ سے ہو کہ ان کو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا ایسا سمجھتی تھیں کہ یہ خواہ مخواہ حاضری ہوں گے کیونکہ ان کو جس قدر تعظیم و تکریم اہل بیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیش نہاد خاطر ہے اور وہ کو نہیں۔ مع ہذا ابو بکر رضی اللہ عنہ ایک بارگی رنجش سے شرمائے ہوئے ہیں۔ اس کے تدارک کے لیے وہ کوئی موقع ایسا نہ چھوڑیں گے جو اس میں غیر حاضری باعث اشتباہ اور موجب بدگمانی اہل بیت ہو۔ علاوہ بریں وہ خلیفہ وقت تھے۔ امامت نماز اور امامت جنازہ دونوں انہیں سے متعلق تھیں، اس لیے بالخصوص ان کا نام لے کر منع کیا ہو۔ غرض اگر تخصیص کہیں سے ثابت ہو بھی جائے تو اس کے یہ وجوہ ہیں۔

سیدہ کی وصیت میں عام ممانعت تھی تخصیص نہ تھی

ورنہ علی العموم مردان نامحرم کے حاضر ہونے کی آپ روادار نہ تھیں، اس لیے یہ وصیت کی کہ مجھ کو شب کو دفن کر دینا اور دلیل اس بات کی (کہ بوجہ حیا و پردہ داری علی العموم ممانعت تھی، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی کچھ تخصیص نہ تھی) یہ ہے کہ بروایت صحیحہ یہ بات مروی ہے کہ حضرت سیدۃ النساء نے اپنے مرض موت میں فرمایا کہ مجھے شرم آتی ہے کہ بعد موت بے پردہ مردوں کے سامنے مجھ کو لائیں اور اس زمانہ کی عادت یہ تھی کہ عورتوں کو مثل مردوں کے بے پردہ یعنی بے گہوارہ دفنانے کو لے جایا کرتے تھے، اس پر اسماء بنت عمیس نے عرض کیا کہ میں نے حبشہ میں دیکھا ہے کہ خرما کی شاخوں سے کبادہ کی صورت کی نقش بناتے ہیں، حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے ارشاد فرمایا کہ میرے سامنے بنا کر دکھلا، حضرت اسماء نے بنا کر دکھلایا تو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا بہت خوش ہوئیں اور تبسم کیا اور

ہرگز بعد وفات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ان کو کبھی کسی نے تجسم کرتے نہ دیکھا تھا۔

اس وجہ سے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے حضرت اسماء کو وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد تو ہی مجھے غسل دیجیو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تیرے ساتھ رہیں، کسی دوسرے کو نہ آنے دیجیو، اب غور کیجئے کہ غسل کے وقت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے آنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی بلکہ کسی مرد کے آنے کی کوئی سبیل ہی نہیں۔ اس وقت جو اوروں کے آنے سے ممانعت ہوئی تو یہ مطلب ہوا کہ عورتوں کو بھی نہ آنے دیجیو۔ سو جسے عورتوں سے اس قدر شرم ہو کہ بعد مردن ننگے بدن ان کے سامنے ہونے سے شرمائے وہ مردوں کے جنازہ پر آنے سے کیونکر نہ شرمائے۔ سو اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو رات ہی کو دفن کر دیا اور کسی کو اطلاع نہ کی۔

القصد یہ کہ تشریف دیا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اس بات کی روادار نہ ہوئیں کہ میرے جنازہ پر کوئی مرد حاضر ہو ورنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کوئی تخصیص نہ تھی اور ہرگز کسی روایت میں اہل سنت کی روایات میں سے یہ بات نہیں کہ بالخصوص حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے نام سے ممانعت ہوئی ہو۔ علی العموم ممانعت ہوئی تھی، یہ شیعوں کی شرارت ہے کہ ممانعت ان کے نام لگا دی اور پھر دلاوری یہ کہ عوام اہل سنت کے سامنے ان کی کتابوں کا حوالہ بنا دیتے ہیں، اس پر مولوی عمار علی صاحب نے تو یہ طوقان جوڑے کہ شرم کی آنکھیں پھوڑ کر صحیح مسلم کا نام لے دیا کہ اس میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے وقت وفات یہ وصیت کی تھی کہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما میرے جنازہ پر نہ آئیں۔ خدا جانے یہ بے حیائی کہاں سے اڑ لی ہے یا ایجاد فقیر ہے؟ کہ اصلاً و مطلقاً جھوٹ بولنے سے شرم نہیں آتی۔ صحیح مسلم کوئی نایاب کتاب نہیں، ہزاروں نسخے اس کے موجود ہیں، حذف کرنے کی گنجائش نہیں، اگر یہ روایت ہو تو کوئی کہیں سے نکال دے۔ فقط اس میں اتنی بات ہے۔

”کہ جب حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی وفات ہوئی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو شب ہی کو دفن کر دیا اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اطلاع نہ کی اور نماز پڑھی، ماں پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے“ چنانچہ تسکین خاطر ناظرین کے لیے عبارت روایت صحیح مسلم منقول ہے۔ اس کا ترجمہ بلا کم و کاست یہی ہے جو میں نے عرض کیا، وہ عبارت یہ ہے: ”فَلَمَّا تُوُفِّيَتْ فَلَحَّهَا زَوْجُهَا عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ لَيْلًا وَلَمْ يُؤْفِنْ بِهَا أَبَا بَكْرٍ وَصَلَّى عَلَيْهَا عَلِيٌّ“ اور اس عبارت سے آگے نہ پیچھے کہیں وصیت کا ذکر نہیں، خدا جانے مولوی صاحب نے اس

عہادت میں سے یہ معنی کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے صدیق اکبر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے نہ آنے دینے کی وصیت کی تھی کون سی اہل بیت اور کون سی زبان اور کون سے محاورہ کے موافق نکال لیے ہیں۔ سبحان اللہ علماء شیعہ کی یہ امانت و دیانت اور صدق گفتار ہے کہ دیدہ دانستہ ایسے مہموٹ بولتے ہیں۔ غرض صحیح مسلم میں تو فقط اتنی بات ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت سیدہ امساء کو شب کو دفن کر دیا اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اطلاع نہ کی اور اپنے آپ نماز جنازہ پڑھی اور یوں بھی ایک قول ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے چند ایک اہل بیت کے ساتھ نماز پڑھ کر رات ہی کو دفن کر دیا مگر بہر حال صحیح مسلم میں وصیت کا ذکر معلوم نہیں ہوتا۔

اور اگر بالفرض کسی روایت میں اس باب میں کوئی وصیت بھی ہو تو اس بات کی وصیت ہوگی کہ مردوں میں سے میرے جنازہ پر کوئی نہ آئے۔ چنانچہ بعضی روایات میں آیا ہے کہ دوسرے دن جو حضرت صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما اور سوا ان کے اور اصحاب رضی اللہ عنہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر تعزیت کے لیے حاضر ہوئے تو شکایت کی کہ ہمیں آپ نے خبر نہ کی، ہمیں بھی شرف نماز اور شرف حضور میسر آ جاتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت کی تھی کہ جب میں دنیا سے اٹھوں تو مجھے رات ہی کو دفن کر دینا تاکہ میرے جنازہ پر کسی نامحرم کی نگاہ نہ پڑے۔ سو میں نے ان کی وصیت کے موافق عمل کیا ہے۔ غرض اس روایت سے اور بھی روایت مشہور ہے۔ علی العموم نامحرموں کے آنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ حضرت صدیق اکبر یا حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی تخصیص کا اشارہ بھی نہیں۔

مگر شیعوں کی بدگمانی کا یہ حال ہے کہ اہل بیت کی تمام حرکات و سکنات کو مطابق بنائیں یا نہ بنائیں، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عداوت پر محمول کرتے ہیں اور عمل و فعل کا کچھ لحاظ نہیں کرتے، ان کی وہی مثل ہے جیسے مشہور ہے سب نے سنا ہوگا۔ شعر:

مگر راجوں کلونے بر سر آید ز شادی بر جہد کیں استخوان است
وگر غشی دو کس بردوش دارند لیتم الطبع پندارو کہ خوان است
”کتے کے سر پر جب پتھر آ کر لگتا ہے تو اس کو ہڈی سمجھ کر خوشی سے اچھلتا ہے اور اگر دو شخصوں

کو لٹکائے ہوئے جاتے دیکھے تو یہ بد طبیعت اس کو دستر خواں سمجھتا ہے۔“

القہ۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ممانعت کی یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ممانعت کی، کہیں تخصیص و تصریح نہیں۔

سیدہ کا جنازہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہما ۱۱

بلکہ لصل الخطاب کی رعایت سے تو یہاں ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی نماز کے وقت حاضر ہوئے اور حضرت فاطمہؓ ہوا رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔
 کے دن رمضان شریف کی تیسری تاریخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی عمر شریف اٹھائیں برس کی تھی، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیش امام ہوئے، چار نگہیروں کے ساتھ نماز پڑھائی اس معامت سے کہ وہ شامان علی رضی اللہ عنہ کو بھی تحقق ہوتا ہے کہ حضرت سید النساء نے ہرگز صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سنا نے دینے کی وصیت نہ کی تھی کیونکہ جب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ یہ عزم رکھتے ہوں کہ سعید بن العاص کو (حالانکہ وہ کچھ مؤدب نہ تھا) امام نہ ہونے دیں تو حضرت علیؓ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

ادھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ ادب کہ تھوڑے ہی دنوں پہلے کیا کیا تاک رگڑ چکے تھے، سوا؟
 حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا وصیت کرتیں تو اول تو صدیق اکبر کو دھکے دلوادیتے ورنہ نماز کا تو ذکر؟ کیونکہ اپنی شجاعت اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ادب کے باعث کوئی وجہ تقیہ کی بھی نہ تھی۔
 القصد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ممانعت کی کوئی روایت نہیں، ہاں ایسی روایتیں ہیں جن سے عموماً ممانعت ثابت ہے اور اگر بالفرض تخصیص کر کے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا نام آتا ہو تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے منع کی وجہ تو مذکور ہو لیں، باقی رہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سوا اول وجہ میں تو وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے شریک ہی ہیں اور علیؓ ہذا القیاس دوسری وجہ بھی کیونکہ یہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سامنے بجز ولہ و زیر مشیر تھے، سو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سب کام انہیں کے مشورہ سے ہوتے تھے، سوا اگر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو (بوجہ نہ دینے فہر کے) کچھ صدیق اکبر سے رنج تھا اور اس سبب سے وہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا سے شرماتے ہوئے ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے تھا اور یہ ان سے پہلے شرماتے ہوئے تھے۔

باقی رعیت تیسری وجہ اس میں بھی حضرت عمر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ایک وجہ سے شریک ہیں کیونکہ حضرت عمر اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہما بجز ولہ لازم و ملزوم ہیں۔ یہ ممکن نہ تھا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بگائے جائیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبر نہ ہو۔ سوا اگر بالفرض وہ اندر کھاروایت میں (اہلسنت کی) ممانعت تخصیص ہاں ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی نکل آئے تو ان کی

وجہ یہ ہیں جو میں نے عرض کیے، عداوت اور بغض صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہ تھا اور دلیل عقلی اس بات کی (کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے جنازہ پر نہ بلوانا، بوجہ حیاء سیدۃ النساء اور باعث پردہ داری حضرت زہرا رضی اللہ عنہا تھا، نہ بوجہ کدورت اور ناخوشی) یہ ہے کہ اگر بوجہ کدورت اور ناخوشی ہوتا تو اس وجہ سے ہوتا کہ مبادا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ان کے جنازہ کی نماز نہ پڑھائیں کیونکہ وہ خلیفہ تھے۔ امامت نماز، بلکہ امامت اور امامت نماز جنازہ انہی سے متعلق تھا۔ سو یہ بات کسی وجہ سے درست نہیں ہو سکتی۔

اس لیے کہ باجماع مؤرخین طرفین شیعہ سنی جب حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا جنازہ باہر لائے، امام حسین رضی اللہ عنہ نے سعید بن العاص کو جو امیر معاویہ کی طرف سے مدینہ کا امیر تھا، نماز پڑھانے کے لیے اشارہ کیا اور یہ فرمایا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یوں نہ ہوتی کہ امام جنازہ امیر ہوا کرے، تو تجھے ہرگز آگے نہ بڑھاتا۔ سو معلوم ہوا کہ حضرت سیدۃ النساء نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نماز پڑھانے کے اندیشہ سے یہ وصیت نہ فرمائی تھی ورنہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کس طرح حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے خلاف کرتے اور ظاہر ہے کہ سعید بن العاص ہزاروں مرتبہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کترتے، خاص کر لیاقت نماز میں۔

کیونکہ کوئی چھ ہی مہینہ گزرے تھے جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امام نماز تمام مہاجر اور انصار کا کیا تھا اور اس باب میں کمال ہی تاکید فرمائی تھی۔ پھر کیونکر احتمال ہو کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اس تھوڑی سی مدت میں یہ تمام واقعات بھول گئی ہوں۔ الحاصل دلائل عقلیہ اور عقلیہ دونوں اس بات پر شاہد ہیں کہ شیعوں کا یہ وہم کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جنازہ پر آنے دینے کی روادار نہ تھیں، عقل نہ ہونے کے باعث پیدا ہوتا ہے اور ان وجوہ کو بھی جانے دو، ہمیں فقط روایت عجیب السالکین جو ابھی مرقوم ہوئی ہے کافی ہے کیونکہ حضرت فاطمہ زہرا سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے (بالخصوص) جنازہ پر آنے کی روادار نہ ہوتیں تو بوجہ رنج روادار نہ ہوتیں۔ سو اس روایت سے یہ بات عیاں ہے کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے دل مبارک میں اگر بالفرض رنج تھا بھی تو وہ زائل ہو گیا تھا اور دونوں باہم راضی خوش ہو گئے تھے۔

مگر کوئی شیعہ منافق پیشہ حضرت سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا کو بھی (نعوذ باللہ) منافق سمجھے اور یوں کہے کہ یہ راضی ہو جانا فقط ظاہر داری کے لیے ہوگا تو یہ بات علیحدہ ہے، پر یہ بات شیعوں ہی کے سمجھنے کی

ہے کیونکہ المرء بقیس علیٰ نفسہ صیغہ خود ہیں ایسے ہی بزرگان دین کو سمجھتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے۔
 کار پا کاں را قیاس از خود مکبر گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر
 "اور ہاں ہمہ پھر کیا ہوتا ہے۔ شیعوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں، یہ ممکن نہیں۔"

خدا اور رسول راضی ہوں تو سیدہ کی ناراضی سے کچھ نقصان نہیں

اگر بالفرض والتقدیر بزم شیعہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے اس جہان سے ناخوش ہی گئی ہوں تو در صورت یہ کہ خدا اور رسول خوش ہوں، کچھ نقصان نہیں اور جو کچھ نقصان تھا بھی تو اس کی تدبیر اور اس کا بندوبست خود خداوند کریم نے لکھو کھا برس پہلے کر دیا۔ سورہ حجر میں فرماتے ہیں "وَنَزَعْنَا مَا فِي صُلُوبِهِمْ مِنْ عَلَقٍ إِخْوَانًا عَلٰی سُرٍّ مَّقَابِلَيْنِ ط" اس آیت میں متقیوں کے جنت میں داخل ہونے کی کیفیت بیان فرماتے ہیں، مطلب یہ ہے "اور نکال ڈالی ہم نے جو کچھ ان کے دلوں میں خفکیاں تھیں وہ بھائی ہو گئے، تجھوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے۔" اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ متقیوں اور پرہیزگاروں میں آپس میں رنج بھی ہو جایا کرتے ہیں اور وہ رنج ان کو کچھ معزز نہیں ہوتے، ہمتا یت خداوندی جنت میں جانے کے خارج نہیں ہوتے بلکہ جنتی ہونے کی وجہ سے وہ رنج خود ہی زائل ہو جاتے ہیں۔

سوا کہ بالفرض بزم شیعہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے رنجیدہ ہی اس جہان سے گئی ہوں جب اس آیت بشارت آمیز نے صدیق اکبر اور ان کے ہوا خواہوں کی تسلی کر دی اور شیعوں کی آنکھوں میں خاک ڈال دی، مگر شاید کوئی شیعہ چرپوزیوں میں سے گمراہ کرے کہ ہر چند اس آیت میں یہ بشارت ہے جو مذکور ہے لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ اوروں ہی کے لیے یہ بشارت ہے جن سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ناخوش ہوں۔ ان کے لیے اس بشارت میں حصہ نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شان میں یوں ارشاد فرمایا ہے اور یہ حدیث متفق علیہ طرفین ہے: "إِنَّ فَاطِمَةَ بَضْعَةٌ مِنِّي يَوْمَ ذِي نِجْدٍ مَا إِذَا هَا وَبُوتِنِي مَا أَبْهَا لَمَنْ أَغْضَبَهَا أَغْضَبَنِي" یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے "کہ یاد رہے یہ بات کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا میرے بدن کا ٹکڑا ہے جس سے اسے تکلیف ہو، اس سے مجھے بھی تکلیف ہو، جس بات سے وہ گھبرائے اس سے میں بھی گھبراتا ہوں، سو جو شخص اسے غصہ کرے گا وہ مجھے غصہ کرے گا۔" فقط اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غصہ کرنے والا کون ہوتا ہے۔

بضعة منی سے اشکال اور اس کے جوابات

سو اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پہلے ہی رعایت کر گئے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ”لَمَنْ أَغْضَبَهَا أَغْضَبْنِي“ جس کے یہ معنی ہیں کہ جو اسے غصہ کرے گا وہ مجھ کو غصہ کرے گا اور یوں نہیں فرمایا ”مَنْ غَضَبْتُ عَلَيْهِ غَضَبْتُ عَلَيْهِ“ یعنی جس پر وہ غصہ ہوں گی اس پر میں بھی غصہ ہوں گا۔ ظاہر ہے کہ کسی کو غصہ کر دینے کی یہ صورت ہے کہ دیدہ و دانستہ کسی بات یا کلام سے کوئی شخص اسے غصہ دلانے کا ارادہ کرے، سو کمال نادانی کی بات ہے کہ کوئی شخص صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف یہ بات منسوب کرے کہ انہوں نے بالقصد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غصہ دلایا تھا جو جانتے تھے، وہ تو جانتے ہی تھے، پر وہ جو نہ جانتے تھے، اب تو ان پر بھی واضح ہو گیا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس قصہ میں معذور تھے، اور بایں ہمہ پھر عذر معذرت کیا کیا کچھ نہ کیا۔

روایات کو ٹٹولنے تو معلوم ہو جائے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مکرریں عرض کیا کہ ”وَاللّٰهُ يَا اَهْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اِنَّ قَرَابَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَبُّ اِلَيَّ اَنْ اَصِلَ مِنْ قَرَابَتِي“ یعنی ”اللہ کی قسم! اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کے ساتھ صلہ کرنا، اور ان کی خدمت کرنا بہت ہی زیادہ محبوب ہے، میرے نزدیک اپنے قرابتیوں کے ساتھ صلہ رحمی کرنے سے“ اور جب ان کی طرف سے اغصاب ہی نہ ہوا، یعنی انہوں نے بالقصد ان کو غصہ نہ دلایا بلکہ حتی المقدور اس کا بچاؤ ہی کیا ہو تو وہ پھر کس طرح اس وعید میں داخل ہوں گے۔ اگر بالفرض کچھ ہوا بھی ہو تو اتنا ہوا ہو کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بمقتضائے بشریت غصہ ہو گئی ہوں، اس کو اگر ہم مان لیں اور ان تو جیہات کا جو مذکور ہو لیں، کچھ خیال نہ کریں تو بیش بریں نیست کہ موافق وعدہ ”وَنَزَعْنَا مَا فِي صُلُوْبِهِمْ مِنْ عُلٍّ“ قیامت کو سینہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا سے وہ رنج نکالا جائے اور دونوں میں سے کسی کو وہ آپس کی شکر رنجی معز نہ ہو۔

بضعة منی کا شان و رود اور حضرت علی رضی اللہ عنہ

کا سیدہ رضی اللہ عنہا کو بار بار ہا غصبناک کرنا

اور اگر قطع نظر غصہ کرنے سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا خود بخود غصہ ہو جانا بھی اس وعید میں داخل کر دیں تو شیعوں کو ہم سے زیادہ مشکل پڑے گی کیونکہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو معصوم نہیں، اگر ان سے کوئی حرکت بیجا ہو جائے اور اس سبب سے کسی وعید میں شامل ہو

جائیں تو کچھ بعید نہیں، پر حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ تو شیعوں کے نزدیک معصوم تھے، ان سے جو ہار یا مقدمات خانگی میں حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو رنج ہو گیا ہے تو اس کا کیا سبب؟ بلکہ اس فرمانے کا "الا ان فاطمہ بضعة منی بو ذہبی الخ" سبب یہی ہوا تھا کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں اس وجہ سے فی الجملہ ناچاقی ہو گئی تھی کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کا پیام بھیجا تھا، اس میں حضرت زہرا رضی اللہ عنہا روتی ہوئیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اس تقریب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور خطبہ یہ ارشاد فرمایا "الا ان فاطمہ بضعة منی الخ" سو اگر فقط حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے غصہ ہو جانے کے باعث صدیق اکبر رضی اللہ عنہ وعید مذکور میں داخل ہو جائیں تو حضرت امیر پہلے داخل ہوں گے کیونکہ اول تو خطبہ انہیں کے سمجھانے سنانے کو فرمایا تھا، دوسرے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تو بوجہ ارشادات خداوندی اور ارشاد پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم فدک کے نہ دینے میں معذور تھے اور پھر بایں ہمہ باشارہ حدیث بحاج یوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر حکم خداوندی نہ ہوتا، تب بھی ان کے تہ دل میں یہی تمنا تھی کہ فدک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی کے پاس رہے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کا ارادہ کیا تو ان کو کیا دشواری تھی؟ اور پھر یہ ہی نہیں کہ تہ دل سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی کے موافق ہوں۔

علی ہذا القیاس ایک بار حضرت امیر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا سے رنجیدہ ہو کر گھر سے باہر تشریف لے آئے اور مسجد میں زمین ہی پر بدون کلمہ بچھونے کے سو گئے۔ جب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قصہ کی خبر ہوئی، آپ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور پوچھا کہ تیرے چچا کا بیٹا یعنی علی مرتضیٰ کہاں ہیں؟ عرب میں ایسے موقع میں اکثر ایک دوسرے کو چچا کا بیٹا بولتے ہیں، خیر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ مجھ سے لڑ کر نکل گئے اور دو پہر کو بھی یہاں نہیں سوئے اور یہ دونوں روایتیں کچھ سنیوں ہی کی کتابوں میں نہیں، شیعوں کی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔

پیغام نکاح کوئی گناہ نہ تھا مگر

سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا کو بشریت کی وجہ سے غصہ آیا

باقی روایت اول سے سوائے مطلب پیش آمدہ کے ایک اور بات بھی نکلتی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آخر بشر تھیں۔ بمقتضائے بشریت غصہ آ جاتا تھا اور نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو

ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کا ارادہ کیا تو انہوں نے موافق حکم خدا و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی گناہ یا کسی گناہ کا ارادہ نہ کیا تھا۔ پھر اب غصہ کی وجہ بجز مقتضائے بشریت اور کچھ نہیں بلکہ دونوں روایتوں سے اتنی بات نکلتی ہے کہ مصحوم کو بمقتضائے بشریت غصہ آ جانا محال نہیں بلکہ بسا اوقات پیش آ جاتا ہے کیونکہ حضرت علی اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہا دونوں ہی مصحوم تھے، پھر جو آپس میں رنج ہو جاتا تھا تو قصور وار کسی کو بھی نہیں کہہ سکتے، بجز اس کے کہ بمقتضائے بشریت ایک کو دوسرے کی نسبت کچھ خیال قاسد دل میں آ جائے اور اس سبب سے بے اختیار غصہ چڑھ جائے اور اس غصہ میں دوسرے کی مصحومیت کا بھی لحاظ نہ رہے اور کوئی صورت نہیں۔ سوائے ہی ہم بمقتضائے بشریت کہتے ہیں۔

اسی طرح اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر بھی بمقتضائے بشریت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے غصہ ہو جانے سے، بے اس کے کہ کوئی دیدہ و دانستہ بے وجہ ان کو غصہ دلائے، آدی و عید مذکور میں داخل نہیں ہو سکتا۔ علاوہ بریں سب جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بشریت کی وجہ سے حضرت ہارون علیہ السلام پر جو ان کے بڑے بھائی تھے اور نبی مقرب تھے غصہ ہوئے یہاں تک کہ سر اور ڈاڑھی کے بال پکڑ کر کھینچنے کی نوبت آئی اور یہ سب کو یقین ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غصہ کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا کیونکہ نبی کا بالتقدیر غصہ دلا نا کفر ہے مگر تاہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غصہ ہونے میں کچھ شک نہیں، پس اگر اتنے غصہ ہو جانے کو یوں کہیے کہ یہ بھی اغصاب ہے یعنی انہیں کی طرف سے ہے تو نفوذ باللہ حضرت ہارون علیہ السلام کو یوں کہنا پڑے کہ اس وقت کافر تھے۔

اس سے انصافاً معلوم ہو گیا کہ فقط بمقتضائے بشریت کوئی شخص کسی پر غصہ ہو جائے تو اسے اغصاب نہیں کہتے اور یہی قضیہ عینہ حضرت صدیق اکبر اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سے اغصاب نہیں۔ فقط حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے اگر تھا تو غضب تھا۔ ہاں ہم کہتے ہوئے ڈرتے ہیں اغصاب ہوا ہے تو بظاہر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوا ہوگا کیونکہ وہ خاوند تھے ان کو اتنا ادب نہ ہوگا جتنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہوگا۔ علاوہ بریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وجہ معلوم نہ کر خطبہ کا پڑھنا جس میں لفظ ”اغضبہا“ اس بات پر گوند دلالت کرتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اغصاب پیش آیا ہو اور جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سے اغصاب ہی نہیں تو پھر ان کو وعید ”لمن اغضبہا اغضبہا“ میں داخل سمجھنا اپنے آپ اس میں داخل ہوتا ہے۔ کیونکہ عقیدہ باطل سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور خود بدولت جناب رسالت مآب صلی

اللہ علیہ وسلم بھی ہینک نا خوش اور غصہ ہوتے ہیں تو اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو وجہ سے رنج اور غصہ ہوگا، ایک اپنے آپ؟ دوسرا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سبب سے اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ یہ اغصاب ہے، فقط بمقتضائے بشریت ہی نہیں، اس سبب سے بالیقین معلوم ہوتا ہے کہ بدگویان صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بایں طور کہ وہ وعید "لمن اغضبها" میں داخل ہیں، آپ اس وعید میں داخل ہوتے ہیں سو جو لوگ بدگویان مذکور میں سے اس دار دنیا سے چل دیئے، وہ تو چل دیئے، پر مولوی عمار علی صاحب وغیرہ باقیان شیعہ تو اپنا فکر کریں اور اس عقیدہ بد سے باز آ کر توبہ واستغفار سے تدارک ماقات کریں، آئندہ نہ مانیں تو وہ جانیں۔

ما نصحت بجائے خود کردم روزگارے درین سر بردم

در نیار دگوش اندر کس بر رسولان بلاغ باشد و بس

اب لازم یوں ہے کہ بس کیجئے کیونکہ کوئی بات مولوی صاحب کی خرافات میں سے باقی نہیں رہی جس کا جواب ثانی بفضلہ تعالیٰ اس رسالہ میں درج نہیں ہوا اس لیے ان کلمات طیبات پر ختم کرتا ہوں۔

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله واصحابه وازواجه واهل بيته وذريته اجمعين. والمرجو منك يا ارحم الراحمين ان تقبل هذه الرسالة مني وتجعله وسيلة لي الى رضاك ورضاء رسولك صلى الله عليه وسلم رضاء اهل بيته ورضاء صاحبه في الغار سيدنا ابي بكر الصديق رضي الله عنه ومن سواه من اصحابه صلى الله عليه وسلم رضوان الله عليهم اجمعين وان تغفر لي وترحمني بهذه الاوراق في الدنيا والاخرة مغفر ورحمة تحيط بها والدي وآبائي الماضين ذريتي واقاربى واحبابى خصوصاً من امرنى بالقيام لهذا الامر العظيم برحمتك يا ارحم الراحمين ط

خلاصہ جواب طعن فدک

جو صاحب مذہب تشیع کی حمایت کریں اور بوجہ ہبہ فدک یا میراث فدک اول الخلفاء کی شکایت کریں تو ان کو در صورت دعویٰ ہبہ یہی تین مقدموں کا اثبات لازم ہے اور در صورت ادعائے میراث بھی تین باتوں کی تحقیق واجب، ہبہ کی صورت میں تو اول مملوک نبوی ہونا فدک کا، دوسرے وقوع ہبہ تیسرے حصول قبض، علیٰ ہذا القیاس در صورت میراث اول مملوک نبوی ہونا فدک کا۔ دوسرے ذوال حیات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور انقطاع تعلق روح پر فتوح حضرت صلی اللہ علیہ وسلم، جو جسم اطہر

سے حاصل تھا۔ تیسرے موم خطاب ”یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مفل حظ الاھلین“ یہاں تک کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی داخل زمرہ مخاطبین ہوں اور یہ خطاب کل دیگر اشخاص مؤمنین امت آپ کو بھی شامل ہو سکیں واقفان فن مناظرہ اور دانشوران فنون دلائل صمدی پر واضح ہوگا کہ اہل سنت کو جو اس مقدمہ میں مدعا علیہ ہیں، قبل استماع دلیل دعویٰ لفظ ”لاکسلم احی“ محض انکار اور عدم تسلیم ہی کافی ہے۔ دونوں دعوؤں کے تینوں مقدموں میں سے اگر ایک مقدمہ کبھی تسلیم نہ کریں تو نہ خود مورد طعن ہو سکیں اور نہ طعن مذکور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر مانع ہو سکے۔ چہ جائیکہ تینوں مقدموں کو نہ مانیں؟ اور اگر مقدمات ثلاثہ مذکورہ کو بدلائل واضح باطل کر دیں ان کے نقائص کو بدلائل قوی ثابت کر دیں تو پھر تو میدان ان سے کون لے سکتا ہے؟

ناظران ہدیۃ الشیعہ پر غلطی نہ ہے گا کہ جب کے تین مقدموں میں سے آخر کے مقدمے کا بطلان ثبوت سے ثابت نہ ہوئے بلکہ موافق اصول اہل سنت ان کی نقیض ثابت ہے اور میراث کے دعویٰ کے لیے جو تین مقدمے مقوف علیہ ہیں ان میں سے دوسرے مقدمے کا ابطال اگرچہ بظاہر دشوار ہے، پر اس پیمند ان نے اس باب خاص میں ایک دہ سالہ کسی باب حیات لکھا ہے جس کی ضخامت پانچ چھ حصے کم نہ ہوگی اھان شاہ اللہ اگر فشی محمد حیات صاحب کی عنایت ہے تو وہ بھی قریب ہی مطبوع ہو کر مطبوع ہوتا ہے اس کے دیکھنے کے بعد امید خدا سے یوں ہے کہ شیعوں میں سے بھی جو صاحب انصاف پرست ہوں، حق باطل، انھیں ورنہ اہل حق یعنی اہل سنت کا تو کام یہی ہے کہ حق کو حق مانیں اور باطل کو باطل جانیں۔

رہا اول مقدمہ ہبہ اور میراث کا اور تیسرا مقدمہ میراث کا، ان کا ابطال اور ان کی نقیضوں کا اثبات رسالہ ہدیۃ الشیعہ میں بتفصیل تمام مرقوم ہے۔ خصوصاً مقدمہ اولی ہبہ و میراث کا بطلان تو ایسا واضح ہے کہ بجز تیرہ دروں کو رہا طعن اس میں اور کوئی متائل نہ ہوگا، یہی وجہ ہوئی کہ ۱۲ ہجری میں جو مرکز دائرہ تشیع نصیر الدین طوسی ثانی نور اللہ شوستری مکانی مفتی محمد قلی کے قرۃ العین مولوی حامد حسین جو اثناء سفر لدھیانہ وارد میرٹھ ہوئے اور میر مہدی علی فرزند ارجمند عمر دراز علی خان کے مکان پر تشریف لائے اور یہ پریشان روزگار جو بوجہ پابندی علاقہ مطیع مجتہائی وہاں ان دنوں شب و روز گزارتا تھا، ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کچھ اس قسم کا مذکور آیا تو مولوی صاحب موصوفی کو کچھ جواب نہ آیا۔ ”واللہ لا یھدی القوم الظالمین“

مقالات حجۃ الاسلام 17 جلدوں پر ایک نظر

جلد 15 مکتوب ششم مکتوب ہفتم مکتوب ہشتم	جلد 11 قبلہ نما تنویر النمراس الحظ المقسوم من قاسم العلوم	جلد 5 الدلیل للحکم مع شرح اسرار الطہارۃ افادات قاسم اجوبۃ الکاملۃ لطائف قاسم	جلد 1 حضرت حجۃ الاسلام رحمہ اللہ کی سوانح پر مشمول اہم مضامین و مقالات
جلد 16 مکتوب نہم مکتوب دہم مکتوب یازدہم مباحثہ سفر رزکی	جلد 12 فرائد قاسم فتویٰ متعلق دینی تعلیم پر اجرت	جلد 6 اجوبہ اربعین	جلد 2 اسرار قرآنی انتباہ المؤمنین تحذیر الناس مناظرۃ عجیبہ تصفیۃ العقائد انتصار الاسلام
جلد 17 جمال قاسمی مکتوبات قاسمی (متعلق اسرار الطہارۃ) حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے علم و فضل اور حالات و واقعات پر متفرق مضامین حکمت قاسم سند حدیث (عربی) علمی خدمات	جلد 13 مکتوب کرامی مضامین و مکتوب الیہ ”انوار النجوم“ اردو ترجمہ قاسم العلوم مکتوب اول تخلیق کائنات سے پہلے اللہ کہاں تھا؟ یعنی مکتوب دوم	جلد 7 ہدیۃ الشیعہ	جلد 3 آب حیات
	جلد 14 مکتوب سوم مکتوب چہارم مکتوب پنجم	جلد 8 تقریر دلپذیر	جلد 4 تحفہ لمحیہ مصباح التراویح الحق الصریح فی اثبات التراویح توثیق الکلام فی الانصات خلف الامام
		جلد 9 قصائد قاسمی فیوض قاسم روداد چندہ بلقان حجۃ الاسلام	
		جلد 10 گفتگوئے مذہبی (میلہ خدائی) مباحثہ شاہ جہاں پور جواب ترکی بترکی برائین قاسم	